جلد نمبر ۱۷ ۔ ۱ جنوری ۱۹۲۶ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی عام طور سے مشہور ہے مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر جس اہتمام کیساتھ مرتب کیا گیا ہے آجتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین تا ہیں حکومت الٰہی وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں اسکے بعد ان معجزات کے متعلق غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں سے، تقطیع خورد صہ و ما، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، ولعہ، تقطیع خورد صہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں ہے، روسے، تقطیع خورد صہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ، وللعہ،

(منیجر دارالمصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۱ | ماہ ذیقعدہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۳۸ء | عدد ۱

مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ سال کے خاتمہ پر ۲۳ دسمبر ۱۹۳۷ء کو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹر ایٹ لاو تعلقہ دار گدیہ (بارہ بنکی صوبۂ اودھ) نے انسٹھ برس کی عمر میں دل کی پرانی بیماری سے وفات پائی، مرحوم اسلام کے پرجوش سپاہی تھے، عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروف جہاد رہے، ووکنگ مشن کی قلمی کوششوں میں انکا حصہ نہایت اہم ہے، جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ ووکنگ ہی میں مقیم تھے، یورپ کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقاتیں رکھتے تھے اور دنیائے اسلام کے اکثر اکابر سے ان کی ذاتی واقفیت اور مراسلت تھی، وہ اتحاد اسلامی کی تحریک کے بانیوں اور ملک کی سیاسی آزادی کے حامیوں میں تھے، ۱۹۲۰ء میں فیض آباد خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ ہندوستان میں ٹرکی اور یورپ کے معاملات کے متعلق پہلا ذریعۂ علم تھا، مرحوم اپنی آخیر زندگی تک اسلام کی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات سے شاید چند ہی روز پہلے ان کی آخری انگریزی تصنیف اسلام اور بولشزم چھپ کر نکلی تھی، اللہ تعالیٰ اس سپاہی کے مجاہدانہ قلمی خدمات کو حسن قبول اور تاثیر بخشے اور اس کو بہشت بریں کی نعمت عطا فرمائے،

---

۷ جنوری ۱۹۳۸ء کو شبلی منزل میں دار المصنفین کی مجلس عاملہ کا جلسہ دار المصنفین کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی صدارت میں منعقد ہوا، باہر سے مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی بھی اس کی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، پروفیسر عبد الباری صاحب ندوی اپنی علالت کے سبب شریک نہ ہو سکے، مجلس نے حسب معمول سال بھر کے معاملات کا فیصلہ کیا، اور دار المصنفین کی مالی حالت کا جائزہ

اور اس کو اطمینان کے قابل پایا، ارکان نے دار المصنفین کے رفقاء سے بار بار مل کر ان کو استفادہ کا موقع دیا

ملک کے سیاسی افق پر آجکل کدورت کا جو غبار چھایا ہے، وہ آہستہ آہستہ ہٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن ہندو مسلمان اہل سیاست کی باہمی آویزش شاید صرف انتخابی نشستون اور چند فیصدی حقوق کی کمی و بیشی پر کر ختم ہو جائے، یا وزیرون کے انتخاب کی مہم کو سر کرنے سے وہ دور ہو جائے لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آزاد ہندوستان مین اسلام اور مسلمانون کی حفاظت صرف نشستون، وزارتون اور فیصدی نوکریون کے تصفیہ سے نہین ہو سکتی، ہماری ہمیشہ سے پکار یہ ہے اور اسی کو ہم ہندوستان مین مسلمانون کی حفاظت کی ضمانت جانتے ہین کہ مسلمان سب کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی مین حصہ لین، اور ملک کی اکثریت انکی کلچرل اٹانومی (تمدنی و مذہبی خود مختاری) کا حق تسلیم کرے، اور مسلمانون کی تعلیم، اوقاف، مساجد اور شخصی قانون وعدالت کے محکمے ان کے ہاتھون مین سپرد کرے، اس تجویز کی تفصیلات پر معارف اور ہمارے بعض خطبون مین تفصیلین آچکی ہین،

یہ بات افسوس کے قابل ہے کہ ہمارے بعض آزاد سیاسی نوجوان اپنی زبان اور قلم سے مذہب کو صدمہ پہنچا کر ملک کی آزادی کی راہ مین جوان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے خود مشکلین پیدا کر رہے ہین، اور مسلمانون اس روش سے کتنی نفرت دلا رہے ہین جسکی طرف وہ مسلمانون کو پوری بیتابی کیساتھ بلا رہے ہین، اگر وہ خدا کیلئے نہین تو کیا اپنی ملکی آزادی ہی کی خاطر اپنے طرز عمل مین تبدیلی کر سکتے ہین، خدا جانے کتنے مسلمان ہین جو ملک کی آزادی کے ان ہی کی طرح خواہان ہین، مگر اس کے لئے وہ اپنے مذہب کو قربان کرنا نہین چاہتے، کاش یہ سیاسی نوجوان "مذہب مین عدم مداخلت" پر اتنا ہی عمل کرتے جتنا انگریز اپنی مملکت مین کرنے کا دعویٰ کرتا ہے،

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

گذشتہ سال کے خاتمہ پر ۲۳ دسمبر ۱۹۳۱ء کو شیخ مشیر حسین صاحب قدوائی بیرسٹرایٹ لا و تعلقہ دار گدیہ (بارہ بنکی صوبۂ اودھ) نے انسٹھ برس کی عمر میں دل کی پرانی بیماری سے وفات پائی، مرحوم اسلام کے پرجوش سپاہی تھے، عمر بھر فرنگستان کی وادیوں میں اپنے قلم سے مصروف جہاد رہے، ووکنگ مشن کی قلمی کوششوں میں انکا حصہ نہایت اہم ہے، جنگ عظیم کے زمانہ میں وہ ووکنگ ہی میں مقیم تھے، یورپ کے بڑے بڑے مشاہیر سے ملاقاتیں رکھتے تھے اور دنیائے اسلام کے اکثر اکابر سے ان کی ذاتی واقفیت اور مراسلت تھی، وہ اتحاد اسلامی کی تحریک کے بانیوں اور ملک کی سیاسی آزادی کے حامیوں میں تھے، ۱۹۲۰ء میں فیض آباد خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے جو خطبہ پڑھا تھا وہ ہندوستان میں ٹرکی اور یورپ کے معاملات کے متعلق پہلا ذریعۂ علم تھا، مرحوم اپنی اخیر زندگی تک اسلام کی خدمت میں مصروف رہے، ان کی وفات سے شائد چند ہی روز پہلے ان کی آخری انگریزی تصنیف اسلام اور بولشزم چھپ کر نکلی تھی، اللہ تعالیٰ اس سپاہی کے مجاہدانہ قلمی خدمات کو حسن قبول اور تاثیر بخشے اور اس کو بہشت بریں کی نعمت عطا فرمائے،

---

۷ جنوری ۱۹۳۲ء کو شبلی منزل میں دارالمصنفین کی مجلس عاملہ کا جلسہ دارالمصنفین کے صدر نشین نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خاں شروانی کی صدارت میں منعقد ہوا، باہر سے مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی بھی اس کی شرکت کے لئے تشریف لائے تھے، پروفیسر عبدالباری صاحب ندوی اپنی علالت کے سبب سے شریک نہ ہو سکے مجلس نے حسب معمول سال بھر کے معاملات کا فیصلہ کیا، اور دارالمصنفین کی مالی حالت کا جائزہ لیا

اور اس کو اطمینان کے قابل پایا، ارکان نے دار المصنفین کے رفقار سے بار بار مل کر ان کو استفادہ کا موقع دیا

ملک کے سیاسی افق پر آجکل کدورت کا جو غبار چھایا ہے، وہ آہستہ آہستہ ہٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے، لیکن ہندو مسلمان اہل سیاست کی باہمی آویزش شاید صرف انتخابی نشستوں اور چند فیصدی حقوق کی کمی و بیشی پر آکر ختم ہو جائے، یا وزیرون کے انتخاب کی مہم کو سر کرنے سے وہ دور ہو جائے، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ آزاد ہندوستان میں اسلام اور مسلمانون کی حفاظت صرف نشستون، وزارتون اور فیصدی نوکریون کے تصفیہ سے نہیں ہو سکتی، ہماری ہمیشہ سے پکار یہ ہے اور اسی کو ہم ہندوستان مین مسلمانون کی حفاظت کی ضمانت جانتے ہین کہ مسلمان سب کے ساتھ مل کر ملک کی آزادی مین حصہ لین، اور ملک کی اکثریت انکی کلچرل اٹانومی (تمدنی و مذہبی خود مختاری) کا حق تسلیم کرے، اور مسلمانون کی تعلیم، اوقاف، مساجد اور شخصی قانون و عدالت کے محکمے ان کے ہاتھون مین سپرد کرے، اس تجویز کی تفصیلات پر معارف اور ہمارے بعض خطبون مین تفصیلین آچکی ہین،

یہ بات افسوس کے قابل ہے کہ ہمارے بعض آزاد سیاسی نوجوان اپنی زبان اور قلم سے مذہب کو صدمہ پہنچا کر ملک کی آزادی کی راہ مین جوان کو ہر چیز سے زیادہ عزیز ہے، خود مشکلین پیدا کر رہے ہین، اور مسلمانون کو اس روش سے انکی نفرت دلا رہے ہین جسکی طرف وہ مسلمانون کو پوری بیتابی کیساتھ بلا رہے ہین، اگر وہ خدا کیلئے نہیں تو کیا اپنی ملکی آزادی ہی کی خاطر اپنے طرز عمل مین تبدیلی کر سکتے ہین، خدا جانے کتنے مسلمان ہین جو ملک کی آزادی کے ان ہی کی طرح خواہان ہین، مگر اس کے لئے وہ اپنے مذہب کو قربان کرنا نہیں چاہتے، کاش یہ سیاسی نوجوان "مذہب مین عدم مداخلت" پر اتنا ہی عمل کرتے جتنا انگریز اپنی مملکت مین کرنے کا دعوی کرتا ہے،

ایک عربی شاعر کہتا ہے،

وظلم ذوی القربی اشد مضاضۃ ۔۔۔ علی النفس من وقع الحسام المھند

اور رشتہ داروں کا ظلم تیز تلوار کے زخم سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے،

اسی لئے اس مسلمان کے قلم اور زبان سے جس کا رشتہ اسلام کے ساتھ خواہ نام ہی کا کیوں نہ ہو قائم ہے، مذہب اور اسلام کے خلاف ایک حرف سننا بھی ہم پر غیروں کے پورے دفتر سے زیادہ شاق گذرتا ہے، اور گذرنا چاہئے، ہم کو ایسے نوجوانوں کی خدمت میں بےباکانہ عرض کرنا ہے کہ وہ اپنے کو کھو کر کچھ پا نہیں سکتے،

مدینہ منورہ کے سب سے محفوظ سب سے منظم اور سب سے نادر کتبخانہ شیخ الاسلام عارف حکمت کے مدیر شیخ ابراہیم حمدی آجکل ہندوستان آئے ہوئے ہیں، اور اس وقت دارالمصنفین میں مقیم ہیں، یہاں سے پٹنہ ہو کر کلکتہ اور وہاں سے سیدھے حیدرآباد دکن جائیں گے، موصوف کے سفر کا مقصد کتبخانہ اور اس کے ملازموں کے لئے امداد حاصل کرنا ہے، اس کتبخانہ میں اس وقت گیارہ ہزار قلمی کتابیں ہیں، وہ تمام اہل علم جو مدینہ منورہ گئے ہیں کتبخانہ کی اہمیت اور شیخ مذکور کی خدمات سے پوری طرح واقف ہیں، اس کتبخانہ کے مصارف جنگ عظیم تک ترکی اوقاف سے ادا کئے جاتے تھے، مگر افسوس کہ ع آں قدح بشکست وآں ساقی نماند،

اس کتب خانہ کے لئے واقف مرحوم نے یورپین ٹرکی میں بہت سی جائدادیں وقف کی تھیں جو اس جنگ عظیم میں ترکوں کے ہاتھوں سے نکل گئیں، اس پر بھی ترکی حکومت اس وقت تک جبتک مصطفیٰ کمال پاشا نے خلافت کے بار سے سبکدوشی نہیں حاصل کرلی، ادا کرتی رہی، اور اب یہ پورا خزانہ مسلمانوں کے دست کرم کا محتاج ہے،

مقالات

جامعہ دارالسلام عمر آباد

کا

خطبۂ اسناد

اکتوبر کے آخر میں مجھے نو دس برس کے بعد ہندوستان کے اس دور دراز صوبہ میں جانے کا اتفاق ہوا جس کو مجھ سے، اور مجھکو جس سے دلی انس ہو یعنی مدراس، مدراس کے اس مقام میں جو آرکاٹ کے نام سے مشہور ہے، اور جو کبھی ایک اسلامی حکومت کا مرکز تھا، اور جس کے کھنڈروں میں اب بھی اسلامی جاہ و جلال کی یادگاریں دفن ہیں، اب ایک نئی اسلامی حکومت کا آفتاب نکلنے والا ہے، مگر یہ آفتاب سیاست کا نہیں، بلکہ علم و فن اور کتاب و سنت اور اسلامی تبلیغ و تہذیب کا ہے، اور اس کا نام جامعہ دارالسلام عمر آباد ہے،

اس کے چاروں طرف مسلمانوں کی مشہور آبادیاں واقع ہیں یعنی آرکاٹ ویلور، میل ویشارم، پیرم پیٹ، آمبور وانمباڑی، ترپاتور وغیرہ،

آرکاٹ ویران ہو چکا ہی میل ویشارم مدراس کے مشہور تاجر نواب سی عبد الحکیم کا وطن ہے اور یہاں اُن کی طرف سے ایک انگریزی اسکول اور شفاخانہ قائم ہے، ویلور میں عربی کے دو مشہور پرانے مدرسے لطیفیہ اور باقیات صالحات واقع ہیں، پیرم پیٹ میں احناف اور اہلحدیث

کے متعدد و عمارہیں، آمبور، روشن کمپنی کے ممتاز تاجر حاجی جلال، اور دوسرے ممتاز مسلمان تاجروں کا مسکن ہے، حاجی جلال صاحب کی طرف سے یہاں ایک ابتدائی مدرسہ، اور جلالیہ اردو لایبریری ہے، ایک اور مسلمان تاجر کا لڑکیوں کا مدرسہ ہے، وانمباڑی میں اسلامیہ کالج، مدرسۂ عربی معدن العلوم، اور لڑکیوں کا مدرسہ، مدرستہ البنات اور بعض دوسرے ابتدائی تعلیم کے اسکول ہیں، اور ترپاتور میں مدرسۂ عثمانیہ اردو اور دینیات کا ایک اچھا مدرسہ ہے، عمرآباد اب ایک نئی آبادی ہے، جو ۱۹۲۳ء سے شروع ہوئی ہے،

ان اطراف میں سب سے پہلے میرا جانا ۱۹۱۲ء میں ہوا، اس وقت وانمباڑی کے اسلامیہ کالج کے ہیرو مرحوم ابراہیم قریشی زندہ تھے، اور انہی مرحوم کی معیت میں ان اطراف کے تاریخی مقامات دیکھے، آمبور اور عمرآباد کے بیچ میں ایک ندی ہے، آمبور سے ندی کو پار کر کے عمرآباد پہونچتے ہیں، اُن دنوں یہ میدان غیر آباد تھا، اور گڑھ آمبور کے نام سے موسوم سامنے ایک پہاڑی سلسلہ ہے، جو اس حیثیت سے تاریخی ہے، کہ اسی دیوار کے پردہ سے میسور کا شیر ٹیپو سلطان انگریزی فوجوں پر حملہ کے لئے نکلا کرتا تھا، پہاڑی کے اوپر دو بہت ہی بڑی چٹانیں آکر اس طرح ملی ہیں، کہ ایک محفوظ سنگی قلعہ بن گیا ہے، پاس ہی میدان میں ایک چھوٹی سی پرانی مسجد ویران پڑی ہے، جس پر ایک فارسی قطعہ نقش ہے، جس سے ۱۱۲۰ھ کی تاریخ نکلتی ہے، قریب ہی وہ مقام ہے، جہاں انور الدین خان نے شہادت پائی تھی،

۱۹۲۳ء میں اس ویرانہ کی قسمت جاگی، روشن کمپنی کے شریک اعظم حاجی کاکا محمد عمر نے جو ان اطراف کے ایک مخلص موحد تاجر تھے، اور جنھوں نے سالہا سال امرتسر میں مولینا عبداللہ صاحب غزنوی کی صحبت سے فیض اٹھایا تھا، اس زمین کو خرید لیا، اور اسکو اپنا

مسکن بنایا، اور اپنے نام کی نسبت سے عمرآباد اس کا نام رکھا، اور اسی کے ساتھ دارالسلام نام ایک نئے طرز کے عربی مدرسہ کی بنیاد ڈالی، اس کو ندوہ اس کا دارالعلوم ندوۃ العلماء سمجھنا چاہئے، نصاب مختصر اور مفید بنایا گیا، معقولات کو کم کیا گیا، دینیات پر زور دیا گیا، انگریزی ضروری کی گئی، کتب خانہ کی بنیاد ڈالی، دارالاقامۃ بنا، مسجد بنی، مدراس، اور ہندوستان کے مدرس یکجا کئے گئے، حنفی اور اہلِ حدیث عالم ساتھ مل کر بیٹھے، اور فقہی تعصب کا خاتمہ کیا گیا، طالب علموں کی تعلیم و تربیت پر ہمت صرف کی گئی، اور اردو زبان یہاں کی تعلیمی زبان قرار پائی، لڑکے اسی میں تحریر اور تقریر کرتے ہیں، اس کا مصحف نام ایک اردو رسالہ ہے، ایک پریس ہے، سنہ ۱۹۲۴ء میں یہ مدرسہ قائم ہوا، اور سنہ ۱۹۲۶ء میں اس کی یہ عمارت تیار ہوئی، اس وقت میں مدراس میں موجود تھا، اور اتفاق سے عمرآباد حاضر تھا،

مدرسہ کے قریب حاجی عمر مرحوم کے بڑے صاحبزادہ کاکا محمد اسماعیل نے ایک محمدیہ مڈل انگلش اسکول قائم کیا ہے، اس کی عمارت الگ ہے، پڑھنے والے مسلمان اور ان سے زیادہ ہندو بچے اور کچھ بچیاں ہیں، لیکن خاص بات یہ ہے، کہ یہاں ہر مسلمان اور ہندو لڑکے کو اردو لازمی طور پر پڑھنا پڑتی ہے، چنانچہ ہندو بچوں اور بچیوں کے منہ سے ہم نے یہاں اردو حمد کے اشعار سنے،

مرحوم حاجی عمر کا انتقال سنہ ۱۹۲۷ء میں ہوگیا، اب ان کی جگہ ان کے لائق جانشین کاکا اسماعیل اور کاکا ابراہیم اوسی فیاضی کے ساتھ اپنی تجارت کی دولت اس درسگاہ پر لٹا رہے ہیں، حاجی جلال اور نواب سی عبدالحکیم وغیرہ دوسرے مسلمان تاجر بھی اونکی مدد کرتے رہتے ہیں،

اس دفعہ اس مدرسہ نے اپنی بارہ سال کی عمر میں اپنے فارغ طالب علموں کو سند دینے

اور اُن کی دستار بندی کی رسم ادا کرنے کے لئے وسط شعبان ۱۳۵۶ھ میں جلسہ ترتیب دیا، اور پنجاب، دہلی، یوپی، اور مدراس کے عالموں کو شرکت کی دعوت دی، جلسہ نہایت کامیاب ہوا، انتالیس طالب علموں کو فراغت کی سند دی گئی، اور ان کی دستار بندی کی رسم ادا کی گئی،

فارغ طلبہ نے اردو عربی اور انگریزی میں تقریریں کیں، یہاں کے کئی طالب علموں نے عالم ہو کر انگریزی پڑھی، اور یونیورسٹی کا امتحان پاس کیا ہے، اس کے طلبہ میں بحمد اللہ پرانے مدرسوں کی فرسودگی، اور جمود نہیں، با خبر اور زمانہ کے رنگ سے آگاہ ہیں، اور ہندوستانی جاننے کی وجہ سے ہندوستان کی ساری تحریکوں سے واقف ہیں، مدرسین بھی خیرخواہ اور مخلص ہاتھ آئے ہیں، خصوصاً مولینا فضل اللہ صاحب کا وجود ان کی رہبری کے لئے بیحد مفید ہوا ہے، ہم کو جنوبی ہند میں اس درس گاہ کے ذریعہ مسلمانوں میں اصلاح اور بیداری پیدا ہونے کی بڑی امید ہے،

دستار بندی کے اس جلسہ میں مجھ سے فارغ شدہ طلبہ کو خطاب کرنے کی فرمائش کی گئی تھی، میں نے چاہا تھا، کہ یہ تقریر زبانی ہو، لیکن کارکنوں کے اصرار سے جلسہ کی رات کو دو بجے اس طرح قلم بند کرائی گئی، کہ بولنے والا ہر لحظہ سونے کے لئے اور لکھنے والے اس کے جگانے کے لئے مستعد تھے، اسی لئے جلسہ میں اس کو پڑھتے وقت میں نے کہا تھا، کہ اگر اس میں کوئی غلطی ہو تو سامعین اس کو میرے "خمار نیم شبی" پر محمول کریں،

"س"

الحمد للہ الذی علم بالقلم، علم الانسان ما لم یعلم، والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الذی بعث بالعلم والحلم، وعلی آلہ واصحابہ الذین

نَشَرُوا الْعِلْمَ فِي الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ، سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا إِنَّكَ أَنْتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ

علمائے عزیز! یہ خطاب ان علما، کی طرف ہے، جو آج اپنی باقاعدہ طلب علم کی منزل طے کرکے اس خطاب کے مستحق ہوئے ہیں، آج سے پہلے وہ طالب علموں کے گروہ میں داخل تھے، جن کی جد وجہد اور کوششوں کے تمام مظاہر اس درسگاہ کی چہار دیواری کے اندر محدود تھے، لیکن آج وہ اس تنگ دائرہ سے نکل کر انسانی مجمع کے بڑے دائرہ میں آگئے ہیں، آج سے ان کی ذمہ داریاں ان کے پچھلے زمانہ سے بالکل الگ اور ممتاز ہیں، اب ان کی ذمہ داریاں بحیثیت کسی درس گاہ کے محکوم اور تابع کے نہیں، بلکہ بحیثیت ایک حاکم اور متبوع کے ہیں، اب نہ صرف ایک محلہ، نہ صرف ایک شہر، نہ صرف ایک صوبہ، نہ صرف ایک ملک، بلکہ پوری دنیائے اسلام کی ذمہ داریاں ان میں سے ہر ایک کے سر بقدر اس کی توفیق اور اسکی کوشش کے ہیں، اب آپ نمونہ بن کر دنیا کے سامنے آرہے ہیں، اب آپ کی حیثیت اتنی اونچی ہو رہی ہے، کہ آپ اگر چاہیں، تو اپنے علم اور عمل کی طاقت سے صراط مستقیم پر چل کر حق کے رہنما اور مسلمانوں کے رہبر بن سکتے ہیں، اور اگر حق کی شاہراہ سے آپکا علم یا عمل کا قدم ذرا ہٹ جائے، تو ضلوا فاضلوا کے مصداق بن سکتے ہیں، اسلئے آج وہ موقع ہے کہ آپ اپنی زندگی نو اپنے اس علم کی روشنی میں جسکو آپ نے اتنی محنتوں اور کوششوں سے حاصل کیا ہے، اس منزل مقصود کے پالینے کے لئے قدم اٹھائیں، جس کے لئے آپنے اپنے شوق و محنت سے، اور آپ کے استادوں نے پورے ذوق و شوق سے، اور آپ کے کارکنوں نے بڑی آرزوؤں، اور تمناؤں سے آپ کو تیار کیا ہے،

جو کچھ میں آج آپسے کہنا چاہتا ہوں، کوئی نئی بات نہیں، یہ وہی ہے، جو آپ سالہا سال تک کتابوں میں پڑھتے رہے ہیں، اور آپ کے استادوں نے آپ کو بتایا، اور آپکے جامعہ نے آپ کو سکھایا ہے، اسلئے میرا اس وقت کچھ کہنا، صرف آپ کو تذکیر اور یاد دہانی ہے،

عزیزان من! آپ کو معلوم ہے دنیا کے تمام مذہبوں میں اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے، جو علم کیساتھ مبعوث ہوا ہے، اور جو حکمت دے کر بھیجا گیا ہے، اس کے نزدیک نسلِ انسانی کا آغاز ہی علم سے ہوا ہے، اور اسی کے ذریعہ آدم کے سر پر کرامت کا تاج رکھا گیا ہے،

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ کی موروثی عزت وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا کا پرتو ہے، ہم کو وہ رسول عنایت کیا گیا، جسکی شان یہ ہے يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ، ہم کو وہ وحی مرحمت ہوئی جسکا آغاز اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ، سے ہوا، وہ عرب جن کی نادانی اور جہالت ضرب المثل تھی، وہ اس دین کو پاکر علم و حکمت کے سرمایہ دار، اور اسرار و رموزِ الٰہی کے امانت دار ہو گئے، وہ قریش جن میں مورخ بلاذری کے بیان کے مطابق بعثتِ نبوی کے وقت صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے، اسلام کی روشنی سے پرنور ہو کر ساری دنیا کے استاد اور معلم ہو گئے، اسلام عرب کے ریگستان سے نکل کر دنیا کے جس حصہ میں پہنچا، اسکو علم کی روشنی سے منور کر دیا، مصر، شام، عراق، ایران، خراسان، افریقہ، مغرب، اسپین، ان سب میں علم کی بہاریں آئیں، صحابۂ کرام اور تابعینِ عظام نے اپنے رسول کی معرفت سے علم کا جو خزانہ پایا تھا، اس کو ربعِ مسکوں میں بانٹا، آج انہی کی کوششوں کا صدقہ ہے، کہ سرزمینِ عرب سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر ہمارے علماء علم و عرفان کی دولت تقسیم کر رہے ہیں،

مدینہ کی وہ چھوٹی سی مسجد، جو مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے، اسلام کی پہلی درسگاہ ہے، وہی حق کی عبادت کا مقام اور علم کی اشاعت کا مرکز تھی، جہاں جہاں بھی مسلمان پھیلے، ان کی عبادت گاہیں ہی علم کی درسگاہیں بنیں، یہانتک کہ چوتھی صدی میں خراسان میں مدرسوں کے نام سے الگ عمارتوں کے بننے کا رواج ہوا، جہانتک ضرورتوں کا تعلق ہے یہ علیحدگی تمدن کی وسعت کا لازمی نتیجہ تھی لیکن جہاں تک حقیقت کا تعلق ہے اس کو نہ بھولنا چاہیے، کہ ہماری عبادت گاہ ہی ہماری درسگاہ ہے، اس کا یہ منشا ہے کہ ہمارا

علم ہماری عبادت کا ایک حصہ ہو، اس لئے جس طرح ہماری عبادت صرف خدا کے لئے ہونی چاہئے، اسی طرح ہمارا علم بھی خدا ہی کے لئے ہونا چاہئے، کیونکہ اسلام میں علم کی غرض و غایت نہ تو نوکری اور خدمت ہو اور نہ نام و شہرت ہو، نہ ذریعۂ رزق اور دنیا طلبی ہے، بلکہ اس سے مقصود صرف خدا کی معرفت اور اس کے احکام اور شرائع سے واقفیت ہو، اور اس کے ذریعہ خدا کی خوشنودی کی طلب ہو، اسلئے ہر وہ شخص جس کے علم کی غرض و غایت یہ نہیں، وہ سچا عالم بھی نہیں، آپ کو ترمذی میں حضرت ابو ہریرہؓ والی وہ روایت یاد ہوگی جسکو بیان کرتے ہوئے ان پر غشی طاری ہو جاتی تھی، کہ اللہ تبارکؑ تعالیٰ قیامت کے دن جب علماء سے پوچھے گا کہ تم نے علم پڑھ کر کیا کیا، اور وہ جو جواب دیں گے، اس پر خدا ارشاد فرمائیگا کہ تم نے تو علم اس لئے پڑھا تھا کہ تم کو عالم کہا جائے تمکو دنیا میں عالم کہا جا چکا، اور تم اپنی مزدوری پا چکے،

احادیث میں علماء سوء کی جو برائیاں آئی ہیں، ان سے آپ میں سے کون واقف نہیں، ہر قدم پر ہم کو اور آپ کو خدا تعالیٰ کی پناہ مانگنی چاہئے، کہ وہ ان برائیوں سے محفوظ رکھے، اور اپنی اس تمثیل مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا کا مصداق نہ بنائے اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ہمارا شیوہ نہ ہو، ایک عالم دین کا پہلا فرض یہ ہو کہ اللہ عزوجل کیساتھ اس کا رشتہ مستحکم ہو اس کے علم و عمل کا ہر قدم خدا کے لئے اٹھے، اسکی سعی و کوشش کی ہر حرکت کا مرکز خدا کی رضا و خوشنودی کی طلب ہو، اس کا علم پہلے اسکے لئے ہو، پھر دوسروں کے لئے اِتَّعِظْ ثُمَّ عِظْ کا موقع اس کے سامنے ہو جس کا معاملہ خدا کے ساتھ درست نہیں، جس کی نیت خیر نہیں، جس کا عمل اخلاص پر نہیں، اس کے لئے خیر و برکت نہیں،

علمائے سلف کی زندگیاں کم و بیش ہماری زندگیوں سے بڑی نہ تھیں، لیکن اس تھوڑی سی زندگی میں انھوں نے جو بڑے بڑے کام انجام دیئے، جو ضخیم تصنیفات یادگار چھوڑیں، اپنے شاگردوں اور مستفیضون کا جو وسیع حلقہ تیار کر لیا، وہ تاریخ کے اوراق میں حیرت کیساتھ پڑھے جاتے ہیں، اگر دنیا میں ابن جریر طبری

کی کوئی اور کتاب نہ ہوتی اور صرف ان کی تفسیر کی یہ تیس جلدیں ہوتیں، تو ان کی دینی اور علمی خدمت کی ایک حیرت انگیز مثال ہوتی، لیکن اس ضخیم تالیف کیساتھ تاریخ واخبار اور فقہ وآثار کے دوسرے بیسیوں ان کے کارنامے موجود ہیں، ابن جوزی کی تصنیفات کا ان کی زندگی کے ایام پر حساب لگایا جائے تو اوسطاً چھ صفحے روزانہ ہوتے ہیں، امام رازی کی صرف تفسیر کبیر ہی اگر تصنیف ہوتی، تو ان کی زندگی کی ایک بڑی خدمت ہوتی، لیکن ان کی تصنیفات کے ہزاروں صفحے اسکے علاوہ ہیں، جو اس حالت میں ترتیب دیئے گئے ہیں، جب دنیائے اسلام تاتاریوں کے حملوں سے زیروزبر ہو رہی تھی، امام مالک کے تلامذہ کے حلقہ میں، ایشیا، افریقہ اور یورپ تین براعظم کے باشندے داخل ہیں، امام بخاری کے ایک شاگرد، فربری کے تقریباً نوّے ہزار شاگرد تھے، یہ چند مثالیں ہیں، جن سے صرف یہ بتانا مقصود ہے، کہ ان بزرگوں کے کاموں کی یہ وسعت ان کے حسن نیت کا صدقہ تھی، آج بھی ہماری کامیابی کا وہی ذریعہ اور طریقہ ہے، جو پہلے تھا، امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بھولنے کے قابل نہیں، کہ لایصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا۔

ہمارے یہاں علما میں جب علم جنگ وجدل اور مناظرہ ومباحثہ کے لئے رہ گیا، اور سلاطین سلجوقیہ کے زمانہ میں فقہا نے اسکو حصول خدمت اور شاہانہ درباروں میں طلب عزت کا ذریعہ بنایا، تو جو حالت ہوئی اس کا ماتم امام غزالی نے احیاء العلوم میں جس طرح کیا ہے، وہ آج بھی ہمارے لئے عبرت کا سامان ہے، بغداد میں حنابلہ اور اشاعرہ کی خونی معرکہ آرائیاں، اور سلجوقیوں کی حکومت میں اشاعرہ اور معتزلہ کی باہمی آویزش کے تلخ نتیجے بھولنے کے لائق نہیں، پہلے واقعہ نے بغداد کی تباہی کا سماں دکھایا اور دوسرے واقعہ نے الموت میں باطنیہ کی صدسالہ قوت کا مسالہ فراہم کیا، خود ہمارے اس ملک میں اسلامی حکومت کے خاتمہ سے لیکر آجتک علمائے فرقہ داری کے اصول پر احقاق حق اور رد باطل کے جو طریقے اختیار کئے، ان کے جو نتیجے سامنے آئے وہ کس سے چھپے ہیں، اہل حق میں سے علمائے اہل حدیث اور علمائے احناف کے مناظرے جادۂ حق سے ہٹ کر جس جس طرح مقدمہ بازی تک پہونچے، اور آج بھی پہونچ رہے ہیں، ان پر افسوس کس کو نہیں آتا، ان افسوسناک جھگڑوں نے امت اسلامیہ

کے شیرازہ کو جس طرح منتشر کیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان چھوٹی چھوٹی جماعتوں اور متفرق فرقوں میں اسطرح بٹ گئے ہیں، کہ اصل دین کی حرمت سے سب غافل ہیں، اور اس حماقت میں مبتلا ہیں، کہ شاخون پر پانی دینے سے جڑیں مضبوط ہوں گی،

علماے عزیز! اس سے پہلے کہ آپ قوم مین جائیں، اور ملک میں پھیلیں، آپ کو اس غلطی سے ہوشیار ہوجانا چاہئے، اور فرقہ داری کے تنگ دائرہ سے نکل کر اسلام کی خدمت اور مسلمانون کی خیرخواہی میں مصروف ہونا چاہئے، آج ہمارے جو فقہی اختلافات ہیں، وہ کم وبیش صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانہ سے چلے آرہے ہیں، ایک کی نظر میں کوئی پہلو قوی ہے، اور دوسرے کی نظر میں کوئی دوسرا، اگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اپنے ان اختلافات کے باوجود اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ کی مثال اور کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ کانمونہ تھے تو کیا وجہ ہے، کہ آج بھی ہم ان کی پیروی میں اپنے اپنے تحقیقی اختلافات کے ساتھ کل مل کر مسلمانون کی ایک متحدہ جماعت نہ بن سکیں، اور ھُوَ سَمّٰکُمُ الْمُسْلِمِیْنَ کے تنہا خطاب سے اپنے کو مخاطب کرین،

آپ کو یہ فخر ہونا چاہئے کہ آپ نے ایک ایسی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے جو ہندوستان کی ان درسگاہوں میں سے ایک ہے، جن کی بنیاد صحیح نقطۂ نظر پر قائم کی گئی ہے، اس کے احاطہ میں مختلف خیال اور طرز کے اساتذہ سے آپنے فیض پایا، اس کے کارکنوں میں ایسے مخلص ہیں، جو اپنی اپنی تسلی کے مطابق پورے اخلاص اور یکجہتی کے ساتھ دین کی خدمت میں لگے ہوئے ہیں، جن بھائیوں کے ساتھ مل کر آپ نے اپنی زندگی کے یہ بہترین دن گذارے، ان میں اپنی اپنی روش کے اختلاف کے باوجود پوری محبت اور برادرانہ خلوص قائم رہا، اب ہم میں سے ہر ایک کو یہ امید ہے کہ آپ کی آیندہ زندگی بھی اسی محبت اور یکجہتی کے ساتھ بسر ہوگی، اور فرقہ داری کے بجائے اصل دین کی حمیت آپ کو سرگرم رکھے گی، اور شاخوں کی بجائے جڑ پر آپ کی نظر رہے گی،

عزیزو! بظاہر آپ کی طلب علم کا زمانہ ختم ہوگیا لیکن حقیقت یہ ہو کہ آپ کی طلب علم کا زمانہ اب شروع

ہوا ہے، اس سے پہلے جو سال بھی آپ نے علم کی تحصیل میں صرف کئے، اس کا منشا اپنے اندر علم کی استعداد پیدا، اور تحقیق کا سامان فراہم کرنا تھا، آج آپ کو جو سند دی جارہی ہے، وہ اس بات کی نہیں ہے، کہ آپ کا علم درجۂ کمال کو پہنچ گیا جس میں اضافہ کی گنجائش نہیں، بلکہ اس بات کی ہے، کہ آیندہ حصولِ کمال اور تحقیق کے مُعدات آپ میں پیدا ہوگئے ہیں جن سے اگر آپ کام لیں، تو منزلِ مقصود تک پہونچ سکتے ہیں، یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہم میں اتنی پستی آگئی ہے، کہ طالب علمی میں جو کچھ پڑھ لیتے ہیں، اس کو منتہی جانتے ہیں، ایک سچے عالم کا تو یہ حال ہوتا ہے، کہ وہ عمر بھر طالب علم ہی رہتا، دائمی زندگی کا ہر لمحہ کسی نئی چیز کی واقفیت اور کسی نیکی کی خدمت میں بسر ہونا چاہئے، مگر کیا یہ واقعہ نہیں ہے، کہ ہم میں سے اکثر طالب علمی ختم کرنے کے بعد علم کی ہر کتاب بیچ کر رکھدیتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ علم کی طلب کی ہر کوشش ختم ہوگئی، آج یہ حال ہے کہ آمدورفت کی سہولت اور چھاپے کی آسانی نے ہمارے اسلاف کے دفینوں کو کھود کھود کر برسر بازار لگا دیا ہے، ہر روز ہمارے بزرگوں کی کوئی نہ کوئی نئی کتاب سامنے آتی ہے، اور مشرق و مغرب کے مشتاق اسکو ہاتھوں ہاتھ خریدتے ہیں، لیکن جو گروہ اس تحفہ کا سب سے زیادہ مستحق ہوسکتا تھا، وہی اپنے تغافل اور سُست کاری سے اعراض برت رہا ہے،

ہمارے درس کا یہ حال ہورہا ہے، کہ متون کی شروح، اور حاشیے اور پھر ان سے متعلق شروح و تعلیقات میں وقت کا بڑا حصہ برباد ہورہا ہے، علوم دین جو مقصود بالذات تھے، پیچھے ہورہے ہیں، فلسفۂ یونان جو ہمارے بزرگون نے دین کی خدمت کے لئے بضرورتِ زمانہ سیکھا تھا، وہ ہم میں سے کتنوں کا مقصود بن گیا ہو، اور اصل کتاب و سنت کی تعلیم کا ذوق کم ہوگیا ہے، علوم عقلیہ کی تعلیم کا مقصد تو یہ تھا کہ وہ علوم دین کی خدمت میں کام آئیں، نہ یہ کہ وہ اصل مقصد قرار پائیں، زمانہ سابق میں ان علوم عقلیہ کو ہم نے اسلئے اختیار کیا تھا، کہ وہ اس زمانہ کے لوگوں کے ذہنوں پر اس طرح چھاگئے تھے، کہ ان کے واسطہ کے بغیر علوم دین کی خدمت نہیں ہوسکتی تھی، اب جب زمانہ کا ماحول بدل گیا، یونانی علوم کی تحقیقات تقویم پارینہ ہوگئیں، اور لوگون کے ذہنون سے ان کا تسلط جاتا رہا، تو ان علوم کے ذریعہ سے اس زمانہ میں علوم دین کی خدمت کا خیال بے سود ہے،

اب جو علوم عقلیہ عوام کے ذہنوں پر چھائے ہیں، اور جس قسم کے دلائل کی قوت کے آگے وہ سر جھکاتے ہیں انہی کو اس زمانہ میں علوم دین کی خدمت کا ذریعہ بنایا جا سکتا ہے، ہم کو خوشی ہے کہ آپ نے ایک ایسی درسگاہ میں تعلیم پائی ہے، جس کی نظر سے یہ نکتہ چھپا نہیں، اور کچھ نہ کچھ اس راہ میں آپ نے قدم اٹھایا ہے، امید ہے کہ آیندہ اور بھی ضروری علوم اس میں داخل ہوں گے، اور خود آپ بھی کوشش کریں گے، کہ نئے علوم کی کتابوں کو جو آپ کی زبان میں بہت حد تک چھپ چکی ہیں، مطالعہ کریں، تاکہ نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے خیالات کو آپ سدھار سکیں، اور دین کی سچائیوں کو ان کی عقل کے مطابق سمجھا کر ان کی تسلی کر سکیں،

عزیز و! آج زمانہ کے خیالات اور دنیا کے واقعات میں اس تیزی کیساتھ تبدیلی ہو رہی ہے کہ ان کے جانے اور سمجھے بغیر آپ مسلمانوں کی کوئی خدمت نہیں کر سکتے، دنیا میں سیاسی اور اقتصادی خیالات ایسے چھائے ہوئے ہیں، اور انقلاب کی گھڑیاں اس طرح پے در پے آرہی ہیں، اور گذر رہی ہیں، کہ ایک عالم دین کے لئے جس کو مسلمانوں کا خدمت گذار ہونا ہے، ان کو سمجھنا اور ان کے حل کرنے کی تدبیر سوچنا، ضروری ہے، صرف اعراض اور تغافل سے ان دقتوں کو آپ حل نہیں کر سکتے، صرف آپ کے توجہ نہ کرنے سے نہ دنیا اپنے قاعدہ کو بدل سکتی ہے، اور نہ زمانہ اپنے رخ کو پلٹ دے سکتا ہے، مشکلات کا مقابلہ کرنا، اور موجودہ جد وجہد میں مناسب حصہ لینا، اور ملک و قوم کی زندگی میں مسلمانوں کے لئے مناسب مقام حاصل کرنے کی کوشش کرنا بھی ایک عالم دین کا فرض ہے،

اسلام وہ مذہب ہے کہ جس دن وہ دین بنا اسی دن وہ سیاست بھی تھا، اس کا منبر اس کا تخت، اس کی مسجد اس کی عدالت، اس کی توحید نمرودوں، فرعونوں، قیصروں اور کسراؤں کی شاہنشاہی کے مٹانے کا پیغام تھی، صحابۂ کرام اور خلفاے راشدین کی پوری زندگیاں ان مرقعوں سے بھری ہیں، اور وہی اسلام کی سچی تصویریں ہیں، اور جب تک علما، علما رہے، وہی ان کا اسوہ تھا، آج جب ہم پھر نئے سرے سے اپنا گھر بنانا چاہتے ہیں، اور پچھلی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتے ہیں، تو ضرورت ہے کہ ہم اسی نقشِ قدم پر چلیں جو ہمارے

[illegible] نے ہمارے لئے چھوڑا ہے،

آج کل ہمارے علما کا کام صرف پڑھنا پڑھانا، مسئلے بتانا اور فتوے لکھنا سمجھا جاتا ہے، لیکن اب وقت ہے کہ وہ اپنے اسلاف کے پچھلے سبق کو پھر دہرائیں، اور دیکھیں کہ ان کا کام صرف علم و نظر تک محدود نہیں، بلکہ سعی و عمل اور جد و جہد اور عملی خدمت بھی ان کے منصب کا ایک بہت بڑا فرض ہے، ہر آبادی جہاں وہ رہیں، وہ ان کی سعی و خدمت سے آباد رہے، وہاں کے جاہلوں کو پڑھانا وہاں کے نادانوں کو سمجھانا، وہاں کے غریبوں کی مدد کرنا، وہاں کی ضرورتوں کو پورا کرنا، وہاں کے امیروں کو حق کا پیغام سنانا، وہاں کے معذوروں کی خدمت کرنا، وہاں کے بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، مسلمانوں کو ان کی کمزوریوں سے آگاہ کرنا، ان کو دنیا کی ضرورتوں سے باخبر کرنا، ضرورت کے ہر موقع پر آگے بڑھنا، اور اپنے علم و عمل کی ہر کوشش سے ان کو فائدہ پہونچانا، ایک عالم دین کے فرائض ہیں،

یہ بات خوب یاد رکھنی چاہئے، کہ مسلمانوں کو اپنے دین کی باتوں سے واقفیت کے لئے بہت بڑے علم و فضل کی ضرورت نہیں، عقیدہ اور عبادت اور دوسری مذہبی نیکیوں کے لئے دین کا معمولی علم کافی ہے، یعنی ہر مسلمان کو بجائے خود بڑا عالم ہونا ضروری نہیں، لیکن اس سے ایک منٹ کے لئے بھی پہلو تہی نہیں کیجا سکتی کہ ان کو اپنی دینی و دنیاوی بھلائی کے لئے ہر وقت عمل کے واسطے کمر بستہ ہونا ضروری ہے، آج دنیا لڑائی کا میدان ہے، جو بھی سستی سے اپنی جگہ کھڑا رہے گا، وہ گر جائے گا، اسی لئے علمی قوت سے زیادہ آج عملی قوت کی سرگرمی کی ضرورت ہے، علم "خیر و شر کی تمیز بتانے کے لئے ضروری ہے، لیکن محض خیر و شر کی تمیز سے آپ کامیاب نہیں ہو سکتے، جب تک جو خیر ہے، اس کی طلب، اور جو شر ہے اس سے پرہیز آپ کا شیوہ نہ ہو،

ایک زمانہ تھا، جب مسلمانوں میں دنیا کی بہتات تھی، دولت کی کثرت تھی، تجارت کا فروغ تھا، حکومت اور سلطنت ان کے ہاتھوں میں تھی، اسوقت کے علمائے اپنی حکمتِ ربانی سے یہ صحیح سمجھا، کہ مسلمانوں

کا دولت میں انہماک، کسب زر میں زیادہ مشغولیت اور حکومت اور سلطنت میں استغراق ان کے دین کے لئے مضر ہے، اسلئے اس وقت انھون نے ترک دنیا اور زہد و قناعت کا ہی وعظ فرمایا، لیکن اب جب کہ حالت بدل گئی ہے، فقر و فاقہ چھایا ہے، مفلسی ان کے لئے فتنہ کا سامان ہے، دولت ان سے جا چکی ہے، تجارت ان سے رخصت ہو چکی ہے، اور سلطنت و حکومت ان کے ہاتھون سے نکل چکی ہے، ضرورت ہے کہ ہمارے واعظ اور ہمارے عالم اپنی تقریرون کا رُخ پھیرین، اور اپنے مواعظ کا موضوع سخن بدلیں، تاکہ مسلمانون میں زندگی کی روح پیدا ہو، اور ان میں زمانہ کے مقابلہ کا حوصلہ آئے، اور اپنی محنت اور سعی و جانفشانی سے اپنے لئے دنیا میں وہ پوزیشن حاصل کرین، جو دنیا کے آخری مذہب کے پیرووٗں کا حق ہے،

علمائے عزیز! اب وہ وقت نہیں رہا، کہ آپ حجرون میں آرام کرین، خلوتوں میں وقت گذارین، اور اپنی کوششوں کو صرف اپنی ہی نجات تک محدود رکھین، ضرورت ہے کہ میدان میں نکلیں، اور مسلمانوں کی سپہ داری اور سپہ سالاری کا فرض انجام دین، اور اپنے صحیح علم اور صحیح عمل سے ان کی رہبری کرین، یہ رہبری صرف چند فقہی مسائل تک محدود نہ رہے، بلکہ علم و عمل کی ہر راہ میں آپ کی ذات ان کے لئے چراغ ثابت ہو، اس کا منشا یہ نہیں ہے، کہ آپ اپنے ذاتی تزکیہ اور روحانی صفائی کو غیر ضروری سمجھیں، بلکہ مقصد یہ ہے، کہ اپنے کو بھی بنائیے، اور دوسرے کو بھی بنانے کی کوشش کیجئے، ورنہ ظاہر ہے کہ جو خود نہیں بنا، وہ اورون کو کیا بنائیگا، اور جو آپ نہیں دیکھ رہا ہے، وہ دوسرون کو کیا راہ دکھائیگا،

اس سلسلہ میں یہ بھی کہنا ہے کہ ہمارے علماء کو اخلاق میں مقدور بھر اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، صحابۂ کرام اور سلف صالحین کا نمونہ بننا چاہئے، ان میں ایثار ہو، ان میں مالی قناعت ہو، ان میں امیرون اور دولت مندون کی خوشامد اور چاپلوسی سے احتراز ہو، ان کو بلند نظر، بلند ہمت، حق گو، اور حق کے اظہار میں بے باک ہونا چاہئے،

آج ان میں ایسے علماء کی بھی ضرورت ہے، جو دوسری قومون کی زبانون کو پڑھیں اور ان تک حق

...یورپ میں اور دوسرے عیسائی ملکوں میں

...ہمارے پاس جاپان سے ایک ہمدرد مسلمان کا خط آیا

...چند ایسے مسلمان علماء کے نام دریافت کئے ہیں، جو وہاں جاکر اسلام کا

وعظ کہہ سکیں، اور اسلام پر کتابیں لکھ کر جاپانیوں کے سامنے پیش کرسکیں، لیکن افسوس آتا

ہے، جب اپنی جماعت کی اس بے بسی و بے کسی پر نظر پڑتی ہے، کہ ہم اپنے اہل مذہب کے لئے سب کچھ جاننے

کے باوجود دوسرے اہل مذاہب کے لئے کچھ نہیں جانتے، بلکہ ان جزیروں اور ان دور افتادہ اسلامی آبادیوں

کیلئے جو اسلامی مرکزوں سے دور ہیں، ہمارے علماء نے نہ اب تک کچھ کیا ہے، اور نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں،

جاوہ، سماترہ، بورنیا، اور مڈگاسکر سے فلی پائن تک اور جنوبی مشرقی اور مغربی افریقہ کے مختلف ملکوں میں نیگرو

کے صحراؤں میں، عیسائی مشنری اور فرق باطلہ کے بعض مبلغ منڈلا رہے ہیں، لیکن افسوس کہ دین حق کا کوئی

منادی ان تک پہونچنے کے لئے بے تاب اور سرگرم عمل نہیں،

دور جانے دیجئے، اسی مدراس کے وسیع علاقہ میں کام کرنے کے بہت سے موقع ہیں، ان حدود

میں بڑی بڑی دولتمند مذہبی درسگاہوں کے پائے جانے کے باوجود ہر طرف جمود اور تعطل نظر آتا ہے، آج

جہاں مذہبی علوم کی واقفیت کے لئے عربی جاننا شرط ہے، وہاں اس علم دین کے پھیلانے اور اس پیغام

حق کے پہنچانے کے لئے آس پاس کی دیسی زبانوں کا جاننا بھی ازبس ضروری ہے، جہاں ہمکو اپنے پورے ملک کے حالات

جاننے اور آپس میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کرنے کیلئے ہندوستانی زبان سیکھنا ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کو

اپنے دیس کی مقامی زبانوں میں ادبی لیاقت پیدا کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ اس زبان کے بولنے والے

مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر سے فائدہ پہونچاسکیں، اس زبان میں اسلامی معلومات کی کتابیں لکھ سکیں، قرآن

پاک، ضروری احادیث، اور فقہ کی ضروری معلومات کو اس زبان میں منتقل کرسکیں،

مدراس میں عموماً تامل، تلنگو، ملیالم، اور کنڑی چار زبانیں بولی جاتی ہیں، اور ان چاروں زبانوں کے

بولنے والے مسلمان موجود ہیں لیکن ایک طرف وہ ہندوستانی زبان سے کتابی طور سے واقف نہیں کہ اس زبان کی لکھی ہوئی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں، عربی حروف سے واقف نہیں جسکی وجہ سے قرآن پاک کی تلاوت سے محروم ہیں، خود ان کی دیسی زبانوں میں دینی معلومات کی کتابیں نہیں، ان میں سے کسی زبان میں قرآن پاک کا کوئی ترجمہ نہیں، ایسی حالت میں ان مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم کی طرف سے ہماری بے پروائی کیا مواخذہ کے قابل نہیں، ہمارا خیال ہے کہ اس مدرسہ میں مدراس کے مختلف اضلاع کے ایسے علماء تیار ہونگے جو اس فرض کو بھی پوری قابلیت سے ادا کرسکیں گے،

مدراس میں عربی کے جو پرانے مشہور مدرسے ہیں، انھوں نے اپنے امکان بھر جو کوششیں کی ہیں وہ ہر مسلمان کے شکریہ کی مستحق ہیں، اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں مزید خیر و برکت عطا فرمائے لیکن عمرآباد کے اس نوجوان دارالسلام سے ہماری امیدیں اس قسم کی وابستہ ہیں جیسی نوجوانوں سے دماغی محنت اور عملی سرگرمی کی توقع کیجاتی ہے، امید ہے کہ اس ننھے سے پودے کو استحکام نصیب ہوگا، یہ پھولے گا، اور پھلے گا، اور ایک دن اسکی شاخیں پورے مدراس کا احاطہ کریں گی، یہاں کے مخلص کارکنوں اور استادوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، کہ بارہ برس کی مختصر مدت میں انھوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے، اس سے آیندہ کیلئے ان سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی بڑی امیدیں قائم ہوتی ہیں،

حقق اللہ اعمالنا واصلح احوالنا،

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْن،

خطباتِ مدراس

کا پیغام پہونچائیں، ہمارے علما اگر یورپ کی زبانیں جانتے، توآج یورپ میں اور دوسرے عیسائی ملکوں میں اسلام کی اشاعت کا کتنا فرض انجام دیتے، اسی ہفتہ ہمارے پاس جاپان سے ایک ہمدرد مسلمان کا خط آیا ہے جس میں اس نے جاپان بلوانے کے لئے چند ایسے مسلمان علماء کے نام دریافت کئے ہیں، جو وہاں جاکر اسلام کا وعظ کہہ سکیں، اور اسلام پر کتابیں لکھ کر جاپانیوں کے سامنے پیش کرسکیں، لیکن افسوس آتا ہے، جب اپنی جماعت کی اس بے بسی و بے کسی پر نظر پڑتی ہے، کہ ہم اپنے اہلِ مذہب کے لئے سب کچھ جاننے کے باوجود دوسرے اہلِ مذاہب کے لئے کچھ نہیں جانتے، بلکہ ان جزیروں اور ان دور افتادہ اسلامی آبادیوں کیلئے جو اسلامی مرکزوں سے دور ہیں، ہمارے علماء نے نہ اب تک کچھ کیا ہے، اور نہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، جاوہ، سماترہ، بورنیا، اور مدگاسکر سے فلپائن تک اور جنوبی مشرقی اور مغربی افریقہ کے مختلف ٹکڑوں میں نائیجیریا کے صحراؤں میں، عیسائی مشنری اور فرقِ باطلہ کے بعض مبلغ منڈلا رہے ہیں لیکن افسوس کہ دینِ حق کا کوئی منادی ان تک پہونچنے کے لئے بے تاب اور سرگرم عمل نہیں،

دور جانے دیجئے، اسی مدراس کے وسیع علاقہ میں کام کرنے کے بہت سے موقع ہیں، ان حدود میں بڑی بڑی دولتمند مذہبی درسگاہوں کے پائے جانے کے باوجود ہر طرف جمود اور تعطل نظر آتا ہے، آج جہاں مذہبی علوم کی واقفیت کے لئے عربی جاننا شرط ہے، وہاں اس علم دین کے پھیلانے اور اس پیغام حق کے پہنچانے کے لئے آس پاس کی دیسی زبانوں کا جاننا بھی ازبس ضروری ہے، جہاں ہمکو اپنے پورے ملک کے حالات جاننے اور آپس میں ایک دوسرے کو تبادلۂ خیال کرنے کیلئے ہندوستانی زبان سیکھنا ضروری ہے، اسی طرح مسلمانوں کو اپنے دیس کی مقامی زبانوں میں ادبی لیاقت پیدا کرنا بھی ضروری ہے، تاکہ وہ اس زبان کے بولنے والے مسلمانوں کو اپنی تحریر و تقریر سے فائدہ پہونچا سکیں، اس زبان میں اسلامی معلومات کی کتابیں لکھ سکیں، قرآن پاک، ضروری احادیث، اور فقہ کی ضروری معلومات کو اس زبان میں منتقل کرسکیں،

مدراس میں عموماً تامل، تلگو، ملیالم، اور کنڑی چار زبانیں بولی جاتی ہیں، اور ان چاروں زبانوں کے

بولنے والے مسلمان موجود ہیں، لیکن ایک طرف وہ ہندوستانی زبان سے کتابی طور سے واقف نہیں کہ اس زبان کی لکھی ہوئی کتابوں سے فائدہ اٹھا سکیں، عربی حروف سے واقف نہیں جسکی وجہ سے قرآن پاک کی تلاوت سے محروم ہیں، خود ان کی دیسی زبانوں میں دینی معلومات کی کتابیں نہیں، ان میں سے کسی زبان میں قرآن پاک کا کوئی ترجمہ نہیں، ایسی حالت میں ان مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم کی طرف سے ہماری بے پروائی کیا مواخذہ کے قابل نہیں، ہمارا خیال ہے کہ اس مدرسہ میں مدراس کے مختلف اضلاع کے ایسے علماء تیار ہونگے جو اس فرض کو بھی پوری قابلیت سے ادا کرسکیں گے،

مدراس میں عربی کے جو پرانے مشہور مدرسے ہیں، انھوں نے اپنے امکان بھر جو کوششیں کی ہیں وہ ہر مسلمان کے شکریہ کی مستحق ہیں، اور ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں میں مزید خیر و برکت عطا فرمائے، لیکن عمرآباد کے اس نوجوان دارالسلام سے ہماری امیدیں اس قسم کی وابستہ ہیں جیسی نوجوانوں سے دماغی محنت اور علمی سرگرمی کی توقع کیجاتی ہے، امید ہے کہ اس ننھے سے پودے کو استحکام نصیب ہوگا، یہ پھولے گا، اور پھلے گا، اور ایک دن اسکی شاخیں پورے مدراس کا احاطہ کریں گی، یہاں کے مخلص کارکنوں اور استادوں کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں، کہ بارہ برس کی مختصر مدت میں انھوں نے جو کچھ کر دکھایا ہے، اس سے آیندہ کیلئے ان سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی بڑی امیدیں قائم ہوتی ہیں حقق اللہ اعمالنا واصلح احوالنا،

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ،

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء میں مدراس میں سیرۂ نبوی کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبے (لکچرز) دئے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانوں نے ان کو بے حد پسند کیا، ۵۰۱ صفحے قیمت ۱-۔ ۸ر "منیجر"

فلسفہ کا حاصل

"بس انسان کی کمزوری اور کوتہ چشمی کا تماشا ہے"

(ہیوم)

از

مولینا عبد الباری صاحب ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

اگر یہ سوال کیا جائے کہ انسان نے اپنی جسمی اور ذہنی حاجتوں اور مطلبوں کے تحت جتنے علوم او فنون پیدا کئے، ان میں سب سے زیادہ ناکام اپنے مقصد میں کون رہا، ؟ تو اس کا سب سے زیادہ صحیح جواب ایک ہی ہوگا، کہ فلسفہ خصوصاً فلسفہ ما بعد الطبیعیات، طبیعیات (علوم طبیعیہ) کی دنیا میں تجربہ کی راہ سے اشیا کے نئے نئے افعال و آثار اور ان کے باہمی تعلقات کا علم اتنا آگے بڑھ گیا ہے، اور بڑھتا جاتا ہے کہ کل جو تھے ان کو آج کی دنیا کا، اور آج جو ہیں ان کو کل کی دنیا کا پہچاننا ناممکن ہوگا،

لیکن تجربات کے آگے یا طبیعیات کے ما بعد ہمارا جہل جہاں کل تھا، وہیں آج ہی اور جہاں آج ہے وہیں کل بھی ہوگا، جن چیزوں کے افعال اور آثار کے علم نے ہماری دنیا کے زمین او آسمان بدل ڈالے، انھیں کی ابتدا، اور انتہا، حقیقت اور اصلیت کا سوال اگر کیجئے، تو سچا جواب صرف لاجوابی ہے، ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے، اور جان سکتے ہیں لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعوی کریں، تو نرا جہل مرکب ہوگا، اور بقول سقراط "ہم اتنا بھی نہیں جانتے، کہ نہیں جانتے"، اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اسی کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو "اول و آخر این کہنہ کتاب افتادہ است" نہ پیچھے کا کچھ نشان ملا

ؔ علم انسانی صٓ۳۲ و صٓ۳۳،

نہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں، سوا اس کے کہ بس بیچ کے اوراق الٹ پلٹ کر لال بجھکڑوں کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکی کا پاٹ باندھتے رہیے،

غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام حقیقت و ماہیت غرض و غایت کے یہ یا اسی طرح کے بنیادی سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں۔ خالص عقل و استدلال نے ان کے بارے میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انسانیت کی یہ پیاس اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی، اور جہاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا بہک کر اس خار زار میں اپنے دامن کو الجھایا، تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ طفلانہ ہمت نے دو ہی چار قدم ڈالے تھے، کہ شک اور ریب جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سے دامن پکڑنا شروع کر دیا، ایک نکالا نہیں، اور دس نے اور پکڑا، جال کے اندر جتنا پھڑکو وہ اتنا ہی کھال کے اندر گھستا جاتا ہے،

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کر کے چلتی رہی عقل کو اگر دخل بھی دیا، تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں، بلکہ جہاں ڈوبتا ہے وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرۃً بعد رہا ہے، تو اس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈھائی ہزار سال کی وسعت میں پھیلی ہیں، ورق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے، اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے،

قدیم فلسفہ کا یونان میں تالیس ملطی (متوفی ۵۵۰ھ ق م) سے آغاز کیا جاتا ہے۔ اور ابھی اسکو مرے پچاس سال نہیں ہوئے اور بمشکل چند فلاسفہ کے ناموں سے گذر دگے، کہ ہرقلیتوس (۵۰۰ھ ق۔م) ہی سے علم و یقین کی جگہ شک و ریب کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے،" انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے، اور مدعی جاہل انسان خدا سے اسی طرح سیکھتا ہے، جس طرح بچہ بڑوں سے[1] حدیہ کہ مادہ پرستوں کے ابو الآبا

---

[1] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ (بیا گرفیکل ہسٹری آف فلاسفی) ص۲۰،

دیمقراطیس (متولد سنہ ۴۶۰ ق م) تک نے نہ جانے کس معنی میں کہدیا کہ کوئی بات سچ نہیں، اور اگر ہے، تو ہم کو معلوم نہیں"[1] پھر سوفسطائیہ (سنہ ۴۵۰ ق م) تو علی الاعلان اپنے فلسفہ کی بنیاد ہی جہل اور لاعلمی قرار دیتے ہیں، حق اور باطل خیر اور شر" ہر چیز کا پیمانہ صرف انسان ہے" اور اس پیمانہ کا حال معلوم ہے، کہ ملک ملک، قوم قوم کا کیا فرد فرد کا الگ ہوتا ہے، بلکہ ہر فرد کا گوناگون حالات اور اثرات کے تحت بچپن سے لیکر بڑھاپے تک بدلتا رہتا ہے، گورجیاس نے تو سرے سے چیزوں کے موجود ہونے ہی کا انکار کر دیا، اور کہا کہ "اگر موجود بھی ہوں، تو معلوم نہیں ہو سکتیں، اور معلوم ہوں تو دوسروں کو معلوم نہیں کرائی جا سکتیں" سقراط جو سوفسطائیہ کی تعلیم کے اخلاقی نتائج کا سخت دشمن اور منکر ہے، وہ تک اپنا کمالِ دانش یہ جانتا ہے کہ "میں یہ جانتا ہوں کہ نہیں جانتا"۔

سقراط کے نامور شاگرد فلاطون کا اصلی فلسفہ اگرچہ مثالیت یا تصوریت قرار دیا جاتا ہے، لیکن اس کے مکالمات کا مطالعہ کرنے والے سمجھ سکتے ہیں، کہ اس نے اپنے استاد کی شاگردی کا حق زیادہ استادی کے ساتھ ادا کیا، خود سقراط (رض) اور دوسروں کا نام لے کر ان مکالمات میں ہر طرح کی باہم متعارض اور متناقض باتیں جمع کر دی گئی ہیں، کہ سوچ کر پڑھنے والے کو "کچھ نہ ملے علم میں حیرت کے سوا" اور بعضوں کا یہ قیاس بالکل قرینِ قیاس ہے، کہ وہ دراصل خود ہی متحیر تھا، کسی علم و یقین تک نہیں پہونچا تھا، بلکہ اسی لئے مکالمہ کا طریق تعبیر اختیار کیا، البتہ ارسطو نے اپنے استاد فلاطون کی شاگردی کا حق خود استاد ہی کو اپنے تیروں کا نشانہ بنا کر ادا کیا، مگر اصل یہ ہے کہ ارسطو فلسفی سے زیادہ حکیم (سائنٹسٹ) تھا، اس لئے مابعد الطبیعیات میں اس کے یہ تیر خالی ہی نہیں گئے، بلکہ اسی کے زمانہ میں تاریخ فلسفہ کے سب سے مشہور ارتیابی پیرہو نے ارتیابیت (شک) کو اپنی انتہا پر پہونچا دیا، کہ "ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے"[2] اس کے بعد سچ یہ ہے کہ یونان میں فلسفہ مابعد الطبیعیات کا خاتمہ ہی ہو گیا، اور کسی نے بالکل ٹھیک لکھا ہے، کہ یونان

---

[1] لیوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ (بیاگرفیکل ہسٹری آف فلاسفی) ص ۱۰۶۔ [2] شوگلر کی تاریخ فلسفہ ص ۱۳۵۔

کا فلسفہ طفلانہ تجسس سے شروع ہوا، اور پیرانہ تذبذب پر ختم، یہ شک و تذبذب صرف جوابات کے متعلق نہ تھا، بلکہ فلسفہ جس قسم کے سوالات کرتا ہے، سرے سے ان کے امکانِ جواب کے متعلق،

مابعد الطبیعیات سے اس مایوسی کے بعد فلسفہ نے یا تو اخلاقیات کی راہ اختیار کی، یا پھر اسکندریہ میں نوفلاطونیت تک پہونچکر مذہب کے زیر اثر وحی والہام کے دامن میں پناہ پکڑی،

"ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہوجانا چاہیئے، بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں، کہ اس کا علم براہ راست خود اس ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے، جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا، جو نوفلاطونیت نے اختیار کیا، اور جسکو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا، علمی تفکر کی راہ سے حصولِ یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی، کہ صداقت کو وحی کے اندر ڈھونڈنے کی کوشش کیجائے، جو فکر سے بالاتر ہے"[۱]

اس طرح قدیم فلسفہ کا تو خیر خاتمہ ہی پیرانہ شک پر ہوا، لیکن جدید نے جنم ہی شک کے پیٹ سے لیا، اور دیکارٹ ہر ہر شے کو قابلِ شک قرار دے کر صرف "میں ہوں" کے ایک نقطہ یقین پر ٹھہر سکا، او گو کہنے کو یہ بیک "ناقابلِ شک" کی تلاش کیلئے تھا، لیکن ہوا یہ کہ شک ہی کی راہوں کو اس نے اور کھول دیا، یہانتک کہ "اس میں ہوں" کے رہے سہے آخری نقطہ یقین کو بھی گم کرکے رہا، یا کم از کم اتنا موہوم کر دیا کہ یہ بھی مفہوم نہ ہو سکے، کہ "میں کیا ہوں" اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے اقرار جہل کی تاریخ بن کر رہ گئی، برلاک کے ہاں یہ اقرار حسیت کے نقاب میں ہے، اور برکلے کے ہاں ادعائی تصوریت کے، مگر اتنی باریک اور شفاف کہ روپوشی سے زیادہ رونمائی کی زینت ہے،

آخر برکلے کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونما نقاب کو بھی تار تار کر دیا، اور نہ صرف جہل اور ارتیابیت کا کھل کر اقرار کر لیا، بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا، آگے اسی کے خیالات کی کچھ تفصیل و ترجمانی

---

[۱] جانٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ، ص۱۱

جس منطق سے برکلے نے مادہ کے جوہری یا قائم بالذات وجود پر وار کیا تھا، اسی کو بعینہ ہیوم نے نفس یا روح کے مستقل وجوہری وجود پر الٹ دیا، جس طرح رنگ و بو شکل وامتداد وغیرہ محسوس صفات اور ادراکات سے ماورا مادہ کا کوئی وجود نہیں ثابت کیا جاسکتا، اسی طرح نفس اور روح کا بھی شعور کے مختلف حوال کے علاوہ کوئی مصداق اور محل نہ معلوم ہے، اور نہ ثابت کیا جاسکتا ہے،

"جسکو میں اپنی ذات کہتا ہوں جب اس کے اندر داخل ہوکر دیکھتا ہوں، تو ہمیشہ سردی گرمی، روشنی تاریکی محبت نفرت لذت الم کسی نہ کسی خاص ادراک ہی پر پاؤں پڑتا ہے، بغیر کسی خاص ادراک کے اپنی ذات کو کبھی نہیں پکڑ سکتا، نہ اس ادراک کے سوا کسی اور شے کا مشاہدہ ہو سکتا ہے، جس وقت میرے یہ ادراکات غائب ہوجاتے ہیں، اس وقت اپنی ذات (یا نفس) کا بھی کوئی ادراک نہیں رہتا، اور بجا طور سے کہا جاسکتا ہے کہ یہ نہیں موجود ہے، اور اگر موت سے میرے تمام ادراکات اسی طرح غائب ہوجاتے ہوں، کہ فنا کے جسم کے بعد نہ میں خیال کر سکتا ہوں، نہ احساس، نہ دیکھ سکتا ہوں، نہ محبت کر سکتا ہوں، نہ نفرت، تو پھر میں قطعاً نیست ہوجاتا ہوں، اور سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کے بعد میرے قطعاً نابود ہوجانے میں کیا کسر رہ جائیگی"[1]

الحاصل مادہ کی طرح نفس، روح، ذات، یا انا کا مستقل بالذات وجود بھی محض ہمارے متخیلہ کا ایک افسانہ ہے،

اب اس سے پہلے کی ساری تاریخ فلسفہ پڑھ جاؤ، تو پاؤ گے، کہ انسان نے حقیقت جوئی کی راہ میں جو کچھ تھوڑا بہت اپنے نزدیک پایا تھا، وہ یہی مادہ اور روح کی وحدیت یا ثنویت تھی، کہ ان میں سے کوئی ایک یا دونوں ہستی کا وہ راز ہیں، جس کی جستجو میں ہم ہزاروں سال سے سرگرداں ہیں، ان دو میں بھی ڈیکارٹ کے ہمہ گیر بے پناہ شک نے جس ایک کو یقین کی آخری چٹان سمجھا تھا ہیوم نے اسکو بھی موہوم و متزلزل کر دیا،

---

[1] ہیومن نیچر (فطرت انسانی) حصہ چہارم،

ظاہر ہے کہ اب اسکے بعد عقل کے پاس شک اور بے یقینی، حرمان اور ناامیدی کے سوا کیا رہجا سکتا ہے کہ باطن یا حقیقت[1] کی یافت سے ہمیشہ کے لئے مایوس اور دست بردار ہو کر صرف ظاہر[2] یا مظاہر تک عقل وعلم کی رسائی کو محدود کر کے حقائق طلب فلسفہ کی ناکامی اور بے حاصلی کا اعلان کر دیا جائے،

یہی تشکیک اور ارتیابیت کی وہ جدید صورت ہے، جسکو لاادریت یا مظاہریت (فنامنا لزم) ایجابیت (پازیٹوازم) اور نتائجیت (پرگمیٹزم) وغیرہ خدا جانے کن کن ناموں سے پکارا یا چھپایا جاتا ہے، اور جس کو ہیوم نے "ہلکی ارتیابیت" سے موسوم کیا ہے،

"ایک اور قسم ہلکی ارتیابیت کی جو نوع انسان کے لئے مفید اور پر ہونی تشکیک کا لازمی نتیجہ ہو سکتی ہے یہ ہے، کہ ہم اپنی بحث و تحقیق کو ایسی چیزوں تک محدود رکھیں، جو انسانی فہم کی محدود صلاحیت کے مناسب ہوں، بے شک انسان کا تخیل دور دراز اور غیر معمولی چیزوں میں بلند پروازی سے قدرۃً خوش ہوتا ہے،...... لیکن سلامت فہم کا تقاضا یہی ہے، کہ اس طرح کی بلند پروازیوں سے محترز رہ کر معمولی زندگی اور روزمرہ کے تجربات کے اندر مقید رہے،...... جب ہم ہزاروں تجربات کے بعد پتھر کے گرنے اور آگ کے جلنے تک پر یقین کرنے کی کوئی تشفی بخش وجہ نہیں بتا سکتے تو کائنات کی اصلیت اور فطرت کے حل کے ازل اور ابد کے باب میں کسی فیصلہ سے ہم کیسے مطمئن ہو سکتے ہیں[3]"

اس ہلکی ارتیابیت کے لئے ہیوم نے فلسفہ کا جو نظام کھڑا کیا ہے، اسکی بنیاد لاک اور برکلے کا وہی اصل اصول ہے، کہ ہم اپنے تجربات اور ادراکات سے آگے قدم نہیں اٹھا سکتے،

ذہن نفس یا روح کیا ہے؟ جس طرح جسم یا مادہ کے متعلق فلسفہ کی تجریدات نے یہ خیال پیدا کر دیا کہ وہ اپنے محسوس افعال اور آثار سے ماورا ایک قائم بالذات حقیقت ہے، اسی طرح غالبًا فلسفہ ہی کے

---

[1] Reality [2] Appearance [3] ہیوم از ہکسلے (خلاصہ) ص ۲۹

زیر اثر اور نیز ظاہر مذاہب کی رہنمائی سے یہ خیال بھی پھیلا، کہ ہمارے ذہنی یا شعوری افعال اور احوال بھی اپنے علاوہ ایک جوہری ذات کے ساتھ قائم اور وابستہ ہیں جس کا نام نفس یا روح ہے،

جس طرح برکلے کے نزدیک محسوس صفات اور افعال کے علاوہ کسی اور جسمی حقیقت یا مادہ کا تصور فلسفیوں کی محض ایک تجرید تھی جس کا عام سلیم الفہم آدمی قطعاً کوئی علم اور یقین نہیں رکھتے، اسی طرح سماعت و بصارت محبت و نفرت، لذت والم، فکر و استدلال، حافظہ و ارادہ وغیرہ کے مختلف ادراکات جذبات اور خیالات سے اگر قطع نظر کر لیا جائے، تو ہیوم کے نزدیک ان کے ماوراء مجرد روح یا نفس کا بھی ہم کو قطعاً کوئی تصور نہیں حاصل، نہ اس لفظ کا کوئی جداگانہ مصداق ہم بتا سکتے ہیں، لہذا جہاں تک ہماری تجربات کی رسائی کا تعلق ہے،

"جس چیز کو ہم نفس کہتے ہیں، وہ ان مختلف ادراکات کے ایک ڈھیر یا مجموعہ کے سوا کچھ نہیں جنکو خاص خاص علائق باہم متحد کر دیتے ہیں، اور جن کی نسبت غلطی سے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ وہ کوئی کامل بساطت یا وحدت رکھتے ہیں"[۱]،

"انسانی نفس کا ٹھیک تصور بس یہ ہے، کہ اس کو ایسے مختلف ادراکات کا یا وجودات کا ایک نظام سمجھا جائے جنکو علت اور معلول کے علاقہ نے باہم باندھ رکھا ہے اور جو آپس میں ایک دوسرے کو پیدا اور فنا متاثر اور متغیر کرتے رہتے ہیں"[۲]،

ڈیکارٹ نے ہمارے تمام ذہنی یا شعوری احوال کا نام افکار یا خیالات[۳] رکھا تھا، لاک اور برکلے کی اصطلاح میں ان کا نام تصورات[۴] تھا، ہیوم کے نزدیک لفظ تصور کا یہ استعمال درست نہیں، لہذا وہ انکو ادراکات سے موسوم کرتا ہے[۵]،

---

[۱] ہیومن نیچر (فطرت انسانی) [۲] ... [۳] Thoughts [۴] Ideas

[۵] وہ تصورات کی اصطلاح کو صرف خیالات یعنی ذہن کے انتقالی اعمال تک محدود رکھتا ہے، Perceptions

محض لاعلمی یا سلبی دلائل سے ہیوم کا یہ نتیجہ نکالنا کہ نفس مختلف ادراکات کے ایک ڈھیر کے علاوہ کچھ نہیں ہکسلے کے بقول خالی دعویٰ اور زبردستی ہے،" البتہ زیادہ سے زیادہ اس نتیجہ کی حمایت میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے، کہ ہم نفس کے متعلق اس سے زائد کچھ نہیں جانتے، کہ یہ ادراکات کا ایک سلسلہ ہے۔[1]

ان ادراکات کی ہیوم نے دو خاص قسمیں قرار دی ہیں، (۱) ارتسامات[2] اور (۲) تصوّرات، رنگ، روشنی، آواز، مزہ، لذّت والم، محبت ونفرت، ارادہ اور قوت وغیرہ کے وہ زیادہ واضح، جلی اور زوردار ادراکات جن کو ہم براہ راست حسّی یا شعوری تجربات سے حاصل کرتے ہیں، ان کا نام ارتسامات ہے، اس کے بعد حافظہ یا تفکر اور استدلال کی صورت میں ان ارتسامات کی جن تصویروں کا اعادہ ہوتا ہے، اور جو اپنی اصل کے مقابلہ میں نسبتہً ناصاف خفی اور کمزور ہوتی ہیں، وہ تصوّرات ہیں، یہ تصورات جس طرح ارتسامات کی نقل اور تصویر ہو سکتے ہیں، اسی طرح دیگر سابقہ تصوّرات کی بھی زیادہ مدھم یا ضعیف وخفی نقل اور اعادہ ہو سکتے ہیں، ارتسامات اور تصوّرات میں وضاحت اور قوت کی اس کمی زیادتی کے سوا اور کوئی فرق نہیں ہوتا،

ہیوم کا یہ دعوی بہت عجیب وغریب، بلکہ نہایت سطحی اور مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے، کہ کسی چیز کے واقعی دیکھنے سننے یا کسی واقعی لذّت والم میں یا پھر بعد کو اس کے یاد اور خیال کرنے میں محض شدّت اور خفت یا قوت اور ضعف کا فرق ہوتا ہے، لیکن ہکسلے کا کہنا غلط نہیں کہ اس کے علاوہ کوئی اور فرق بتانا آسان نہیں یہی وجہ ہے، کہ بارہا ہم خفی اور کمزور ارتسامات کو تصوّرات اور جلی اور زوردار تصوّرات کو ارتسامات سمجھ بیٹھتے ہیں، مثلاً کسی آواز کو اگر ہم نے بے توجہی کی وجہ سے اچھی طرح نہیں سنا، تو اکثر کہتے ہیں، کہ لا حول ولا قوۃ میں تو اس کو اپنا وہم سمجھا تھا، اسی طرح اگر ہم کسی کے شدید انتظار میں بالاخانہ پر بیٹھے ہیں، تو اس کے آنے سے پہلے بارہا زینے پر صاف کسی کے چڑھنے کی آواز سنائی دیتی ہے، جس کو ہم واقعی آواز سمجھ اور زینہ کی طرف استقبال کے لئے دوڑ جاتے ہیں" بعض بیماریوں میں تو ہمارے تصوّرات ہو بہو

[1] مجموعہ مضامین (ہکسلے) جلد ۶ ص ۶۵، [2] Impressions

واقعی اشیاء کی قوت اور وضاحت اختیار کر لیتے ہیں؛

بظاہر کسی چیز کی پرواز اتنی محدود نہیں نظر آتی جتنی کہ ہمارے خیالات اور فکر کی لیکن درحقیقت یہ پرواز تجربہ کے فراہم کردہ مواد کی تحلیل و ترکیب سے آگے ایک قدم نہیں جاتی، مواد سارا کا سارا حسی یا ذہنی ارتسامات سے حاصل ہوتا ہے، فکر کا کام محض اس کا توڑنا جوڑنا ہے" ہر صحیح تصور کسی نہ کسی ارتسام ہی سے پیدا ہو سکتا ہے" صحت اور واقعیت کی آخری کسوٹی صرف ارتسامات ہیں" جب ہم کو کسی فلسفیانہ اصطلاح کی صحت میں شک ہو، تو خالی یہ دیکھ لینا چاہئے کہ اس کا تصور کس ارتسام سے ماخوذ ہے" اور جس تصور کو بالآخر کسی ارتسام تک نہ پہونچایا جا سکے، اسکو نرا وہم سمجھنا چاہئے، البتہ تصورات کا ہمیشہ اپنے ارتسامات کے مماثل ہونا ضروری نہیں، بلکہ فہم و فکر کے تصرف سے بسیط تصورات طرح طرح کے مرکب تصورات کی صورت اختیار کر لیتے ہیں لیکن اصل اور ابتدائی تصورات چونکہ ارتسامات ہی سے ماخوذ ہوتے ہین، اسلئے تمام تصورات کا سرچشمہ بواسطہ یا بلا واسطہ بہر حال ارتسامات ہی کو ہونا چاہئے،

حافظہ کے تصورات چونکہ ہمارے ادراکات کی زیادہ براہ راست نقل اور اعادہ ہوتے ہیں، لہذا وہ زیادہ واضح اور قوی یا اجاگر اور زوردار ہوتے ہیں، بخلاف اس کے متخیلہ اپنے تصورات میں رد و بدل کی آزادی سے کام لیتا ہے، یا یوں کہو کہ اصل تجربات سے باہر نکل جاتا ہے، اسلئے لازماً غلطیوں میں مبتلا ہوتا اور ایسی ایسی باتیں فرض کرنے لگتا ہے جن کا نہ کوئی وجود ہوتا ہے، اور نہ جنکو ثابت کیا جا سکتا ہے فلسفی زیادہ تر اسی قسم کی اغلاط اور مفروضات کا شکار ہو جاتے ہین،

خلاصہ یہ کہ ہمارے ذہن اور اس کی فکر کی کائنات اور پرواز ارتسامات اور ان کے تصوری اعادات کی تحلیل و ترکیب سے آگے نہیں، ان اعادات یا تصورات سازی کا کام دو قوتین انجام دیتی ہین، (۱) حافظہ اور (۲) متخیلہ[1]، حافظہ کا کام ارتسامات کی ہوبہو نقالی ہوتی ہے، بخلاف اس کے متخیلہ اپنے خاص

[1] Imagination.

خاص قوانین کے تحت ان میں ترمیم و تغیر اور تحلیل و ترکیب کے تصرفات کرتا ہے،

متخیلہ کے یہ قوانین یعنی وہ وسائط اور روابط جن کے ذریعہ سے ہم اپنے تصورات میں باہم ربط اور ائتلاف پیدا کرتے ہیں، ہیوم کی تحقیق میں تین ہیں، (۱) کبھی تو دو چیزوں میں محض مماثلت اور مشابہت[1] کی بنا پر ذہن ایک سے دوسری کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، جیسے کسی عزیز کی تصویر دیکھ کر اس عزیز کا تصور آجانا،

۲- دوسرا واسطہ جس سے مختلف تصورات کے درمیان ذہن ربط اور ائتلاف پیدا کرتا ہے، زمانی یا مکانی تعلقات کی سابقہ مقارنت[2] ہوتی ہے، مثلاً کسی موقع پر ہم نے دو چیزوں کو ایک ہی جگہ یا ایک دوسرے کے بعد دیکھا تھا، تو ان میں سے ایک کے تصور سے دوسری کا تصور آجا سکتا ہے لیکن محض مماثلت اور مقارنت پر مبنی یہ ائتلافات زیادہ تر سطحی ہوتے ہیں، اور دو چیزوں کے مابین کوئی گہری اور حقیقی وابستگی نہیں ظاہر کرتے،

۳- تیسرا قانون علیت کا ہے یعنی دو چیزوں کے مابین علت اور معلول ہونے کا ربط، یہ ائتلاف تصورات کا سب سے گہرا، مضبوط اور یقینی واسطہ اور اصول ہے، کسی جلی ہوئی شے کو دیکھ کر آگ کا تصور آجانا ناگزیر ہے، اسی طرح اگر کسی کے قاتل کو ہم جانتے ہیں، تو یہ مشکل ہی سے ممکن ہوگا، کہ مقتول کے تصور سے قاتل یا قاتل کے تصور سے مقتول کا تصور نہ آجائے، علت اور معلول کے تعلق میں ہم ایک کو دوسرے سے کچھ ایسا جکڑا ہوا پاتے ہیں، کہ ان کا انفکاک ناممکن معلوم ہوتا ہے، اور یہ یقین رکھتے ہیں، کہ دونوں میں کوئی بہت گہرا حقیقی اور اندرونی رابطہ ہے،

اسی لئے ہیوم نے سب سے زیادہ توجہ قانون علیت ہی کی بحث اور تحقیق پر کی ہے، اور یہی دراصل اس کا خاص فلسفہ اور اس کی فلسفیانہ شہرت کا مدار ہے،

خیال یہ کیا جاتا ہے کہ ہر شے میں کچھ خاص خاص صفات اور خواص، قوتیں، اور طاقتیں پائی جاتی ہیں، جن سے خاص خاص افعال اور آثار کا ظہور ہوتا رہتا ہے، اور یہ خاصیتیں یا قوتیں چونکہ اس شے کی ذات میں داخل سمجھی

[1] Similarity and Resemblance. [2] Contiguity

جاتی ہیں، اس لئے جب تک یہ شے یہ شے ہے، اس کے افعال اور آثار کا اس سے منفک یا جدا ہونا تصور ہی میں نہیں آسکتا، آگ آگ ہو کر نہ جلائے، یہ کیسے ہو سکتا ہے،

اس طرح علت اور معلول کے درمیان ہم ایک وجوب اور لزوم یا ضرورت کے پائے جانے کا تصور رکھتے ہیں، یہ ضرورت یا وجوب ایک معنی میں ہیوم کو بھی مسلّم ہے، البتہ اسکو یہ تسلیم نہیں، کہ ہم کو خود علت کے اندر بالذات کسی ایسے خاصہ یا قوت کا علم ہے، جس کی بنا پر معلول کا اس سے صدور واجب و ضروری اور تخلف وانفکاک ناممکن ہو،

اس کے نزدیک لزوم اور ضرورت کی ایک صورت تو وہ ہے، جو واقعی وجود سے قطع نظر کرکے خود بعض تصورات کے نفس علائق میں پائی جاتی ہے، مثلاً مثلث اور زاویہ قائمہ کی تعریف سے ان کا جو تصور قائم ہوتا ہے، اس سے برہانی طور پر یہ نتیجہ وجوباً اور ضرورۃً نکلتا ہے، کہ مثلث کے تین زاویے دو قائموں کے برابر ہوں، خواہ فی الواقع کوئی مثلث، اور زاویہ قائمہ اپنی تعریف کے مطابق سرے سے نہ پایا جائے، لیکن نفس ہمارے تصور کی حد تک انکا یہ باہمی لزوم بہرحال یقینی اور قطعی رہے گا، اور ہندسہ وغیرہ کے ریاضیاتی مسائل میں ہمارے علم اور یقین کی نوعیت یہی ہوتی ہے،

"جو چیزیں انسانی عقل اور تحقیق کے دائرہ میں داخل ہیں، وہ قدرتی طور پر دو قسم کی ہو سکتی ہیں، علائق تصوریہ اور امور واقعیہ، پہلی قسم میں علوم ریاضی یعنی ہندسہ، الجبرا، حساب وغیرہ مختصراً ہر وہ چیز شامل ہے جس کا یقینی ہونا بدیہی اور برہانی ہے، مثلاً یہ امر کہ زاویہ قائمہ کے مقابل والے ضلع کا مربع باقی دو ضلعوں کے مربعے کے برابر ہوتا ہے، ان دو شکلوں کے باہمی علاقہ کا بیان ہے، اسی طرح جب یہ کہا جاتا ہے، کہ پانچ کا تگنا تیس کا آدھا ہے، تو اس سے بھی ان دو عددوں کا باہمی علاقہ ظاہر ہوتا ہے، اس قسم کے جتنے احکام ہوتے ہیں، وہ اس پر موقوف نہیں ہوتے، کہ خارجی دنیا میں کیا ہے، بلکہ محض خیال یا تصور کرنے ہی سے منکشف ہو جاتے ہیں، خارج میں

خواہ کبھی سرے سے کوئی دائرہ یا مثلث نہ پایا گیا ہو، پھر بھی اقلیدس کی صداقتوں کی قطعیت اور یقین میں کوئی فرق نہیں آسکتا"[1]

دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ علائقی تصورات میں مخالف صورت ناقابل تصور ہوئی، اور اس کا فرض کرنا محال ہوتا ہے، بخلاف واقعاتِ فطرت کے جن سے علوم طبیعیہ میں بحث ہوتی ہے، اور جنکو ہیوم امور واقعیہ سے تعبیر کرتا ہی، ان کے علم اور یقین کی یہ نوعیت نہیں ہوتی،

"ہر امر واقعی کی مخالف صورت یا ضد کا امکان ہمیشہ اور ہر حال میں قائم رہتا ہی کیونکہ اس سے کوئی تناقض لازم نہیں آسکتا، اور کسی واقعہ کی مخالف صورت کا آدمی اسی آسانی اور صفائی کر تصور کر سکتا ہے جس طرح کہ خود اسی واقعہ کا، مثلاً یہ امر کہ کل سورج نہ نکلے گا، نہ تو ناقابل تصور ہے، اور نہ اس سے زیادہ مستلزم تناقض کہ نکلے گا، لہذا اس کے بطلان پر کوئی برہان قائم کرنیکی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی، کیونکہ اگر کل سورج کا نکلنا برہاناً باطل ہوتا تو لازماً اسکو مستلزم تناقض ہونا چاہئے تھا، اور ذہن اس کا سرے سے صاف طور پر تصور ہی نہیں کر سکتا تھا"[2]

لیکن اصل یہ ہی کہ نہ تو علائق تصوریہ اور امور واقعیہ کی یہ تقسیم و تفریق ہی درست معلوم ہوتی ہی اور نہ یہ کہنا صحیح ہے، کہ علائق تصورات کا علم اور یقین یا ان کا وجوب ولزوم اس کے تابع نہیں ہوتا، کہ واقعی اور خارجی دنیا میں کیا ہے، بلکہ محض ان کے تصور یا خیال کرنے ہی سے منکشف ہو جاتا ہی، پروفیسر ہکسلے نے بالکل سچ لکھا ہی کہ "فرض کرو وہ چیزیں جن کو لمس و بصر کے ارتسامات کہا جاتا ہی دنیا میں کہیں نہ پائی جاتیں، تو سرے سے خط مستقیم ہی کا ہمکو کیا تصور ہو سکتا تھا، چہ جائیکہ مثلث اور اس کے اضلاع کے باہمی علائق کا کوئی تصور ہو سکتا،؟ ..... اگر انسان مستقیم اور منحنی کے فرق کو دیکھ یا چھو کر محسوس نہ کر سکتا، تو اسکے معنی اس سے زیادہ نہ ہوتے، جتنے اندھے کے لئے سرخ اور نیلے میں فرق کے ہونگے"[3]

---

[1] فہم انسانی باب ۴ ص ۲۲ [2] فہم انسانی ص ۲۲ مطبوعہ دار المصنفین، [3] مجموعۂ مضامین ج ۶ ص ۱۳۹،

پھر جب خود ہیوم کے نزدیک تصورات کے مقابلہ میں ارتسامات کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں کہ وہ ہمارے ذہن کے بس نسبتہً زیادہ واضح اور قوی تجربات کا نام ہوتے ہیں، تو اس دعویٰ کا کہ امور واقعیہ کی صداقت اتنی زبردست نہیں ہوتی جتنی کہ علائق تصوریہ کی، بجا طور سے یہ جواب دیا جا سکتا ہے، کہ خود امور واقعیہ کی ایک بڑی تعداد علائقِ تصورات کے سوا کچھ ہوتی ہی نہیں، اگر میں کہتا ہوں، کہ سُرخ نیلے سے مختلف ہے، تو یہ تصورات ہی کے ایک علاقہ کا حکم ہے لیکن ساتھ ہی ایک امر واقعی بھی ہے اس کی مخالف صورت ناقابلِ تصور ہے[1]۔" (باقی)

[1] مجموعہ مضامین ہکسلے جلد ۶ صفحہ ۱۳۰۔

۱

از

مولینا سید ریاست علی صاحب ندوی

"یہ مقالہ گذشتہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڈھ کے سالانہ اجلاس کے لئے لکھا گیا تھا، اور اس کا خلاصہ اجلاس کے شعبۂ مدارس اسلامیہ میں پیش کیا گیا تھا"

اسلامی نظام تعلیم کی سرگذشت پر ابھی تک مشرق و مغرب کے اہل علم کو بہت کم توجہ کرنے کا موقع ملسکا ہی، اور جن لوگوں نے اس پر قلم اٹھایا ہی، وہ معلومات کی کمی کی بنا پر عجز کے اقرار کے بغیر آگے نہ بڑھ سکے، اور اس سلسلہ میں اب تک برہان الدین زرنوجی کے ایک رسالہ تعلیم المتعلم کے سوا کوئی دوسرا قیمتی ماخذ یورپ کے اہل علم کے سامنے موجود نہیں رہا،

چنانچہ اس موضوع پر سب سے پہلے ۱۷۰۹ء میں موسیو ریلینڈس (Ralandus) نے زرنوجی کے اس رسالہ کو جرمنی سے شائع کیا اور غالباً جرمن مستشرق ڈاکٹر فریڈیخ وسٹیفیلڈ (Freiderich Wustefeld) نے اسی رسالہ کا ترجمہ پہلی مرتبہ جرمن زبان میں کیا، پھر ۱۸۳۸ء میں موسیو کاسپاری نے اسے لائبزک سے لاطینی زبان کے ترجمہ اور موسیو فلیشر کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا[۱] اس کے بعد ایک دوسرے فاضل مستشرق ڈاکٹر دانیال ہانے برگ (Daniel Haneberg) نے ۱۸۵۰ء میں میونخ یونیورسٹی میں ایک مختصر اور سرسری معلومات کا حامل مقالہ اس موضوع پر پڑھا، جسے ایک مسلمان فاضل نے اسلامی

[۱] معجم المطبوعات العربیہ جلد ا ص ۹۶۹ و اکتفاء القنوع بما ہو المطبوع، ص ۱۹۰،

نظامِ تعلیم کے نام سے ہندوستانی زبان میں بھی منتقل کر دیا ہے، اس میں ڈاکٹر موصوف لکھتے ہیں :۔

تاریخ تمدن کا یہ پہلو نہایت اہم ہے اور حیرت ہے کہ باوجود اس قدر اہم ہونے کے اب تک بہت کم علماء نے اسے اپنی توجہ کا مستحق سمجھا ہے، بلاشبہ اس موضوع کے بعض حصوں پر کافی محنت صرف کی گئی ہے، لیکن جزئیات کے متعلق کئی ایک سوال ہیں جن کی تحقیق ابھی باقی ہے، جہاں تک اس موضوع کی مجموعی حیثیت کا تعلق ہے، خو دیلین (. . . . . . جس نے اسلامی مدارس کا مختصر خاکہ ابن خلکان کے ترجمہ کی دوسری جلد میں کھینچا ہے) نے بھی اس سے زیادہ جرأت نہیں کی کہ محض ایک مختصر خاکہ کھینچ دے[1]"

جناب ڈاکٹر ضیاء الدین احمد صاحب نے "تاریخ التعلیم" کے نام سے ایک رسالہ لکھا ہے، اس میں یونان اور روما پر تو صفحوں کے صفحے لکھے گئے ہیں، مگر جب عربوں کے دورِ حکومت کی باری آئی، تو انھیں اعتراف کرنا پڑا کہ

"اس امر کے متعلق معلوم کرنے کے لئے کہ مسئلۂ تعلیم کی نسبت اہلِ عرب کے کیا خیالات تھے، بہت کم مواد موجود ہے، تعلیم کی تاریخ پر اہلِ یورپ میں جن لوگوں نے تصانیف کی ہیں، اگرچہ وہ اپنی تصانیف میں اوائلِ زمانہ کے حالات درج کرتے ہیں، لیکن اہلِ عرب کے زمانہ کو قطعاً چھوڑ جاتے ہیں[2]"

درحقیقت اس وقت تک اسلامی نظامِ تعلیم پر جو کچھ مواد فراہم ہوا ہے، وہ مولینا شبلی نعمانی مرحوم کے چند مضامین کے مجموعہ کے باہر نہیں ہے، لیکن علامۂ موصوف نے ان میں زیادہ تر اسلامی مدارس پر توجہ رکھی ہے، اگرچہ اسلامی نظامِ تعلیم پر بھی انھوں نے مضامین لکھے ہیں، لیکن ان میں ندوۃ العلماء کے تعلق سے زیادہ تر ہندوستان کی اسلامی درسگاہوں کے نصاب پر نظر ڈالی گئی ہے، نفس اصول و طرقِ تعلیم، اسلامی نظامِ تعلیم کے رو سے اساتذہ و طلبہ کے فرائض، اور مدارس اور دارالاقامہ کے نظم و نسق و طرزِ بود و ماند وغیرہ پر انھیں بھی توجہ فرمانے کا موقع نہیں ملا، مولینا عبدالسلام

---

[1] اسلامی نظامِ تعلیم ص ۱ [2] تاریخ التعلیم ص ۲۶۴

ندوی نے التربیۃ کا استقلالیہ کے مقدمہ میں جسے ایجوکیشنل کانفرنس نے شائع کیا ہے، اسلام تعلیم پر نظر ڈالی ہے لیکن ان کی توجہ بھی زیادہ تر مسئلہ نصاب اور اسکی اصلاح پر مبذول رہی ہے، اور نواب صدر یار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے علمائے سلف کے سوانح میں جستہ جستہ ان کی طالب علمی کے حالات بھی لکھے ہیں،

قدیم ماخذ میں فن تعلیم پر مباحث قدیم عربی ماخذوں پر اگر نظر ڈالی جائے تو علماء اسلام میں سے جن لوگوں نے اسلامی اصول و طریق تعلیم پر توجہ کی، ان میں امام اعظم ابوحنیفہ، امام بخاری، حافظ ابن عبد البر، امام غزالی، برہان الدین زرنوجی، قاضی ابن الجماعہ، محمد بن ابوزید اور علامہ ابن خلدون کے نام لئے جا سکتے ہیں۔

امام اعظم علیہ الرحمۃ کا ایک رسالہ کتاب العالم والمتعلم کے نام سے ہے، جسے مجلس احیاء معارف نعمانیہ حیدرآباد نے شائع کیا ہے، یہ رسالہ اگرچہ عقائد و کلام کے مباحث پر ہے لیکن وہ مباحث مکالمہ کے طریقے سے متعلم و عالم کے سوال و جواب میں بیان کئے گئے ہیں، اور اس سے متعلم کے طریق سوال و جواب، اور معلم کے طریق افہام و تفہیم و شفقت و محبت پر بھی روشنی پڑتی ہے،

امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایمان کے بعد علم ہی کو جگہ دی ہے، چنانچہ کتاب الایمان میں ایمانیات سے متعلق احادیث جمع کرنے کے بعد کتاب العلم میں علم کے متعلق احادیث اور اخبار و آثار جمع کئے ہیں، جن سے علم کی فضیلت، علم و تعلیم کی اشاعت، تعلیم کے لئے تحریص و تشویق، عالم و متعلم کے فرائض اور طالب علموں کی تادیب وغیرہ کے مباحث اخذ کئے جا سکتے ہیں،

امام بخاری کی پیروی میں دیگر ارباب سنن و کتب احادیث نے بھی اپنی کتابوں میں کتاب العلم کے تحت یہ امور پیش کئے ہیں، اور حافظ ابن حجر نے بخاری کی شرح فتح الباری میں معلومات بڑھائے ہیں،

حافظ ابن عبد البر متوفی ۴۶۳ھ کو یہ شرف تقدم حاصل ہے، کہ انھوں نے اصول علم و تعلیم مفہوم علم، فضیلت طلب علم، آداب تعلم، اور علماء و طلبہ کے فرائض و اخلاق پر کتاب جامع بیان العلم وفضلہ میں تفصیلی مباحث پیش کئے، اور احادیث و اخبار و آثار و اقوال سے استشہاد لائے، اس کا اختصار احمد بن عمر محمصانی

بیروتی ازہری نے مختصر جامع بیان العلم وفضلہ کیام سے کیا، اور اُسے ۱۳۲۰ھ ہجری میں مطبع موسوعات مصر سے شائع کیا ہے،

امام غزالی متوفی ۵۰۵ھ نے طریقۂ درس و تدریس، فضیلت علم، اساتذہ و تلامذہ کے فرائض ان دونوں کی باہمی معاشرت کے آداب، احیاء العلوم میں قلم بند فرمائے ہیں، اور علوم کی تقسیم کرکے ان کے درجات و امتیازات دکھائے ہیں، یہ مباحث احیاء العلوم جلد اول کتاب العلم اور جلد ثالث کتاب شرح عجائب القلوب میں مذکور ہیں،

محمد بن ابو زید نے معلمین و متعلمین کے فرائض پر ایک کتاب لکھی تھی لیکن اس کا سراغ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں اسکا تذکرہ کیا ہے، اور اس نے فن تعلیم پر جو کچھ لکھا ہے اس میں یہ کتاب بھی اسکی ماخذ رہی ہے،

علامہ ابن خلدون متوفی ۸۰۸ھ نے اپنے مقدمہ میں فن تعلیم پر ایک مستقل باب لکھا ہے، اور بعض دوسری مناسبتوں سے اسی مقدمہ میں دوسرے مقاموں پر بعض تعلیمی مباحث درج کئے ہیں، اور ان میں علم و تعلیم کی ترقی کے اسباب و وجوہ اور تعلیم کے اصول و طریق پر فلسفیانہ نظریے قائم کئے ہیں،

سیر و تراجم کی عام کتابوں جیسے وفیات الاعیان ابن خلکان، تذکرۃ الحفاظ ذہبی، طبقات الشافعیہ سبکی، حسن المحاضرہ سیوطی اور تاریخ تمدن کی کتابوں میں سے خطط مصر مقریزی وغیرہ میں مختلف ائمہ اور علماء کے سوانح اور شہروں کے مدارس کے ذکر میں جستہ جستہ تعلیمی مباحث ملتے ہیں،

فن تعلیم پر سب سے پہلی کتاب، یوں تو فن تعلیم پر مستقل حیثیت سو جو کتاب سب سے پہلے لکھی گئی، وہ ابن عبد البر کی جامع بیان العلم قرار پا سکتی ہے لیکن اس کا ایک گونہ تعلق تعلیم و تعلم کے ساتھ علماء کے مقام علم و حقیقت فقہ و قیاس سے بھی ہے، اس لئے فن تعلیم پر سب سے پہلی مستقل کتاب جو خاص اسی موضوع پر تصنیف ہوئی، اسی مذکورۂ بالا رسالہ تعلیم المتعلم کو قرار دیا جا سکتا ہے،

تعلیم المتعلم | یہ برہان الدین زرنوجی کی تصنیف ہے، جو چھٹی صدی میں گذرے ہیں، اور ہدایہ کے مشہور مصنف علامہ برہان الدین کے شاگردوں میں تھے، اس رسالہ میں تعلیم کا مقصد، استادوں کے انتخاب، عالموں کی عزت، سبق اور ان کی مقدار اور ترتیب اور علماء اور طلبہ کے اخلاق و فرائض پر اختصار کیساتھ نظر ڈالی گئی ہے، اور علماء اور ائمہ کے اقوال اور ان کی تعلیم و تعلم کے واقعات سے مثالیں دی گئی ہیں،

اس لئے اس رسالہ کو عام مقبولیت حاصل ہوئی، لاطینی اور جرمن زبانوں میں ترجمہ ہونے کے علاوہ ترکی زبان میں بھی اسے شیخ عبدالمجید بن نصوح نے ارشاد الطالبین فی تعلم المتعلمین کے نام سے منتقل کیا اور ۹۹۶ھ میں شیخ ابراہیم بن اسماعیل نے اس کی شرح سلطان مراد ثالث کے زمانہ میں لکھی، ہندوستانی زبان میں بھی اس رسالہ کا ترجمہ الرفیق الفہیم لطریق التعلیم کے نام سے مولوی محمد معین الدین صاحب (محافظ کتب خانہ حبیب گنج علی گڈہ) نے کیا ہے، یہ ۱۳۵۰ھ میں حبیب گنج علی گڈہ سے شائع ہوا ہے،

اصل رسالہ متعدد مرتبہ چھپ چکا ہے، جیسا کہ اوپر گذرا، ۱۷۰۹ء میں جرمنی میں چھپا، پھر ۱۸۳۸ء میں لائبزک میں اس کے بعد ۱۲۶۵ھ میں ہندوستان میں شہر مرشد آباد میں چھاپا گیا، پھر ۱۹۰۱ء میں قازان میں، اس کے بعد ۱۲۸۶ھ میں تیونس میں ایک مختصر شرح کے ساتھ چھپا، پھر یہی تیونس کا نسخہ ۱۲۹۲ھ میں آستانہ میں چھاپا گیا، اس کے بعد ۱۳۰۷ھ میں پھر قازان میں چھپا، اور ۱۸۹۰ء میں مصر میں، پھر ۱۳۰۰ھ اور ۱۳۰۷ھ میں مطبوع ہوا[1] علاوہ ازیں ابن اسمٰعیل کی شرح کے ساتھ بھی چھپتا رہا، چنانچہ ۱۳۱۰ھ اور ۱۳۱۱ھ میں یہ قسطنطنیہ میں چھاپا گیا، اور آخری اڈیشن ۱۳۴۴ھ میں مصر سے شائع ہوا[2]

اس رسالہ کے ان بکثرت اڈیشنوں کی اشاعت سے یہ اندازہ ہوتا ہے، کہ یہ اس فن کا مقبول عام رسالہ رہا ہے، اور اب تک اہل علم کا اس فن میں اسی پر مدار تھا،

تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم | لیکن اب حیدرآباد کی مجلس دائرۃ المعارف ہمارے شکریہ کی مستحق ہے، کہ اس فن میں

---

[1] معجم المطبوعات العربیۃ جلد ا ص ۹۹۹، [2] ایضاً ص ۱۱ و اکتفاء القنوع ص ۱۹۰،

انکی کوششوں سے ایک دوسری قابلِ قدر کتاب تذکرۃ السامع والمتکلم فی ادب العالم والمتعلم مولینا سید ہاشم صاحب ندوی کی عالمانہ تصحیح وتحشیہ کیساتھ شائع ہوئی ہے، اس کتاب سے اس موضوع کے بہت سے قیمتی معلومات سامنے آگئے ہیں، جن میں خصوصًا قدیم اسلامی تعلیم کے اصول کی تشریح کے ساتھ تحصیلِ علم کے طریقے اساتذہ اور شاگردوں کے باہمی تعلقات، شاگردی کے آداب، اور مدارس اور دارالاقامہ کے نظم ونسق اور رہنے سہنے کے طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے، پھر محشی نے اپنے حواشی میں سیر تاریخ، رجال اور حدیث کی مستند کتابوں سے ایسے بہت سے قیمتی معلومات نئے مذاق کے مطابق عنوانات قائم کرکے بڑھائے ہیں، جنسے اسلامی عہد کی تعلیم کے طریقوں اور نظام کے مزید حالات سامنے آگئے ہیں،

تذکرۃ السامع، قاضی بدرالدین ابواسحٰق محمد بن ابراہیم بن سعداللہ بن جماعہ کنانی معروف بہ قاضی ابن جماعہ متوفی ۷۳۲ھ کی تصنیف ہے، موصوف مصر وشام کے مختلف مقاموں پر قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز رہنے کے علاوہ کسی نہ کسی مشہور درسگاہ میں درس وتدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، پھر مصر میں صدر اساتذہ کے منصب پر سرفراز رہے[1] اسلئے انھیں تعلیمی معاملات کا عملی تجربہ حاصل تھا اور انھوں نے جو کچھ لکھا وہ اپنے عملی تجربہ کے بعد لکھا ہے، ان کے بیان کا اسلوب یہ ہے، جیسا کہ محشی نے دکھایا ہے، کہ پہلے وہ اصول بیان کرتے ہیں، پھر ان سے فروع نکالتے ہیں، اس کے بعد موقع کے لحاظ سے واقعات اور اقوال نقل کرتے ہیں، انھوں نے درس وتدریس کے طریقہ اور اساتذہ اور شاگردوں کے باہمی تعلقات میں جابجا ان کو مشورے دیئے ہیں، وہ درسگاہوں میں مدرس تھے، اور صدر اساتذہ کے منصب پر فائز تھے، اس لئے یہ بجا قیاس کیا جاسکتا ہے، کہ انھوں نے جو کچھ مشوروں کے طور پر لکھا ہے، ان پر اپنی نگرانی میں عمل بھی کرایا ہوگا، علاوہ ازیں انھوں نے اس میں متقدمین کی کتابوں سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس کتاب میں متاخر مصنفین سے کم از تصنیف

[1] قاضی ابن جماعہ کے سوانح کی تفصیل کے لئے دیکھو طبقات الشافعیہ سبکی جلد ۵ ص ۲۳۰، ۲۳۳، الدرر الکامنہ ابن حجر جلد ۳ ص ۲۸۰ و ۲۸۳، شذرات الذہب ابن عماد حنبلی جلد ۶ ص ۱۰۵، ۱۰۶

کے مطابق امام غزالی کی احیاء العلوم، ابن عبد البر کی جامع بیان العلم اور زرنوجی کی تعلیم المتعلم کی اصل عبارتیں جا بجا نقل کی گئی ہیں، یہ کتاب پانچ بابوں پر تقسیم کی گئی ہے،

۱۔ "علم اور اہل علم کی فضیلت"،

۲۔ "اساتذہ کے آداب و تہذیب اپنی ذات کے متعلق، اور اپنے شاگردوں کے ساتھ، اور درس کے حلقہ میں"،

۳۔ "طلبہ کے فرائض، اور اخلاق، اپنی ذات کے لئے، اور اپنے استادوں اور ساتھیوں کے ساتھ، اور حلقۂ درس میں"،

۴۔ "طلبہ اور ان کی کتابیں"،

۵۔ "مدارس، مدرسین، اور طلبہ کے آداب اور طریقے"،

تذکرۃ السامع کے حواشی، تذکرۃ السامع کے محشی نے بھی اپنے حواشی اور تعلیقات میں مصنف کے اسلوب بیان کی پیروی کی ہے، اگر کتاب میں ایسے قواعد اور اصول نظر آئے جنھیں مصنف نے لکھ کر کوئی مثال دئیے بغیر چھوڑ دیا ہے، تو ایسے موقعوں میں سے اکثر جگہ محشی نے مثالیں دیکر دکھایا ہے، کہ اسلامی عہد میں ان پر عمل ہوتا تھا، کتاب میں درس و تدریس کے طریقے اور درس و تدریس کے حلقہ میں نشست برخاست کے آداب کے ایسے بہت سے جزئی معلومات ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتے، محشی نے مختلف کتابوں کے اقتباسوں سے ان کی مثالیں واضح کی ہیں،

مقالہ کے ماخذ اور عنوان مباحث اس لئے ضرورت تھی کہ اصل کتاب اور اس کے ان قیمتی حواشی کو نئی ترتیب اور اسلوب میں ہندوستانی زبان میں منتقل کیا جائے، حسن اتفاق کہ ایجوکیشنل کانفرنس کی پنجاہ سالہ جوبلی کے اس اجلاس کے توسط سے اس کا موقع جلد ہاتھ آگیا، اور مناسب نظر آیا کہ "اسلامی نظام تعلیم" کے عنوان پر فن تعلیم کے متعلق تمام مذکورۂ بالا ماخذوں اور خاص طور پر تذکرۃ السامع اور اس کے حواشی سامنے رکھ کر چند

مباحث حسبِ ذیل عنوانوں میں پیش کئے جائیں:-

۱۔ اسلام کا تعلیمی نصب العین،

۲۔ اسلامی نظام تعلیم کے تین دور،

۳۔ نظام مدارس و دارالاقامہ،

۴۔ اساتذہ کے فرائض،

۵۔ طلبہ کے واجبات،

۶۔ حلقۂ درس (کلاس)

۷۔ طریقۂ تعلیم و نصاب درس،

۸۔ طرز تعلیم و نصاب درس کی چند خامیاں، اور ان کی اصلاح کی کوششیں،

(حاشیہ ص ۹ ۳) لہ محشی نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، اور جن کے جابجا اقتباسات درج کئے، وہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ خطط مقریزی، ۲۔ تذکرۃ الحفاظ ذہبی، ۳۔ وفیات الاعیان ابن خلکان،
۴۔ الشقائق النعمانیہ طاش کبری زادہ، ۵۔ تعلیم المتعلم زرنوجی، ۶۔ احیاء العلوم غزالی،
۷۔ طبقات الشافعیہ سبکی، ۸۔ مختصر جامع بیان العلم ابن عبدالبر ۹۔ ترمذی،
۱۰۔ ابن ماجہ، ۱۱۔ کنز العمال ۱۲۔ ابو داؤد،
۱۳۔ صحیح بخاری، ۱۴۔ صحیح مسلم ۱۵۔ فتح الباری ابن حجر،
۱۶۔ رحلۃ ابن بطوطہ ۱۷۔ مفتاح السعادہ ۱۸۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ،

راقم سطور نے اُن ماخذوں کے اُن اقتباسوں سے جو حواشی میں درج ہیں، فائدہ اٹھایا ہے، علاوہ ازیں اُن کتابوں سے لیسے بہت سے نئے معلومات جو حواشی میں موجود نہ تھے، اصل کتابوں سے بڑھائے ہیں، پھر اس

تعلیم العلمین
اسلام کا تعلیمی نصب العین

اسلام نے علم اور دین دونوں کے ڈانڈوں کو ایک دوسرے سے اس طرح باندھا ہی کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتا، بلکہ قرآن مجید کی سب سے پہلی آیت اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ (اس کا نام لیکر پڑھ جس نے پیدا کیا) اسی حقیقت کو لیکر اتری ہے، اور اشارہ سے بتاتی ہے، کہ پیدا کرنے والے نے ہمکو پڑھنے اور سیکھنے ہی کے لئے بنایا ہی،

اسلام کی نظر میں تعلیم کا مقصد، اسلام کی نظر میں تعلیم و تعلّم کا مقصد خالص رضائے الٰہی کی طلب ہی، اور بس، اس میں کسی دنیاوی غرض کا میل نہیں، بلکہ اسکی نظر میں تعلیم کا اصلی مقصد صرف انسانی پیدائش کے منشا کو پورا کرنا، اچھے اخلاق سے آپ آراستہ ہونا، اور دوسروں کو آراستہ کرنا، اپنے علم کی روشنی سے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰) مقالہ کی تسوید میں ذیل کی چند دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے:۔

۱۔ رحلۃ ابن جبیر	۲۔ معجم البلدان یاقوت حموی	۳۔ مقدمہ ابن خلدون،
۴۔ معالم الایمان ابن ناجی	۵۔ بغیۃ الوعاۃ سیوطی،	۶۔ صبح الاعشیٰ قلقشندی،
۷۔ الدرر الکامنہ ابن حجر	۸۔ عیون الانباء ابن ابی اصیبعہ	۹۔ استیعاب،
۱۰۔ مسند احمد بن حنبل	۱۱۔ اسد الغابہ	۱۲۔ الوافی بالوفیات صفدی
۱۳۔ حسن المحاضرہ سیوطی،	۱۴۔ یعقوبی،	۱۵۔ سیرۃ عمر بن عبد العزیز ابن جوزی
۱۶۔ معجم المطبوعات العربیہ،	۱۷۔ اکتفاء القنوع	۱۸۔ اکبر نامہ ابو الفضل،
۱۹۔ اخبار الاخیار،	۲۰۔ مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ	۲۱۔ علماے سلف،
۲۲۔ خیام،	۲۳۔ الغزالی،	۲۴۔ تاریخ صقلیہ،
۲۵۔ اسلامی نظام تعلیم،	۲۶۔ تاریخ التعلیم،	

جہل اور نادانی کے اندھیرے کو دور کرنا، نہ جاننے والوں کو سکھانا، بھولے بھٹکوں کو راہ دکھانا، حق کو پھیلانا اور باطل کو مٹانا ہے،

علم وعلما کے فضائل قرآن مجید میں

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اہل علم کی خوبیاں اور بڑائیاں گنا کر ان کے مرتبے بڑھائے، چنانچہ اسلام کی مقدس کتاب قرآن مجید میں ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں علم تعلیم اور علما کی بزرگی اور بڑائی بیان کی گئی ہے، سورۂ مجادلہ میں ہے:۔

يَرْفَعُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْكُمْ وَالَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ، (۲۶)	تم میں سے جو ایمان لائے، اور جنھیں علم دیا گیا، اللہ ان کے درجے بلند کرے گا،

امام غزالی لکھتے ہیں، کہ حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں، کہ علما کو عام مسلمانوں پر سات سو درجہ زیادہ فضیلت دی گئی ہے، اور ان درجوں کے باہمی فرق کیلئے ان میں سے ہر دو درجوں کے درمیان پانسو سال کی مدت کا فصل سمجھنا چاہئے،

سورۂ آل عمران میں ہے:۔

شَهِدَ اللّٰهُ أَنَّهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلٰئِكَةُ وَأُولُوا الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ، (ع-۲)	اللہ نے گواہی دی، کہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں، اور فرشتوں نے، اور علم والوں نے گواہی دی، حاکم انصاف کا،

اس آیت سے امام غزالی نے یہ نکتہ پیدا کیا ہے، کہ اس میں اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنا نام لیا، پھر فرشتوں کا، پھر اپنے سے تیسرا درجہ اہل علم کو عطا کیا، اور یہ اہل علم کے شرف و فضیلت کی ایک نشانی ہے،

سورۂ زمر میں ہے:۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ، (ع-۱)	کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہوں گے،

نحل میں آیا ہے :۔

فَسْئَلُوْا اَهْلَ الذِّكْرِ (ع - ۵) ۔۔۔ اہل ذکر سے پوچھو،

امام غزالی نے اس آیت سے علم والون سے تعلیم حاصل کرنے کی تلقین دکھائی ہے،

سورۂ عنکبوت میں فرمایا :۔

وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا يَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ ، (ع - ۵) ۔۔۔ یہ مثالیں ہم نے لوگوں کے لئے بیان کیں، اور انھیں سوائے علم والون کے دوسرے نہیں سمجھ سکتے،

اس کے بعد اسی سورہ میں ارشاد ہوا :۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَا اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ، (ع ۵) ۔۔۔ بلکہ جن لوگوں کو علم دیا گیا، ان کے نزدیک تو یہ (قرآن) کی کھلی آیتیں ہیں، اور ہماری نشانیوں سے سوائے ظلم کرنے والوں کے کوئی انکار نہیں کرسکتا،

پھر سورۂ بینہ کی یہ آیت :۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ ، جَزَاۗؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ، رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ ، (ع - ۱) ۔۔۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک کام کئے، وہی لوگ بہترین خلائق ہیں، ان کا بدلہ ان کے پروردگار کے یہاں رہنے کے باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، وہاں میں سدا رہیں گے، اللہ ان سے خوش ہوا اور وہ اس سے خوش، یہ (اجر) اسکے لئے ہی جو خدا

پڑھ کر سورۂ فاطر میں یہ ارشاد خداوندی ملاحظہ ہو:۔

اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا — خدا سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں،

ان دونوں آیتوں سے امام غزالی اور قاضی ابن جماعہ یہ نکتہ پیدا کرتے ہیں، کہ علما ہی اللہ سے ڈرتے ہیں، اور جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں، وہ بہترین خلائق ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی شہادت کے رو سے علما بہترین خلائق ہیں[1]،

علامہ زرنوجی نے حضرت آدم اور ملائکہ کے قصہ میں دکھایا ہے، کہ انسان کا حقیقی شرف اس کا علم ہی ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسی کے ذریعہ ابو البشر حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں پر فضیلت دی اور سجدہ کرنے کے قابل ٹھہرایا[2]،

علم و تعلیم اور تحصیل علم اور علما کے فضائل احادیث میں

حدیثوں میں بھی علم و علما کی بہت سی فضیلتیں بیان کی گئی ہیں، اور انھیں دین کی خاطر علم حاصل کرنے کی تلقین کی گئی ہے، بخاری میں ہے:۔

"اللہ جس کے ساتھ بھلائی چاہتا ہے، اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے[3]"،

عالم اور عابد کے موازنہ میں آپ نے فرمایا:۔

"عابد پر عالم کی فضیلت ایسی ہی ہے جیسے کہ مجھے تم میں سے سب سے معمولی آدمی پر فضیلت حاصل ہے[4]"

تحصیل علم کی فضیلت میں ارشاد ہے:۔

"جس شخص نے ایک راستہ علم کی طلب میں طے کیا، وہ جنت کے راستوں میں سے ایک

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۴۔ و تذکرۃ السامع ص ۵ و ۶، [2] تعلیم المتعلم ص ۰، [3] صحیح بخاری کتاب العلم جلد ۱ ص ۱۶
[4] ترمذی ص ۳۲۵،

راستہ پرچلا[1]"

امام غزالی اور ابن عبدالبر نے چند اور حدیثیں علم کی طلب کی فضیلت میں لکھی ہیں جن میں بعض بہت مشہور ہیں، جیسے طَلَبُ العِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ اور بہ روایت عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ یعنی علم کی طلب ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے، اسی طرح ارشاد ہے، :۔

"علم خزانے ہیں اور اون کی کنجی سوال ہے"،

فرمایا:۔

"جاہل کو سزاوار نہیں کہ اپنی جہالت پر خاموش (قانع) رہے، اور نہ عالم کو سزاوار ہے، کہ وہ اپنے علم کے باوجود خاموش رہے"،

حضرت ابو ذرؓ سے مروی ہے، کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"ایک عالم کی مجلس کی حاضری ایک ہزار رکعت نمازوں، ایک ہزار مریضوں کی عبادت اور ایک ہزار جنازوں کی شرکت سے افضل ہے"،

اس پر پوچھا گیا، کہ اور "قرآن مجید کی تلاوت سے"؟ تو آپ نے فرمایا:۔

"کیا قرآن علم کے بغیر نفع پہونچا سکتا ہے،؟"

آپ نے فرمایا:۔

"اگر کسی ایسے شخص کو موت آئی، جو ایسے علم کی طلب میں تھا جس سے اسلام کو زندگی عطا ہو تو اسکے اور رسولوں کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا"،

حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت آپ نے ان سے فرمایا:۔

"اگر تمھارے ذریعہ سے ایک شخص نے ہدایت پائی تو یہ تمھارے لئے دنیا و ما فیہا سے بہتر ہے"،

---

[1] بخاری جلد ۱ ص ۱۶ و ترمذی،

آپ نے فرمایا:۔

"جس نے علم کا ایک باب اس لئے پڑھا کہ لوگوں کو تعلیم دے تو اسے ستر صدیقین کا ثواب عطا ہوا"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا:۔

"کیا ہی عمدہ عطیہ اور عمدہ ہدیہ ہے حکمت کا ایک وہ کلمہ جسے تم نے سنا اور محفوظ رکھا پھر اسے اپنے بھائی تک پہونچایا، اسکا سکھانا مسنون عبادت کے برابر ہے"

آپ نے ایک مرتبہ فرمایا:۔

"میرے جانشینوں پر خدا کی رحمت ہو"

سوال کیا گیا کہ آپ کے جانشین کون ہیں؟ تو ارشاد ہوا:

"وہ لوگ جو میری سنت کو زندہ کریں گے، اور اللہ کے بندوں کو اسکی تعلیم دیں گے"[1]

آپ نے فرمایا:۔

"بندہ دین میں فہم حاصل کرنے سے زیادہ کسی دوسری چیز کی وجہ سے افضل نہیں، ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان کے لئے سخت ہوتا ہے"[2]

نیز فرمایا:۔

"قیامت کے دن تین گروہوں کے لوگ شفاعت کریں گے، انبیاء، پھر علماء، پھر شہداء"

اسی طرح روایت ہے:۔

"جس نے ایک عالم کی عزت کی، اوس نے ستر نبیوں کی عزت کی، اور جس نے ایک طالب علم

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۶ و ۷ ومختصر جامع بیان العلم ص ۹ تا ۱۲، [2] ترمذی ص ۳۲۴، وابن ماجہ ص ۲۰،

کی عزت کی، اس نے ستر شہیدوں کی توقیر کی؛

ایک روایت میں ہے:۔

"جس نے عالم کے پیچھے نماز پڑھی، اوس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی، اور جس نے نبی کے پیچھے نماز پڑھی اسے مغفرت حاصل ہوئی[1]؛"

علمار کی شان میں سب سے مشہور حدیث یہ ہے:۔

العلماء ورثة الانبياء،	علمار انبیار کے وارث ہیں،

علامہ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں، کہ اسے ابو داؤد، ترمذی، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہی، اور امام بخاری نے ترجمہ باب میں اسے جگہ دیکر اسکی صحت تسلیم کرلی ہی، اور اس کی تائید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:۔

ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتَابَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا[2]	پھر ہم نے کتاب ان لوگوں کے درمیان وراثت چھوڑی جنھیں ہم نے اپنے بندوں میں سے چُن لیا ہے،

نیز امام بخاری نے اس حدیث کو اپنی دوسری کتاب تاریخ کبیر میں متعدد سندوں سے نقل کیا ہے، اور ابو داؤد اور ابن ماجہ میں اسی مفہوم کی ایک دوسری روایت موجود ہے[3]،

علم اور تحصیلِ علم کی فضیلت میں صحابہ تابعین و علمائے اسلام کے آثار اور اقوال

علم اور علمار کی فضیلت میں صحابہ، تابعین، اور علمائے اسلام کے بہ کثرت آثار و اقوال مروی ہیں، حضرت معاذ بن جبل رض تحصیلِ علم کی تلقین کرتے ہوئے

---

[1] یہ حدیثیں ابن عبد البر نے جامع بیان العلم میں، امام غزالی نے احیار العلوم میں اور قاضی ابن جماعہ نے تذکرۃ السامع میں نقل کی ہیں، اور ان میں سے اکثر کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۴ کتاب العلم میں موجود ہیں، [2] فتح الباری جلد ا ص ۸۳ [3] حاشیہ تذکرۃ السامع ص ۶،

فرماتے ہیں:۔

"علم سکھاؤ اس لئے کہ علم کا سکھانا نیکی ہے، اور اس کا طلب کرنا عبادت ہے، اور اس کا مذاکرہ کرنا تسبیح اور اس پر بحث کرنا جہاد، اس کا خرچ کرنا تقرب الٰہی کا ذریعہ اور نہ جاننے والے کو بتانا صدقۂ جاریہ ہے۔"[1]

حضرت ابوذرؓ اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے:۔

"علم کا ایک باب جو ہم پڑھتے ہیں، وہ میرے نزدیک نفل کی ایک ہزار رکعتوں سے زیادہ پسندیدہ ہے، اور علم کے ایسے باب کا پڑھنا جس پر ہم عمل بھی نہ کرسکیں ؟ تو وہ بھی سو رکعتوں کے پڑھنے سے بہتر ہے۔"

حضرت ابن عمرؓ کا ارشاد ہے کہ

"فقہ کی ایک مجلس ساٹھ سال کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔"[2]

حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے حضرت کمیلؓ سے فرمایا:۔

"اے کمیل! علم دولت سے بہتر ہے، علم پاسبانی کرتا ہے، اور دولت کی پاسبانی تمھیں کرنی پڑتی ہے، اور علم حکمراں ہوتا ہے، اور دولت پر حکمرانی کیجاتی، اور دولت خرچ ہونے سے کم ہوتی ہے، اور علم خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے یہ اثر بھی منقول ہے کہ

"عالم روزہ دار، زاہد اور مجاہد سے افضل ہے، جب کوئی عالم وفات پاتا ہے، تو اسلام میں ایک روزن ہوجاتا ہے جو اسکے قائم مقام کے آنے کے بعد بند ہوتا ہے۔"

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ

---

[1] ابوداؤد جلد ۲ ص ۷۷، وابن ماجہ ص ۱۱، [2] دارقطنی و کنز العمال جلد ۵ ص ۲۰۸،

"حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کو علم، دولت، اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا، انھوں نے علم کو منتخب کیا، تو دولت وسلطنت بھی اس کے دامن سے وابستہ ہاتھ آئی"،

فتح موصلیؒ سے منقول ہے کہ انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ اگر مریض کھانے پینے اور دوا کھانے سے روک دیا جائے تو وہ مرنہ جائے گا؟ لوگوں نے اثبات میں جواب دیا تو انھوں نے فرمایا:

"یہی قلب کا حال ہے، اگر اسے تین دن علم وحکمت سے روک دیا جائے، تو وہ مردہ ہوجائیگا"

زبیر بن ابوبکر کہتے ہیں، کہ ان کے والد نے انھیں یہ نصیحت لکھ بھیجی کہ

"لازم ہے کہ تم علم کی طلب کرو، کیونکہ اگر تم فقیر ہوگئے، تو علم تمھاری دولت ہوگا، اور اگر تم مالدار ہوئے تو علم تمھارا حسن وجمال بنے گا"

ابن مبارک فرماتے ہیں:-

"مجھے اس شخص پر تعجب آتا ہے، جو علم حاصل نہیں کرتا، اس کے باوجود اپنے کو عزت کیئے جانے کا مستحق سمجھتا ہے"،

حضرت ابو درداؓ فرماتے ہیں:-

"اگر میں ایک مسئلہ کی تعلیم حاصل کروں تو یہ میرے نزدیک رات بھر نماز پڑھنے سے بہتر ہے"

حضرت عطاؒ فرماتے ہیں:-

"علم کی ایک مجلس لہو ولعب کی ستر مجلسوں کا کفارہ ادا کرتی ہے،

امام شافعی نے فرمایا:-

"علم کی تحصیل نفل پڑھنے سے افضل ہے"

ابن عبد الحکم کا بیان ہے، کہ وہ امام مالک کے پاس تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے، جب ظہر کی نماز کا وقت آیا، تو انھوں نے نماز میں جانے کے لئے اپنی کتابیں سمیٹیں، اس وقت امام مالک نے فرمایا:

"جس چیز کے لئے تم جس چیز کو چھوڑ کر اٹھا رہے ہو، وہ اس سے افضل نہیں اگر علم کی تحصیل کی نیت درست ہے[۱]"

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا:۔

"انسانوں کو خیر کی تعلیم دینے والے کے لئے ہر چیز دعا کرتی ہے، یہاں تک کہ مچھلی بھی سمندر میں دعا گوئی میں مصروف رہتی ہے"

بعض بزرگوں کا قول ہے:۔

"علماء زمانوں کے چراغ ہیں، ان میں سے ہر عالم اپنے اپنے زمانہ کے لئے روشنی ہے جس سے اسکے زمانہ کے لوگ روشنی حاصل کرتے ہیں"

حضرت عکرمہ سے مروی ہے، کہ انھوں نے ایک مرتبہ کہا کہ علم کی قیمت ہوتی ہے، پوچھا گیا وہ کیا ہے تو فرمایا:۔

"اسے اس شخص کو دو، جو اسے عمدہ طریقہ سے اٹھائے اور ضائع نہ کرے[۲]"

سفیان بن عیینہ کہتے ہیں:۔

"اللہ کے نزدیک عزت میں سب سے بڑھے ہوئے وہ ہیں، جو اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان ہیں، اور وہ انبیاء اور علماء ہیں"

نیز انھوں نے فرمایا،

"نبوت سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں، اور نبوت کے بعد علم کا درجہ ہے"

سہل کہتے ہیں:۔

"جو انبیاء کی مجلس دیکھنے کی آرزو رکھتا ہو، وہ علماء کی مجلسوں میں بیٹھے، ان کی مجلس انبیاء

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۵ تا ۶ [۲] ایضاً

کی مجالس کا نمونہ ہیں"

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:۔

اگر باعمل علماء، اللہ کے اولیا نہیں تو پھر اللہ کا کوئی ولی نہیں ہے"

امام سفیان ثوری اور امام شافعی سے منقول ہے، کہ

فرائض کی ادائی کے بعد علم کی طلب سے زیادہ افضل کوئی چیز نہیں"

قاضی ابن جماعہ ان آثار و اقوال کو نقل کرکے لکھتے ہیں، کہ ان سے یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے لئے علم میں مشغول رہنا نفل کی بدنی عبادتوں نماز، روزہ، تسبیح اور دعا وغیرہ سے بہتر ہے، کیونکہ اس کے علم کا نفع اس شخص کو حاصل ہونے کے علاوہ دوسرے لوگوں تک بھی پہونچے گا، اور جسمانی عبادتوں نفل نمازوں اور وظیفوں وغیرہ کا نفع صرف اسکی ذات تک محدود رہے گا، بلکہ عالم کے علم سے اس کی وفات کے بعد بھی نفع پہونچنا ممکن ہے، اور علامہ ابن عبد البر نے اس موقع پر اس حدیث سے بھی استدلال کیا ہے، کہ مرنے کے بعد سب کے عمل کا رشتہ ٹوٹ جاتا ہے سوائے تین قسم کی چیزوں کے ایک صدقہ جاریہ، دوسرے ایسا علم جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی نفع ہو، اور تیسرے صالح لڑکے جو اس کے حق میں بھلائی کی دعا کریں، لیکن عابد کی عبادت سے صرف اسکی ذات کو نفع پہونچتا ہے[۵]

اس بزرگی اور بڑائی کا مصداق بننے کے لئے بعض شرطیں، لیکن اسلام نے علم کی ان بزرگیوں اور عزتوں سے صرف ان علماء کو مشرف کیا ہے جو علم کے ساتھ اپنے دامن میں عمل کا ذخیرہ بھی رکھتے ہوں، چنانچہ قاضی ابن جماعہ علم اور علم والوں کی فضیلتیں بیان کرنے کے بعد علم حاصل کرنے والے کیلئے ذیل کی شرطیں لکھتے ہیں:

۱۔ علم اور علماء کی یہ فضیلتیں صرف ان لوگوں کے لئے ہیں، جو علم کیساتھ عمل کے زیور سے بھی آراستہ ہوں اور ان کے علم حاصل کرنے کا حقیقی مقصد اللہ تعالیٰ کی رضامندی حاصل کرنا ہو،

۵؎ تذکرۃ السامع ص ۱۳ و مختصر جامع بیان العلم ص ۱۴

۲۔ علم کی طلب کسی بری نیت سے نہ ہو،

۳۔ علم کی طلب میں دنیاوی غرضیں، جاہ، منزلت، دولت، ثروت، ناموری اور پیشوا بننے کی ہوس شامل نہ ہو، کیونکہ اسلام میں علم کے جہاں وہ فضائل گنائے گئے ہیں، اسی کیساتھ بری خواہشوں اور دنیاوی غرضوں سے بچنے کی سخت تاکید کی ہے،[۱] ترمذی کی روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا:۔

"جو شخص علم اس غرض سے حاصل کرے کہ وہ اسکے ذریعہ سے بیوقوفوں سے بحث ومباحثہ کرے یا اسکی طرف لوگ عقیدت سے جھکیں، تو اللہ اس شخص کو دوزخ میں داخل کریگا،"

دوسرے لفظوں میں ارشاد نبوی ہے:۔

"جس شخص نے علم خدا کے سوا کسی دوسرے کے لئے حاصل کیا، اور خدا کے علاوہ اس کی طلب میں کوئی دوسری غرض شامل رہی ہو، تو خدا جہنم میں اس کا ٹھکانا بنائے گا،"[۲]

اسی طرح آپ نے فرمایا:۔

"جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی مرضی حاصل کیجاتی ہے، اسلئے حاصل کیا کہ اس سے اپنی کوئی (دنیوی) غرض حاصل کرے تو وہ قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا،"[۳]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا،

پہلا شخص جسکا قیامت کے دن فیصلہ کیا جائے گا (ور راوی نے تینوں شخصوں کا ذکر کیا اور انمیں) وہ شخص ہے جس نے علم سیکھا اور اسکو سکھایا اور قرآن پڑھا، تو اسکو لایا جائیگا اور خدا اس پر اپنے احسانات جتائیگا اور وہ انکو تسلیم کریگا، پھر خدا کہے گا کہ تُنے اس کو کیا کام لیا، وہ کہے گا کہ میں نے تیرے لئے علم سیکھا اور سکھایا، تیرے لئے قرآن پڑھا، خدا کہے گا کہ تو جھوٹ کہتا ہے، تونے اسلئے علم سیکھا کہ یہ کہا جائے کہ تو عالم ہے، اور تونے قرآن اسلئے پڑھا کہ یہ کہا جائے کہ تو قاری ہے، پھر اسکے متعلق حکم دیا جائیگا اور وہ منہ کے بل گھسیٹتا ہوا لایا جائے گا، یہاں تک کہ آگ میں ڈال دیا جائے گا،[۴] (باقی)

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۳، [۲] ترمذی ص ۴۲۱، [۳] ابوداؤد جلد ۲ ص ۱۲۰، [۴] صحیح مسلم جلد ۲ ص ۱۴۰

تلخیص و تبصرہ

دنیاے فلسفہ

گذشتہ سال کئی ممتاز فلسفیوں کا انتقال ہوا، سر فریڈرک پولک نے ۹۱ سال کی عمر میں ۱۰ جنوری ۱۹۳۷ء کو اس دنیا کو خیرباد کہا، سر فریڈرک آکسفورڈ یونیورسٹی میں بیس سال تک قانونیات کا پروفیسر رہا، وہ قانون پر فلسفیانہ نظر رکھنے میں بہت ہی ممتاز تھا، اس موضوع پر اسکی کتابیں "خطباتِ آکسفورڈ" (Oxford Lectures - 1890 [illegible]) اور "قانونیات اور اخلاقیات پر مضامین" بہت ہی قابلِ قدر ہیں، خیالی فلسفہ میں اس کا نام اسکی تصنیف "اسپنوزا۔ اسکی سوانحِ حیات اور فلسفہ کے سبب زندہ جاوید رہے گا، پولک نے یہ کتاب ۱۸۸۰ء میں لکھی تھی، اس کے قبل انگریزی زبان میں اسپنوزا کے فلسفہ پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی تھی، اسی کتاب کی بدولت اسپنوزا کے فلسفہ سے اہلِ انگلستان کی دلچسپی بڑھی، یہ کتاب اس لئے بھی ایک کارنامہ کہی جاسکتی ہے کہ مصنف نے اسپنوزا کی تحریروں سے براہ راست استفادہ کیا ہے، اور اس کے فلسفہ کی جو تفسیر و تشریح فرانسیسی، جرمن اور ڈچ شارحین نے کی ہے، ان کو ملحوظ رکھا ہے، بعد کے بعض شارحین نے پولک کے استدلال سے اختلاف ضرور کیا ہے، لیکن سبھوں نے اسکی کتاب سے استفادہ کرنے پر تشکر و امتنان بھی ظاہر کیا ہے۔

۶ر اگست ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر اف، سی، اس، شیلر کا لوس انجلیس میں ۷۳ سال کی عمر میں انتقال ہوا، وہ قلم کا بڑا دھنی تھا، مسلسل پچاس برس تک مضامین اور مستقل تصانیف لکھتا رہا، گرین کے انتقال کے بعد آکسفورڈ میں اسکی تعلیمی زندگی شروع ہوئی، لیکن وہ ابتدا ہی سے گرین کے طریقۂ فکر و نظر کا مخالف تھا، اپنی سب سے

پہلی تصنیف "ابوالہول کا معمہ" (Riddle of the sphinx) ہے جو ۱۸۹۱ء میں شائع ہوئی اور جس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے تاثرات تھے، اس نے ایک نظریہ پیش کیا جو کل سے ملتا جلتا ہوا تھا کہ خدا ایک متناہی ذات ہے جو دنیا میں بطور ایک فعّال کے داخل و ساری ہے لیکن اصلی شخصیت کے لحاظ سے ماوراء مارج طاری ہے، اپنے ایک دوسرے مضمون "براہین اوّلیہ بحیثیت اصول موضوعہ" (Axioms as postulates) میں سب سے پہلے اس نے اس چیز کا خاکہ پیش کیا، جس کو اس نے ولیم جیمس کی تقلید میں (Pragmatism) اور بعد میں (Humanism) کہا، اس مضمون میں اس نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے تجربہ کی دنیا بنی بنائی معطیات نہیں، بلکہ انسانوں کے تجربوں اور آزمائشوں کی ایک تعبیر ہے، ہمارے نئے نئے تجربے واقعات کو برابر بدلتے رہتے ہیں، اور اس تعبیر میں جو اصول ابتداء میں کارفرما ہوتا ہے، وہ "مطالبہ" ہے جس کا انحصار ہمارے تجربات یا معطیات پر ہے، اور پھر انہی کی جانچ پڑتال سے بعض تو براہین اوّلیہ بن آجاتے ہیں، اور بعض بالکل نظرانداز ہو جاتے ہیں، (Humanism) سے شیلر کا مقصد موجودہ طرز کے منطقیانہ خیالات کی اصلاح تھی، اس کے لئے اس نے بہت سی کتابیں بھی لکھیں، اپنی کتاب "رسمی منطق" (Formal Logic) میں اس نے روایاتی منطق پر سخت نکتہ چینیاں کی ہیں، دوسری کتاب "منطق برائے استعمال" (Logic for use) میں اس نے ثبوت کے بجائے "کشف و تحقیق" کی منطق پیش کی، اس کی دوسری تصنیفات (Studies in Humanism, Humanism) اور افلاطون (Plato) ہیں،

ایک تیسری المناک موت پروفیسر جے، ال، اسٹاکس کی ہے، جو ۷۰ برس کی عمر میں ۱۳ر جون کو فوت ہوا، پروفیسر موصوف اسی سال کے شروع میں لیورپول یونیورسٹی کا وائس چانسلر مقرر ہوا تھا، وہ یونانی فلسفہ کا بڑا ماہر تھا، اس نے ۱۹۲۲ء میں ارسطو کی کتاب (De Coelo) کا ترجمہ کیا تھا، جو آکسفورڈ ایڈیشن کے تصنیفاتِ ارسطو کے مجموعہ کے ساتھ شائع ہوا، اس نے اس ترجمہ کیساتھ جو حواشی اضافہ کئے

ہیں، وہ ارسطو کے فلسفہ سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لئے بہت ہی مفید اور قیمتی ہیں ۱۹۲۵ء میں اس کی ایک مختصر کتاب (Aristotelianism) کے عنوان سے نکلی جس میں اُس نے ارسطو کی تصنیفات اور فلسفیانہ تعلیم کا ایک بہت ہی قابل تعریف، واضح اور دلچسپ بیان پیش کیا ہے، اس نے اپنے مخصوص واضح طرز میں ایپیکورس اور اس کے مقلدین کے الفاظ و اصطلاحات کی بھی تحقیقات کی ہے، جو لڈل اور اسکاٹ کے یونانی لغت میں شامل کر لی گئی ہیں، ۱۹۲۴ء میں وہ منچسٹر یونیورسٹی میں فلسفہ کے شعبہ کا صدر مقرر ہوا، اور اسی سال "بزم ارسطو" (Aristotelian Society) کا رکن بنایا گیا، جس کی روداد میں اس نے بہت سے عالمانہ مقالات لکھے ۱۹۳۵-۳۶ء میں اس بزم کی صدارت اسکو تفویض ہوئی، ۱۹۳۳ء میں ڈرہم یونیورسٹی میں اس نے "مذہبی اعتقادات کی نوعیت اور فطرت" کے عنوان سے توسیعی خطبات بھی دیئے اس کی آخری تصنیف "مقصد کے حدود، اور دیگر مضامین" کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی،

پروفیسر ایلی ہیلیوی کی موت بھی افسوسناک ہے، ۶۶ برس کی عمر میں ۲۱ راگست کو اس دنیا کو خیرباد کہا، وہ ایک فرانسیسی فلسفیانہ رسالہ کا مدیر تھا، اور انگریزی تاریخ اور ادب میں بڑی بصیرت رکھتا تھا، اس کی تاریخ "انگلستان محاربات نپولین کے بعد" بہت اہم تصنیف سمجھی جاتی ہے، اس نے فرانسیسی میں (La Formation du radicalisme philosophique) تین جلدوں میں لکھی ہے، جن سے بنتھم کے فلسفہ سے انگلستان اور فرانس میں از سر نو دلچسپی پیدا ہوگئی،

گذشتہ سال فلسفہ کی نوعیت اور مقصد پر بعض دلچسپ مباحثے ہوئے، اس سلسلہ میں پروفیسر اے، ای، ٹیلر نے "رسالہ فلسفہ" جنوری ۱۹۳۷ء کے ایک مضمون میں اپنا خیال اس طرح ظاہر کیا ہے، کہ "سچے فلسفی کی اصلی خصوصیت متناہی چیزوں سے تعلق ہے، اس میں متناہیت کا صحیح مذاق، متناہی اور دنیاوی چیزوں کی فطرت کو اور ان کے غیر متناہی اور ابدی چیزوں سے تعلق کو پورے طور سے پہچاننے کا صحیح ذوق

ہوتا ہی، ذہنی نظام کی حیثیت سے فلسفہ صورت کے نظام ترتیب کی تفصیل کا مظاہرہ اور امتحانی وجود کو اپنی مناسب جگہوں پر متعین کرنے کا ذریعہ ہے،

پروفیسر ڈبلیو، ٹی سٹیس نے اسی رسالہ کی جون کی اشاعت میں "انسانی تہذیب وتمدن میں فلسفہ کی جگہ" کے عنوان سے لکھا ہی کہ فلسفہ کی یہ کوشش ہوتی ہے، کہ معلومات کو ان کے آخری اصولوں کی طرف واپس لیجائے، وہ ان بنیادی اور آخری مسائل پر غور کرتا ہے، جو مذہب، اخلاق، سائنس، آرٹ اور ذوق سلیم سے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں، فلسفہ محض خیالات کی ایک ایسی قسم ہے، جس سے انسان اپنے معلومات کی ہر شاخ کے متعلق غور وفکر کر سکتا ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ وہ ہر مضمون کی بنیاد ہے، اور ساری انسانی تہذیب وتمدن سے متعلق ہے، اسی لئے یہ ایک مکمل تعلیم کا جزو لازم ہے،

مسٹر گلبرٹ اسی رسالہ کے جولائی نمبر میں فلسفہ کی حمایت کرتے ہوئے لکھتا ہے، کہ فلسفہ میں "ازم" کوئی معنی نہیں رکھتا، اگر فلسفہ میں کسی اصول کا سوال پیدا ہوتا ہو تو لائق فلسفیوں کا فرض ہے کہ وہ اس اصول نظریہ کی حمایت اور مخالفت کے براہین و دلائل کو یکساں طور پر پیش، ایک سنجیدہ فلسفی کی متانت کا یہی اقتضا ہے، کہ عالم امثالیت (Idealism) منطقیانہ ایجابیت (Logical positivism) اور "طام ازم" کے موافق اور مخالف دلائل کو سنے اور اُن پر غور کرے، فلسفہ کے مذہب میں ایمان وراسخ العقیدگی کفر ہے، ہر جدید فلسفیانہ نقطۂ نظر کے لئے ایک "ازم" قائم کر دینا لغو اور مہمل ہی، اس میں شک نہیں، کہ طرز خیالات کی تاریخ کو واضح کرنے کے لئے اصطلاحات کا استعمال ضروری ہے، لیکن ایسے اصطلاحات جتنے بھی کم استعمال کئے جائیں زیادہ بہتر ہے،

ڈاکٹر اچ گوٹ استاذ بیل یونیورسٹی نے "افلاطون کا تخیل فلسفہ" کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے جس میں اس نے فلسفہ کے اغراض و مقاصد کے متعلق افلاطون کا تخیل پیش کیا ہی، یہ کتاب فاضلانہ ہی اور نہ صرف فلسفہ کے طلبہ بلکہ عام پڑھنے والوں کے لئے بھی دلچسپ ہے، وہ لکھتا ہے کہ "افلاطونیت محض نتائج

کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک خاص طرز زندگی ہے، یہ جہالت کے خلاف ایک عظیم الشان مذہبی جنگ ہے" اس نے افلاطونیت کے چار خصوصیات بتائے ہیں، ایک یہ کہ فلسفہ سچائی کی پرستش کرنا سکھاتا ہے، چنانچہ ذات کا مرکز؟ مقام یہی سچائی ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ فلسفہ ہر انسان کے لئے نہیں، بلکہ چند افراد کیساتھ مخصوص ہے، تیسرے یہ کہ فلسفہ کے معنی "سچائی کا اقتدار ہے" اس لئے ایک فلسفی کا سب سے اہم فرض یہ ہو کہ وہ اسی حیثیت سے اپنی سیرت کو برقرار رکھے، خواہ دنیاوی زندگی میں اس کے نتائج کیسے ہی مترتب ہوں، چوتھے یہ کہ جب ایک افلاطونی سچائی کا پابند ہو جاتا ہے تو وہ گویا اپنی زندگی کا حلیف ہو جاتا ہے،

پروفیسر جی سی فیلڈ نے "تعلیم فلسفہ" پر ایک تقریر میں کہا کہ مجھکو بڑا ہی اطمینان حاصل ہوگا، اگر طلبہ میرے شعبہ سے نکل کر فلسفہ کے فن کو غور نہ کریں، لیکن اور دوسرے تمام مضامین کو فلسفیانہ طرز پر غور کریں، فلسفہ کی تعلیم کا مقصد یہی ہے، کہ لوگ اپنے اعتقادات اور خیالات کو سوچیں اور انکے متولوں پر ناقدانہ نظر رکھیں"

مذہب پر بھی بعض دلچسپ فلسفیانہ مباحث ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر برونر نے یہ خیالات ظاہر کئے ہیں، کہ خدا کے وجود کے احساس کا آغاز مذہبی خیالات سے نہیں ہوتا ہے، اگر ہم صرف مذہبی خیالات کو پیش نظر رکھیں، تو ہماری نظروں میں خدا کا وجود ہمیشہ مشکوک رہے گا، اگر خدا تخیل سے زیادہ کوئی چیز ہے، یا ایک وجودی روحانی حقیقت ہے، تو پھر اس کے وجود کا احساس ہم کو اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ ہم سے براہ راست گفتگو کرے"، پروفیسر موصوف کا خیال ہے، کہ خدا ہم سے براہ راست گفتگو کرتا ہے وہ ہم سے ملتا بھی ہے، اس کی گفتگو انجیل ہے، اور اسکی ملاقات حضرت مسیح کی روح جو انسان کے دل میں جاگزین ہے، مگر پروفیسر ڈاوس ہکس اس پر یہ اعتراض کرتا ہے، کہ انجیل خدا کی گفتگو کیونکر قرار دیا جا سکتی ہے جب کہ یہ "غلطیوں، متضاد باتوں، اور انسان، فطرت اور تاریخ کے بہت سے واقعات وحالات سے متعلق گمراہ کن غلط نظریوں سے بھری ہوئی ہے"، پھر بائبل میں یہ بھی ہے، کہ خدا ایسی بات کو جسے ایک زمانہ میں کہہ چکا ہے، مومن کے دل میں تاریخ کے مابعد عہد میں پھر کہے گا"

ڈاکٹر ہیوبرٹ بوکس نے ایک کتاب "خدا اور جدید ذہنیت" میں ایک دوسرے قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں، اس میں ڈاکٹر موصوف نے پہلے مذہب کے متعلق بہت سے جدید مفکروں کی رائے پیش کرکے ان کو سینٹ طامس اکیوناز کے اصولوں پر جانچنے کی کوشش کی ہے، اور اکیوناز کے اصولوں پر بحث کرتے ہوئے یہ ثابت کیا ہے کہ خدا واحد ہے، غیر مخلوق ہے، غیر متغیر ہے، متناہی ہے، مطلق ہے، خدا میں عرض اور جوہر ساتھ ساتھ ہیں، خدا نے اپنے وجود کو نہ خود بنایا، اور نہ کسی دوسرے سے بنوایا، اس کا وجود فطری اور لازمی ہے" یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن یہ کتاب اسلئے قابلِ قدر ہے کہ اس میں ازمنہ وسطیٰ کے مفکروں کے بعض اہم خیالات کو جدید روشنی میں پیش کرکے قابلِ قبول بنانے کی کوشش کی گئی ہے،

موجودہ دور میں افلاطون (Plato Today) کے نام سے کراسمین (آکسفورڈ یونیورسٹی) نے ایک نہایت ہی دلچسپ کتاب لکھی ہے، جس میں افلاطون کے تخیل اور نظریوں کی روشنی میں تمام مسائلِ حاضرہ پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے، افلاطون کا فلسفہ ایک ایسا طرز زندگی سمجھا جاتا ہے، جس کا انحصار ذہنی سچائی پر ہے، افلاطون ایک انقلاب آفرین شخص اور فلسفی تھا، اور انسانی زندگی کی خرابیوں اور برائیوں سے بہت متاثر تھا، اسی لئے اس نے ہیئتِ اجتماعیہ اور اس کے افراد کو تاریکی سے نکال کر ذہنی روشنی میں لانا اپنا مقصدِ زندگی بنالیا تھا، لیکن کیا اس کا تخیل ہر زمانہ اور ہر فرد کے لئے موزوں ہو سکتا ہے؟ اسی سوال کو پیشِ نظر رکھ کر کراسمین نے مذکورۂ بالا کتاب لکھی ہے،

اس کتاب کے پہلے چار ابواب میں افلاطون کے نظریہ کی تشریح ہے، باقی پانچ بابوں میں مؤلف نے مسائلِ حاضرہ مثلاً جمہوریت، اشتراکیت، فاشزم، تعلیم، خاندانی زندگی وغیرہ افلاطون کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کئے ہیں، اس سلسلہ میں وہ عورتوں کی آزادی کے متعلق لکھتا ہے کہ "اس وقت ہم لوگ ایک المناک مغالطہ میں ہیں، اگر عورتیں آزاد ہو کر ہر حیثیت سے مردوں کی مدمقابل سمجھی جانے لگیں، تو جنسی خصوصیات خصوصاً مسئلہ ازدواج کو نظر انداز کرنا پڑے گا، لیکن اگر ہم متاہل زندگی کو اہمیت دیتے ہیں، اور صنفی جبلت کو

اپنے سے دور نہیں کر سکتے، تو پھر عورتوں کو مردوں کا مد مقابل بننے کے دعویٰ سے دست بردار ہونے پڑے گا، اور اپنی زندگی کی اہم غرض صرف مردوں کا شریک زندگی ہونا قرار دینا پڑے گا....... افلاطون کی نظر میں اس کشمکش سے بچنے کی صورت یہ ہے کہ کچھ مرد اور عورتین بلند اخلاق کا نمونہ پیش کرتی ہین، گو سب نہیں، اسلئے ایک ایسا قانونی نظام بنانا چاہئے جس میں کچھ قوانین طبقۂ خواص کے لئے ہوں، اور کچھ عوام کے لئے، مگر کیا یہ ممکن ہے؟ شاید نہیں، روس نے صنفی آزادی دے کر تجربہ کیا تھا، لیکن وہ ناکام ثابت ہوا، عوام نے اس کا جائز استعمال نہیں کیا، اب گذشتہ دو سال سے روس ایک نئے معاشرتی اخلاق کے لئے قوانین وضع کر رہا ہے"

سب سے فاضلانہ باب "افلاطون کی نظر اشتراکیت پر" ہے، ایک راسخ العقیدہ اشتمالی تو افلاطونیت کو اسی نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے، جس طرح عیسائیت کو دیکھ چکا ہے، لیکن اشتمالیت اور افلاطونیت میں ایک اشتراک ضرور ہے، افلاطون کا نظریہ ہے کہ ایک فلسفی بادشاہ ہو سکتا ہے لینن جسکی اہم مثال ہے، کراسمین کا خیال ہے کہ اگر افلاطون موجودہ دنیا کی اصلاح کی کوشش کرتا تو اپنے عہد کی طرح آج بھی ناکامیاب ہوتا، اس کا خواب کہ "ایک ذہنی سربرآوردہ گروہ کو فرمانروائی کے تمام اختیارات سپرد کر دیئے جائیں" محض خواب ہی رہتا ہے، کیونکہ یہ صورت لامحالہ جماعتی استبداد میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور جماعت کی مدافعت اور حفاظت میں سچائی ایک شریفانہ جھوٹ میں بدل جاتی ہے،

اپنی تمام نکتہ چینیوں کے باوجود کراسمین افلاطون کو ایک بہت بڑا سیاسی مفکر سمجھتا ہے، ایک جگہ لکھتا ہے، "میرے تمام اعتراضات اپنی جگہ پر صحیح ہیں لیکن اس کے باوجود میں افلاطون کی "جمہوریت" (Republic) کو سیاسی فلسفہ کی اہم ترین کتاب سمجھتا ہون، اگرچہ میں اسکو جتنا زیادہ پڑھتا ہون اتنی ہی زیادہ مجھکو اس سے نفرت پیدا ہونے لگتی ہے، لیکن پھر بھی میں اسکو بار بار پڑھنے پر مجبور ہون، کیونکہ اسی میں اصلی فلسفہ پاتا ہون، یہ عقلی مباحثوں سے سچائی کی حد تک پہونچنا چاہتی ہے، اور ایک غیر جانب دار تحقیق کا نمونہ ہے، وہ اپنے پڑھنے والوں کو نہ مرعوب اور نہ کسی فریب میں مبتلا کرنا چاہتی ہے

اور نہ ان کے جذبات برانگیختہ کرکے ان کو گمراہ کرتی ہے، بلکہ ان کو اپنے مصنف ہی کے جیسا فلسفی سمجھتی ہے، جنکی زندگی کا واحد مقصد صرف تلاش حق ہوتا ہے،

کراسمین کے خیالات افلاطون کے متعلق خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ایک بات غور طلب یہ ہے کہ کیا افلاطون کے یہاں موجودہ دنیا کے لئے کوئی پیام نہیں ہے، ہو ضرور ہے لیکن اس کا پیام حکومت کے پیچ پیچ نظام کے لئے نہیں، بلکہ اس کے مابعد الطبیعاتی تخیل کی اسپرٹ میں ہے، جس کو وہ عمل میں لاکر ایک نئی دنیا بنانا چاہتا تھا، اگر افلاطون موجودہ دور میں پیدا ہوا ہوتا تو وہ ہماری بڑھتی ہوئی مادیت پر ہماری سائنس، ہمارے آرٹ، فلسفہ، سیاست، خیالات، واعتقادات اور یقینیات پر اسی شدت کے ساتھ نکتہ چینیاں کرتا جس طرح کہ اپنے عہد کی برائیوں اور خرابیوں پر کی تھیں، اور ہم کو نجات دلانے کے لئے تغیر پذیر چیزوں سے دور ایک غیر متغیر حقیقت کی طرف، زمانہ سے دور دوام کی طرف اور کثرت سے دور وحدت کی طرف لیجاتا یہی اس کا اصلی فلسفہ ہے، اور اسی میں اس کا پیام ہے، جو نہ صرف ہر ملک اور ہر قوم بلکہ ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانہ کے لئے یکساں موزوں ہے،

(ہیبرٹ جرنل اکتوبر ۱۹۳۶ء)

"ص ع"

الکلام

مولینا شبلی مرحوم کی مشہور تصنیف، جدید علم کلام جس میں عقلی دلائل سے مذہب کو فلسفہ کے مقابلہ میں ثابت کیا ہے، اور ملاحدہ اور منکرین کے دلائل کا رد کیا ہے، اور عقائد واصول اسلامی کی فلسفیانہ تشریح، طبع سوم مطبوعہ معارف پریس، ضخامت ۲۷۵ صفحے، قیمت عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

غیر محدود کائنات

الٰہ آباد یونیورسٹی کی طلائی جوبلی کے موقع پر ڈاکٹر شاہ محمد سلیمان نے "غیر محدود کائنات" پر ایک محققانہ لکچر میں فرمایا، کہ "انسان جس نے اس کرۂ زمین کی زندگی کی ایک نہایت ہی قلیل مدت ابھی گذاری ہے، اب تک فطرت کی غیر محدود وسعت پر محض قیاس آرائیاں کرتا رہا ہے، اور حقیقت کی تلاش میں صرف تاریکی میں سرگرداں ہے، اس نے قیاسات بھی کئے تو غلط، اور ادھورے، نئے نئے تجربات سے اسکو اپنی غلطیاں بھی ضرور معلوم ہوتی رہیں، اور وہ نئے نئے قیاسات بھی کرتا رہا، لیکن فطرت کی کنہ اب تک اسکی دسترس سے باہر ہے، کائنات کی گہرائی کو جاننے کی بھی اس قسم کی کوشش ہوتی رہی ہے، گیلیلیو کے زمانہ سے اب تک نہایت ہی طاقتور دوربینیں بن گئی ہیں، لیکن فضا کی گہرائی اب تک نہیں معلوم ہو سکی ہے، انسان اپنی بصیرت کی مصنوعی ترقیوں کے ذریعہ سے فضا کی گہرائیوں کو دیکھنے میں کچھ ضرور کامیاب ہوا ہے، لیکن ابھی تک اسکی حد کو نہیں پہونچ سکا ہے، کیونکہ وہاں تک پہونچنا انسانی طاقت سے باہر ہے، اس میں شبہ نہیں کہ انسانی معلومات میں عظیم الشان ترقیاں ہو چکی ہیں، لیکن یہ معلومات ابھی تک اپنے ابتدائی دور میں ہیں جس طرح اسکی بصیرت ایک تنگ دائرہ میں محدود ہے، اور وہ ان اشیاء کو جو ایک مقررہ شکل و صورت سے بھی چھوٹی ہیں، یا ان اجسام کو جو ان کی دیکھی ہوئی حد سے دور تر ہیں نہیں دیکھ سکتا، اسی طرح اس کی معلومات بھی ایک تنگ دائرہ میں محدود ہیں، گذشتہ صدی میں سائنسدانوں کی تحقیق و تدقیق سے وہ چھوٹے چھوٹے ذرات جو نامعلوم تھے،

انسانی مشاہدہ میں آگئے ہیں، مثلاً اب مادہ کی ماہیت یہ سمجھی جاتی ہے، کہ اس میں سالمے ہیں، جو ایسے ذرات پر مشتمل ہیں، جو مرکزہ (nucleus) رکھتے ہیں جن کے گرد ایک برقیہ گھومتی رہتی ہے، اس برقیہ کا مشاہدہ کرنا ناممکن ہے، کیونکہ یہ ایک سنٹی میٹر کا پانچ کروڑواں حصہ ہے، اور ایک سکنڈ میں اربوں دفعہ مرکزہ کے گرد گھومتی رہتی ہے، اگر یہ بھی معلوم کر لیا جائے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اندرونی دنیا کی یہی حد ہے، ممکن ہے اس کے اندر بھی بہت سی چھوٹی چھوٹی دنیائیں آباد ہوں،

انسان تو اس دنیا کی ایک نہایت ہی حقیر مخلوق ہے، یہ زمین جس پر کہ وہ آباد ہے، پچیس ہزار میل کے احاطہ کا ایک عظیم الشان کرہ ہے، لیکن آفتاب کے مقابلہ میں کتنی حقیر چیز ہے، کیونکہ اول الذکر زمین سے ۱۳ لاکھ گنا زیادہ بڑا ہے، اور پھر یہی عظیم الجرم آفتاب کائنات کا ایک نہایت ہی حقیر ذرہ ہو جاتا ہے، اتنا حقیر جتنا ایک غیر محدود سمندر میں ایک قطرہ، کہکشان کا قطر اتنا بڑا ہے کہ اسکی روشنی اپنی انتہائی سرعت کے باوجود ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہونچنے میں دو لاکھ بائیس ہزار سال کی مدت لیتی ہے، اس کہکشان سے ماورا کروروں کہکشاں اور ہیں، جو ۱۰۰ انچ والی خوردبین سے دکھائی دیدیتی ہیں، قیاس کیا جاتا ہے کہ یہاں سے دنیا تک روشنی پہونچنے میں چودہ کرور برس لگیں گے، امریکہ کے سائنسدانوں نے ایک ایسی دوربین تیار کی ہے کہ جس کا قطر ۲۰۰ انچ ہے، گو ابھی یہ استعمال میں نہیں آئی ہے، مگر یہ آنکھوں سے دس لاکھ گنی زیادہ روشنی پیدا کرتی ہے، اور سائنسدانوں کو امید ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ دور دراز آسمانی نظام کا مشاہدہ کر سکیں گے، لیکن وہ کتنی ہی دور تک کیوں نہ دیکھ سکیں، کائنات کے متعلق معلومات پھر بھی نامکمل رہیں گی،

کائنات کی لمبائی اور چوڑائی کی پیمایش کرنا ایک فعل عبث ہوگا، انسان کو اپنی لاچاری محسوس کر کے اعتراف کر لینا چاہئے، کہ اس میں اتنی قوت نہیں کہ وہ کائنات کا احاطہ کر سکے، یہ تو پھر بھی ایک عظیم الشان مسئلہ ہے، آفتاب ماہتاب اور ستاروں کی حرکت ہی اب تک ایک معمہ بنی ہوئی ہے، کتنے نظریے قائم کئے گئے اور کتنے رد کئے گئے، اور انسان ان کے متعلق کوئی صحیح رائے قائم نہ کر سکا، لیکن ان محققوں کی کوشش قابل

تحسین ہے، جو اپنی مخلصانہ تحقیقات سے انسانی معلومات میں اضافہ کر رہے ہیں، اور جن کے نظریے گو اصل حقیقت تک پہونچنے سے قاصر ہیں، اور رہیں گے، تاہم انسانی تمدن ان کے مزید معلومات کا ممنون ہوتا رہے گا،

سمندر کی گہرائیوں میں

بحری سفر کا ماہر ولیم بیب پھر ایک نئے سفر پر نکلا ہے، وہ میکسیکو اور متوسط امریکہ کے ساحل پر سفر کرتا ہوا، پناما تک جائے گا، اس کی خاص توجہ وہیل مچھلیوں کی طرف ہے، وہ ان کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، اور بحر منجمد اور اوقیانوس کی مچھلیوں میں جو یگانگت پائی جاتی ہے، اس پر بھی غور کر رہا ہے، لیکن اس مرتبہ وہ خاص طور سے سمندر کے پانی کی سطح سے ایک میل نیچے کے جانوروں اور پودوں کی تحقیقات کرے گا، اور اسکے رفقائے سفر سمندر کے زیریں حصے کے ٹیلوں، پہاڑیوں اور آبشاروں کے متعلق معلومات حاصل کرین گے، ابھی حال میں برطانی نوآبادیات کے دفتر کا ایک جہاز پچاس ہزار میل کا بحری سفر کر کے دو سال کے بعد واپس آیا ہے، اس کے جہازراں سمندر سے تین میل نیچے کی گہرائیوں کے جانوروں، پودوں اور وہاں کی حرارت اور موجوں کی لہروں کے باضابطہ نقشے تیار کر کے لائے ہیں،

اس سلسلہ میں اہل سائنس کو جس چیز کے متعلق دلچسپ معلومات حاصل ہوئی ہیں، وہ سمندر کے اندر دبے ہوئے آبشار اور وہ مادے ہیں جو سمندر کی تہ کو ڈھکے ہوتے ہیں، ایسے سیکڑوں آبشار معلوم ہوئے ہیں، جو سمندر کے اندر ہی نکل کر بہتے رہتے ہین، اس میں زیادہ مشہور دریائے ہڈسن کا آبشار ہے، جو نیویارک کی بندرگاہ سے بہہ کر سمندر تک پہونچتا ہے، اسی طرح نیوانگلینڈ کے ساحل سے دور تیس آبشار ہین، جنوبی کلیفورنیا، جزیرہ وینکوور، اور جزیرہ ہوائی کے پاس بھی ایسے آبشار بہت ہین، ان میں بعض تو ایک میل گہرے ہیں،

سمندر کی تہ میں جو مادے ہیں، اس کے متعلق معلوم ہوا ہے، کہ ساحل سے نیچے کی طرف کی گہرائی میں پہلے ریت ملتی ہے، یہ ریت آگے چل کر کیچڑ ہو جاتی ہے، اور پھر کیچڑ سے بخارات پیدا ہوتے ہیں،

یہ بخارات سرخ مٹی میں تبدیل ہو جاتے ہیں، یہ کیچڑ اور بخارات کہاں سے آتے ہیں، یا کیسے بنتے ہیں، ان کے متعلق ابھی صحیح معلومات نہیں مل سکی ہیں، لیکن جو کریب کو کچھ پتہ چل سکے،

قدیم مختصر نویسی

۴۰۰ سال قبل مسیح مختصر، تیز اور مخفی تحریروں کی ضرورت ایسی ہی اہم تھی جیسی آج ہے، زینوفن اپنے استاد سقراط کے پاس بیٹھکر اس کے ملفوظات لکھنے میں مصروف رہتا تھا، وہ موم کی تختیوں اور ہڈیوں پر مخفی نشانات بنایا جاتا تھا، سسرو کی معرکۃ الآرا تقریریں اسی مختصر نویسی کی مدد سے ہم لوگوں تک پہونچی ہیں قدیم روم میں جہاں مقرروں کی تعداد بکثرت تھی، مختصر نویسی عام طور سے رائج تھی،

مختصر نویسی کی باضابطہ ایجاد ۶۳ء قبل مسیح میں مارکس ٹولیس ٹی رو نے کی، جو سیسرو کا دوست تھا، ٹی رو کی مختصر نویسی میں ہر لفظ کا صرف ابتدائی حرف ہوتا تھا، اس کے لئے اس نے الگ الگ نشانات مقرر کئے گو ہزاروں الفاظ کے لئے الگ الگ حروف ذہن نشین کرنا بہت ہی مشکل کام تھا، لیکن اس کے باوجود اسکی تعلیم اسکولوں میں ہوتی تھی، اور اسکو شہنشاہ وقت بھی سیکھتا تھا، اس کا استعمال کئی صدیوں تک رہا،

ٹی رو سے بھی بہت پہلے یونانیوں میں بھی مختصر نویسی پھیلی ہوئی تھی، اس کے نمونے روم، پیرس اور لندن کے عجائب خانوں میں اب تک موجود ہیں، زینوفن اور ٹی رو کی مختصر نویسی کاغذ پر نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ موم کی تختیوں پر ہڈیوں سے لکھتے تھے، جولیس سیزر بھی اپنے ساتھ مختصر نویسوں کا ایک گروہ رکھتا تھا جو موم کی تختیاں لئے اس کے پاس بیٹھے رہتے تھے، جب لکھنے والے کی ایک تختی ختم ہو جاتی، تو سیزر دوسرے کو مخاطب کرتا تھا، جب سیزر اپنی گفتگو یا تقریریں ختم کر چکتا، تو یہ دوسری تختیوں یا چمڑوں پر نقل کر لی جاتیں، اس کو نقل کرنے میں سیزر کے سکریٹری تمام دن لگے رہتے، حالانکہ آج کل کے ٹائپسٹ اسی کام کی مقدار کو چند گھنٹوں میں انجام دیسکتے ہیں،

"ص، ع"

باب التقریظ والانتقاد

نئے رسالے اور اخبار

ماہانہ رسالے

سب رس مرتبہ صاحبزادہ میر محمد علی خان صاحب میکش، تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ حیدرآباد کے لئے للعہ شاہی عہ فی پرچہ ۳ بیرون حیدرآباد کے لئے آٹھ آنے زائد، پتہ دفتر سب رس رفعت منزل خیرت آباد حیدرآباد دکن،

یہ رسالہ آغاز ۱۳۵۷ھ سے نکلا ہے، حیدرآباد کی مشہور ادبی مجلس "ادارۂ ادبیات اردو" کا جو متعدد مفید کتابیں شائع کر چکی ہے، ترجمان ہے، اس کا مقصد ہر استعداد ہر ذوق اور ہر صنف کے ہندوستانی خوانون میں اسکے مطالعہ کی توسیع اور ان کے لئے دل پسند سامانِ مطالعہ فراہم کرنا ہے، اس لئے مضامین میں تنوع، رنگارنگی اور زبان کی سہولت کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے جسے ہر استعداد کے مرد عورتین اور بچے یکسان دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہین، لیکن غالباً عجلت کی وجہ سے پہلے نمبر کے مضامین کیفیت اور افادہ کے اعتبار سے ابھی تشنہ ہین، لیکن امید ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب زور قادری کی سرپرستی میں آیندہ نمبرں میں یہ کمی پوری ہو جائے گی، اور سب رس نہ صرف اپنے مقصد کے اعتبار سے بلکہ مضامین کے معیار کے اعتبار سے بھی حیدرآباد کے ممتاز رسائل میں آجائے گا،

نیسان مرتبہ پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت فی پرچہ آٹھ آنہ، پتہ اردو ایسوسی ایشن الہ آباد یونیورسٹی،

یہ رسالہ اردو ایسوسی ایشن الہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے نکلتا ہے، کئی مہینہ ہوئے اس کا ایک نمبر ہمیں ریویو کے لئے موصول ہوا تھا، اس میں نہ مہینہ کی تصریح ہے نہ سالانہ قیمت رقم ہے، اسلئے اسکی اشاعت میں نظم و ترتیب کا پتہ نہیں چلتا، جلد اور نمبر کے ہندسہ سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ عرصہ سے نکلتا ہے، مضامین کے لحاظ سے نیساں اچھے ادبی رسائل میں شمار ہونے کے لائق ہے، ادبی رنگ غالب ہے، بیشتر مضامین مفید اور پڑھنے کے لائق ہیں، پروفیسر امرناتھ جھا کا مضمون "مذہب کے نام پر ایک التماس" خصوصیت کے ساتھ نئی تعلیم یافتہ پود کے مطالعہ کے لائق ہے، ادبی مضامین قریب قریب سب اچھے ہیں، نیساں الہ آباد یونیورسٹی کے طلبہ میں ہندوستانی زبان کا ذوق پیدا کرنے کا اچھا ذریعہ ہے،

انیس مرتبہ جناب محمود شفاعت صاحب تقطیع اوسط، ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ ؎۱۲ر ششماہی ؎۷ر، پتہ دفتر انیس نمبر ۲۵ محمد علی پارک الہ آباد

یہ رسالہ الہ آباد کی ایک ادبی مجلس انجمن انیس اردو کا نقیب ہے، اس کے کئی نمبر ہم نے دیکھے، سب میں مفید علمی، ادبی اور تاریخی مضامین اور دلچسپ افسانے نظر آئے، علمی اور سنجیدہ مضامین میں سر تیج بہادر سپرو کا پنجاب یونیورسٹی کا خطبۂ صدارت اور سر سلیمان کا "حقیقتِ فلسفہ" قابلِ ذکر ہیں، ادبی مضامین بھی ستھرے اور دلچسپ ہیں، امید ہے کہ انیس ہندوستانی زبان کی مفید خدمت انجام دے گا،

شاہکار، مرتبہ جناب حکیم عارف بلگرامی تقطیع اوسط، ضخامت ۶۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت سالانہ ؎ ششماہی ؎عا، پتہ دفتر شاہکار گورکھپور،

شاہکار عرصہ سے ہمارے جوار گورکھپور سے نکل رہا ہے، علمی، ادبی، تاریخی، فلسفیانہ، فنونِ لطیفہ، مختلف مذاق کے مضامین کا اچھا مواد پیش کرتا ہے، ہم نے اس کے متعدد نمبر دیکھے، مضامین کے تنوع اور دلچسپی کے لحاظ سے سب کو بہتر پایا، مضمون نگاروں میں جناب اثر لکھنوی، مولوی ابوالعلا، ناطق لکھنوی اور مجنوں گورکھپوری کے نام رسالہ کی ادبی حیثیت کے لئے کافی ضمانت ہیں، کبھی کبھی ہندوستانی زبان کے متعلق مفید اور اچھی بحثیں نکلتی

ہیں جن میں بعض منصف مزاج ہندؤں کے نام بھی نظر آتے ہیں،

ہندوستانی مرتبہ جناب رشید کمالی صاحب ایم اے تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت

اوسط قیمت سالانہ ۶ ششماہی ۳ فی پرچہ ۸ پتہ ہندوستانی عزیز منزل مرادآباد،

یہ رسالہ سر محمد یعقوب کی سرپرستی میں ان کے وطن مرادآباد سے نکلتا ہے، ہندوستانی زبان کی خدمت اس کا مقصد ہے جس کا شاہد اس کا نام ہے، اوسط درجے کے ادبی رسائل میں ہے، مضامین زیادہ تر ادبی ہوتے ہیں، کبھی کبھی کوئی علمی مضمون بھی ہوتا ہے ایک حصہ عورتوں اور طلبہ وطالبات کے مضامین کیلئے مخصوص ہے ابھی اسکو اسکے مقصد سے قریب کرنے کیلئے مضامین کے معیار اور ترتیب دونوں چیزوں کی جانب توجہ کی ضرورت ہے،

ندیم مرتبہ جناب مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی، تقطیع بڑی ضخامت ۷۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت سالانہ للعہ ششماہی ۳ پتہ دفتر ندیم خانقاہ منعیہ رام ساگر روڈ گیا،

ندیم گیا (صوبہ بہار) کا پرانا رسالہ ہے، اب چند مہینوں سے اس کی ملکیت اور ادارت دونوں ہمارے رفیق مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی کے تجربہ کار ہاتھوں میں آگئی ہے، اسلئے قدرۃً اسکی ظاہری اور باطنی خوبیوں میں نمایاں فرق پیدا ہوگیا ہے، مضامین کا معیار بلند ہوگیا ہے، ادب و افسانہ اور سنجیدہ مضامین میں تناسب و توازن پیدا ہوگیا ہے، زبان کی خدمت کے متعلق مفید نوٹس ہوتے ہیں، صوبہ بہار میں ہندوستانی زبان کی رفتار کی خبریں ہوتی ہیں، امید ہے کہ ندیم اس نئے دور میں اپنے صوبہ میں پہلے سے زیادہ بہتر اور کامیاب طریقہ سے ہندوستانی زبان کی خدمت انجام اور وہاں کے ادیبوں کے لئے نمونہ کا کام دیگا لیکن افسانوں اور تصاویر کو مذاقِ عوام سے بچانے کی ضرورت ہے،

الادب مرتبہ جناب مولوی ضیاء النبی صاحب عباسی فاضل دیوبند، تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت سالانہ عہ پتہ اشرف العلوم کانپور،

یہ مذہبی رسالہ مدرسہ اشرف العلوم کانپور سے نکلتا ہے، ابھی اس کے صرف ایک دو نمبر نکلے ہیں، عام مسلمانوں

کے فائدہ اور اصلاح کے دینی مسائل و مباحث اور اصلاحی مضامین ہوتے ہیں، عام دلچسپی کے لئے ادب کی چاشنی کا بھی انتظام ہے، ہر مہینہ مدرسہ اشرف العلوم کے آمد و خرچ کا گوشوارہ ہوتا ہے، عام مسلمانوں کی مذہبی معلومات کے لئے اچھا رسالہ ہے،

الارشاد مرتبہ جناب حاجی بشیر احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت سالانہ عہ پتہ دائرۃ الارشاد امرتسر،

الارشاد دائرۃ الارشاد امرتسر سے حال میں نکلا ہے، مسلمانوں کو الحاد و مغربیت، اور ان گمراہ کن تحریکوں سے جو مذہب کی نقاب اوڑھ کر نکلتی ہیں، بچانا اس کا مقصد ہے، اس مقصد کے مطابق وہ صحیح اسلامی تعلیمات اور مفید مذہبی اور اخلاقی مضامین پیش کرتا ہے، اور گمراہ کن تحریکوں کے چہرہ سے مذہب کی نقاب ہٹاتا ہے مقصد نیک ہے، خدا کامیاب کرے،

انوار، مرتبہ جناب ماسٹر محمد وزیر خانصاحب تقطیع اوسط ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ عہ، طالب علموں سے عہ، پتہ انجمن محمدیہ فیروز پور چھاؤنی پنجاب،

"انوار انجمن محمدیہ فیروز پور کا مذہبی پرتو ہے، چند مہینوں سے نکلا ہے، مذہب کے مختلف پہلوؤں اور اسلام اور مسلمانوں کے متعلق مفید مختصر مضامین ہوتے ہیں،

نور مرتبہ جناب اسد اللہ خانصاحب تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۳ر پتہ دفتر نور جالندھر،

نور، ادبی اخلاقی اجتماعی اور تجارتی رسالہ ہے، اتنے ہمہ گیر اور مختلف النوع فرائض کا پورا کرنا دشوار ہے اسلئے مضامین کا اختصار حد اعتدال سے بھی کم ہو جاتا ہے، تاہم عام لوگوں کے لئے مذکورہ موضوعوں کے متعلق چھوٹی چھوٹی کارآمد باتیں ملجاتی ہیں،

دور اندیش مرتبہ جناب رضی نظامی وطاہر بی اے، تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ معمولی،

کتابت وطباعت اچھی قیمت سالانہ عہ فی پرچہ ۲؍ پتہ دفتر دوراندیش جنگ پورہ دہلی،

شروع میں اس رسالہ کے چند نمبر ہمارے پاس ریویو کے لئے آئے تھے، ادھر کئی مہینہ سے نہیں آیا معلوم نہیں اب نکلتا ہے یا بند ہوگیا، اوسط درجہ کا ادبی رسالہ ہے مختصر ادبی مضامین اور افسانے ہوتے ہیں،

خاتون، مرتبہ شوکت صاحبہ بنت میاں غلام ہمدانی مرحوم تقطیع اوسط ضخامت ۴۰ صفحے، کاغذ کتابت ومعمولی قیمت سالانہ عار پتہ دفتر خاتون کوہاٹی دروازہ پشاور،

ہماری خواتین کی علمی بیداری کے ساتھ ساتھ نسوانی رسائل کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے، اس کا ایک تازہ نتیجہ رسالہ خاتون ہے، جو پشاور جیسے دور دراز مقام سے نکلا ہے، اس میں مختلف نسوانی موضوعوں پر مفید مضامین اور مفید و کارآمد معلومات ہوتے ہیں، امید ہے کہ خاتون صوبہ سرحد میں زبان اور نسوانی دنیا کی اچھی خدمت کریگا،

تجارتی دنیا مرتبہ جناب فیاض حسین صاحب ومختار احمد صاحب جامی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۲؍ فی پرچہ ۲؍ پتہ تجارتی دنیا قرولباغ دہلی،

آج کل رسائل کی کمی نہیں لیکن ایک عام مقصد علم وادب کی خدمت کے سوا ایسے رسائل کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں، جن کے سامنے کوئی ایسا مقصد ہو جو عملی دنیا میں مفید اور کارآمد ہو سکے لیکن اب اس طرف لوگوں کا رجحان نظر آتا ہے چنانچہ اس وقت تجارتی موضوع پر ایک سے زیادہ رسالے نکل رہے ہیں، ان میں ایک نیا اور مفید اضافہ تجارتی دنیا ہے، جو تجارت کے مختلف پہلوؤں پر مفید مضامین اور فائدہ بخش معلومات پیش کرتا ہے، اور ایسی چھوٹی چھوٹی گھریلو صنعتوں کی تعلیم دیتا ہے جن سے بے کار اشخاص فائدہ اٹھا سکتے ہیں، یہ رسالہ تاجر اور غیر تاجر کے لئے یکساں مفید ہے،

بصیرت مرتبہ جناب حکیم سید عزیز الدین صاحب نصرتی ضخامت ۳۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت سالانہ عہ پتہ ناظم حلقہ کتب چرتھاول ضلع مظفر نگر،

چرتھاول ضلع مظفر نگر میں مسلمانوں کی عملی مذہبی تعلیم اور اخلاقی اصلاح کے لئے کئی سال سے حلقہ قطب کے

نام سے ایک انجمن قائم ہوا انہی مقاصد کے ماتحت بصیرت اس انجمن کی جانب سے نکلا ہے پہلے نمبر میں مختلف دینی، اصلاحی اسلامی پہلوؤں پر مفید مضامین اور منقولات ہیں، اگر بصیرت اسی نمونہ پر قائم رہا تو عام مسلمانوں کے لئے اسکا مطالعہ مفید ہوگا

خیام ہفتہ وار مرتبہ جناب حافظ محمد عالم صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۲۴ صفحے، کاغذ معمولی کتابت و طباعت اچھی قیمت سالانہ صہ فی پرچہ ۲ر پتہ دفتر خیام تحصیل بازار لاہور،

جناب حافظ محمد عالم صاحب مدیر رسالہ عالمگیر نے چند مہینے سے یہ نیا ہفتہ وار ادبی اخبار نکالا ہے اگرچہ خیام ہفتہ وار ہے، لیکن ادبی خصوصیات میں وہ کسی اچھے ماہانہ ادبی رسالہ سے کم نہیں، اس میں علمی، ادبی، تاریخی، سیاسی اور تفریحی مضامین دلچسپ افسانے مختلف النوع دلچسپ خبروں اور مفید معلومات کا نہایت ستھرا اور لائق مطالعہ مواد اور ہر ذوق کی سیرابی کا پورا سامان ہوتا ہے، اہم سیاسی کوائف پر نوٹس ہوتے ہیں، حافظ محمد عالم نے خیام نکال کر ہفتہ وار ادبی اخبار کا نہایت اچھا معیار پیش کیا ہے، قیمت کے لحاظ سے بھی ارزان ہے، امید ہے کہ وہ ہر ذوق کے اشخاص میں مقبول ہوگا،

تیج ویکلی:- مرتبہ جناب دھرمپال گپتا صاحب تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۲۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ ؎ فی پرچہ ۲ر پتہ برن بیشن روڈ دہلی،

دہلی کے مشہور روزانہ اخبار تیج کا ہفتہ وار اڈیشن بھی نکلتا ہے، ہمارے پاس کچھ دنوں سے آنا شروع ہوا ہے ہم نے اسکے کئی نمبر دیکھے، ادب و سیاست کا اچھا مجموعہ ہوتا ہے، مختلف رنگ اور مذاق کے دلچسپ مضامین اور معلومات ہوتے ہیں، مستقل مضامین کے ساتھ ساتھ ہفتہ بھر کی سیاسی خبروں کا خلاصہ اور اہم مسائل پر تبصرہ ہوتا ہے، روزانہ اخبار کے ہفتہ وار اڈیشنوں میں تیج کا ہفتہ وار اڈیشن ممتاز حیثیت رکھتا ہے،

آفتاب، مرتبہ جناب مولوی عبد المومن صاحب فاروقی تقطیع اخباری ضخامت ۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت سالانہ للعہ ششماہی عہ فی پرچہ ایک آنہ، پتہ اخبار آفتاب لکھنؤ،

اہل سنت کا مشہور اخبار النجم لکھنؤ تعارف کا محتاج نہیں، اخباربین حضرات کو معلوم ہوگا، کہ وہ کئی مہینہ

ہوئے، ضمانت کی خطیر رقم کی تاب نہ لاکر پریس ایکٹ کے ماتحت بند ہوگیا، اور اس نئے دورِ حکومت میں بھی جبکہ اکثر اخباروں کی ضمانتیں منسوخ ہوگئی ہیں، النجم اس فیاضی سے محروم رہا، اس لئے اب النجم نام کی تبدیلی کے ساتھ آفتاب کی صورت میں طلوع ہوا ہے، النجم کی خصوصیات و خدمات معلوم و مشہور ہیں، اسلئے آفتاب کو پہچنوانے کی ضرورت نہیں، امید ہے کہ النجم کے قدر دان آفتاب کی ضیا باری سے بھی متنیر ہوں گے،

آئینہ مرتبہ جناب محمد ابراہیم صاحب صدیقی، تقطیع اوسط اخباری ضخامت ۸ صفحے، کتابت و طباعت معمولی، قیمت سالانہ ے ششماہی ۸ فی پرچہ ۲ پتہ محمد فضل الرحمٰن کشن گنج پورنیہ،

یہ ہفتہ وار سیاسی اخبار چند مہینوں سے صوبہ بہار کے ایک دور افتادہ ضلع پورنیہ سے نکل رہا ہے، اخباری معیار کے لحاظ سے ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم اس میں سیاسی ہفتہ وار اخبار کا خاصہ مواد موجود ہوتا ہے، اور کسی نہ کسی حد تک اس سے اخبار بینی کی ضرورت پوری ہوتی ہے، لیکن ابھی اسے اچھے اخبار کے معیار پر لانے کے لئے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے، سیاسی مسلک میں مسلم لیگ کا حامی ہے،

دعوت (پندرہ روزہ) مرتبہ جناب مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی تقطیع چھوٹی اخباری ضخامت ۱۲ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت سالانہ ے ششماہی ۸ فی پرچہ ۱، سرور پریس الہ آباد،

مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب ندوی ایک خاموش کارکن ہیں، مذہب کی خدمت کا ولولہ رکھتے ہیں، اور اپنی بساط کے مطابق عرصہ سے دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں، اب اس کام کو زیادہ وسعت اور تنظیم کے ساتھ کرنے کے لئے انھوں نے پندرہ روزہ اخبار دعوت جاری کیا ہے، اسمیں غیر مسلموں کیلئے اسلام کی خوبیاں اور مسلمانوں کی مذہبی اصلاح کے لئے صحیح اسلامی تعلیمات پیش کیجاتی ہیں، اور ان کے مناسب مفید مذہبی اور تاریخی مضامین، اور نتیجہ خیز اور سبق آموز افسانے ہوتے ہیں، اس کار خیر میں مسلمانوں کو عملی ہمدردی کا ثبوت دینا چاہئے،

"م"

مطبوعات جدیدہ

معاہدۂ عمرانی مترجمہ جناب ڈاکٹر محمود حسین خانصاحب ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۴۶ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

فلسفۂ سیاست کی مشہور فلسفی ژان ژاک روسو کی کتاب (Social contract) کا نام اس حیثیت سے سرفہرست ہو کہ فرانسیسی انقلاب کے اہم محرکات میں ہے "معاہدۂ عمرانی" اسی کا ہندوستانی ترجمہ ہو، اس کتاب کا مقصد مصنف کے قلم سے یہ ہے، کہ "میں اس مسئلہ کی تحقیق کرنا چاہتا ہون، کہ اگر انسان کو اسی حالت پر فرض کر لیا جائے جیسا کہ وہ واقعی ہے، اور قوانین کو ایسا فرض کیا جائے، جیسا کہ انھیں ہونا چاہئے، تو کیا معاملات ملکی کے لئے کوئی منصفانہ اور یقینی اصول حکومت مقرر کرنا ممکن ہے" معاہدۂ عمرانی میں اسی مشکل مسئلہ کا حل پیش کیا گیا ہے، اور آزادی، مساوات حقوق اور عدل و مفاد عامہ کی (جو ایسے نظام کے بنیاد ہیں) اصولوں پر فلسفیانہ بحث کی گئی ہے، جس کی حیثیت "باہمی معاہدہ" کی ہے، جس میں کوئی جماعت یا فرد حاکم و محکوم نہیں، بلکہ قوم کا ہر فرد خود اپنا حاکم اور خود محکوم ہے، سب کا مفاد مشترک اور سب کے حقوق مساوی ہین، ان مباحث کی نوعیت کا اندازہ صرف ان کے پڑھنے سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں روسو کے مختصر حالات اور اس کے فلسفۂ سیاست پر تبصرہ ہے، آخر میں اصطلاحات کے ترجمہ کا انڈکس ہے، جو بجائے خود ہندوستانی زبان کی ایک مفید خدمت ہے، مباحث کے اشکال کے لحاظ سے یا اردو میں نامانوس ہونے کی وجہ سے یہ کتاب غالباً مشکل ترین کتابوں میں ہوگی، لیکن فاضل مترجم لائق مبارکباد ہیں، کہ انھوں نے ایسے دقیق مباحث کا ایسا صاف سلیس اور رواں ترجمہ کیا ہے کہ ان کے سمجھنے میں مطلق دقت نہیں ہوتی، ہندوستان کے اس انقلابی دور میں ایسی

کتابوں کا ترجمہ نہایت مفید ہے، ہر پڑھے لکھے شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے،

معیار العلماء مصنفہ جناب مولوی اکبر شاہ خانصاحب نجیب آبادی تقطیع بڑی ضخامت ۱۴۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت علاوہ محصولڈاک عمر پتہ: مکتبہ عبرت نجیب آباد یوپی،

یہ کتاب مولوی اکبر شاہ خان صاحب نجیب آبادی کی مفید تالیفات کی تازہ کڑی ہے، اس میں جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، علماء خیر اور علماء سو کے جانچنے کا معیار بتایا گیا ہے، آغاز کتاب میں مقدمہ میں ہدایت انسانی، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے مختلف پہلوؤں پر کلام اللہ سے روشنی ڈالی گئی ہے، کہ ہدایت کن وسائل سے حاصل ہو سکتی ہے، اس میں کیا کیا مشکلات پیش آتی ہیں، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک ضروری فرض ہے، اور اس کا وسیلہ صرف کتاب اللہ اور سنت رسول ہے، دین کا سیکھنا بہت آسان ہے، اس کے بعد قرآن وحدیث اور علماء اسلام کی کتابوں سے نہایت تفصیل کے ساتھ علماء خیر کے اوصاف وفرائض اور علماء سو کی پہچان بتائی گئی ہے، اور علماء کے ایجابی اور سلبی اوصاف پر قرآن وحدیث سے تفصیلی بحثیں ہیں، آخر میں ان شکوک کا ازالہ ہے، جو ان مباحث سے پیدا ہوتے ہیں، موجودہ دور کے بہت سے علماء کے اخلاقی زوال اور انکے فرائض سے غفلت کو دیکھتے ہوئے یہ کتاب فائدہ سے خالی نہیں ہے، لیکن کوئی دور بھی علماء خیر سے خالی نہیں رہا ہے، چنانچہ اس گئے گذرے زمانہ میں بھی ان کی ایک جماعت مل جائے گی، اس لئے مولف نے جہاں سے علماء خیر کے اوصاف وفرائض بتائے ہیں، اور علماء سو کا پردہ چاک کیا ہے، وہاں سو انھوں نے اگر علماء خیر کے حقوق بھی بتا دیئے ہوتے تو دونوں پہلو برابر ہو جاتے،

صحیفۂ چین از جناب سید اسد علی صاحب انوری فریدآبادی بی ایس سی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

ہماری زبان میں چین خصوصاً جدید چین کے متعلق بہت کم معلومات ہیں، غالباً سب سے اول چین کے ایک فرزند مولوی بدرالدین چینی نے "چینی مسلمان" کے سلسلہ میں ضمناً چین کے حالات لکھے جو مطبع معارف میں چھپ کر

شائع ہو چکے ہیں، اس ضروری موضوع پر "صحیفہ چین" دوسرا مفید اضافہ ہے، اس میں چین کے مشہور حکیم کنفیوشس کی کتاب "شوکنگ" کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ ہے جس میں قدیم چین کے گیارہ فرمانرواؤں کے متفرق حالات ہیں جن سے اس عہد کے حالات اور طریق حکومت پر روشنی پڑتی ہے، اس سے زیادہ مفید وہ ضمیمے ہیں جو لائق مصنف نے بڑھائے ہیں، اور جن کی حیثیت مستقل تالیف کی ہے، پہلے ضمیمہ میں حکیم کنفیوشس کے حالات اور اس کے فلسفۂ اخلاق پر تبصرہ ہے، دوسرے میں چین کے جغرافی اور تمدنی حالات اور عہد حاضر تک اسکی سیاسی تاریخ ہے، آخر میں عہد قدیم سے لیکر موجودہ دور تک کے چینی فرمانرواؤں کے ناموں کی فہرست ہے، اس کتاب سے ہماری زبان میں چین کے متعلق معلومات کا اچھا اضافہ ہوا ہے،

مشاہیر ہند جلد اوّل، مولفہ سید بادشاہ حسین صاحب حیدرآبادی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۱ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ سید عبد القادر اینڈ سنس، تاجر کتب چار مینار، حیدرآباد دکن،

سب سے پہلے مشاہیر ہند کے حالات آج سے سترہ اٹھارہ سال پہلے دار الاشاعت پنجاب نے بہاء الدین نے شائع کئے تھے، اس مدت میں بہت سے نئے لوگ مشاہیر کی صف میں آگئے ہیں، اب جناب سید بادشاہ حسین صاحب غالباً زیادہ جامع شکل میں مشاہیر ہند کے حالات لکھ رہے ہیں، زیر نظر کتاب اس کی پہلی جلد ہے جو حروف تہجی کی ترتیب کے لحاظ سے معلوم ہوتی ہے، اس حصہ میں سر آغا خان، سر اقبال، سر اکبر حیدری، جگدیش چندر بوس، ڈاکٹر ٹیگور، پنڈت جواہر لال نہرو کے حالات اور ان کے کارناموں کا اجمالی ذکر ہے، امید ہے کہ یہ کتاب تکمیل کے بعد پہلی "مشاہیر ہند" سے زیادہ جامع ہوگی،

شمع راہ مرتبہ جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب صفوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۳ صفحات، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر، پتہ صفوۃ اللہ بیگ سجاد منزل دہلی،

پروفیسر محمد سجاد مرزا بیگ مرحوم دہلوی صاحب الفہرست ہماری زبان کے ادیبوں میں تھے، اور جدت

زبان کے ساتھ مذہب کا بھی صحیح ولولہ رکھتے تھے، انھوں نے مختلف موقعوں پر متعدد مذہبی تقریریں کیں، جناب صفوۃ اللہ بیگ صاحب نے شمع راہ میں انکی چار تقریریں جمع کی ہیں، پہلی تقریر خدام کعبہ "انجمن خدام کعبہ" کی تحریک کے موقع پر کی تھی، دوسری تدبیر منزل ایک شادی کی تقریب کے سلسلہ میں تیسری "ذکر میلاد" محفلِ میلاد میں چوتھی "تعلیم" رسم تسمیہ خوانی کے موقع پر، چاروں تقریریں اپنے موضوع کے لحاظ سے مفید اور پراز معلومات ہیں،

بصائر القرآن حصہ اول، جناب نگہت شاہجہانپوری بی اے تقطیع جیبی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸؍ پتہ:- علیہ بک ڈپو محمد علی روڈ نمبر ۳ بمبئی، و نگہت شاہجہانپوری انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر بمبئی،

بصائر القرآن جناب نگہت شاہجہاں پوری کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو انھوں نے "انجمن عالمگیر تحریک قرآنی بمبئی" کے سلسلہ میں کی تھیں، ان میں جدید مذاق کا لحاظ رکھتے ہوئے صحیح اسلامی نقطۂ نظر سے اللہ کے مفہوم، مغفرت ورحمت کی حقیقت، قبلہ کے مصالح اور ایمان کی تشریح و توضیح کی گئی ہے، عام مسلمانوں کے لئے اسکا مطالعہ مفید ہوگا،

آفتابِ رسالت مصنفہ جناب راؤ بہادر حاجی محمد صالح خاں صاحب منظر تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۴ صفحے کاغذ اچھا کتابت وطباعت روشن قیمت ۸؍ پتہ:- بانیت ضلع میرٹھ،

غالباً سب سے پہلے حفیظ صاحب جالندھری نے شاہنامۂ اسلام کے سلسلہ میں منظوم سیرت لکھی آفتاب رسالت دوسری کوشش ہے، اس میں سیرتِ پاک کے جستہ جستہ واقعات ہیں جو زیادہ تر مشہور عوام روایات سے لئے گئے ہیں، مسلسل نظم میں بڑی قادر الکلامی کی ضرورت ہے، اسلئے اس منظوم سیرت میں بڑا نشیب و فراز ہے، تاہم اس حیثیت سے مفید ہے کہ آسانی سے حفظ کیجا سکتی ہے،

واردات منشی پریم چند، تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۹ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ پتہ:- مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

واردات منشی پریم چند کے تیرہ افسانوں کا مجموعہ ہے، جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، ان کے متعلق اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ ان میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں، جو منشی پریم چند کے افسانوں کا طغرائے امتیاز ہیں، زبان وبیان میں شیرینی لطافت اور شگفتگی ہے، معنی ومقصد کے لحاظ سے اصلاح معاشرت واخلاق کا رنگ نمایاں ہے، بعض بعض افسانوں میں حسن وعشق کی چاشنی بھی دیدی گئی ہے،

منتخب دیوان غالب مع شرح، از مولوی نور اللہ محمد نوری صاحب تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت مرقوم نہیں، پتہ غلام دستگیر تاجر کتب چارکمان حیدرآباد دکن،

دیوان غالب کا انتخاب جامعہ عثمانیہ کے انٹرمیڈیٹ کے نصاب میں داخل ہے، مولوی نور اللہ محمد نوری صاحب مصنف داغ نے جنھیں شاعری کا اچھا مذاق ہے، اس نصابی انتخاب کی شرح لکھی ہے، شروع میں بقدر تعارف غالب کے حالات ہیں، غالب کے کلام کی اتنی شرحیں ہو چکی ہیں، کہ ان میں مشکل سے کچھ اضافہ کیا جاسکتا ہے، نور اللہ صاحب نے ان شرحوں سے استفادہ کیا ہے، جس کے حوالے موجود ہیں جن غزلوں یا اشعار کے متعلق کوئی واقعہ معلوم ہے اسکو بھی ظاہر کر دیا گیا ہے گو اس میں زیادہ ترقیاس آرائی ہے کہیں کہیں شرح کا انداز غیر شاعرانہ ہو گیا ہے، جس سے اصل شعر کی خوبی ولطافت میں فرق آگیا ہے، ممکن ہے طلبہ کے لحاظ سے ایسا کیا گیا ہو، بہرحال یہ شرح طلبہ کے استفادہ کے لئے اچھی ہے،

انہار الادب، (حصہ اول ودوم) از مولوی محمد ایوب صاحب اورنگ آبادی تقطیع اوسط، ضخامت علی الترتیب ۸۶ و ۱۰۲ صفحے کاغذ سپید کتابت وطباعت اچھی دونوں حصوں کی قیمت ۱۲؍ پتہ محمد ایوب عثمانی اورنگ آباد ضلع گیا،

مشہور ادیب عالم مولانا محمد بن یوسف السورتی سابق استاذ عربی جامعہ ملیہ نے یہاں کے طلبہ کے لئے ازہار العرب کے نام سے عربی شعراء کے کلام کا انتخاب مرتب کیا تھا، جو غالباً اب دوسرے عربی مدارس

ہیں بھی داخل ہے، مولوی ایوب صاحب عثمانی ناظم مدرسہ معارف القرآن نے "انہار الادب" کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، شرح میں ہر شعر کے لغوی، صرفی اور نحوی مشکلات کا حل اور عربی نثر اور اردو میں اس کا ترجمہ ہے، نزہار العرب پڑھنے والے طلبہ کے لئے یہ شرح مفید ہوگی،

حال حاجی صفت اللہ صاحب محدث خیرآبادی } از جناب مولوی فخر الحسن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۱۹۶ صفحے کاغذ کتابت وطباعت اوسط قیمت مرقوم نہیں غالباً ۱۲؍ تک ہوگی، پتہ:۔ سید فخر الحسن سجادہ نشین خیرآباد اودھ،

خیرآباد اودھ کا قدیم اور مردم خیز خطہ ہے، یہاں بڑے بڑے ارباب کمال پیدا ہوئے، ان میں ایک حاجی صفت اللہ صاحب محدث متوفی ۱۱۵۵ھ ایک جامع کمال اور صاحب درس وتدریس بزرگ تھے، ان کے ظاہری اور باطنی فیوض سے صدہا تشنگان علم ومعرفت سیراب ہوئے، اور یہ فیض ایک عربی مدرسہ کی صورت میں اب تک جاری ہے، ان کے سجادہ نشین مولوی سید فخر الدین صاحب نے معتبر تذکروں سے محدث رحمۃ اللہ علیہ کے حالات لکھے ہیں، ضمناً ان کے پیر اور ان کے سلسلہ کے خلفاء کے موجودہ سجادہ نشین تک مختصر حالات بھی دیدئے ہیں، اس کے بعد محدث حاجی صفت اللہ کے پندرہ مکتوبات ہیں، جو صوفیانہ نکات پر مشتمل ہیں، آخر میں دلائل الخیرات اور مختلف سلسلوں کے شجرے ہیں، اس تذکرہ میں صوفیانہ مذاق رکھنے والوں اور اس سلسلہ کے متوسلین کے ذوق کا کافی سامان ہے،

انتخاب غزلیات شمس تبریز منتخبہ ڈاکٹر نکلسن تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ نفیس خط پاکیزہ ٹائپ، قیمت مرقوم نہیں، پتہ شرف الدین اینڈ سنز تاجر کتب بھنڈی بازار بمبئی،

مولینا روم کے کلام کیساتھ مشہور مستشرق پروفیسر نکلسن کے شغف سے ارباب علم واقف ہوں گے جنہوں نے متعدد نسخوں کے مقابلہ، تصحیح اور تحشیہ کیساتھ مثنوی مولینا روم کا ایک بہترین اڈیشن شائع کیا ہے، اس شغف کی بنا پر انھوں نے مولینا کے دیوان کا جو حضرت شمس تبریز کی جانب منسوب ہے ایک انتخاب کیا تھا جو کیمبرج

یونیورسٹی پریس کی جانب سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، یہ انتخاب بمبئی یونیورسٹی کے بی اے کے نصاب میں داخل ہے لیکن بہت کمیاب اور گراں ہے، اس لئے بمبئی کے عربی کتابوں کے مشہور تاجر شرف الدین اینڈ سنز نے بڑے اہتمام اور نفاست کیساتھ عمدہ ٹائپ میں یہ انتخاب شائع کیا ہے، اس انتخاب میں ہر غزل کے ساتھ اس کی بحر بھی دیدی گئی ہے، یونیورسٹی کے طلبہ کے علاوہ حضرت شمس تبریز کے کلام سے ذوق رکھنے والوں کیلئے بھی یہ انتخاب اچھا تحفہ ہے،

منتخبات قصائد انوری تقطیع بڑی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ نفیس خط پاکیزہ ٹائپ قیمت مرقوم نہیں، پتہ شرف الدین اینڈ سنز تاجر کتب بھنڈی بازار بمبئی،

قصائد انوری کا انتخاب اکثر یونیورسٹیوں میں داخل ہے، بمبئی یونیورسٹی کے ایم اے کے نصاب میں بھی ہے، لیکن قصائد انوری جو عرصہ ہوا نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپے تھے، اب کمیاب ہیں، اسلئے طلبہ کی سہولت کیلئے شرف الدین اینڈ سنز نے بقدر نصاب انتخاب شائع کردیا ہے،

کفر عشق از پنڈت امرناتھ مدن صاحب ساحر دہلوی، تقطیع متوسط ضخامت ۲۱۴ صفحے، کاغذ سپید، کتابت و طباعت معمولی قیمت مجلد عہ، پتہ پنڈت امرناتھ ساحر دہلوی پنشنر تحصیلدار، لال حویلی، چوڑیگراں دہلی،

پنڈت امرناتھ مدن صاحب دہلوی ہندو مسلمانوں کی اس مشترکہ قدیم تہذیب کی یادگاروں میں ہیں جن کے نمونے کچھ دنوں کے بعد ڈھونڈھے نہ ملیں گے، "کفر عشق" ان کا اردو دیوان ہے، آج کل شعرا اور دواوین کی کمی نہیں، لیکن ساحر کا کلام اس سے بالکل مختلف ہے، وہ محض رسمی شاعری اور قافیہ پیمائی نہیں ہے بلکہ شاعری کی زبان میں عارفانہ واردات قلب، سلوک کے احوال و کوائف اور صوفیانہ نکات و لطائف کا بیان ہے، ہر نظم یا غزل میں جسے زبان و بیان کے لحاظ سے غزل اور مضامین کے تسلسل اور مستقل ہونے کے لحاظ سے نظم کہہ سکتے ہیں، تصوف کے نکتے اور اخلاق عالیہ کے سبق ہیں، اس طرح اس مجموعہ میں تصوف اور

ویدانت کے بہت سے مسائل آگئے ہیں، زبان شستہ، انداز بیان موثر اور دل آویز ہے، کہیں کہیں پر زبان مسائل کی باریکیوں کا ساتھ نہیں دیتی ہے،

تسہیل العربیہ مرتبہ رقیہ بنت قلیل و عبید بن محمد عرب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت متوسط قیمت، ار محمد بن عرب بھوپال،

عربی صرف ونحو کی قدیم کتابوں کی تعلیم میں بڑا وقت صرف ہوتا ہے، اس لئے مصر میں جدید طرز تعلیم کے مطابق صرف ونحو کی ریڈریں لکھی گئی ہیں، جن سے طلبہ کم سے کم مدت میں بقدر ضرورت مذکورہ فنون سیکھ سکتے ہیں اسی سلسلہ کی ایک صرفی ریڈر "مطالعۃ العربیہ" ہے، رقیہ بنت مولانا قلیل عرب صاحب اور عبید بن محمد عرب صاحب ایم اے نے اسکے مطالب کو تسہیل العربیۃ کے نام سے اردو میں لکھ دیا ہے، شروع میں اس کے پڑھنے، اور مشق کے طریقے بھی بتا دیئے ہیں، یہ ریڈر اسکول اور کالج کے عربی طلبہ کے لئے بہت مفید ہے، اس حیثیت سے یہ چیز اور زیادہ قابل قدر ہے کہ اسکی تالیف میں ہماری قوم کی ایک خاتون کا بھی حصہ ہے،

زندگی، مولفہ جناب ملا رموزی صاحب فاضل الہیات تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۳ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت معمولی، قیمت ۸ر، پتہ غلام دستگیر صاحب تاجر کتب چار کمان حیدرآباد دکن و مکتبہ جامعہ دہلی و ملا رموزی صاحب بھوپال،

زندگی مشہور مزاحیہ نگار ملا رموزی صاحب کے سترہ مضامین کا مجموعہ ہے، ملا صاحب کا رنگ اور ان کی خصوصیات معلوم و مشہور ہیں، یہی رنگ ان مضامین کا ہے،

شہزادی گلنار، مولفہ پروفیسر عطاء الرحمٰن صاحب ایم اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۴ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

اس سبق آموز کتاب میں نیکی کے پھل اور بدی کے نتائج کو قصہ کے پیرایہ میں دکھایا گیا ہے، ایک پرہیزگار نیک دل اور خدا ترس شہزادی گلنار اپنی نیکی کی وجہ سے کینہ آدمیوں کے فریب سے سخت مصیبتوں میں مبتلا ہو جاتی ہے

سلطنت، گھر بار، شوہر سب چھوٹ جاتے ہیں، پھر خدا اسکو سمندر کے ایک جزیرہ کی ملکہ بنا دیتا ہے، اور اس کی پرہیزگاری کا شہرہ دور دور تک پھیل جاتا ہے، اسکے سب دشمن اندھے کوڑھی اور اپاہج ہو جاتے ہیں، اور اسکی دعا کی قبولیت کا شہرہ سنکر اسکے پاس دعا کیلئے پہنچتے ہیں اسوقت ان سب کے فریب کا پردہ چاک ہوتا ہے، اس کا بچھڑا ہوا شوہر مل جاتا ہے، یہ کتاب بچوں کی اخلاقی تعلیم کے لئے مفید ہے،

دنیا کے بچے از مولوی حسین حسان صاحب ندوی جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے کاغذ سپید کتابت و طباعت اچھی قیمت ۸/ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی،

مولوی حسین حسان صاحب اڈیٹر پیام تعلیم نے اس دلچسپ کتاب میں مختلف ملکوں اور قوموں کے حالات سے بچوں کی واقفیت کے لئے قصہ کے پیرایہ میں افریقہ، جنوبی امریکہ، فرانس، جرمنی، اٹلی، روس، اسپین، سوئزرلینڈ، سویڈن، ہالینڈ، رومانیہ، اسکیمولینڈ، ادر چین و جاپان کے بچوں کے حالات اس طرح لکھے ہیں، کہ ان ملکوں کی آب و ہوا، ضروریات زندگی، رہنے سہنے کے طریقے، لباس اور غذا وغیرہ دیہاتی معاشرت کے متعلق جملہ ضروری معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، زبان نہایت آسان، طرز ادا بچوں کے مذاق کے مطابق ہے، یہ کتاب بچوں کے لئے مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی،

کائنات جناب محمود علی خانصاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۵/ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی،

اس کتاب میں زمین، چاند، سورج، اور دوسرے کواکب کی پیدائش، ان کے نظام اور عجیب و غریب حالات کو آسان زبان اور دلنشیں انداز میں سمجھایا گیا ہے، جسے بچے دلچسپی کیساتھ سمجھ سکتے ہیں،

چھوٹا باپ مولوی حسین حسان صاحب جامعی تقطیع چھوٹی ضخامت ۳۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت ۲/ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی،

یہ بچوں کے لئے چوہے کے ایک شریر بچے چھوٹو کا دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے جو اپنی شرارت سے ایک مصیبت میں پھنسکر کسی طرح چھوٹا

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۰ فروری ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڑھ

جلد ۴۱	ماہ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۳۸ء	عدد ۲

مضامین

مولنٰا ابوالاعلیٰ صاحب مودودی صاحب ترجمان القرآن حیدرآباد جن کے سنجیدہ مذہبی مضامین نوجوانون کے خیالات کے درست کرنے کے لئے بیحد مفید ہوتے ہین، اب حیدرآباد دکن سے پنجاب (جمال پور متصل پٹھان کوٹ) چلے آئے ہیں، امید ہو کہ زندہ دلون کے ملک مین پہنچکر وہ اس کی نئی زندگی کا باعث اور اس کے بڑھتے ہوے مذہبی انتشار کے لئے تسکین کا موجب ہونگے، رسالہ بھی یہین سے نکلیگا،

اب یہ رسالہ صرف ایک رسالہ نہ ہوگا، بلکہ دارالاسلام نام ایک مذہبی مرکز کا نقیب بھی ہوگا، اس مرکز کے لئے ایک نیک دل مسلمان نے بہت بڑی زمین وقف کردی ہو، مسجد، اقامت گاہ اور بعض ضروری مکانات بھی اس مین تعمیر کردیئے ہین، اور اسکو ان لوگون کے لئے جنکو مذہبی تحقیقات کا شوق، اور خالص اسلامی زندگی بسر کرنے کی آرزو ہو، خاص کردیا گیا ہے، دعا ہے کہ یہ دارالاسلام اپنے حقیقی معنون مین مسلمانون کے لئے دارالاسلام ثابت ہو،

رسالہ کے لائق مدیر کئی نمبرون سے مذہب اور سیاسیات پر زور قلم صرف کررہے ہین اس سلسلہ مین انھون نے میری ایک آدہ ناتمام تقریر اخبارون میں پڑھکر اس کی تردید مین ان موشگافیون اور نازک استنباطون سے کام لیا ہے، جو لکھنے والے کے حاشیۂ خیال مین بھی نہین، اس دور مین جب کہ پروپگنڈا ایک فن کی حیثیت اختیار کرچکا ہو اس قسم کی باتین خلاف توقع نہین لیکن مدیر ترجمان القرآن کو مین اس بلاے عام سے بالاتر سمجھتا ہون، اس لئے مین ان کی تسکین کے لئے یہ ظاہر کردینا چاہتا ہون کہ اگر وہ میرے گذشتہ بیس برس کی تحریرون اور تجویزون سے واقف ہوتے تو ان پر ظاہر ہوچکا ہوتا کہ "سلطنت در سلطنت" کی اصطلاح گو نئی ہو مگر خیال نیا نہین ہے، مجھے ان کے مقامات

اور اصل مقصد سے پورا اتفاق ہے، اختلاف ہے تو ان کی تحریر کے نتائج اور طریق کار سے،

اس سلسلہ مین انھون نے میری مرعوبیت کے ثبوت مین ایک ہندو صاحب قلم کے خط سے جس کو اس نے گاندھی جی کے نام بھیجا تھا، اور جس کو مین نے اس سے پہلے نہین پڑھا تھا، یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ مین نے یوم سیرت کی ایک مطبوعہ تقریر مین آنحضرت صلعم کو "سوامی محمد" لکھا ہے، مدیر ترجمان ماشاء اللہ روایت کے ساتھ درایت کے بھی امام ہین، وہ میری طرز تحریر سے واقف ہین، وہ سننے کے ساتھ فیصلہ کر سکتے تھے کہ سبحانک ھذا بھتان عظیم، یہ میری مطبوعہ تقریر سیرت جس کا نام رسول وحدت ہے ناپید بھی نہین کہ وہ واقعہ کی تحقیق نہین کر سکتے تھے، اور مجھ کو ہندو کی غلط فہمی سے محفوظ نہین رکھ سکتے تھے، بہر حال حکایت بالاسراسر خلاف واقعہ ہے، رسالہ موجود ہے، ہر شخص دیکھ سکتا ہے، البتہ اس رسالہ کا ترجمہ بہت سی زبانون مین ہوا ہے، ممکن ہے کہ کسی ہندی ترجمہ مین ایسا ہوا ہو سو مجھے اس کی خبر نہین اور نہ مجھ پر اس کی ذمہ داری ہے،

کئی مہینے ہوئے کہ ہمارے دارالعلوم ندوۃ العلماء کے دو عالم مولوی حافظ محمد عمران خان ندوی منعم دارالعلوم اور مولوی سعد الدین صاحب ندوی مدرس دینیات جامعہ ملیہ دہلی، اپنی تعلیم کی تکمیل کے لئے مصر گئے ہین، اور جامع ازہر مین داخل ہوئے ہین، ازہر مین اس سے پہلے بھی ندوہ کے طالب العلم گئے ہین، مگر ان دونون بھائیون کا کارنامہ یہ ہے کہ انھون نے اپنی جرأت اور خود داری اور جامع ازہر کے ہندی وفد کے ارکان اور سکریٹری کی سفارش سے دارالعلوم ندوہ کی سند فضیلت کو کالج کی سند منوا کر، وہان تخصص (ڈاکٹریٹ) کے درجہ مین داخلہ کی اجازت حاصل کی ہے، اور یہ وہ رتبہ ہے جو اس سے پہلے کسی بیرونی درسگاہ کو حاصل نہین ہوا،

ہمارے خیال مین جامعہ ازہر کی ریاست کے لئے یہ موزون ہوگا کہ وہ اپنے ارکان وفد کے مشورہ سے

ہندوستان کی مشہور عربی درسگاہون کی سندون کو معیار مان کران کے مطابق وہان کے فارغ طلبہ کو اپنے یہان داخلہ کی اجازت دیدے، ابھی دیوبند کے ایک فارغ عالم حیدرآباد دکن سے جارہے ہیں، امید ہو کہ ان کے داخلہ کے وقت کوئی قاعدۂ عام بن سکے،

اُردو اُن صوبون مین بھی جہان وہ مادری زبان نہین، ایک عام ملکی ہندوستانی زبان کی حیثیت سے آگے کو بڑھ رہی ہے، دسمبر کے آخر اور جنوری کے شروع مین سندھ کے دار السلطنۃ کراچی میں ایک کامیاب اردو کانفرنس منعقد ہوئی جس مین سندھ کے اندر اس زبان کی اشاعت کے مسئلہ پر غور کیا گیا، اس وقت سندھ مین سات اردو ہفتہ وار اخبار نکل اور پچاس اردو اسکول چل رہے ہین،

وہان اردو اخبارون میں الحبیب اخبار دو سال سے کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے، ہم کو ان صوبون مین ہندوستانی زبان کے اخبارون کی ضرورت صرف ادبی ہی نقطۂ نظر سے نہین ہے، بلکہ اس لئے بھی ہو کہ اگر ایسا نہ ہو تو ہندوستان کی مسلمان قوم ملک کے موجودہ رجحانِ دستور کے مطابق صوبون مین بٹ کر اپنی مشترکہ ملکی اہمیت کھو بیٹھیگی، اس لئے ضرورت ہو کہ سندھ، بمبئی، مدراس، متوسط اور سرحد مین اس زبان کے اخبارون کی پوری پوری مدد کیجائے اور ان کی ہمت بڑھائی جائے،

احاطۂ مدراس میں بنگلور گویا ایک بین الاقوامی شہر ہے، اور اسی سے وہان ہندوستانی زبان کو کافی فروغ ہے، وہان ایک مسلم اردو لائبریری پچیس برس سے قائم ہے، اس لائبریری کا اتنی عمر پاجانا اسکی قوت حیات کی دلیل ہے، اب اسکے ارکان کوشش کر رہے ہین کہ اسکی اپنی عمارت ہوجائے، اہلِ مدراس و میسور کے لئے یہ کوئی بڑی بات نہین، شرط ہمت اور عزیمت ہے، امید ہو کہ مدراس و میسور کے مسلمان ادھر توجہ کرینگے،

مقالات

جواہر تفسیر

مقدمۂ تفسیر جواہر

ایک کے مافی الضمیر کی تشریح دوسرے کی زبان سے کتنا مشکل کام ہے، پھر جب کسی انسانی قول کی تشریح میں اتنا اشکال ہے، تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے کلام کی تشریح اس کے بندوں کی زبان وقلم سے جتنا مشکل ہو اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، کسی نے خوب کہا ہے کہ قرآن پاک کی کوئی تفسیر کبھی مکمل نہیں ہوسکتی، کیونکہ شارح کے لئے ضروری ہے، کہ وہ ماتن سے زیادہ علم رکھتا ہو، ورنہ کم سے کم اس کے برابر تو ہو، اور اس کا تصور بھی کسی بندہ میں قرآن اور صاحب قرآن کی نسبت سے نہیں کیا جاسکتا،

شارح اور مفسر کا کام یہ ہے کہ ماتن کے اختصار کی تفصیل اور اجمال کی توضیح کرے، اسکے کلام بے دلیل کی دلیل دے، اسکی بات پر کوئی شبہہ یا اعتراض پیدا ہو تو اسکو دور کرے، اسکے لفظوں کی گرہ کھولے، ترکیبوں کی پیچیدگی کو صاف، اور مطلب کی دشواریوں کو حل کرے، قولوں میں کہیں تضاد نظر آئے تو ان میں تطبیق دے، اور اسکے ایک قول سے دوسرے قول کو سمجھنے کی کوشش کرے،

یہ اور اسی قسم کے اور طریقے ہیں، جن سے انسانوں کے کلام کو سمجھتے، اور ان کی دشواریوں کو حل کرتے ہیں، لیکن قرآن پاک کی تفسیر میں ان طریقوں کے علاوہ کچھ اور طریقے بھی ہیں، جو قرآن ہی کیساتھ مخصوص ہیں،

قرآن خدا کا کلام ہے، جو ۲۳ برس کی مدت میں تھوڑا تھوڑا کر کے ملک عرب میں، فصیح و بلیغ عربی زبان

میں خدا کے ایک برگزیدہ بندہ پر اترا، اس میں نظریئے بھی تھے، اور عملی تعلیمات بھی، اس نے ان نظریوں کو خدا کے بندوں کو سمجھایا، اور ان عملی تعلیمات کو عملاً کرکے اور برت کے اپنے آس پاس والوں کو دکھایا، اور بتایا، اس لئے کہ وہ اس کلام کا پہلا مخاطب تھا، اور اسی کے ذریعہ اس کلام کا مطلب دوسروں کو سمجھانا تھا، اس لئے یہ ماننا پڑے گا، کہ وہی اس کلام کے مطلب کو سب سے بہتر سمجھ سکتا تھا، اور اسی لئے وہ اس کلام کا جو مطلب سمجھا، اور اپنی تعلیم اور عمل سے اس نے دوسروں کو جو سمجھایا، وہی اس کا صحیح اور بے خطا مطلب اور مفہوم ہے، اس لئے قرآن پاک کے سمجھنے کے لئے حامل قرآن محمد رسول اللہ صلعم کی قولی و عملی تفسیر سے بہتر قرآن کی تفسیر کا کوئی ذریعہ نہیں ہو سکتا، رسول کی قولی و عملی تفسیر سنت ہے، اور قرآن کتاب، سنت اور کتاب اسلام کے وہ بنیادی پتھر ہیں جن پر اسلام کی پوری عمارت کھڑی ہے،

حامل قرآن علیہ السلام کے بعد قرآن کی فہم میں ان سے تربیت اور فیض پائے ہوئے اشخاص کا مرتبہ ہے، جنھوں نے رسول اللہ صلعم کی زبان وحی ترجمان سے ان آیتوں کو سنا، آیتوں کے ماحول کو جانا، اور جو اس فضا سے آشنا تھے، جو آیتوں کے نزول کے وقت موطن وحی میں جلوہ گر تھی، اس کے بعد تابعین کا گروہ ہے جنھوں نے صحابہ سے اس فیض کو حاصل کیا، اور خاص طور سے قرآن پاک کی تعلیم و تعلّم کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا، دن رات وہ اس کے ایک ایک لفظ کی تحقیق، اور اس کے لغوی و صرفی و نحوی ترکیبوں کا حل، اور کلام عرب سے ہر قرآنی محاورہ کی تطبیق کرتے تھے،

آجکل بعض عقلیت پسندوں کا میلان ادھر ہے، کہ وہ اس طریقہ تفسیر کو روایتی سمجھکر اس کی تحقیر کریں، حالانکہ دوسری حیثیتوں کو چھوڑ کر اگر صرف زبان کے ماہر اور واقف کار ہی کی حیثیت سے ان مفسرین بالروایۃ کو دیکھا جائے تو بھی ان کا مرتبہ ہم سے آپ سے بمراتب اونچا ہوگا، یہ کوئی قدامت پرستی کی بات نہیں ہے بلکہ واقعہ کا حقیقی پہلو ہے،

قرآن پاک کی تفسیر کا پہلا دور اسی طریقہ سے شروع ہوا، لیکن افسوس ہے کہ غیر ضروری تشریح

وتوضیح کے لئے مسلمانوں نے ان مضامین میں جو قرآن پاک اور پچھلے آسمانی صحیفوں میں اشتراک رکھتے تھے تو مسلم اہل کتاب کی طرف رجوع کیا، اور ان سے سن سن کر اسرائیلی روایات کا بڑا حصہ قرآن پاک کی تفسیروں میں بھر دیا، محدثین نے ان اسرائیلیات سے بے اعتباری کا ہمیشہ اظہار کیا ہے، اور اسی لئے وہ حصہ ہماری تفسیروں کا نہ صرف یہ کہ مفید نہیں، بلکہ بہت حد تک مضر اور قرآن پاک کے صحیح مطلب سمجھنے میں عائق ہے،

کسی کتاب کا صحیح مطلب سمجھنے کے لئے سب سے اہم چیز اس کتاب کی زبان اور اس زبان کے قواعد کی پیروی ہے، یہ کسی طرح درست نہ ہوگا، کہ ہم عقلیت کے جوش میں اس کتاب کے کسی فقرہ کی تشریح میں اس زبان کے لغت اور قواعد میں ایسا تصرف کریں، جو ہر حیثیت سے ناجائز ہو، اور ہمارے اس تصرف کا اصل منشا اتنا ہو کہ ہم اپنے استبعاد عقلی کی تسکین کر سکیں، حالانکہ استبعاد عقلی کوئی یکساں چیز نہیں، اور نہ وہ خلافِ عقل کے معنوں میں ہے، عقل کی وسعت اور استبعادات عقلی کی فہرست ہر زمانہ میں گھٹتی اور بڑھتی رہی ہے، اس لئے قرآن پاک کی تفسیر کا یہ معیار نہیں بنایا جا سکتا،

تاہم اس میں شک نہیں کہ ہر زمانہ کا ماحول دوسرے زمانہ سے بالکل الگ ہوتا ہے، عقلی مسلمات اور زمانہ کے غیر محسوس عقائد ہمیشہ بدلتے رہتے ہیں، اس لئے ہر کتاب کے مفہوم ومعنی کے سمجھنے میں اس زمانہ کے مؤثرات سے قطع نظر کرنا کسی طرح ممکن ہی نہیں، ہر زمانہ کے لوگ اپنے زمانہ ہی کے موثرات کے مطابق کسی کلام کو سمجھنا چاہتے ہیں، فانی انسانوں کے فانی کلام اور جزئی علم رکھنے والوں کے جزئی علم، اگر ایک زمانہ میں صحیح اور دوسرے زمانہ میں غلط ہو جائیں تو ایسا ہونا بہت حد تک قرینِ قیاس ہے، مگر خدائے پاک کے کلام میں جس کا علم ازل سے ابد تک کو محیط ہے اس قسم کا تصور بھی ذہن میں نہیں لایا جا سکتا، اس لئے اگر مخلص اہلِ علم اور نیک نیت علماء اس کلام کی مزید تشریح اپنے زمانہ کے موثرات کے مطابق اس طرح کر سکیں کہ وہ متکلم کے اصول متواترہ مخاطب اول صلعم کی تفہیم اور زبان کے لغت و قواعد کے خلاف نہ ہوں، تو ان کی یہ سعی مشکور ہو گی،

اسی بنا پر اس زمانہ سے جب سے مسلمانوں میں عقلیات کا رواج ہوا، اس نظر سے بھی قرآن پاک کی تفسیریں

لکھی گئیں، معتزلہ میں ابو مسلم اصفہانی کی تفسیر، قاضی عبد الجبار معتزلی کی تنزیہ القرآن، اور اہلِ سنت میں امام ابو منصور ماتریدی کی تاویلات اور امام ابن فورک کی مشکلات القرآن امام محمد غزالی کی جواہر القرآن اور سب سے آخر میں امام فخر رازی کی تفسیر کبیر اپنے اپنے زمانہ کے موثرات کی بہترین ترجمان ہیں،

زمانہ حال میں انسانوں کے علوم و فنون، رسم و رواج، مسلمات اور عقائد عقلی میں جو انقلاب ہوا ہے اس نے بہت سے علمائے متفکرین کو اپنے زمانہ کے ماحول اور ضروریات کے مطابق قرآن پاک کی تفسیر کی طرف متوجہ کیا، اسوقت دنیائے اسلام کے وسیع رقبہ کی ترجمانی دو ہی ملک کر رہے ہیں، ہندوستان اور مصر، اسلئے اس قسم کی تفسیر کی تحریک بھی انہی دو ملکوں کے مسلمان عالموں کے سینوں میں موجزن ہوئی، سرسید احمد خان نے ہندوستان میں اور مفتی محمد عبدہ نے مصر میں ادھر توجہ کی، اور قرآن پاک کی آیات کی اپنے زمانہ کے خیالات کے مطابق تفسیر کی کوشش کی، سرسید کے حسنِ نیت میں شک نہیں، مگر افسوس کہ ان کے حسنِ نیت کے مطابق ان کے علم کا پایہ نہ تھا، اور نہ ان کو عربی زبان کے لغت و ادب پر عبور تھا، اس لئے ان کی غلطیاں ان کی صحت سے زیادہ ہوئیں، اور خصوصاً فطرت اور قوانینِ فطرت کا جو تخیل ان کے زمانہ میں چھایا تھا، اس کی غلط پیروی نے انکو حق کے جادہ سے ہٹا ہٹا دیا،

اس کے بعد مصر میں سید رشید رضا اور ہندوستان میں مولینا عبد الحمید فراہی کا دور شروع ہوا، یہ دونوں گو اصول میں مختلف تھے، مگر نتیجہ میں بہت حد تک متفق تھے، سید رشید مرحوم آثار و روایات کی چھان بین کر کے آیات کو روحِ عصری سے مطابق کرتے تھے، اور فراہی رحمۃ اللہ علیہ خود قرآن پاک کے نظم و نسق اور قرآن پاک کی دوسری آیتوں کی تطبیق اور کلامِ عرب کی تصدیق سے مطالب کو حل کرتے تھے،

اسی زمانہ میں مصر میں دو اور تفسیروں کی تالیف شروع ہوئی، ایک نئے تعلیم یافتہ فاضل فرید وجدی کے قلم سے جن کا مقدمۂ تفسیر تو میں نے دیکھا ہے، مگر اصل تفسیر کا حال معلوم نہیں، دوسری ایک ایسے فاضل کے قلم سے جو یورپ کے علوم و فنون اور ترقیات سے پوری طرح واقف اور اپنے گھر کی قدیم دولت سے بھی

آشنا ہے، یعنی حضرت شیخ طنطاوی جوہری جو جامعہ مصریہ اور مدرسہ دار العلوم میں ایک زمانہ تک علوم وفنون کے مدرس رہ چکے تھے، موصوف کو اس تفسیر کا خیال جدید طلبہ میں قرآن پاک سے عقیدت کا رشتہ مستحکم رکھنے کے ذریعہ سے آیا، انھوں نے آہستہ آہستہ مغربی علوم وخیالات سے سرمست طالب علموں کی ہدایت ورہنمائی کے لئے ان کے سامنے قرآن پاک کی آیتوں کی تفسیر وتشریح نئے ڈھنگ سے کی،

شیخ طنطاوی جوہری کی تفسیر کی اصل غایت مسلمانوں کو نئے علوم وفنون کی طرف متوجہ کرنا، اور مسلمانوں کو یہ باور کرانا ہے کہ ان کا یہ تنزل اسوقت تک دور نہ ہوگا جب تک وہ جدید سائنس اور دوسرے نئے علوم اور یورپ کے جدید آلات اور علمی و مادی قوتوں سے مسلح نہوں گے،

ہندوستان میں اسی خیال نے تذکرہ کی صورت اختیار کی ہو مگر افسوس ہے کہ جو غلطی سرسید سے ان کے زمانہ میں ہوئی، وہی صاحب تذکرہ سے اس زمانہ میں ہو رہی ہے، مسلمانوں کو یورپ کے علوم وفنون اور مادی قوتوں کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا بالکل صحیح ہے، مگر اس کے لئے یہ بالکل ضروری نہیں ہے، کہ ہم اپنے سارے تیرہ سو برس کے سرمایہ کو آگ لگادیں، اور پہلے کے سارے مفسرین، اہلِ لغت، اہلِ قواعد، اور اہلِ علم کو ایک سرے سے جاہل، دشمنِ اسلام اور احمق کہنا شروع کریں، ورنہ آیندہ جب زمانہ کا ورق پلٹے گا، مؤثرات اور ماحول میں تغیر ہوگا، تو ان خوش فہموں کی تفسیریں اور تاویلیں بھی ایسی ہی غلط اور دور از کار اُس زمانہ میں نظر آئیں گی جیسی آج ان کی نگاہ میں امام ماتریدی، ابن فورک، امام غزالی اور امام رازی کی تفسیریں معلوم ہوتی ہیں،

خدا کا کلام بحر ناپیدا کنار ہے، اسکی موجوں کی گنتی کون کرسکتا ہے، بس جسکو جو کچھ نظر آتا ہو، ایماندار اور دیانت کیساتھ اس کی تشریح کرے، لیکن جو کچھ اگلوں کو نظر آیا اور ان کی نظروں سے اوجھل ہے اسکو نادانی وجہالت نہ کہیں، اور جو آیندہ نظر آئے گا، اس کا انکار نہ کریں، اور صرف اپنی ہی نظر کی وسعت کو جو زمان ومکان کی قیود میں گھری ہے، تحقیق کی انتہا اور صحت کا معیار قرار دے لیں،

شیخ طنطاوی کی تفسیر کی خوبی یہی ہے، کہ گو انھوں نے قرآن کی آیتوں کی تشریح میں سائنس اور تحقیقات

اور موجودہ زمانہ کے دوسرے علوم وفنون وتحقیقات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا ہے، اور اپنے ناظرین کے دل ودماغ کو ادھر متوجہ کیا ہے، اور مسلمانوں کو اپنی حالت پر غور کرنے اور ترقی کے اصول سمجھنے کی دعوت دی ہے، پھر بھی وہ پچھلے مفسروں کی تحقیقات کی تحقیر نہیں کرتے، مسلمان عالموں کا دل نہیں دکھاتے، اور نہ مذہب کے نام سے لوگوں کو مادیت اور بے دینی کی تعلیم دیتے ہیں،

انھوں نے اپنی تفسیر کا مقصد، کتاب کے شروع ہی میں چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے:۔

"آج خدا کے بھروسہ پر میں تفسیر کا سلسلہ پھر شروع کر رہا ہوں، اس امید کے ساتھ جو دل میں متمکن ہے، کہ اس تفسیر سے اللہ تعالیٰ کچھ دلوں کو کھول دے گا، اور کچھ قوموں کو راہ دکھائیگا اور عام مسلمانوں کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیگا، تو وہ علوم کونیہ (سائنس) کو سمجھیں گے، اور مجھے امید ہے، کہ اللہ تعالیٰ اسی امت کے ذریعہ سے اس دین کی مدد فرمائے گا، اور مسلمان اس تفسیر کی روش پر کام شروع کریں گے، اور ساری دنیا میں وہ مقبول ہو گی، اور نوجوان مسلمان آسمان اور زمین کے عجائب وغرائب احوال کی واقفیت کا شوق پیدا کرین گے، اور اللہ تعالیٰ انکی تمدن وشائستگی کو بلندی بخشے گا، اور یہ کتاب فطرت کے قوانین کی معرفت کی دعوت دیگی، اور اس امت میں بھی ایسے لوگ پیدا ہوں گے، جو یورپ والوں سے زراعت، طب، معدنیات، حساب انجینرنگ اور دیگر علوم وفنون اور صنعت وحرفت میں ترقی کر جائیں گے، اور کیونکر ایسا ہو کہ قرآن پاک میں وہ آیتیں جن میں علوم کا ذکر، یا ان کی طرف اشارے ہیں، ساڑھے سات سو سے زیادہ ہیں، اور خالص احکام فقہی کی آیتیں ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں، اور میں نے اس تفسیر میں وہ تمام باتیں بیان کی ہیں، جن کی ضرورت مسلمانوں کو ہے یعنی احکام، اور اخلاق، اور سائنس کے عجائبات، اور مین نے اس میں جدید علوم کی نادر تحقیقات اور فطرت کے وہ قوانین

---

[۵] جلد اول ص ۲، و ۳،

بیان کردیئے ہیں جو مسلمان مردوں اور عورتوں میں حیوانات و نباتات اور زمین و آسمان کی تحقیقات کا شوق پیدا کر دیں گے، اور تمھیں معلوم ہو جائے گا، کہ یہ تفسیر، ربانی لطف و کرم کا نتیجہ ہے، اور اس میں اس بشارت کا رمز چھپا ہے، کہ یہ تفسیر آیندہ ان لوگوں کی ترقی کا سبب بنے گی، جو آج زمین میں کمزور سمجھے جاتے ہیں، اور خدا اسکی مدد کرے گا، جو اس کی مدد کرتا ہے، بے شبہہ اللہ زبردست قوت والا ہے"

اس اقتباس سے ظاہر ہے کہ اس تفسیر کی تالیف سے انھوں نے زمانہ جدید کے علوم عصریہ کے مقابلہ میں وہی خدمت انجام دی ہے، جو آج سے ساڑھے سات سو برس پیشتر امام فخر الدین رازی نے قدیم یونانی علوم کے مقابلہ میں انجام دی تھی، اور اسی لئے یہ کہنا غیر موزوں نہ ہوگا، کہ شیخ طنطاوی کی یہ تفسیر چودہویں صدی کی تفسیر کبیر ہے،

اس تفسیر کو پڑھ کر جدید تعلیم کے نوجوانوں کو معلوم ہوگا، کہ قرآن پاک فطرت کے اسرار اور سائنس کے عجائبات کے استدلال سے پُر ہے، اور یہ بجائے خود رسول امی محمد رسول اللہ صلعم کی رسالت اور قرآن کے اعجاز معنوی پر ناقابلِ تردید شہادت ہے،

حضرت مولینا سید انور شاہ صاحب کشمیری بھی اس تفسیر کی اس افادی حیثیت کے مداح تھے، کہ اس نے آیات کریمہ سے متعلق جدید علوم و مسائل پوری تفصیل سے بیان کر دیئے ہیں[1]،

مصنف نے اس تفسیر میں جو نئی باتیں لکھی ہیں، وہ زیادہ تر توضیح اور استشہادی ہیں، اس لئے اس میں جدت کے باوجود بدعت نہیں پیدا ہوئی ہے، اور آج کل کے بعض غلط رو عجمی مدعیانِ تفسیر کی طرح زبان اور زبان کے قواعد، اصول اور لغت سے دست بردار ہو کر زمانۂ جدید کی خواہشوں کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی ہے،

---

[1] نفحۃ العنبر من ہدی الشیخ الانور، ص ۹۱،

ضرورت تھی کہ اس تفسیر کا ترجمہ کوئی فاضل ہندوستانی عالم اپنی زبان میں کرتا، کہ دنیاے اسلام کا وہ بر اعظم جہاں قرآن کے مومن سب سے زیادہ بستے ہیں، اس سے فائدہ کا فیض پا سکتا، جامعہ دار السلام عمرآباد کے لائق مدرس مولوی عبید الرحمن صاحب رحمانی ہمارے شکریہ کے مستحق ہیں، کہ انھوں نے بڑی محنت سے اس کا ترجمہ کیا، اور کاکا محمد اسمٰعیل صاحب اور ان کے بھائی کاکا محمد ابراہیم صاحب (عمرآباد مدراس) بھی مبارکباد کے سزاوار ہیں، کہ انھوں نے اس تفسیر کو اپنے سرمایہ سے چھپوا کر اپنی دولت کو صحیح مصرف میں صرف کرکے ثواب دارین حاصل کیا، جزاھم اللہ خیر الجزاء، ابھی تو صرف یہ پہلی جلد کا ترجمہ ہے، امید کہ باقی جلدیں بھی ہماری زبان میں منتقل ہو کر ہمارے نوجوانوں کے لئے شمع ہدایت کا کام دیں،

فلسفہ کا حاصل

از

از مولینا عبد الباری ندوی پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(۲)

جب شعور اور تجربات شعور کے سوا ہماری دنیا کچھ نہیں، تو خواہ ارتسامات ہوں خواہ تصورات، ایک تجربہ یا ادراک کا دوسرے سے فرق اور تعلق نفس شعور کی حد تک، تو بہر نوع وہی رہیگا، جو شعور میں آتا ہے، اور اس کے خلاف کا ہم کسی طرح تصور نہ کر سکیں گے، مثلاً وہ وجوبی یا ضروری صداقت جس کو قانون عینیت کہا جاتا ہے کہ "الف" "الف" ہے، اس کے معنی یہ ہوتے ہیں، کہ وہ ادراک جس کو "الف" کہا جاتا ہے، اسکو ہمیشہ "الف" ہی کہا جائے گا، علیٰ ہذا اس صداقت کے، کہ دو مستقیم خط کسی جگہ کو گھیر نہیں سکتے، معنی یہ ہوتے ہیں، کہ نہ ہم کو ایسا ہونا یاد ہے، اور نہ آیندہ ایسا ہونے کی توقع قائم کر سکتے ہیں، میرے ذہن میں اس وقت اس وجوبی صداقت کا خیال موجود ہے، جس کا انکار کرنا خود انکار شعور کو مستلزم ہوگا[1]" اسی طرح سرخ اور نیلے میں فرق اور اختلاف کا جو خیال یا شعور میرے ذہن میں پایا جاتا ہے، اس کا انکار بھی نفس اس شعور ہی کا انکار ہو جائے گا، بقول ڈیکارٹ ہم ہر شے سے انکار کر سکتے ہیں، مگر نفس اپنے کسی خیال یا شعور سے کہ میں فلاں بات کا خیال کر رہا ہوں، یا مجھ کو اس کا شعور ہو رہا ہے، انکار کی کیا صورت ہے،

امور واقعیہ اور علائق تصوریہ کی تقسیم اور تفریق بجائے خود صحیح ہو یا غلط، لیکن ہیوم کی بحث تعلیل (علت اور معلول۔) کا تعلق بہرحال صرف اس سے ہے کہ ہم جن چیزوں میں علت اور معلول کا رابطہ اور علاقہ سمجھتے

[1] مجموعہ مضامین ہکسلے، جلد ۶ صفحہ ۱۷۱

ہیں، اُن میں نہ علت میں کوئی ایسی شے پاتے ہیں، جس کی بنا پر دعوی کرسکیں، کہ اس سے وجوباً اور ضرورۃً فلاں معلول کو ظاہر ہونا چاہئے، اور نہ معلول میں کوئی ایسی شے پاتے ہیں، کہ اس کو لازماً فلاں علت کا نتیجہ ہونا چاہئے،

تم کسی کے سامنے خواہ وہ کتنا ہی ذہین اور طباع شخص ہو ایک بالکل ہی نئی چیز رکھدو، پھر دیکھو کہ وہ اس کے نفس صفات پر غور و خوض میں لاکھ سر مارے، اور اپنی ساری دقت نظر صرف کر ڈالے لیکن خالی ان صفات سے اس چیز کے اندر نہ کسی علت کا پتہ چلا سکے گا، نہ معلول کا، فرض کرو کہ کوئی شخص پہلے پہل پانی دیکھے، تو کیا وہ محض اسکی رقیق اور شفاف ہونے کی صفتوں سے یہ نتیجہ نکال لیگا، کہ اس میں ڈوبنے سے لازماً دم گھٹ جانا چاہئے، یا آگ کی خالی روشنی اور حرارت سے یہ اخذ کر سکے گا، کہ یہ جلا کر خاک کر دیگی، مقناطیس کو دیکھکر صرف عقل اور قیاس سے یہ کون بتا سکتا ہے، کہ اس میں کشش کی طاقت ہو گی، یا روٹی کی صرف محسوس صفات سے یہ کون حکم لگا سکتا ہے کہ یہ آدمی کی غذا تو ہو سکتی ہے، لیکن شیر کی نہیں،

اگر پانی کے بجائے پتھر پر چلنے سے ہم کو یہ تجربہ ہوتا، کہ اس میں آدمی ڈوب جاتا ہے، اور پانی پر اسی طرح دوڑتے ہوئے چلنے کا تجربہ ہوتا جس طرح آج زمین یا پتھر پر ہوتا ہے، تو کیا ہم یہ کہتے اور نہ سمجھتے، کہ پانی یا رقیق شے کے برخلاف پتھر یا سخت مٹی کا خاصہ غرق کر دینا ہے، یا اگر شیر گھاس کھاتا اور بکری گوشت تو کیا ہم کسی عقلی اور حسی شہادت کے زور سے یہ دعوی کر سکتے تھے، کہ نہیں شیر کی غذا گوشت اور بکری کی گھاس ہونی چاہئے، یا مقناطیس کے بجائے سنگ مرمر میں اگر ہم کشش پاتے تو کیا کسی طرح بھی کہہ سکتے تھے کہ نہیں سنگ مرمر میں ہرگز کشش نہ ہونی چاہئے، مقناطیس ہی میں ہونی چاہئے،

"معلوم ہوا کہ مختلف واقعات میں باہم لزوم اور ضرورت کا تصور کسی ایک واقعہ اور مثال کے الٹنے پلٹنے سے کسی طرح نہیں حاصل ہو سکتا، بلکہ ایک ہی قسم کی بہت سی ایسی مثالیں سامنے آنے سے پیدا ہوتا ہے، جن میں ایک واقعہ دوسرے کے ساتھ برابر ملحق رہا ہو، لیکن ان مثالوں کی کثرت سے

کوئی ایسی نئی اور مختلف بات نہیں مل جاتی، جو ایک مثال میں نہ ملتی ہو، بجز اس کے کہ یکسان جزئیات کے بار بار اعادہ اور تکرار سے عادۃً ذہن ایک واقعہ کے ظہور سے دوسرے کا جو معمولاً اس کے ساتھ رہا ہے، متوقع ہو جاتا ہے، اور یقین کر لیتا ہے کہ اس کے بعد وہ بھی وجود میں آئے گا، لہٰذا یہی ارتباط جو ہم خود اپنے ذہن میں محسوس کرتے ہیں یعنی تخیل کا بر بنائے عادت، ایک واقعہ سے دوسرے کی طرف منتقل ہو جانا، وہ احساس یا ارتسام ہے جس سے ہم قوت و لزوم یا رابطہ ضروری کا تصور حاصل کرتے ہیں بس اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوتا، ہر پہلو سے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھ لو، اس انتقالِ ذہن کے علاوہ لزوم اور قوت کے تصور کیلئے تم کو کوئی اور اصل یا ماخذ نہیں مل سکتا۔..... پہلی دفعہ جب آدمی نے دیکھا ہوگا، کہ دھکے یا دفع سے حرکت پیدا ہوئی، مثلاً بلیرڈ کے دو گیندوں کے ٹکرانے سے، تو یہ حکم وہ ہرگز نہ لگا سکتا ہوگا، کہ ان میں سے ایک واقعہ دوسرے کے ساتھ لزوماً اور وجوباً وابستہ ہے، بلکہ فقط اتنا کہہ سکتا ہوگا کہ اس کے ساتھ الحاق رکھتا ہے لیکن جب وہ اس طرح کی متعدد مثالیں یا واقعات دیکھتا ہے، تو پھر دونوں کی باہمی وابستگی کا فتویٰ صادر کر دیتا ہے، کیا فرق ہو گیا جس نے وابستگی کا یہ نیا تصور پیدا کر دیا؟ اس کے سوا کچھ نہیں، کہ اب وہ اپنے متخیلہ میں ان واقعات کو باہم وابستہ محسوس کرنے لگا ہے، اور ایک کے ظاہر ہونے پر دوسرے کی پیشین گوئی کر سکتا ہے لہٰذا جب ہم کہتے ہیں کہ ایک شے دوسری سے وابستہ ہے، تو مراد صرف یہ ہوتی ہے، کہ ہمارے ذہن یا متخیلہ میں انھون نے ایسی وابستگی حاصل کر لی ہے کہ ہم ایک سے دوسرے کا وجود مستنبط کرتے ہیں[1]؛

"علت کی صحیح تعریف و تحدید ناممکن ہے، یکسان واقعات ہمیشہ دوسرے یکساں ہی واقعات

---

[1] فہم انسانی ص۸۵،

کیا تعلق ہے، یہ ایک تجربہ ہے، جس کے مطابق علت کی تعریف یہ ہو سکتی ہے، کہ وہ ایک ایسی چیز کا نام ہے، جس کے بعد دوسری چیز ظاہر ہوتی ہے، اور تمام چیزیں جو پہلے سے مماثل ہیں، ان کے بعد ہمیشہ ایسی ہی ایسی چیزیں وجود میں آتی ہیں، جو دوسری سے مماثل ہوتی ہیں" بالفاظ دیگر یوں کہو کہ "اگر پہلی چیز نہ پائی جائے تو دوسری کبھی نہ پائی جائے گی" اسی طرح ایک دوسرا تجربہ یہ ہے، کہ علت کے سامنے آنے سے عادت کی بنا پر ذہن ہمیشہ تصور معلول کی طرف دوڑ جاتا ہے، جس کے مطابق علت کی ہم ایک اور تعریف یہ کر سکتے ہیں، کہ "وہ نام ہے ایک چیز کے بعد دوسری کے اس طرح ظاہر ہونے کا، کہ پہلی کے ظہور سے ہمیشہ دوسری کا خیال آجائے" گویہ دونوں تعریفیں ایسے حالات سے ماخوذ ہیں، جو نفس علت سے خارج ہیں، تاہم ہمارے پاس اس کا کوئی چارہ کار نہیں، نہ ہم علت کی کوئی ایسی حد تام بیان کر سکتے ہیں، جس سے اس کے اندر کسی ایسی شے کا سراغ مل جائے جو اس میں اور معلول میں موجب ربط ہوئی ہو، اس ربط کا ہم کو قطعاً کوئی تصور نہیں حاصل، بلکہ جب ہم اسکو جاننا چاہتے ہیں تو صاف طور پر یہ بھی نہیں جانتے کہ کیا جاننا چاہتے ہیں، مثلاً ہم کہتے ہیں، کہ فلاں تار کی لرزش فلاں آواز کی علت ہے، لیکن اس سے کیا مراد ہوتی ہے؟ یا تو یہ کہ "اس لرزش کے بعد یہ آواز ظاہر ہوتی ہے، اور اسی طرح کی تمام لرزشوں کے بعد ہمیشہ اسی طرح کی آوازیں ظاہر ہوتی رہی ہیں" یا پھر یہ کہ "اس لرزش کے بعد یہ آواز ظاہر ہوتی ہے، اور ایک کے ظہور کیساتھ ہی ذہن فوراً دوسری کے احساس کا متوقع ہو جاتا ہے، اور اس کا تصور پیدا کر لیتا ہے" علت اور معلول پر بحث کی بس یہی دو راہیں ہیں، جن کے علاوہ ہم کچھ نہیں جانتے[1]

جس طرح نفس اشیا یا محسوسات کے اندر ہم کو کسی علیت، قوت، اور خاصیت یا باہم کسی ربط او

---

[1] فہم انسانی ص۰۶۳،

وابستگی کا مطلق کوئی سراغ نہیں ملتا، اسی طرح خود اپنے افعالِ ذہن یا احوالِ شعور پر غور وفکر کرنے سے بھی اس کا کوئی نشان نہیں پاتے۔ بلاشبہ جب ہم ہاتھ اٹھانیکا ارادہ کرتے ہیں، تو وہ اٹھ جاتا ہے، ہاتھ ہی کیا جب ہم چلنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو ارادہ کے محض اسی ایک ذہنی فعل یا شعور سے ہمارا پانچ چھ فٹ کا سارا جسم حرکت میں آجاتا اور چلنے لگتا ہے، ہم نے لکھنے کا ارادہ کیا نہیں کہ انگلیاں حرکت میں آکر قلم کو چلانے لگیں، یہ ہر وقت کا ایک پیش پاافتادہ تجربہ ہے، لیکن ایسا کیونکر ہوتا ہے ؟ ارادہ کی خالی ایک نفسیاتی جنبش میں کیا ایسا جادو ہے کہ دو گز کا جسم دوڑنے لگتا ہے، اس راز کو کون کھول سکتا ہے ؟

"کہا جاسکتا ہے کہ ہم کو ایک باطنی قوت کا ہر آن شعور ہوتا رہتا ہے، کیونکہ ہم محسوس کرتے ہیں کہ محض اپنے ارادہ سے اپنے اعضائے جسم کو حرکت دے سکتے ہیں، یا اپنے ذہنی قویٰ سے کام لے سکتے ہیں، ارادہ کا عمل ہمارے اعضا میں حرکت یا ذہن میں نیا تصور پیدا کر دیتا ہے، ارادہ کے اس اثر کو ہم خود اپنے شعور سے جانتے ہیں، لہذا یہیں سے ہم قوت یا انرجی کا تصور حاصل کرتے ہیں، ......"[1]

"بیشک ہم کو ہر لحہ اس کا شعور ہوتا رہتا ہے، کہ ہمارے جسم کی حرکت ہمارے ارادہ کی تابع ہے، لیکن وہ ذریعہ جس سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے، وہ انرجی جس کی بدولت ارادہ سے ایسا عجیب وغریب فعل صادر ہوتا ہے، اسکے شعور واحساس سے ہم اسقدر دور ہیں، کہ انتہائی کوشش تحقیق پر بھی ہمیشہ ہمارے علم کی گرفت سے باہر ہی رہے گی"[2]

"کوئی اصول بھی اتنا پر اسرار نہیں، جتنا کہ روح کا جسم کیسا تھا اتحاد جس کی بنا پر مانا جاتا ہے کہ کوئی نامعلوم جوہر روحانی جوہر مادی پر اس طرح موثر ہے، کہ لطیف سے لطیف خیال کثیف سے کثیف مادہ پر عمل کرتا ہے، اگر ہم کو یہ قدرت حاصل ہوتی کہ ہمارے اندر کسی مخفی خواہش

---

[1] فہم انسانی ص ۱، ۵۲، ۵۳

یا ارادہ سے پہاڑ چلنے لگتے، یا سیاروں کی گردش ہمارے قابو میں آجاتی، تو وہ بھی اس سے زیادہ غیر معمولی یا فوق الفہم بات نہ ہوتی، جتنا کہ روح کا جسم پر عمل ہے[1]،

ایک طرف تو ارادہ کی پراسراری کا یہ عالم ہے، کہ اگر اس سے پہاڑ چلنے لگیں یا سیارے رک جائیں تو یہ بھی کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی، دوسری طرف اسکی بے بسی یہ ہے کہ خود اپنے جسم کے تمام اعضاء پر بھی مساوی قدرت نہیں حاصل، نہ ہم اس اختلاف کا سبب بجز تجربہ کے کچھ اور بتا سکتے ہیں، کہ ارادہ زبان اور انگلیوں کی حرکت پر تو قابو رکھتا ہے، لیکن قلب اور جگر کی حرکت پر اس کا کوئی بس نہیں،؟ حالانکہ اگر خود اس قوت کا ہم کو کوئی علم یا شعور ہوتا، جو زبان اور انگلیوں کو متحرک کر سکتی ہے، مگر قلب اور جگر پر اختیار نہیں رکھتی، تو یہ سوال ہرگز نہ پیدا ہوتا، کیونکہ اس صورت میں ہم تجربہ سے قطع نظر کرکے بتا سکتے، کہ ارادہ کی حکومت اعضائے جسم پر ایک خاص دائرہ کے اندر ہی کیوں محدود ہے[2]؟

یہ طویل اقتباسات ہیوم کے نظریۂ علت و معلول کی قریباً ساری تفصیلات اور تمام اجزاء کا نچوڑ ہیں، جنکو مختصراً حسب ذیل نتائج میں پیش کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ نفس اشیاء (اگر ان کا وجود ہو بھی) میں نہ کسی قسم کی علیت ہے، نہ قوت، نہ خاصیت، نہ فعل، نہ اثر یا کم از کم ہم کو ان کے ہونے کا قطعاً کوئی علم نہیں، نہ ہو سکتا ہے،

۲۔ اسی طرح احوال شعور یا ارادہ کے اندر بھی ہم کو کسی قوت، علیت یا اثر جی کا مطلقاً علم و ادراک نہیں،

۳۔ باقی جس چیز کو ہم علیت یا قوت کہتے اور سمجھتے ہیں، اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں، کہ گذشتہ تجربات میں ایک خاص قسم کا واقعہ دوسرے خاص قسم کے واقعہ کے بعد ہمیشہ علی الاتصال ظاہر ہوتا آیا ہے، جس کے محض بربنائے عادت آیندہ بھی ذہن اسی کا متوقع ہو جاتا ہے، اور ایک کے ظہور سے دوسرے کے ظہور کی پیشین گوئی کر سکتا ہے،

---

[1] فہم انسانی ص ؟ ، [2] ایضاً ص ؟

۴۔ علت اور معلول میں باہم جو وجوب اور لزوم ہم محسوس کرتے ہیں، اس کا تصور تمام تر اسی ذہنی عادت کے ارتسام سے ماخوذ ہے، دوسرے لفظوں میں یوں کہو، کہ علیت اور قوت یا وہ وجوب اور ضرورت جو علت اور معلول کے مابین ہم پاتے ہیں، وہ نہ خود اشیا کے اندر کوئی واقعہ ہوتا ہے، نہ احوالِ شعور یا ارادہ کے اندر، بلکہ وہ ہمارے ذہن اور تخیل کے ایک خالص عادی ربط اور ایتلاف کا نام ہے،

۵۔ لازماً جس چیز کو قانونِ فطرت کہا جاتا ہے، وہ خود اشیا کی فطرت کا کوئی قانون نہیں، بلکہ کلیۃً ہمارے ذہن کی فطرت کا ایک قانون ہے،

۶۔ اور اس لئے خود اشیا میں بالذات نہ ہم کسی بات کو خلافِ فطرت کہہ سکتے ہیں، اور نہ اس کے وقوع کو بالذات محال اور ناممکن قرار دے سکتے ہیں،

۷۔ لیکن ان سب سے اہم اصلی اور کلی نتیجہ جو نکلتا ہے، وہ ارتیابیت یعنی فلسفہ کی ناکامی اور نارسائی کا ہے، جسکو خود ہیوم ہی کی زبان سے سننا چاہیئے،

"کوئی شے اپنے نتائج سے زیادہ ارتیابیت یا تشکیک کی موید نہیں ہو سکتی جس سے انسانی عقل اور صلاحیت کی کمزوری اور نارسائی کا راز فاش ہوتا ہو،

زیرِ بحث مسئلہ سے بڑھ کر ہماری عقل اور فہم کی حیرت انگیز کمزوری کی اور کون سی مثال پیش کی جا سکتی ہے؟ کیونکہ اشیا کے باہمی علائق میں اگر کسی علاقہ کا کما حقہ جاننا ہمارے لئے از بس اہم ہے، تو وہ یقیناً علت اور معلول کا علاقہ ہے۔ واقعات اور موجودات سے متعلق ہمارے سارے استدلالات اسی علاقہ پر موقوف ہوتے ہیں، صرف یہی ایک ذریعہ ہے، جس کی بدولت ہم ان چیزوں پر کوئی یقینی حکم لگا سکتے ہیں، جو حافظہ یا حواس سے دور ہیں، تمام علوم کی اصلی غرض و غایت فقط یہی ہے، کہ علل و اسباب کو جان کر آیندہ کے واقعات کو قابو اور انضباط میں لایا جا سکے، اسی لئے ہماری ساری فکر و کاوش ہمہ وقت اسی علاقہ پر مصروف رہتی ہے، با این ہمہ اس کی نسبت ہمارے

تصورات اتنے ناقص ہیں، کہ بجز چند خارجی اور سطحی باتیں بیان کر دینے کے علت کی صحیح تعریف ناممکن ہے[1]"

بہ چلئے انسانی علم اور یقین کا یہ سہارا بھی ختم ہوا،

نہ ہم رنگ و روشنی، آواز و مزہ، سردی و گرمی، نرمی و سختی، شکل و صورت، وزن و امتداد وغیرہ حواسی ادراکات کی محض شعوری حیثیت کے آگے کچھ جانتے اور بتا سکتے ہیں، کہ ان کا محل و منشا کوئی خارجی یا مادی جوہر ہے، نہ خود اپنے ذہنی یا شعوری احوال، فکر و ارادہ، محبت و نفرت، رنج و راحت وغیرہ مختلف کیفیات شعور کا نفس شعور کے علاوہ کوئی غیر مادی یا روحانی محل و منشا معلوم، بس لے دے کر صرف شعوری ادراکات و کیفیات گویا ایک معلق صورت میں رہجاتی ہیں، جو نہ زمین میں ہیں نہ آسمان میں یعنی نہ ان کے مادہ میں پائے جانے کا علم ہے، نہ روح میں ہونے کا یقین،

ایک آخری سہارا یہ رہجاتا تھا، کہ ان معلق احساسات اور تصورات میں باہم ایک حقیقی ربط اور تعلق بہرحال پایاجاتا ہے، جس کا نام علت اور معلول کا لزومی اور ضروری تعلق تھا، مگر یہ لزوم بھی تمامتر ہمارے متخیلہ یا واہمہ کی خلاقی کا ایک کرشمہ نکلا جس کے سوا نہ علت کے اندر کچھ حقیقت معلوم ہے، نہ معلول کے اندر، نہ اشیا کے خارج میں (اگر ہوں) کہیں اس لزوم اور وجوب کا نشان ملتا ہے، نہ افعال باطن میں،

ہیوم کی اس ارتیابیت کو کانٹ صرف ماورائے تجربہ چیزوں تک نارسائی سمجھا، لیکن در اصل ہیوم جس نتیجہ پر پہونچا، یا ہم کو پہونچاتا ہے، اس کی رو سے عقل تجربہ کی دنیا میں بھی معزول ہو جاتی ہے، اور اسکے نزدیک تجربات کی دنیا میں بھی عقل کی نہیں، بلکہ ایک غیر عقلی عادت کی حکومت ہے؛

درحقیقت ہیوم کی یہ ارتیابیت خود تجربیت ہی کی تکمیل اور اس کا لازمی نتیجہ ہے، حواس کے فراہم کردہ منتشر ادراکات میں نفس عقل قطعاً کوئی جوڑ اور ربط نہیں پیدا کر سکتی، نہ ان پراگندہ ادراکات اور تصدیقات کے

---

[1] فہم انسانی باب فصل ۲،

آگے ایک قدم اٹھا سکتی ہے، گویا شے بذات خود اور صداقت کا خیال ہی سرے سے پادر ہوا جاتا ہے، کائنات خارجی کا وجود جو نوع انسان کا ابتدائی اور عالمگیر مسلّمہ ہے، یہ تو فلسفہ کے نہایت ہلکے چھینٹے سے بہ جاتا ہے، اب رہے نرے تصورات، ان کے مابین بھی جب عقل کسی حقیقی ربط اور علاقہ کی سراغ رسانی کر عاجز ٹھہری تو سارا فلسفہ ہی فنا ہو جاتا ہے، " (انسائیکلوپیڈیا)

ظاہر ہے کہ جب وہ ایک ہی ذریعہ جس کی بدولت ہم حواس سے آگے کوئی قدم اٹھا سکتے تھے، ایسا ناکارہ بلکہ بے معنی ہے، کہ اس کے کوئی معنی ٹھیک ٹھیک نہیں سمجھے سمجھائے جا سکتے، تو پھر یہ فلسفہ اور مابعد الطبیعیات کی ناکامی کیا قطعًا اس کی موت کا اعلان ہے، اس لئے کہ فلسفہ خصوصًا فلسفہ مابعد الطبیعیات نے تو اپنا سب سے بڑا کارنامہ یہی بتایا تھا کہ وہ ہم کو احساسات اور ادراکات سے "مابعد" اور ماورار بلکہ وراء الوراء کی سیر کرانا چاہتا ہے، وہ صرف علتوں ہی کی نہیں، بلکہ تمام علتوں کی علت اور سب غیبوں کے غیب کی خبر لگاتا ہے، وہ علت اور معلول، زمان اور مکان، مادہ اور روح کے بھیدوں کو کھولتا ہے، خلاصہ یہ کہ ہستی کے سارے راز کو بے نقاب کر دینا اس کا اصلی کام تھا، مگر معلوم ہوا کہ ہم پیاس کی بدحواسی میں سراب کی طرف دوڑے جا رہے تھے، اور ہزاروں سال کی کوشش محض ایک عبث کاوش تھی ورنہ ہم کبھی اس قابل ہو ہی نہیں سکتے، کہ علت العلل کی کوئی تشفی بخش توجیہ یا عقدہ کشائی کر سکیں، کیونکہ انتہائی اصول اور مبادی کا دروازہ انسانی علم اور تحقیق کے لئے قطعًا بند ہے، کشش ثقل، التصاق اجزا، حرکت، دفع وغیرہ بس یہی کائنات فطرت کے وہ آخری اصول و علل کہے جا سکتے ہیں، جہاں پہونچکر ہمارے علم اور انکشاف کی رسائی ختم ہو جاتی ہے، "مکمل سے مکمل فلسفہ طبیعی بھی صرف یہ کرتا ہے، کہ ہمارے جہل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے، جس طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے، کہ ہمارے اس جہل کے وسیع حصوں کی پردہ دری کر دیتا ہے" مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی نہیں، صرف ہمارے جہل کی پردہ دری کرتا ہے، اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے، تو انسان کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا دیکھنا دکھانا، جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود

بار بار دوچار ہونا پڑتا ہے[1]

جب ہم اس ثک کا کوئی تشفی بخش جواب نہیں دے سکتے، کہ ہزاروں بار کے تجربہ کے بعد ہم کیوں یقین کرنے لگتے ہیں، کہ اگر پتھر کو اوپر پھینکا جائے، تو وہ لوٹ کر نیچے گر پڑے گا، اور آگ جلا دیگی، تو کیا کائنات کے آغاز اور انجام اور فطرت کی ابتدار کے متعلق ہم کبھی بھی قطعی اور تشفی بخش نظریات قائم کرسکتے ہیں[2] ؟؟

"چراغ کے نیچے اندھیرا" اس مثل کا نہایت حسرتناک تجربہ خود انسان کے اندر بہت زیادہ ہوتا رہتا ہے، کہ وہ اپنی عقل اور علم کی روشنی سے جو کچھ اور جہانتک دوسروں کو دکھا دیتا ہے، بار ہا خود نہیں دیکھتا، کیسی بوالعجبی ہے کہ "انسانی فہم" جس کتاب کی تحقیق کا خاتمہ صرف "انسانی نافہمی" پر ہوتا ہے، اسی میں "خدا و آخرت، جبر و قدر جیسے کائنات کے آغاز اور انجام" سے متعلق ماورائی مباحث پر مستقل ابواب موجود ہیں، جن میں کھلے چھپے کہیں اپنے اور کہیں دوسروں کے پردے میں نظریات قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور تو اور جس کتاب میں انکار معجزات کے سب سے بڑے سہارے قانون فطرت اور قانون علت یا خود اشیا کے اندر کسی قوت و خاصیت کی موجودگی کے یقین کو ہمیشہ کے لئے دفن کیا گیا ہے، اُسی کے پورے ایک باب میں معجزات کا نہایت شد و مد سے انکار ہے[3]!

پھر اس کتاب کے علاوہ نفس مذہب پر، جس کی نوعیت ہی تمامتر مابعد الطبیعیاتی اور ماورائی ہے، اور جس کا سارا تعلق ہی کائنات کے "آغاز و انجام" سے ہے، اس "مذہب کی طبعی تاریخ" کے نام سے ایک الگ رسالہ یا مقالہ لکھا گیا ہے، جس میں فطرت شناسی اور تاریخ دانی کی یہ داد دی گئی ہے، کہ مذہب کی اصل و فطری صورت شرک اور بت پرستی ہے، توحید اور خدا پرستی بعد کی پیداوار ہے، باقی ضمناً تو ایسے مذہبی مباحث پر خدا جانے کتنی جگہ اظہار رائے ملیگا، جس میں اس ساری "ملائم و معتدل ارتیابیت" کی تردید ہوتی جاتی ہو کہ "ہم اپنی

---

[1] فہم انسانی، باب ۴، فصل ۱۔ [2] ایضاً باب ۱۲، فصل ۲، [3] اس بوالعجبی کا اگر پورا تماشا دیکھنا ہو تو سیرۃ النبی جلد سوم مطبوعہ دار المصنفین کا مقدمہ دیکھنا چاہئے، [4] The Natural History of Religion.

تحقیقات کے دائرہ کو فقط انہی مباحث تک محدود رکھیں جو انسان کی تنگ اور محدود سمجھ کے مناسب ہیں"،

اس تنگ اور محدود سمجھ میں بھی کم از کم ایک بار اگر کوئی بات آئی تھی، تو وہ یہ کہ "سارا کارخانہ فطرت اپنے اندر سے ایک صاحب عقل خالق کی شہادت دے رہا ہے" اور کوئی عقلمند محقق سنجیدہ غور و فکر کے بعد ایک لمحہ بھی سچے دین و مذہب کے ابتدائی اصول کے یقین سے اپنے کو روک نہیں سکتا۔[1]

یا پھر اس "معقول اور معتدل ارتیابیت" کا صحیح نتیجہ یہ ہو سکتا تھا جس پر "فہم انسانی" کا صحیفہ ختم ہوتا ہے، کہ "جہاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے، وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن انکی اصلی و محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے"،

مگر کہیں یہ اعلان بھی ہے کہ "مذہب کی باتیں بیماروں کے خواب کے سوا کچھ نہیں"[2] جس کو بیانات بالا کیساتھ ملا کر پڑھنے کے بعد شاید "سنجیدہ غور و فکر" اور "وحی و ایمان" دونوں سے محرومی کا اعلان کیا جا سکتا ہو، ورنہ کوئی بتلاؤ کہ ہم تبلائیں کیا،

بات یہ ہے کہ جب ایک طرف ارتیابیت کے بھنور میں پھنسکر انسان کی عقل بالکل ڈوب چکی ہو، اور دوسری طرف وحی و ایمان کا سہارا بھی نہ ہو، تو دل اور دماغ کے اس دہرے بیمار کو مذہب کی باتیں بیماروں کے خواب کے سوا نظر ہی کیا آسکتی ہیں، جو بیمار اپنے کو بیمار نہ جانتا ہو، وہ ضرور تندرستوں کو بیمار جانیگا،

آخر میں اصل نتیجہ پر پھر ایک نگاہ ڈال لو، جدید فلسفہ پہلے ہی قدم پر جس سوچ میں پڑ گیا تھا، کہ "میں سوچتا ہوں، اسلئے میں ہوں" اس کے بعد عقل اور فلسفے منطق اور استدلال کی طاقت سے یہ بالکل باہر ہو گیا، کہ وہ پھر اسی سوچ سے ایک قدم بھی باہر نکال سکے، لاک نے بہت زور لگایا کہ کم از کم "صفات اولیہ" کو باہر لا سکے مگر

---

[1] دیکھو ماڈرن تھنکرس ص۹، جس کے مصنف (Edgar Asinger) پروفیسر فلسفہ کو ہیوم کے ان تناقضات کا حل مشکل معلوم ہوتا ہے۔ [2] تاریخ فلسفہ از ٹوئیبر ص۴۲۲،

تم نے دیکھا کہ خود لاک ہی کی دلیل سے برکلے نے ان کو "صفات ثانیہ" کی طرح اندر ہی پہونچا دیا، اور آگے چل کر ساری تاریخ فلسفہ بس ایک گردش پرکار ہو کر رہ گئی، کہ ہر قدم پھر پھر کر اسی سوچ کے دائرہ میں پڑتا رہا،

برکلے کی بے پناہ منطق نے اسی دائرہ کے اندر بند کر کے مادہ کا نام لینے تک کی گنجائش نہ چھوڑی، اور ہیوم نے بعینہ اسی منطق سے جو دوسرا نتیجہ نکل سکتا تھا نکالدیا، کہ اگر مادہ نہیں تو روح بھی نہیں، اس کے بعد رہ کیا گیا، وہی خالی سوچ یا مجرد احساسات و خیالات جو نہ کسی باہر کے مادی جوہر کے آفریدہ ہیں، اور نہ کسی اندر کے روحانی جوہر میں قائم، گویا یونہی آپ ہی آپ ٹنگے ہیں، "میں سوچتا ہوں" کا میں بھی غائب اور نرا سوچ ہی سوچ فلسفہ کے ہاتھ میں رہ گیا،

نیز اس "سوچ" کے مختلف احساسات، خیالات اور ادراکات وغیرہ میں باہم جو ایک ربط اور وابستگی نظر آتی تھی، جسکو علت و معلول کہا جاتا تھا، یعنی ایک کا دوسرے پر لازماً موقوف اور اس کا محتاج ہونا، ہیوم کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ اس علیت و معلولیت، لزوم و احتیاج کے واقعہ کو بھی ایک طرح کی "سوچ" (ذہنی عادت) ہی میں تبدیل کر دیا،

اس طرح ڈیکارٹ سے صرف ہیوم تک ہی آتے آتے فلسفیانہ علم و یقین کے پاس نہ مادہ رہا، نہ روح نہ جسم نہ نفس، نہ میں نہ تو، نہ (انا نہ غیری) نہ علت نہ معلول، نہ قوت نہ خاصیت، نہ لزوم نہ وجوب، نہ اندر نہ باہر، لے دے کر صرف شعوری احوال، شعوری خیالات اور محض خیالات، جو نہ کسی شے کے ہیں اور نہ کسی شخص کے، یعنی وہی نرا "سوچ"

اب اس سے بڑھکر انسانی عقل کی کمزوری اور کور چشمی کا تماشا کیا دیکھئے، کہ دیکھنے کے لئے جتنا زیادہ زور لگاتے ہیں، اتنا ہی زیادہ اور اندھے ہوتے جاتے ہیں،!!

شاید اسی طرح کی "عقل آزمائی" کے بعد کچھ "ہوشیار" دیوانے بنجاتے ہیں،

آزمودم عقل دور اندیش را، بعد ازاں دیوانہ کردم خویش را،

———•———

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی صاحب ندوی

(۲)

اخلاق وسیرت کی تربیت اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تکمیل کے لئے یہ ضروری تھا کہ طالب علموں میں نیک سیرت اور عمدہ اخلاق پیدا کئے جائیں، چنانچہ مشہور علمار کے ایسے بہت سے اقوال ہیں، جن میں طلبہ کو بلند اخلاق کے حصول کی تلقین کی گئی ہے، ابومرزوق حبیب بن شہید متوفی ۱۰۹ھ اپنے صاحبزادے سے فرماتے ہیں،:-

"بیٹا (حصول علم کیساتھ) عالموں اور فقیہوں کی صحبت اختیار کرو، ان سے تعلیم حاصل کرو، تہذیب و شائستگی سیکھو، یہ میرے نزدیک زیادہ باتیں بنانے سے بہتر ہے"،

ابن سیرین فرماتے ہیں،:-

"لوگ جیسے علم حاصل کرتے تھے، ویسے ہی سیرت او اخلاق بھی حاصل کرتے تھے"؛

سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے،:-

"آنحضرت صلعم سب سے بڑی ترازو ہیں، چیزیں آپ ہی کے خلق اور سیرت پر تولی جائیں، جو چیزیں آپ سے مطابق نکلیں، وہ حق ہیں، اور جو آپ سے مخالف ہوں وہ باطل ہیں"،

بعض بزرگون کا قول ہو کہ

"تہذیب اور حسن ادب کا ایک باب پڑھنا علم کے ستر بابوں کے پڑھنے سے زیادہ بہتر ہے"،

حضرت مخلد بن حسین ابن مبارک سے فرماتے ہیں،:-

"ہم لوگ حدیثیں زیادہ حاصل کرنیکے بجائے حسن ادب کے زیادہ حاصل کرنے کے خواہشمند ہیں"[۱]

[۱] تذکرۃ السامع ازص ۲ تا ۱۴،

طلبہ کو اسلام کے تعلیمی نصب العین کی تلقین

اہل علم و اساتذہ طالب علموں کو اسلام کی ان تعلیموں کے مطابق انھیں اپنا تعلیمی نصب العین مقرر کرنے کی ہدایت کرتے تھے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اُسے استادوں کے فرائض میں شمار کیا ہے، کہ وہ طلبہ کو اپنے قول و عمل سے حسن نیت اور اخلاص عمل اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں، انھیں علم کی فضیلتیں بتائیں، اور اچھے مستقبل کی امید دلائیں، اور ان کے سامنے ان کے علم حاصل کرنے کا مقصد بیان کریں کہ

"وہ اپنی تعلیم اور تہذیب کا مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی حاصل کرنا، علم کی اشاعت کرنا، شریعت کو قائم کرنا، حق بات زبان سے نکالنا، اور ناحق باتوں کو روکنا قرار دیں، ...... (ورنہ) اگر نیک نیتی سے علم حاصل نہیں کیا گیا، تو اس علم سے فائدہ اٹھانا ممکن نہیں، کیونکہ حسن نیت ہی سے علم میں برکت حاصل ہونے کی امید کیجاتی ہے"

پھر دوسرے موقع پر طالب علموں سے کہتے ہیں کہ

"طلبہ کو چاہیئے کہ وہ اپنے دل کو ہر قسم کی کھوٹ کپٹ، عداوت، کینہ، بدخلقی، اور بدعقیدگی سے پاک رکھیں تاکہ اس میں علم کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو، اس کی باریکیاں دل میں اتر سکیں، جیسا کہ بعض لوگوں نے کہا علم باطن کی نماز اور دل کی عبادت ہے، اس لئے جس طرح ظاہر کی عبادت، طہارت کے بغیر قبول نہیں اسی طرح باطنی عبادت بھی دل کی پاکی کے بغیر درست نہ ہوگی، حدیث میں آیا ہے، کہ "جسم میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہے، تو جسم بھی تندرست ہے، اور اگر اس میں خرابی آئی، تو سارا جسم ہی خراب ہوگیا، آگاہ رہو کہ وہ دل ہے"

(بخاری کتاب الایمان جلد ۱ ص ۱۳)

سہل کہتے ہیں "قلب میں اس وقت تک روشنی نہیں پہونچ سکتی جب تک اس میں کوئی ایسی چیز موجود ہو، جو خدا کو پسند نہیں ہے"

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ طالب علموں کے حُسن نیت اور اخلاص کے متعلق لکھتے ہیں:-

"پھر طالب علم کے لئے علم کی طلب میں دوسری شرط اسکی نیت کا خالص ہونا ہے، اس سے یہ یقین رکھنا چاہئے، کہ علم کے حاصل کرنے کا مقصد خداوند تعالیٰ کی خوشنودی کی جستجو اس کے حکموں پر عمل، سنت کو زندہ، دل کو روشن اور باطن کو اجاگر کرنا ہے[۵۱]۔

اسی طرح زرنوجی کہتے ہیں:۔

"طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ وہ تحصیل علم سے رضائے الٰہی، اور دار آخرت کی طلب جہل کے ازالہ احیائے دین، اور ابقائے اسلام کی نیت رکھے[۵۲]"

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:۔

"میں نے اپنی نیت سے زیادہ کسی دوسری چیز کی نگرانی نہیں کی، کہ علم کی تحصیل کی غرض میں دنیاوی اغراض جاہ و منزلت کی خواہش، دولت و ثروت کی ہوس، ہمعصروں اور دوستوں میں سربلندی کی تمنا لوگوں کی نگاہوں میں عظمت حاصل کرنے کی آرزو، اور مجلسوں میں ہاتھوں ہاتھ لئے جانے کا خیال شامل نہ ہو جائے، کیونکہ اگر ایسا ہوا تو عمدہ چیز کے بدلہ میں معمولی چیز بکجائیگی"

قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ فرماتے ہیں:۔

"لوگو! اپنے علم سے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حاصل کرنے کی نیت رکھو، میں جب کبھی کسی مجلس میں اس نیت سے بیٹھا کہ خاکسار اور متواضع رہونگا، تو ہمیشہ اس مجلس سے سربلند ہو کر اٹھا، اور جب کبھی میری نیت میں فتور آیا، اور ہم چشموں میں سربلند ہونے کا تصور دل میں آیا تو مجھے اس مجلس سے رسوا ہو کر اٹھنا پڑا، علم بھی عبادتوں میں سے ایک عبادت ہے[۵۳]":۔

نصب العین کی بلندی سے نظر کی بلندی، اسلام کے اس بلند تعلیمی نصب العین کا یہ اثر تھا کہ اس دور کے اہل علم

---

[۵۱] تذکرۃ السامع ص ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۴، امام غزالی نے احیاء العلوم جلد اکتاب العلم میں اسے زیادہ تفصیل سے لکھا ہے، [۵۲] تعلیم المتعلم ص ۴، [۵۳] تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۶۔

نے بڑی بلند نظر پائی تھی، اور اپنی زندگی بڑے استغنا اور قناعت سے گذارتے تھے، اور اپنے علم کی عزت خود کرتے تھے، وزیر جعفر برمکی عیسیٰ بن یونس مقری کے متعلق کہتا ہے:-

"میں نے قاریوں میں عیسیٰ بن یونس کے مثل کسی کو نہیں دیکھا، ان کے سامنے ایک لاکھ درہم پیش کئے گئے، لیکن انھوں نے یہ کہکر واپس کر دیئے، کہ خدا کی قسم اہل علم یہ کہہ سکیں گے کہ میں نے سنت کی اشاعت کرنے کی قیمت کھائی ہے"،

اسی طرح ایک دوسرے موقع پر مامون نے دس ہزار ان کی خدمت میں پیش کئے، لیکن انھوں نے قبول کرنے سے انکار کر دیا[۱]،

سفیان بن عیینہ کا بیان ہے، کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب میں نے ابو جعفر (المنصور متوفی ۱۵۸ھ) سے تھیلی لے لی تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے مسامحت پر عفو چاہتے ہیں"[۲]،

بعض شبہات کا ازالہ اور اسلام میں دیگر علوم کی اہمیت

اسلام کے اس تعلیمی نصب العین سے یہ شبہہ نہ ہو، کہ اسلام نے دوسرے دنیا وی علوم جن کی تمدنی زندگی میں ضرورت پڑتی، اور جن پر انسانی معاشرت، عمرانی ضرورت اور جسمانی آسایش کا مدار ہے، ان کی کوئی اہمیت نہیں دی ہے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک اپنے خطبہ میں کہتے ہیں، کہ

"آٹھویں صدی (دوسری صدی ہجری) میں اسلامی دنیا کے ایک سربرآوردہ عالم کا ذکر ہے کہ اس نے بڑے تذبذب کیا تھ اس بات کا اعتراف کیا کہ فقہ کے علاوہ جس کی بنیاد قرآن کریم پر ہے، اور جو روحانی صحت کا باعث ہی، طب بھی علم کی ایک شاخ ہے جس سے جسمانی صحت قائم رکھنے میں مدد ملتی ہے، ان کے علاوہ اس نے باقی سب علوم کو تفنن طبع کا سامان قرار دیا"،

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۵۵ [۲] تذکرۃ الحفاظ،

یہ شبہ اسلام کے اسی بلند نصب العین کی غلط تاویل سے پیدا ہوا ہے، درحقیقت اسلام کے اس بلند نصب العین کا تعلق علم اور تعلیم کے مقصد اعلیٰ سے ہے، ورنہ اس نے نہ صرف ہمیں دنیاوی، عمرانی، اجتماعی، اور معاشرتی ضرورتوں کے لئے دوسرے علموں کے حاصل کرنے کی اجازت دی، بلکہ بعض موقعوں پر ہمت افزائی کی ہے، اور ان کے تعلیم و تعلم میں دینی حیثیت سے کسی قسم کی مداخلت روا نہیں رکھی ہے، ارشاد نبوی ہے:

اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْیَاکُمْ۔ تم اپنے دنیاوی امور کے زیادہ جاننے والے ہو

وعید کی ان حدیثوں میں بھی جن میں علم کی تحصیل میں دنیاوی غرض کے وابستہ کرنے کی مذمت کی گئی ہے، یہ نکتہ فراموش نہ کرنا چاہئے کہ مومن کی ہر حرکت و جنبش خداوند تعالیٰ کی خوشنودی ہی کے ماتحت رکھی گئی ہے اور ہر کام میں اصل مدار انسانوں کی نیتوں پر رکھا گیا ہے اسلئے اگر کسی دنیوی سے دنیوی علم کی تحصیل بھی مثلاً مخلوق خدا کو فائدہ اور شہر اور وطن کے لوگوں کو آرام پہنچانے اور اہل و عیال کی پرورش کرنے کے لئے اس نیت سے کی جائے، کہ ان کے حقوق ادا کرکے اور انھیں فائدہ پہونچا کر حکم خداوندی بجا لانے کی توفیق حاصل ہوگی، تو بارگاہ الٰہی سے اُسے مقبولیت کی سند عطا ہوگی، اور وہ آخرت میں اجر پانے کا مستحق ہوگا، احادیث میں اس مفہوم کی مختلف روایتیں ہیں، مثلاً اگر کسی شخص نے اپنے بچہ کے منہ میں ایک لقمہ بھی اس نیت سے ڈالا کہ حکم خداوندی پورا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ اس کی نیت کا اجر اسے عطا فرمائے گا، ایک حدیث میں ہے کہ "بہت سے ایسے عمل جو دنیاوی معلوم ہوتے ہیں، وہ حُسنِ نیت سے اُخروی اعمال بن جاتے ہیں، اور بہت سے عمل جو دینی نظر آتے ہیں، وہ نیت کی برائی سے دنیاوی بن جاتے ہیں"۔

علاوہ ازیں وعید کی ان حدیثوں میں سے ابوداؤد میں جو حدیث مروی ہے اس کے متن کے الفاظ یہ ہیں:-

مَنْ تَعَلَّمَ عِلْمًا مِمَّا یُبْتَغٰی بِہٖ جس نے اس علم کو جس سے اللہ کی

وجہ اللہ تعالیٰ لا یتعلمہ الا	مرضی حاصل کیجاتی ہے، اسلئے حاصل کیا کہ اپنی
لیصیب بہ عرضا من الدنیا لم	کوئی دنیوی غرض حاصل کرے، تو وہ قیامت
یجد عرف الجنۃ یوم القیامۃ،	کے دن جنت کی خوشبو بھی نہ پائے گا،

اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے، کہ یہ تمام وعیدیں ان لوگوں کے لئے ہیں جو اشرف علوم یعنی علم دین کی تحصیل میں مصروف ہوں، اور اس سے ان کی کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہو، اسلئے معلوم یہ ہوا کہ صرف علم دین کا کسی دنیاوی غرض سے حاصل کرنا اسلام کی نگاہ میں ناپسندیدہ ہے، ورنہ جہانتک دوسرے دنیاوی علوں کا تعلق ہے بعض اوقات علما نے ان کی تحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ کے طور پر عائد کی ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ نکات تفصیل سے دکھائے ہیں، چنانچہ حدیث نبوی طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم اور اطلبوا العلم ولو کان بالصین پیش کر کے جس علم کی تحصیل ہر مسلم پر فرض ہے، اسکو دکھا کر اس علم کا بیان جس کی تحصیل فرض کفایہ ہے" کے عنوان سے لکھتے ہیں :-

"علوم کی اولاً دو قسمیں ہیں، (۱) علوم شرعیہ (۲) علوم غیر شرعیہ،

علوم شرعیہ سے میری مراد وہ علوم ہیں جو انبیاء کرام علیہم الصلوات کے براہ راست حاصل ہوتے ہیں، ان کی طرف عقل کی رہنمائی اس طریقہ سے نہیں ہوسکتی، جیسے عقل کے ذریعہ علم حساب سیکھا جاتا ہے، نہ وہ تجربہ سے حاصل ہو سکتے ہیں، جیسے علم طب کی تدوین ہوتی ہے، اور نہ محض سننے سے انکا حاصل کرنا ممکن ہے، جیسے علم لغت حاصل کیا جاتا ہے،

اسکے بعد جو علوم غیر شرعیہ ہیں، ان میں بعض پسندیدہ ہیں، اور بعض ناپسندیدہ، اور بعض ایسے جو صرف درجۂ مباح رکھتے ہیں،

۱- علوم پسندیدہ وہ ہیں جن سے دنیاوی امور کی مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں، جیسے علم طب اور حساب وغیرہ،

پھر ان علوم پسندیدہ میں اپنے درجوں کے لحاظ سے بعض ایسے ہیں جنکا حاصل کرنا فرض کفایہ ہے بعض ایسے ہیں جنھیں

حاصل کرنا افضل ہو، اور بعض ایسے ہیں، جنکو حاصل کیا جاسکتا ہے، مگر ان کی تحصیل فرض نہیں ہے،

پھر ان میں سے فرض کفایہ ہر وہ علم ہو، جس سے ہم دنیاوی زندگی اور کاروبار کے قائم اور باقی رکھنے میں بے پروا نہیں ہوسکتے، جیسے علم طب ہے، کہ اس کی تحصیل صحت کے باقی رکھنے کے لئے لازمی ہے، یا علم حساب ہے، کہ مختلف معاملوں وصیتوں اور ترکہ کی تقسیم میں اسکی ضرورت ہوتی ہے، اگر کوئی شہر ان علوم کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے، تو شہر والوں کو دقت پیش آئے گی اور جب کوئی ایک شخص بھی ان کا جاننے والا ان کے درمیان پیدا ہو جائے تو اس کے ذریعہ سے شہر کی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں، اس لئے یہ فرض اس کی موجودگی میں دوسروں کو ذمہ سے ساقط ہو جائے گا، اسی طرح مختلف پیشے کاشتکاری، یا غبانی، پارچہ بافی، سیاسی تجارت اور خیاطی وغیرہ ہیں، کہ اگر ان میں سے کسی پیشہ والے سے کوئی شہر خالی ہو جائے، تو زحمت پیش آئے، اور بعض پیشہ والوں کی عدم موجودگی میں ہلاکت تک کی نوبت آجائے، پس جس نے بیماری اتاری، اس نے دوا بھی بتائی، اور ان کے استعمال کے طریقے بتائے، اور ان کے مہیا کرنے کے اسباب پیدا کئے، اس لئے ان پیشوں کو چھوڑنا جائز نہ ہوگا۔

اور بعض علوم جن کا حاصل کرنا اگرچہ فرض نہیں، مگر افضل ہے، وہ جیسے علم حساب و طب میں باریکیاں پیدا کرنا ہو، کہ انسان ان سے مستغنی ہوسکتا ہے لیکن ان کی تحصیل سے فائدہ پہونچنے کے پہلوؤں میں اضافہ ہوتا ہے،

ناپسندیدہ علوم میں سحر شعبدہ بازی، اور نظر بندی وغیرہ ہیں، اور علم مباح میں جیسے ایسے اشعار کا پڑھنا جن میں رکاکت نہ ہو یا علم تاریخ وغیرہ سے دلچسپی رکھنا ہے[۱]"

پھر امام غزالی نے بھی ایک دوسرے موقع پر بھی "علم" کے مصداق میں مختلف علموں اور پیشوں کو داخل

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۱،

کیا ہے ان کے بیان کا خلاصہ حسب ذیل ہے، کہتے ہیں:-

"جب علم تمام امور میں افضل ہے، تو اس کا حاصل کرنا افضل چیز کا حاصل کرنا ہے، اور اس کی تعلیم دینا افضل چیز کا مہیا کرنا ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے، کہ انسان کی پیدایش کے مقاصد دین اور دنیا دونوں کے مجموعہ پر مشتمل ہیں، کیونکہ دین کا نظام جبتک دنیاوی نظام قائم نہ ہو، قائم نہیں ہوسکتا، اور امر دنیاوی کا انتظام انسانوں کے کاموں اور پیشوں پر موقوف ہے، اور انسانی پیشے تین قسم کے ہیں،

ایسے پیشے جو عالم کے قیام کے لئے بنیاد کے طور پر ہیں، اور وہ چار ہیں، زراعت انسان کی غذا لئے، پارچہ بافی تن پوشی کے لئے، تعمیر سکونت کی جگہ کے لئے اور سیاست خاندان اور ملک کے انتظام اور معیشت کے اسباب کے مہیا کرنے اور اسکی حفاظت کرنے کے لئے،

۲- دوسرے وہ پیشے جو ان چاروں پیشوں کے لئے آلات اور وسیلے مہیا کریں، جیسے لوہاری اور ندافی (دُھنائی) وغیرہ،

۳- تیسرے وہ پیشے ہیں، جو پہلی قسم کے پیشوں کو مدد پہونچاتے ہیں، جیسے کھانا پکانے، اور سینے پرونے وغیرہ کے پیشے،

ان سب پیشوں میں پہلی قسم کے پیشوں کو فضیلت حاصل ہے، اور ان میں سے بھی سب سے افضل سیاست کا پیشہ ہے جس سے نظم اور ضبط کا وجود عمل میں آتا ہے، اور اس کے ذریعہ سے مخلوق کی اصلاح کیجاتی ہے اور انھیں حق کی راہ دکھائی جاتی ہے،

پیشۂ سیاست کے چار درجے قرار پا سکتے ہیں،

۱- پہلے درجہ میں انبیاء کرام کی سیاست ہے، جو وہ اپنے پیغاموں سے خلق کی رہبری فرماتے ہیں،

۲- دوسرا درجہ خلفاء اور سلاطین کو حاصل ہے، ان کے احکام عوام و خواص پر نظم و انتظام کے لئے جاری ہوتے ہیں، لیکن ان کی حکومت ظاہر پر ہوتی ہے باطن پر نہیں،

۳- تیسرے علمائے کرام ہیں، یہ انبیائے کرام کے وارث ہیں، ان کی حکومت لوگوں کے دلوں پر ہوتی ہے، اور یہ باطن کی اصلاح کرتے ہیں،

۴- چوتھے واعظ ہیں جو صرف عوام کی اصلاح کرتے ہیں،

پس ان پیشوں میں سب سے بڑھ کر پیشہ نبوت کے بعد علم کا فائدہ پہونچانا اور لوگوں کو تہذیب اخلاق سکھانا ہے، اور یہی فن تعلیم کا حقیقی مقصود ہے[۱]"

اس کے ساتھ اسلامی نقطۂ نظر سے علم دین کے حاصل کرنے والوں کے لئے یہ بھی جائز نہ تھا کہ وہ اس علم کی فضیلت پر ناز کرکے دوسرے غیر شرعی علوم کو حقارت کی نظر سے دیکھیں، کیونکہ دنیاوی زندگی میں ان علوم کی ضرورتیں مسلّم تھیں، امام غزالی نے اس بحث پر اس لحاظ سے بھی گفتگو کی ہے، اور نتیجہ کے طور پر دکھایا ہے، کہ علم دین حاصل کرنے والوں کی مثال ان مجاہدوں سے دیجا سکتی ہے، جو جہاد کے میدان میں اپنا تیر تسلی پر لئے دین کی حمایت میں لڑ رہے ہیں، اور دوسرے علوم کے حاصل کرنے والوں کی مثال فوج کے اس دستہ کر دیجائیگی، جو سرحدی قلعوں پر سرحد کی حفاظت کیلئے متعین ہوتا ہے[۲]

علم کی تعلیم و تحصیل انسانی فطرت میں طبعی ہے، دوسری طرف علمائے اسلام میں سے ابن خلدون نے تعلیم و تحصیل کے فن کو تمدنی زندگی میں انسانی طبیعت کے لئے فطری قرار دیا ہے، وہ لکھتا ہے:-

"انسان تمام حیوانوں سے اپنی حیوانیت میں حس، حرکت اور غذا کے لحاظ سے مشارکت رکھتا ہے، اسے حیوانوں سے جو امتیاز حاصل ہے، وہ اس کی قوت فکر کی وجہ سے ہے، اس کے ذریعہ سے وہ اپنی معاش کی تحصیل اور اپنے ابنائے جنس سے اس کے حصول میں تعاون کرتا ہے، اور اس تعاون

---

[۱] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۸، ۹، [۲] ر جلد ۱ ص ۴۰،

کے مہیا کرنے کے لئے اجتماعی ہیئت اختیار کرتا ہے،

وہ اسی قوتِ فکر سے ان پیغاموں کو قبول کرتا ہے، جو انبیاے کرام اللہ تعالیٰ کی طرف سے لاتے ہیں، اوران پر عمل کرتا ہے، اور اپنی آخرت کی بھلائی کے وسیلے اختیار کرتا ہے، وہ ان تمام معاملات میں ہروقت غور و فکر سے کام لیتا رہتا ہے، پل بھر بھی اس سے غافل نہیں ہوتا، اور اسی غور و فکر کے ذریعہ سے علوم پیدا ہوتے ہیں، وہ اس فکر کے ذریعہ اُن ادراکات کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اسے حاصل نہیں رہتے، اس لئے وہ ان لوگوں کی طرف رجوع کرتا ہے، جو اس سے پہلے علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں، یا جن لوگوں کو اس کی معرفت زیادہ حاصل رہتی ہے، یا ان انبیاؑ کی تعلیمات میں ڈھونڈھتا ہے، جو پیشتر گذر چکے ہیں، اوران سے انکی تعلیمات کی تلقین حاصل کرتا ہی، اور ان کے حاصل کرنے اور جاننے کی کوشش کرتا ہی،

پھر اس کی فکر و نظر ایک ایک کر کے حقائق تک پہنچتی ہے، اور جو چیز اس کے سامنے آتی ہے، اسکا مطالعہ کرتا ہے، اور اس کی مشق مسلسل جاری رکھتا ہے، یہاں تک کہ اس حقیقت کے عوارض کے الحاق سے اسے ایک ملکہ حاصل ہوتا ہے، اسوقت اس حقیقت کو جو چیز پیش آتی ہے، اسکے متعلق اس کا ایک مخصوص علم بن جاتا ہے، اور آیندہ نسل اس کے حاصل کرنے کی مشتاق ہوتی ہے، اور لوگ اسکے جاننے والوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور اسی سے فن تعلیم کا آغاز ہوتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ علم و تعلیم انسانی فطرت کے لئے طبعی ہے[1]،

پھر ابن خلدون نے امام غزالی سے زیادہ واضح طریقہ سے علم و تعلیم کو منجملہ دنیاوی پیشوں کے ایک پیشہ قرار دیا ہے، اور اس نے اسے مختلف وقیع دلیلوں سے ثابت کیا ہی[2] اس لئے یہ سمجھنا کہ اسلام اور مسلمانوں کے تعلیمی نصب العین میں صرف مذہبی تعلیم داخل رہی ہے، صحیح نہیں ہے، بلکہ علماے اسلام نے جملہ علوم کو عقلی و نقلی

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۳۰، ۴۳۱، [2] ر ر ۴۳۱، ۴۳۲،

دو بڑی قسموں میں تقسیم کرکے قسم اول یعنی عقلی علوم کی تحصیل انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے ضروری قرار دی ہے، اور نقلی علوم کو ربانی پیغام کی تحصیل، دین و مذہب کی واقفیت اور آخرت کی بھلائی کے لئے حاصل کرنا فرض ٹھہرایا ہے، جیسا کہ امام غزالی کا بیان اوپر گذر چکا، اسی طرح ابن خلدون لکھتا ہے:-

جن علوم پر انسان غور کرتا ہے، اور جن کی تحصیل و تعلیم شہروں میں عام طور پر کیجا سکتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں، ایک انسان کے لئے طبعی ہیں جسے وہ اپنی قوت فکر سے حاصل کرتا ہے اور دوسری نقلی ہیں جسے اسکے وضع کرنے والے سے حاصل کیا جاتا ہے،

قسم اول علوم حکمیہ فلسفیہ ہیں، یہ وہ علوم ہیں جن سے انسان اپنے غور و فکر کی طبیعت کے ذریعہ واقف ہوتا ہے اور اپنے بشری ادراک کے ذریعہ ان کے مسائل اور براہین تک پہونچتا ہے، یہانتک کہ اسکی نظر وسیع ہو جاتی ہے، اور وہ اس حیثیت سے کہ وہ صاحب غور و فکر انسان ہے، اس کے صواب و خطا کی تمیز کرتا ہے،

اور دوسرے وہ وضع کئے ہوئے نقلی علوم ہیں، جو واضع شرعی کی خبر کی بنیاد پر قائم ہیں، اور اس میں عقل کو دخل نہیں ہوتا، بجز اس کے کہ اس کے فروعی مسائل کو اس کے اصول سے عقل و قیاس کے ذریعہ سے ملانے کی ضرورت پڑتی ہے، کیونکہ بعد میں پیش آنے والے جزئیات نقل کلی کے ماتحت اپنی وضع کے وقت درج نہیں کئے جا سکتے، اسلئے قیاسی صورت کے الحاق کی ضرورت ہوتی ہے، لیکن یہ قیاس بھی اصل میں حکم کے ثبوت کیساتھ خبر ہی سے نکلتا ہے، اس لحاظ سے یہ قیاس بھی نقل قرار پائے گا، اور ان تمام نقلی علوم کی شرعی بنیاد کتاب و سنت ہے، جو ہمارے لئے اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے مشروع کیا گیا ہے۔[1]"

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۹، ۴۰۰

(۲)

اسلامی نظام تعلیم کے تین دور

زمانہ کے اعتبار سے اسلامی نظام تعلیم کے تین دور قائم کئے جا سکتے ہیں :-

پہلا دور، عہد رسالت سے دولت اموید کے ابتدائی زمانہ تک،

دوسرا دور عہد اموی سے چوتھی صدی ہجری تک،

تیسرا دور پانچویں صدی سے آٹھویں صدی ہجری تک،

ان تینوں دوروں کی امتیازی خصوصیتیں حسب ذیل ہیں :-

پہلا دور | قرآن مجید جس طرح تمام اسلامی علوم و فنون کا سرچشمہ ہے، ویسے ہی مسلمانوں کے تعلیم و تعلم کی داستان کا آغاز بھی اسی کے نام سے ہوتا ہے، نزول قرآن کے ساتھ اس کی کتابت کی ضرورت پیش آئی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی مرتبہ چند کاتبوں عبد اللہ بن سعید بن عاص رضؓ کو مسلمانوں کو فن کتابت سکھانے کے لئے مقرر فرمایا، اور بعض صحابہ حضرت ابن مکتومؓ و حضرت مصعب بن عمیرؓ مکہ کے قیام کے زمانہ میں باشندگان مدینہ کو قرآن مجید پڑھانے کے لئے مدینہ بھیجے گئے[۱]، پھر مدینہ منورہ پہونچ کر آپ نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر توجہ رکھی، اور نوشت و خواند دونوں سلسلے قائم رہے، غزوۂ بدر کے قیدیوں میں سے جو لوگ لکھنا جانتے تھے، ان کا فدیہ دس مسلمان بچوں کو لکھنا سکھانا قرار پایا[۲]، اسی طرح مسجد نبوی میں اصحاب صفہ کا حلقۂ درس قائم کیا گیا، جس میں ایک شخص قرآن مجید پڑھتا تھا، اور حلقہ کے دوسرے حاضرین اسے توجہ سے سنتے تھے، پھر نئے مہاجرین جو دوسرے مقاموں سے آتے گئے، وہ درس قرآن کیلئے اسی حلقہ میں شریک کئے گئے[۳]،

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۴ ص ۲۹۴، و بخاری کتاب التفسیر آیہ سبح اسم ربک الاعلی [۲] ، جلد ۱ ص ۲۴۶ [۳] ، جلد ۳ صفحہ ۱۳۷،

اس حلقہ کے ماسوا ہر تعلیم یافتہ مسلمان ناخواندہ مسلمان کے لئے معلم تھا، عربوں کے جو وفد دور دور سے مدینہ منورہ آتے، وہ انصار کے مکانوں میں فروکش ہوتے تھے، جہاں انھیں کتاب و سنت کی تعلیم دیجاتی تھی، چنانچہ وفد عبد القیس کا بیان ہے، کہ

"انصار ہمیں ہمارے پروردگار کی کتاب اور ہمارے نبی کی سنت کی تعلیم دیتے تھے"[1]

پھر فتوحات کے بعد جب نظامِ حکومت کی تشکیل ہوئی، اور عمال مقرر ہوکر ولایتوں میں بھیجے جانے لگے، تو آپ نے اُن کا مقصدِ سفر یہ بیان فرمایا، کہ

"یہ بھیجے جاتے ہیں، تاکہ لوگوں کو قرآن اور اسلامی شریعت کی تعلیم دیں"[2]

اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں جب فتوحات کا سلسلہ وسیع ہوا، تو قرآن کی تعلیم کے لئے مستقل معلمین عمال کے ساتھ بھیجے گئے، جیسے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بصرہ کے عامل بنائے گئے تو حضرت عمران بن حصینؓ قرآن مجید و شریعتِ اسلامی کی تعلیم کے لئے ان کے ساتھ کئے گئے، اسی طریقہ سے شام کی فتح کے بعد مختلف شہروں میں عمال کے علاوہ قرآن کی تعلیم دینے والوں کا تقرر ہوا، حضرت عبادہ بن صامتؓ نے معلمِ قرآن کی حیثیت سے حمص میں قیام فرمایا، حضرت معاذ بن جبلؓ فلسطین روانہ ہوئے، اور حضرت ابو درداءؓ نے دمشق میں اقامت اختیار فرمائی،[3] ان معلمین نے نو مفتوح شہروں میں قرآن مجید کی تعلیم کے لئے مکاتب قائم کئے، اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہوگیا، لوگ جوق جوق علم کی تحصیل کے لئے ان کے درس میں شریک ہوتے، حضرت ابو درداءؓ کے متعلق بیان کیا گیا ہے، کہ جب وہ دمشق کی جامع مسجد میں درس کے لئے بیٹھتے تھے، تو طلبہ کا اس قدر ہجوم ہوتا تھا، کہ گویا کسی بادشاہ کے استقبال کے لئے لوگ جمع ہوئے ہیں،[4] صحابہ جہاں بیٹھتے، محفل کی شمع بن جاتے، اور لوگ علم حاصل کرنے کے لئے پروانوں کی طرح ان پر گرتے، ابو ادریس خولانی بیان

[1] مسند ابن حنبل جلد ۳ ص ۴۳۲ [2] استیعاب تذکرہ حضرت معاذ بن جبلؓ عامل یمن [3] اسد الغابہ ترجمہ حضرت عبادہ ابن صامتؓ، [4] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ حضرت ابو درداءؓ

کرتے ہیں کہ وہ ایک مرتبہ حمص کی مسجد میں گئے، تو ۳۲ صحابہ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے، وہ یکے بعد دیگرے اپنی روائتیں سناتے رہے، اور لوگ ہمہ تن گوش بن کر سنتے رہے[۱]

صحابۂ کرام نے علم حدیث کی اشاعت کی خدمت مستقل طور پر انجام دی، جو جس شہر میں قیام پذیر تھا اس نے وہاں کی مسجد میں روایت و سماع کے لئے حلقہ قائم کر لیا تھا، مثلاً حضرت جابر بن عبد اللہؓ مسجد نبوی میں مستقل طور پر درس دیتے تھے[۲] حضرت ابو درداءؓ دمشق کی مسجد میں بیٹھتے تھے[۳] حضرت حذیفہ بن اسحاقؓ کوفہ کی مسجد میں درس کا سلسلہ قائم کئے تھے[۴]

کتاب و سنت کی تعلیم و اشاعت کیساتھ جب مختلف نئی صورتوں اور ضرورتوں میں کتاب و سنت پر قیاس کر کے مسائل مستنبط کرنے کی ضرورت پڑی تو ایسے اہل علم متعین کئے گئے، جو اس خدمت کو اپنی دینی اور علمی بصیرت سے انجام دیں اور لوگوں کو مسائل کے استنباط کے طریقے بتائیں، چنانچہ مختلف صحابہ اس خدمت پر مامور ہوئے، اور ان کے ذریعہ علم فقہ کی اشاعت ہوئی، مثلاً حضرت عبد الرحمٰن بن قاسمؓ شام میں[۵] حضرت عبد اللہ بن معقل[۶] اور حضرت عمران بن حصینؓ بصرہ میں[۷] حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ مدائن میں[۸] اور حضرت حبان ابن جبلہؓ مصر میں[۹] اس خدمت پر مامور تھے،

پہلے دور کے تعلیمی خصوصیات، یہ نظام دولت امویہ کے عہد کے ابتدائی دنوں تک جاری رہا، اس دور کے تعلیمی خصوصیات اجمالاً حسب ذیل تھے،

۱۔ علم، قرآن مجید، حدیث اور فقہ میں منحصر تھا، ان کے ماسوا کسی دوسرے علم کی اشاعت نہیں کی گئی،

---

[۱] مسند احمد بن حنبل جلد ۵ ص ۲۲۰، [۲] حسن المحاضرہ جلد ۱ ص ۰ ۷، [۳] تذکرۃ الحفاظ [۴] مسند ابن حنبل جلد ۵ صفحہ ۴۰۳، [۵] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عبد الرحمٰن بن اسری، [۶] اسد الغابہ ترجمہ عبد اللہ بن معقل [۷] تذکرۃ الحفاظ ترجمہ عمران، [۸] یعقوبی جلد ۲ ص ۱۷۳، [۹] تہذیب التہذیب ترجمہ حبان،

۲۔ تعلیم کتابی نہ تھی، قولی اور سماعی تھی،

۳۔ تعلیم کیلئے کوئی معاوضہ لینا یا دینا ممنوع تھا معلّمین کے لئے معیشت کے دوسرے ذریعے تھے، یہانتک کہ ایک مرتبہ ایک مہاجر نے حضرت عبادہ بن صامتؓ کو جن سے وہ قرآن پڑھتے تھے، ایک کمان ہدیہ میں بھیجی، تو آنحضرت صلعم نے اس کے لینے سے منع فرمادیا[1]،

۴۔ استاذ، طالب علموں سے بڑی شفقت اور محبت کا سلوک کرتے تھے، جسکی بہ کثرت مثالیں ہیں۔

۵۔ مسجدیں، تعلیم گاہ کے طور پر استعمال کیجاتی تھیں،

۶۔ علم حدیث کے چرچے سے علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے کا رواج ہوا، خود صحابۂ کرام بھی ایک ایک حدیث کے تحقیق کے لئے ایک دوسرے کے پاس ایک شہر سے دوسرے شہر کو جاتے تھے، ایک مرتبہ آنحضرت صلعم نے کوئی بات بیان فرمائی تھی، اس موقع پر حضرت عقبہ بن عامرؓ اور حضرت سائب بن مخلدؓ حاضر تھے، حضرت سائبؓ کو اس حدیث کے متعلق کچھ شبہہ ہوگیا، تو انھوں نے صرف اس شبہہ کو دور کرنے کے لئے مصر کا سفر کیا، اور وہان پہنچ کر حضرت عقبہؓ سے اس حدیث کی بابت دریافت کیا[2]،

۷۔ علمی سفر کے متعلق یہانتک احتیاط برتی جاتی تھی، کہ اسے خالص تحصیل علم کے لئے ہونا چاہئے تھا، اگر اس میں کوئی دنیاوی غرض وابستہ ہوجاتی، یا کسی شہر میں کوئی پہونچتا، اور ضمنی طور پر کچھ علم حاصل کرنا چاہتا، تو اسے مایوس ہونا پڑتا تھا، ایک مرتبہ ایک شخص حضرت ابو دردآءؓ کی خدمت میں مدینہ سے کسی حدیث کے متعلق دریافت کرنے کے لئے آیا، انھون نے پہلے اس سے یہ اطمینان کرلیا، کہ یہ کسی دنیاوی غرض جیسے تجارت وغیرہ کے لئے نہیں آیا ہے، اسکے بعد اس سے حدیث بیان کی[3]،

دوسرا دور، دوسرے دور کا آغاز دولتِ امویہ میں حضرت عمر بن عبد العزیز کی خلافت کے زمانہ سے ہوتا ہے، علم کی اشاعت میں ان کے عظیم الشان کارنامے ہیں، انہی نے سب سے پہلے حدیثوں کے منتشر سرمایہ کو یکجا کرنے کیلئے

---

[1] ابوداؤد کتاب البیوع باب فی کسب العلم، [2] حسن المحاضرہ جلد ا ص ۱۰۶ [3] مختصر جامع بیان العلم ص ۲۰،

صوبہ کے والیون اور شہرون کے عاملوں کے نام فرمان بھیجے کہ

"احادیث نبویہ کی تلاش کرکے انھیں لکھ لو کیونکہ مجھے علم کے مٹنے اور علماء کے فنا ہونے کا خوف ہی اور صرف رسول اللہ صلعم کی حدیث قبول کیجائے[1]"

چنانچہ اس فرمان کے بموجب احادیث کا قیمتی سرمایہ جمع ہوگیا، سعد بن ابراہیم سے روایت ہی کہ

"ہم کو حضرت عمر بن عبد العزیز نے حدیث جمع کرنے کا حکم دیا، تو ہم نے دفتر کے دفتر حدیثیں لکھ لین اور انھون نے ان کا ایک ایک مجموعہ اپنی حکومت کے تمام حدود میں روانہ فرمایا[2]"

حدیثون کے جمع کرنے کا مقصد صرف فن حدیث کی تعلیم و اشاعت تھا چنانچہ اسی فرمان میں آگے چل کر ہے :۔

"علماء کو چاہئے کہ علم کی اشاعت عام طور پر کرین اور تعلیم کے لئے درس کے حلقوں میں بیٹھیں تاکہ جو لوگ نہیں جانتے وہ جان لیں، کیونکہ علم صرف اسی وقت ضائع ہوتا ہے، جب وہ راز بن جاتا ہی"

ایک دوسرے فرمان میں لکھا :۔

"اہل علم کو حکم دو کہ اپنی مسجدوں میں علم کی اشاعت کریں، کیونکہ حدیثیں فنا ہو رہی ہیں[3]"

حضرت عمر بن عبد العزیز نے نظام تعلیم مین ایک دوسری تبدیلی یہ کی کہ پڑھانے والوں اور بعض اوقات پڑھنے والون کو معاش کی فکر سے آزاد کرکے ان کے لئے مستقل وظیفے جاری کرنے کی ابتدا کی، چنانچہ انھون نے والیوں کو لکھ بھیجا کہ

"جن لوگوں نے دنیا کو چھوڑ کر اپنے کو فقہ کی تعلیم کے لئے وقف کر دیا ہے، ان میں سے ہر ایک کو بیت المال سے سو سو دینار دو، تاکہ وہ لوگ موجودہ حالت میں اس سے مدد حاصل کریں[4]"

---

[1] بخاری کتاب العلم جلد ۱ ص ۲۰، و فتح الباری جلد ۱ ص ۱۷۴، [2] مختصر جامع بیان العلم ص ۳۰، [3] سیرۃ عمر بن عبد العزیز (ابن جوزی) [4] ص ۹۵،

اسی طرح اس عہد میں نادار طلبہ کے لئے بھی وظیفے جاری کئے گئے، جس کا تذکرہ ابن عبد البر نے کیا ہے[۱]

اس کے ماسوا اسی زمانہ سے شروع ہو کر دولت عباسیہ کے ابتدائی زمانہ تک میں مختلف شرعی، ادبی اور عقلی علوم کی تدوین ہوئی، اور غیر زبانوں کے علوم عربی میں منتقل کئے گئے، جس سے تصنیف، تالیف اور ترجمہ کا وسیع سلسلہ قائم ہو گیا، چنانچہ اس عہد تک علوم قرآن، حدیث، فقہ، کلام، مغازی، سیر، تاریخ، ادب، نحو، شعر، طب، فلسفہ، منطق، ریاضیات، اور ہندسہ وغیرہ کی تدوین ہو چکی تھی،

دوسرے دور کے خصوصیات، ان حیثیتوں سے اس دور میں حسب ذیل تعلیمی خصوصیتوں کا اضافہ ہوا:-

۱۔ علوم و فنون کا سرمایہ سینوں سے نکل کر سفینوں میں آیا،

۲۔ تالیف، تصنیف اور ترجمہ کا سلسلہ قائم ہوا،

۳۔ کتب خانہ کا قیام عمل میں آیا،

۴۔ اساتذہ اور طلبہ کے وظائف مقرر کئے گئے،

۵۔ مسجدوں میں تعلیم کے لئے درس کے مستقل حلقے قائم ہوئے،

۶۔ تعلیم عموماً مسجدوں ہی میں دی جاتی تھی، بلکہ اگر کسی نئی تعلیم گاہ کے قائم کرنے کی ضرورت ہوتی تو نئی مسجد ہی تعمیر کی جاتی تھی[۲]

۷۔ بعض اسلامی ملکوں میں اہل علم کو اپنا تعلیمی شغل جاری رکھنے کے لئے جہاد کی خدمت سے بھی مستثنیٰ کیا گیا[۳]

طریقہ تعلیم اس دور میں بھی وہی رہا، جو پہلے دور میں تھا، یعنی استاد زبانی تعلیم دیتا تھا، لیکن اس طریقہ میں پچھلے دور سے اس دور میں یہ اضافہ ہوا کہ املا کا طریقہ جاری ہوا، استاد جو کچھ درس دیتا شاگرد اسے لکھ لیتے، یا استاد خود لکھاتا جاتا، اور طلبہ لکھتے جاتے،

---

[۱] جامع بیان العلم ص ۸۰ [۲] معجم البلدان جلد ۵، ص ۳۷۵ [۳] ذکرۃ تدبیہ [۴] ص ۳۷۶،

۹۔ کتابون کے مصنفین بھی اپنی کتابون کی قرأت کراتے تھے،

۱۰۔ کتابوں کی قرأت وسماع کی سند واجازت کے رواج کی ابتدا بھی اسی دور میں ہوئی،[1]

تیسرا دور اس کے بعد اسلامی نظام تعلیم کا تیسرا دور شروع ہوا، اس میں تعلیمگاہون کے لئے مسجدون سے علٰحدہ کرکے عمارتین بنانے کا رواج ہوا، اگرچہ مسجدوں میں بھی تعلیم کا سلسلہ قائم رہا، تاہم تعلیمگاہوں کی علٰحدہ عمارتوں سے اسلام کے تعلیمی نظام کی نئی تشکیل ہوئی، مدرسوں کے لئے قواعد وضوابط بنائے گئے، طلبہ اور اساتذہ کے لئے اقامت گاہیں تیار ہوئین، ملک کے چیدہ اہل علم اپنے عہد کے فرق وامتیاز کیساتھ بیش قرار تنخواہوں پر معلمی کے منصب پر سرفراز کئے گئے، اور طلبہ کے تعلیمی وظیفے پابندی سے جاری کئے گئے، ان کے لئے تعلیم کے سامان مہیا کئے گئے، ان کے قیام، طعام اور لباس کا انتظام کیا گیا،

تیسرے دور کے خصوصیات، ان حیثیتوں سے اس دور کے حسب ذیل نمایان خصوصیات قرار پا سکتے ہین،

۱۔ مدرسوں اور اقامت گاہوں کی تعمیر سے استادوں اور لڑکوں کی باہمی معاشرت کا آغاز ہوا،

۲۔ بڑے بڑے اوقاف کی بدولت علما، فراغ بالی سے اپنی خدمتین انجام دیتے رہے، اور لڑکون کیلئے بھی تعلیمی سہولتین بہم پہونچین،

۳۔ مدرسوں کی تعمیر اور اوقاف کا قیام دینداری کی ایک علامت قرار پائی، اور نیک دل مسلمانون نے آخرت کی بھلائی کے لئے مدرسے اور دار الاقامے قائم کئے، نیز مدرسوں کی تعمیر اس دور کے تمدن میں دنیاوی اعزاز اور سربلندی کا ذریعہ بھی گئی، جس کی وجہ سے امرا، واہل مناصب نے مدرسوں کی تعمیر میں بڑھ بڑھ کر حصہ لیا،

---

[1] یہ حصہ مقدمۃ التربیۃ الاستقلالیہ از ص ۹ تا ص ۲۰، و تاریخ صقلیہ جلد دوم باب علوم و فنون از ص ۸۰ تا ۱۹۵ سے مستفاد ہے،

۴۔ اسلامی ملکوں کی تعلیمی ترقی سے درس وتدریس کا پیشہ اس قدر معزز سمجھا جانے لگا، کہ اہل علم وزراء و امراء اپنی غیر معمولی مشغولیتوں کے باوجود پڑھنے پڑھانے کے لئے بھی وقت نکالتے تھے، چنانچہ اس زمانہ کے امرأ کے سوانح میں ان کے اہل علم کے درس کے حلقہ میں بلا تکلف شریک ہونے، اور خود درس کا حلقہ قائم کرکے لوگوں کو پڑھانے کے واقعات ملتے ہیں،

۵۔ مختلف علوم وفنون کے لئے جداگانہ مدرسے قائم کئے گئے،

۶۔ طریقۂ تعلیم کے لحاظ سے اس دور میں بھی املا کا طریقہ جاری رہا، اور مصنفین اپنی کتابیں پڑھاتے تھے، لیکن اس دور میں کتابوں کی قرات اور سماع کی سند اور اجازت کا طریقہ پہلے دور سے زیادہ اہتمام سے جاری ہوا، نیز اس دور میں ایک اضافہ یہ ہوا، کہ نصاب تعلیم کی چیدہ کتابیں منتخب کی گئیں، اور ہر فن میں جو معیاری کتابیں نکلیں، انھیں درس کے نصاب میں داخل کیا گیا، ہر فن کے پڑھانے کے لئے مختصر رسالے تیار کئے گئے، لیکن پھر امتداد زمانہ سے نصاب درس میں غیر ضروری کتابیں بھی داخل ہوگئیں، اور مختلف زمانوں میں نصاب کی اصلاح کی کوششیں جاری رہیں،[1]

عہد اسلامی کے مختلف دوروں میں اسلامی ملکوں میں تعلیم کے اہم مرکز

اسلامی نظام تعلیم کے ان مختلف دوروں میں اسلامی ممالک کے مختلف شہر تعلیم کے اہم مرکز بنے رہے، جہاں تعلیم کے سلسلہ کے تمام وسائل مہیا رہتے تھے، اور طلبہ دور دور سے پہونچ کر وہاں علم کی تحصیل کرتے تھے، یہ تعلیمی مرکز مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں، ابن خلدون نے اسکی یہ صحیح توجیہ کی ہے، کہ جس ملک کا تمدن جس قدر ترقی یافتہ رہا، اسی قدر وہاں اعلیٰ تعلیم کے موقعے اور وسیلے پیدا ہوئے، اور پھر جس ملک کو تمدنی حیثیت سے زوال آیا، وہ اپنے تعلیمی مرکز کے امتیاز کو بھی کھو بیٹھا، چنانچہ وہ لکھتا ہے، :-

"اس کا سبب یہ ہے جیسا کہ ہم دکھا چکے ہیں، کہ علوم کی تعلیم بھی منجملہ پیشوں کے ایک پیشہ ہے

---

[1] ان مباحث کی تفصیل آگے آئیگی،

اور ہم یہ بھی دکھا چکے ہیں، کہ پیشے شہروں ہی میں زیادہ ہوتے ہیں، اور شہروں کی تمدنی ترقی اور تنزل کے اعتبار سے ان میں بھی بیشی اور کمی ہوتی ہے، جس قدر تمدنی لطافتیں بڑھتی ہیں، ان پیشوں میں بھی باریکیاں اور ندرتیں پیدا ہوتی جاتی ہیں، کیونکہ یہ انسانی خاصہ ہے، کہ جب معاشی فراغ بالی حاصل ہوتی ہے، تو انسان کی زندگی میں مزید لطافت پیدا ہوتی ہے، اور ان میں علوم و صنائع سے شغف پیدا ہوتا ہے"

اسی اصول کے بموجب اسلامی عہد میں جو شہر تمدنی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچے، وہ تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، چنانچہ صحابہ کے زمانہ میں مدینہ منورہ کو قدرۃً مدینۃ العلم کا لقب حاصل تھا، پھر کوفہ و بصرہ کو یہ امتیاز حاصل ہوا، اس کے بعد بغداد اور نیشاپور مشرق میں اور قیروان اور قرطبہ مغرب میں علم کے شہر قرار پائے اور اسلام کے ابتدائی زمانہ میں انہی شہروں کو تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی، چنانچہ ابن خلدون لکھتا ہے:-

"بغداد، قرطبہ، قیروان، بصرہ، اور کوفہ کو دیکھو کہ جب یہاں اسلام کے ابتدائی زمانہ میں تمدن پھیلا اور عمرانی ترقی کمال کے درجہ پر پہونچ گئی، تو یہاں علم کے سمندر جوش مارنے لگے، اور یہاں کے باشندے تعلیمی اصطلاحات اور مسائل کے استنباط میں تفنن طبع دکھانے لگے، لیکن جب یہاں کے تمدن کو زوال آیا، اور یہاں کے باشندوں میں ابتری پیدا ہوئی، تو وہ بساط الٹ گئی، اور علم اور تعلیم مفقود ہو کر یہاں سے دوسرے شہروں میں منتقل ہو گیا"[۱]

(باقی)

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۰۶۔

عہدِ وسطیٰ کی تاریخِ مصر پر ایک نظر

از

جناب محمد جمیل الرحمن صاحب ایم اے پروفیسر تاریخ عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن

مصر کے ملک سے مسلمانوں کو شروع ہی سے دلچسپی تھی، انھوں نے اس ملک کا نام قرآن میں پڑھا، اور یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ سے اس کا گہرا تعلق ہے، یہیں حضرت یوسفؑ کی زندگی کے بہترین واقعات پیش آئے تھے، اور حضرت مریمؑ نے اسی ملک میں حضرت عیسیٰؑ کیساتھ ان کے بچپن میں پناہ لی تھی، یہ تاریخی واقعات ایسے تھے، جن سے مسلمان پوری طور پر واقف تھے، اور ان کی وجہ سے یہ ملک مسلمانوں کے لئے اجنبی نہیں تھا، اسلامی ملک ہونے کی حیثیت سے مصر کی تاریخ ۱۸ھ (۶۳۹ء) سے شروع ہوتی ہے جب حضرت عمرو بن العاصؓ اسلامی فوجیں لیکر وہاں داخل ہوئے اس وقت سے آج تک اس ملک کو تاریخِ اسلام میں ایک خاص اہمیت حاصل رہی ہے مسلمانوں کے ابتدائی اور درمیانی دور میں یہ سرزمین اسلامی سلطنت کا غالباً سب سے زیادہ زرخیز علاقہ تھا، اسی پر قبضہ کی وجہ سے مسلمانوں نے بحیرۂ روم کو اپنے قابو میں رکھا تھا، اس کے بعد کے زمانہ یعنی عہد فاطمیین میں جب بغداد پر زوال آیا، تو مصر اسلامی تہذیب و تمدن کا مرکز بنا، سلاطینِ عثمانی کی فتح کے بعد اس ملک پر یورپ کی نوزائیدہ تہذیب کے اثرات پڑنے شروع ہوئے، ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) میں جب نپولین نے مصر پر ناکام حملہ کیا، اور آخر میں جب محمد علی پاشا کو بابِ عالی نے یہاں کا مستقل حاکم تسلیم کیا، تو یورپی تہذیب کے اثرات اور بھی زیادہ بڑھ گئے، اس لحاظ سے نپولین کا حملہ درحقیقت مصر کے لئے ایک نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوا، اسی زمانہ سے تاریخِ مصر کا

بنا یعنی موجودہ دور شروع ہوا، اور اسی حملہ کی وجہ سے آج کل مصر تمام اسلامی ممالک میں علم و فضل کا مرکز بنا ہوا ہے، بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ عالم اسلامی کا دل کہ ہے، اور دماغ مصر اسی دور وسطیٰ کی تاریخ، جو ۱۸ھ (۶۳۹ء) سے شروع اور ۱۲۱۲ھ (۱۷۹۸ء) پر ختم ہوتی ہے، ہم مختصراً اوراق آیندہ میں بیان کریں گے۔

مصر کے حکمراں خاندانوں کا نقشہ

سنہ ہجری	خاندان	سنہ عیسوی
۱۸ھ سے ۲۱ھ	حضرت عمرو بن عاص کی فتح مصر	۶۳۹ء سے ۶۴۱ء
۲۱ھ " ۳۸ھ	خلفائے راشدین کے والیان مصر	۶۴۱ء " ۶۵۸ء
۳۸ھ " ۱۳۲ھ	خلفائے بنی امیہ کے والیان مصر	۶۵۸ء " ۷۵۰ء
۱۳۲ھ " ۲۵۴ھ	خلفائے عباسیہ کے والیان مصر	۷۵۰ء " ۸۶۸ء
۲۵۴ھ " ۲۹۲ھ	آل طولون	۸۶۸ء " ۹۰۵ء
۲۹۲ھ " ۳۲۳ھ	والیان خلفائے عباسیہ	۹۰۵ء " ۹۳۵ء
۳۲۳ھ " ۳۵۸ھ	اخشیدیہ	۹۳۵ء " ۹۶۹ء
۳۵۸ھ " ۵۶۷ھ	خلفائے فاطمیین	۹۶۹ء " ۱۱۷۱ء
۵۶۷ھ " ۶۴۸ھ	ایوبیین	۱۱۷۱ء " ۱۲۵۰ء
۶۴۸ھ " ۷۹۲ھ	ملوک بحری	۱۲۵۰ء " ۱۳۹۰ء
۷۹۲ھ " ۹۲۳ھ	ملوک برجی	۱۳۹۰ء " ۱۵۱۷ء
۹۲۳ھ " ۱۲۱۲ھ	عثمانی والیان مصر اور مملوک	۱۵۱۷ء " ۱۷۹۸ء
۱۲۱۲ھ	نپولین کی مہم مصر اور دور جدید کا آغاز	۱۷۹۸ء

(۱)

شام اور عراق کی عظیم الشان فتوحات کے بعد جب مسلمانوں نے اپنے سیاسی حالات پر نظر ڈالی، تو

معلوم ہوا کہ ان فتوحات کو سنبھالنے کے لئے انھیں اور آگے بڑھنا چاہئے، اوّل تو یہ دونوں ممالک ہی بازنطینی سلطنت
سے خطرناک طور پر قریب تھے، اگرچہ اس سلطنت نے اپنے بہترین ایشیائی صوبے کھو دئے تھے لیکن پھر بھی
وہ مسلمانوں کے لئے خطرہ کا باعث تھی، تاریخ عالم شاہد ہے کہ شام اور مصر کا سیاسی تعلق اس قدر گہرا ہے
کہ شام کے حکمران اسوقت تک اطمینان سے نہیں بیٹھ سکتے جب تک کہ مصر پر بھی ان کا قبضہ نہ ہو جائے، اور ذرا
غفلت کریں تو ہر وقت مصری حکومت سے انھیں خطرہ ہو سکتا ہے، صرف یہی نہیں بلکہ اب ان فتوحات کے
بعد عرب کی سیاسی حالت بھی بدل گئی تھی، اب وہ حالت نہیں رہی تھی، کہ ہمسایہ سلطنتیں اس ملک کو محض
حقارت سے دیکھیں اور اپنے آپ کو ان عربوں سے جنھیں وہ اب تک لٹیرے سمجھتے آئے تھے محفوظ سمجھیں عرب
اب سیاسیات عالم کا ایک جزء تھا، اور یہ ممکن تھا کہ بازنطینی سلطنت اسلامی سیاسیات کے مرکز یعنی مدینہ پر حملہ کر کے
اور اس نئی حکومت کا بالکل خاتمہ کر دے، چونکہ مدینہ اسوقت بازنطینی سلطنت کے فوجی مرکز قلزم (سویز)
سے خطرناک طور پر قریب تھا، اس لئے اسکی اشد ضرورت تھی، کہ اس خطرہ کو جلد از جلد زائل کر دیا جائے، اس سے
قطع نظر مصر دنیا کی تجارتی منڈی ہونے کے علاوہ ایک نہایت ہی زرخیز ملک تھا، اور اس کے غلہ سے قسطنطنیہ
کی آبادی پلتی تھی، اس دار و گیر کے زمانہ میں ممکن ہے کہ مسلمانوں نے تجارت کو زیادہ اہمیت نہ دی ہو لیکن
یہ یقینی امر ہے کہ مصر کا غلہ عرب کی بے آب و گیاہ سرزمین کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا تھا ہمیں معلوم ہے
کہ شام و عراق کی فتح کے بعد ان ممالک سے بے انتہا غلہ حجاز کو درآمد ہونا شروع ہو گیا، پھر ایسی صورت
میں مصر کو کیوں چھوڑا جاتا، اس کا ہمیں علم ہے کہ فتح مصر کے دوران ہی یعنی (سنہ ۱۸ھ م ۶۳۹ء) حجاز
میں ایک سخت قحط پڑا، اسی وجہ سے اس سال کو عام الرمادہ کہتے ہیں، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے فاتح مصر
حضرت عمرو بن عاصؓ کو لکھا کہ مصر سے غلہ حجاز بھیجیں، حضرت عمرو بن عاصؓ نے جواب دیا کہ وہ غلہ سے لدے
ہوئے اتنے اونٹ بھیج رہے ہیں کہ پہلا اونٹ مدینہ میں ہوگا، اور آخری مصر میں[۱]، اس کے علاوہ مصر کے

---

[۱] ابن سعد جلد ۳- ص ۲۰۳، ۲۲۳، ۲۲۴،

سیاسی اور مذہبی حالات بھی اسوقت ایسے تھے کہ ہر بالغ نظر فاتح کی نگاہ اس ملک پر پڑ سکتی تھی، اس سے چند سال قبل تقریباً دس برس تک ایرانی اس ملک پر قابض رہ چکے تھے، اور اہل مصر نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا تھا، اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان فاتحین کے زیر سایہ انھیں کم از کم مذہبی آزادی مل جائے گی، لیکن جب ہرقل نے اسے دوبارہ فتح کیا تو اُن کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا، اب بھی مصری یہ سمجھتے تھے، کہ گذشتہ واقعات سے فائدہ اٹھا کر سلطنت قسطنطنیہ اپنا طرز عمل بدل دے گی، اور انھیں مذہبی عقائد کے لحاظ سے آزاد چھوڑ دیگی، مگر ان کی یہ آرزو بھی بر نہ آئی، وہی پرانے مناقشات اور وہی پرانا مذہبی جبر و تشدد بدستور جاری رہا، اسلئے مصری اپنی حکومت سے بیزار اور کسی نئے نجات دہندہ کے لئے دست بدعا تھے، ایک اور خاص طور پر قابل غور بات یہ ہے، کہ اس زمانے میں مصر کا کلیسائی اور ملکی نظم و نسق ایک ہی شخص کے سپرد ہوتا تھا، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مصریون کی مخالفت نہ صرف مذہبی اختلافات کی بنا پر تھی، بلکہ اس کے معاشی اسباب بھی اتنے ہی اہم تھے، جتنے کہ مذہبی، ان تمام باتوں کو دیکھتے ہوئے، عرب مورخوں کا یہ بیان قابل وثوق نہیں رہتا، کہ حضرت عمرؓ مصر پر حملہ کرنے میں پس و پیش کر رہے تھے، اور حضرت عمرو بن عاصؓ ان کی اجازت کے بغیر اس پر حملہ آور ہوئے تھے، یہ صحیح ہے کہ حضرت عمرو بن عاصؓ زمانۂ جاہلیت میں مصر میں رہ چکے تھے، اس لئے وہاں کے حالات سے بخوبی واقف تھے[1]

لیکن ایک روایت یہ بھی ہے کہ عمرو بن عاص حضرت عمرؓ کی اجازت سے مصر گئے تھے، بلکہ خود حضرت نے انھین شام سے مصر جانے کا حکم دیا تھا[2]

سنہ (سنہ ۶۳۱ء) میں قیصر ہرقل نے سیرس (Cyrus) کو جو اب تک کاکے سوس کے شہر فیسس (Phasis) کا اسقف تھا، اسکندریہ کا بطریک مقرر کیا، اور اسی کو شہری نظم و

[1] الکندی، کتاب الولاۃ و کتاب القضاۃ ص ۰، سیوطی حسن المحاضرہ جلد ۲ ص ۴۱، ابن عبد الحکیم فتوح مصر ص ۵۳

[2] ابن عبد الحکیم ص ۵۶، ۵۷،

نسق کا بھی حاکم بنایا، اس شخص نے دس سال تک مسلسل اور انتہائی کوشش کی کہ قبطی کلیسا سے صلح کرلے، اور ملک کی آمدنی میں اضافہ کرے، لیکن معلوم ہوتا ہو کہ اسکی تمام کوششیں رائگاں گئیں، زمانۂ مابعد کی قبطی روایات میں اس شخص کی حیثیت برابر دھندلی ہوتی جاتی ہے، اس کے متعلق یہ فرض کیا گیا ہو کہ اس نے عرب فاتحین سے اہلِ ملک کے خلاف سازباز کیا، اور اسی نے مصریوں کے سب سے زیادہ اہم شخص ہونے کی حیثیت سے عربوں کیساتھ سب سے اہم عہد نامہ کیا، جس کی رو سے عرب مصر کے مالک بن گئے، یہی سرس وہ شخص ہو جو اسلامی تاریخی روایات میں مقوقس کے نام سے مشہور ہوا،

ایک طرف مقوقس کی ناکامی تھی، اور دوسری طرف ہرقل نے شام کی لڑائیاں لڑنے کے لئے مصر کی مشرقی سرحد سے فوجیں ہٹالی تھیں، ان باتوں سے حضرت عمرو بن العاصؓ نے فائدہ اٹھایا، اور ذی الحجہ ۱۸ھ (دسمبر ۶۳۹ء) میں اچانک اسلامی فوجیں مصر کی مشرقی سرحد پر ظاہر ہوئیں، اس کے ایک مہینہ بعد محرم ۱۹ھ (جنوری ۶۴۰ء) صرف تین چار ہزار فوج کے ساتھ حضرت عمرو بن العاصؓ نے فرما (Pelusium) فتح کرلیا، یہ مقام مصر کا دروازہ سمجھا جاتا تھا لیکن حضرت عمرو بن عاصؓ نے اس سے آگے بڑھنے کی اس وقت تک ہمت نہیں کی جب تک کہ حضرت زبیر بن العوامؓ کی سرکردگی میں پانچ ہزار تازہ دم فوج مدینہ سے نہ آگئی، اب پوری فوج آگے بڑھی، اور رجب ۱۹ھ (جولائی ۶۴۰ء) میں عین الشمس (Heliopolis) کے سامنے بازنطینی سپہ سالار اغسطس تھیوڈورس کو شکست دی، عین الشمس، بابل کے قریب واقع تھا، اور اس کا نواح سمجھا جاتا تھا، شہر تو فتح ہوگیا، مگر قلعہ کی فوج نے مدافعت کی، مقوقس یہاں بذاتِ خود موجود تھا، اس نے مدافعت کا انتظام کرنے کے بجائے حضرت عمرو بن العاصؓ سے خط و کتابت شروع کی، اور معاہدہ کی شرائط طے کرنے کے بعد بغرض توثیق مصر سے ہرقل کے پاس چلا گیا، مگر قیصر اس عہد نامہ سے سخت ناراض ہوا، اس نے مقوقس پر غداری کا الزام لگا کر اسے جلاوطن کردیا، اہل بابل اس عرصہ میں برابر مسلمانوں کا مقابلہ کرتے رہے، انھیں توقع تھی کہ ان کی مدد کے لئے فوجیں بھیجی

جائیں گی، لیکن ۱۳ر صفر ۲۰ھ (۱۱ر فروری ۶۴۱ء) کو ہرقل کا انتقال ہوگیا، اور جب مدد کی توقع نہ رہی تو ۲۱ر ربیع الثانی ۲۰ھ (۹ر اپریل ۶۴۱ء) کو محصورین نے ہتھیار ڈالدیئے، بابلی دریائے نیل کے اس حصّے کی کنجی سمجھا جاتا تھا، اس لئے اس فتح سے ڈیلٹا کے مشرقی حصّے اور اس کے علاوہ مصر صعید پر مسلمانوں کا قبضہ ہوگیا، اب حضرت عمرو بن عاص نے دریائے نیل کو عبور کیا اور اس کے مغربی کنارے کے ساتھ ساتھ نیکو پہونچے، یہ ایک اسقفیہ کا مرکز تھا، ۲۶ر جمادی الاول (۱۳ر مئی) کو اہلِ شہر نے اطاعت قبول کر لی، اب اسلامی فوج نے آہستہ آہستہ اسکندریہ کی طرف بڑھنا شروع کیا، اسکندریہ کی سیاسی بحری اور تجارتی اہمیت اتنی تھی کہ یونانی آسانی سے اُسے ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے، چنانچہ مسلمان اس کے گرد و نواح کے علاقے پر بآسانی قابض ہوگئے، لیکن اس مستحکم اور قلعہ بند بندرگاہ کو فتح کرنا اتنا آسان کام نہ تھا، اس درمیان میں ہرقل کی موت کے بعد قسطنطنیہ میں بڑی سیاسی تبدیلیاں ہوئیں، اور حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے، مجبوراً مقوقس کو دوبارہ مصر بھیجا گیا، کہ جہاں تک بن پڑے، وہ حضرت عمروؓ ابن عاص کے ساتھ مفید مطلب شرائط پر صلح کرلے، وہ ۲ر شوال ۲۰ھ (۱۴ر ستمبر ۶۴۱ء) کو اسکندریہ واپس آیا، اب مقوقس نے کیا کیا سیاسی چالیں چلیں، اور کس طرح مسلمانوں سے ساز باز کیا، اس کا علم ہم کو نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ اب اس کا رویہ بالکل بدل چکا تھا، وہ علانیہ مسلمانوں کا ساتھ دے رہا تھا، غالباً اسے امید تھی کہ مسلمانوں کے ماتحت اُسے مصری کلیسا کا حاکم اعلیٰ مقرر کردیا جائے گا، اسی سال کے موسم خزاں میں اُس نے اہلِ اسکندریہ کو اطلاع کئے بغیر حضرت عمرو بن عاصؓ سے ایک معاہدہ کیا، جس کے مطابق قرار پایا کہ ۱۶ر شوال ۲۱ھ (۱۷ر ستمبر ۶۴۲ء) تک شہر ان کے حوالہ کردیا جائے گا، اور یونانی شہر خالی کردینگے ایک مقررہ خراج کے بدلے میں مسلمانوں نے اہلِ شہر کی جان و مال کی حفاظت کا ذمّہ لیا، اور انھیں پوری مذہبی آزادی عطا کی، اسکندریہ والوں کو اس عہد نامہ پر سخت غصّہ آیا، مگر مجبور تھے، انھوں نے معاہدہ کو منظور کرلیا، اور یونانیوں نے شہر خالی کردیا، اسطرح اسکندریہ پر عربوں کا مکمل قبضہ ہوگیا، اس کے

بہت جلد بعد مقوقس کا انتقال ہو گیا، مصر پر اب مسلمانوں کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا، مگر اس کی حقیقی تکمیل اسوقت ہوئی جب ۲۲ھ (۶۴۳-۴۴ء) میں حضرت عمرو بن عاصؓ نے برقہ کو جو افریقیا اور مصر کی سرحد پر واقع تھا فتح کیا، اب تک اسکندریہ مصر کا صدر مقام تھا، لیکن عمرو بن عاص نے اسے ترک کرکے بابل کے سامنے اپنے پرانے لشکر گاہ کو فسطاط کے نام سے ملک کا صدر مقام قرار دیا[۱] لیکن اسکندریہ جیسے شہر کو یونانی کس طرح چھوڑ سکتے تھے، ایک مرتبہ بازنطینی حکومت نے شہر پر قابض ہونا چاہا، ۲۵ یا ۲۶ھ (۶۴۵ء) میں یونانیوں کا ایک بیڑا امینول کی سرکردگی میں اسکندریہ پہونچا، اہل شہر نے جو ابتک عربوں سے مطمئن نہیں تھے، فوراً اطاعت سے انحراف کیا، اور یونانیوں کو شہر میں داخل کر لیا، اس موقع پر حضرت عمرو بن عاصؓ مصر کے عامل موجود نہ تھے، ان کا جانشین صورت حال کو نہ سنبھال سکا، اس لئے انھیں واپس بھیجا گیا، انھوں نے پھر اپنی اعلیٰ فوجی قابلیت کا اظہار کیا، اور تھوڑی مدت میں شہر خالی کرالیا، اس طرح اسکندریہ مستقل طور پر بزور شمشیر فتح ہوا، حالانکہ پہلی فتح بذریعہ صلح تھی، اس سے مصر کی جنوبی اسلامی سرحد کا بھی فیصلہ ہو گیا، بالعموم مصر کی سرحدیں قدرتی طور پر معین ہوتی ہیں، شمال میں بحیرۂ روم ہے، مغرب میں لیبیا کا صحرا، اور مشرق میں عرب کا ریگستان اور بحیرۂ احمر ہے، صرف جنوبی سرحد واقعات کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی تھی، اس سمت کی حدبندی حضرت عثمانؓ کے والی مصر عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح کی ایک فوجی مہم نے کر دی، عبد اللہ بن سعد اسکندریہ کی دوسری فتح سے کچھ قبل عمرو بن عاص کے جانشین ہوئے تھے، اور حضرت عثمانؓ کی شہادت سے ذرا قبل تک مصر کے حاکم رہے، انھوں نے ۳۱ھ (۶۵۱-۵۲ء) میں جنوب مصر میں نوبیہ کی مسیحی سلطنت کے شہر اسوان پر فوج کشی کی، اور دُنقلہ تک آئے، یہاں نوبیہ کے بادشاہ سے ایک عہد نامہ طے کیا، جو بقط کہلاتا ہے، بظاہر یہ لفظ لاطینی (Pactum .) کی معرب شکل ہے، یہ عہد نامہ اب تک محفوظ ہے[۲] اس کی رو سے مسلمانوں اور اہل نوبیہ کے سیاسی تعلقات کا

[۱] دیکھو بکر (Becker) کا مضمون "کائرو" انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں ۲ خطط، (مصر ۱۳۲۴ھ) جلد اصفحہ ۳۲۲

آغاز ہوا، چراکس کے عہد تک یلاق (. e ...) مصر کی جنوبی سلطنت سمجھا جاتا رہا، سلطنت کا انتہائی شمالی شہر القصر کہلاتا تھا،

حضرت عثمانؓ کے عہد میں جب فتنہ شروع ہوا تو مصر ہی اس کا حقیقی مرکز تھا، مصر پر اس فتنہ کا اثر یہ ہوا کہ عبداللہ بن سعد کو ملک چھوڑنا پڑا، اور بالآخر یہیں سے مفسدوں کی ایک جماعت ۳۵ھ (۶۵۶ء) میں مدینہ روانہ ہوئی، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مصر پر حضرت علیؓ کی طرف سے محمد بن ابی بکرؓ والی رہے، اگرچہ جنگ صفین کے خاتمہ کے بعد جب حضرت امیر معاویہ نے شام میں اپنی حکومت قائم کی تو ۳۸ھ (۶۵۸ء) میں عمرو بن عاص پھر وہاں پہونچے، اور محمد بن ابی بکر کو قتل کرکے امیر معاویہ کی طرف سے مصر پر قابض ہو گئے، اس کے بعد ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) تک، سوائے ایک مختصر سے عرصے کے (۶۴ھ سے ۶۵ھ م ۶۸۳ء سے ۶۸۴ء) جب کہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ اس پر برائے نام قابض رہے، مصر بنی امیہ کے قبضے میں رہا، بنی امیہ کے دور میں مصر کا سب سے بڑا اور مشہور حاکم خلیفہ عبدالملک کا بھائی عبدالعزیز تھا، یہ شخص اپنے بھائی سے مساویانہ سلوک کرتا تھا، اور مصر کے مفاد کی خاطر اس کے احکام کو رد کرنے میں بھی تامل نہ کرتا تھا، ۷۰ھ میں فسطاط (مصر) میں طاعون پھیلا، تو عبدالعزیز فسطاط سے حلوان چلا آیا جو دو فرسخ کے فاصلہ پر دریائے نیل کے کنارے واقع ہے، یہ جگہ اسے ایسی پسند آئی، کہ مستقل طور پر اس نے وہیں سکونت اختیار کر لی، اس نے وہاں محلات اور مکانات بنائے اور باغ لگائے، اسی کی بدولت وہاں کھجور کے درخت اور انگور پہونچے، حلوان ہی سے وہ مصر پر حکومت کرتا تھا[۱]، واقعہ یہ ہے کہ عبدالعزیز ہی تھا جس نے مصر کے نظم و نسق کو حقیقی طور پر مرتب کیا، اور اسے ایسی شکل دے دی کہ جو والی اس کے بعد آئے انھوں نے اسی کے اصولوں پر عمل کرکے شہرت حاصل کی، عبدالعزیز اپنے باپ مروان کی فتح مصر کے بعد ۶۵ھ (۶۸۴ء) میں حاکم مقرر ہوا، اور خلیفہ عبدالملک کی وفات سے چند ماہ قبل ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں اس نے انتقال کیا، اس کے بعد عبدالملک نے اپنے بیٹے عبداللہ کو

۱؎ الکندی ص ۴۹، یاقوت معجم البلدان تحت "حلوان"

وہاں کا والی مقرر کیا، حالانکہ اسکی عمر اسوقت صرف ستائیس برس کی تھی، اس کا زمانۂ ولایت اسلئے مشہور ہے کہ اس نے خلیفہ ولید کے حکم سے دواوین مصر کو قبطی زبان سے عربی میں منتقل کیا، اور عربی کو دفتری زبان قرار دیا[۱]، اس عہد کا ایک اور مشہور حاکم عبدالملک بن مروان بن موسیٰ بن نصیر تھا یہی بنی امیہ کا آخری حاکم مصر تھا، اسے ۱۳۱ھ (۷۴۸ء) میں مروان ثانی نے حاکم مصر مقرر کیا تھا، اس کی شہرت کی وجہ یہ ہے کہ یہی والی تھا جس کے حکم سے مصر کے دوسرے حصوں کی مسجدوں میں منبر قائم کئے گئے، اس سے قبل ان حصوں کے والی بغیر منبروں کے خطبہ پڑھا کرتے تھے[۲]، ۱۳۲ھ (۷۴۹ء) کے انقلاب کا اثر مصر پر بھی پڑا، یہاں کے اکثر عمائد مسوّدہ میں شامل ہو گئے، بنی امیہ کے آخری خلیفہ مروان ثانی نے مصر میں پناہ لی یہیں ذی الحجہ ۱۳۲ھ (اگست ۷۴۹ء) کے آخر میں بوصیر کے گرجا میں قتل ہوا، اس واقعہ نے قبطی کلیسا پر بھی اپنا اثر چھوڑا ہے، چنانچہ قبطی روایات میں بھی اس قتل کی تفصیل عرب مورخوں سے کہیں زیادہ ملتی ہے، لیکن اس سے قطع نظر مصر کی سیاسیات پر اس انقلاب کا اور کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا،

عہد عباسیہ میں مختلف والی مصر پر مقرر ہوئے ۲۴۲ھ (۸۵۶ء) تک اکثر والی عرب تھے[۳]، مصر کا آخری عرب والی عنبسہ بن اسحاق تھا،

یہی آخری والی تھا جس نے لوگوں کے ساتھ جامع مسجد میں نماز پڑھی[۴]، اس کے بعد ترک والیان مصر کا دور شروع ہوا، یہاں تک کہ ۲۵۴ھ (۸۶۸ء) میں احمد بن طولون نے ایک نیم خود مختار ترکی خاندان کی بنا ڈالی، مامون کے عہد سے خلیفہ اور والیوں میں یہ سمجھوتہ سا ہوگیا تھا کہ صوبہ کا والی شاذ و نادر ہی بذات خود اپنے صوبہ کو جاتا تھا، بلکہ کسی دوسرے کو اپنا نائب مقرر کر دیتا تھا، اور خود دارالخلافہ کے عیش و طرب سے حظ اٹھاتا تھا، چنانچہ پہلے ترک حاکم یزید بن عبداللہ نے بھی اپنے بھائی عباس بن عبداللہ کو بطور نائب مصر بھیج دیا تھا[۵]،

(باقی)

---

[۱] الکندی ص ۵۸، ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۲۳۲ [۲] ابن عبدالحکم ص ۱۲۲ [۳] الکندی ۹۲، ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۳۵۱ [۴] الکندی ۲۰۲، [۵] ۲۰۰، و ابن تغری بردی جلد ۱ ص ۷۴۰،

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات

حال میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن (لندن) کے ایک جلسہ میں سرآرل اسٹائن ([illegible]) نے ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات پر ایک مقالہ پڑھا تھا، جو سنڈے اسٹیٹسمین مورخہ ۲۲ر جنوری ۱۹۳۶ء میں نقل ہوا ہے، اس کا خلاصہ درج ذیل ہے، سرآرل آثارِ قدیمہ کے ایک ممتاز ماہر ہیں، اور انھون نے ایشیائی ادب، اثریات، اور جغرافیہ پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، ۱۸۸۸ء سے ۱۸۹۹ء تک وہ اورنیٹل کالج لاہور کے پرنسپل رہ چکے ہیں، لاہور ہی کے زمانۂ قیام میں انھون نے اپنی اثری تحقیقات شروع کین، اور ۱۹۰۰ء میں ایک مہم ترکستان لے گئے، اس کے بعد تیس سال تک وہ وسط ایشیا، ایران اور بلوچستان میں آثارِ قدیمہ کی دریافت و تحقیق میں مصروف رہے، اور یہ انہی کی تحقیقات کا نتیجہ تھا، کہ ان ملکون کے عظیم الشان قدیم تمدنون کا جو ابتک تقریبًا نامعلوم تھے سراغ لگ سکا،

ہندوستان اور ایران کے قدیم تعلقات پر تاریخ کی روشنی چھٹی صدی قبل مسیح کے وسط سے پہلے نہیں پڑتی، جب کہ ایران کی عظیم الشان سلطنت کے بانی سائرس (Cyrus) نے اپنی سلطنت کے حدود گندھارا (قندھار) تک وسیع کر دیئے، اور اس میں پوری وادی کابل شامل ہوگئی، اس سے قبل کے حالات کے لئے ہمیں چند سال پیشتر تک زیادہ تران اشارات پر بھروسا کرنا پڑتا تھا، جو رگ وید کے گیتون میں ملتے ہیں، سو برس سے زیادہ ہوئے، کہ مغرب میں سنسکرت کے فاضلون نے ان مقدس گیتون کا مطا

تنقیدی نظر سے شروع کیا، اس وقت سے ان گیتوں کے ذریعہ ہندوستان کے قدیم ترین آرین باشندوں کے مذہبی عقائد، مذہبی نظام، رسم و رواج، معاشرتی حالات وغیرہ کے متعلق بہت زیادہ معلومات حاصل ہوئے ہیں، ان گیتوں کا زمانہ پندرھوین صدی قبل مسیح سے لیکر آٹھوین صدی قبل مسیح تک سمجھا جاتا ہے، اگرچہ ان گیتوں کے زمانہ تالیف کی نسبت اتفاق رائے نہیں ہوسکا ہے، تاہم اس میں شبہ نہیں کہ ویدک عہد کے ہندی آریائی باشندے زبان اور نسل میں ان آرین لوگوں سے بہت قریبی تعلقات رکھتے تھے، جنھوں نے ایران کو اپنا نام دیا،

ویدک گیتوں کی زبان اَوِستا کی زبان سے بہت ملتی جلتی ہے، جو ایران کے زرتشتی مذہب کی مقدس کتاب ہے، یہ بات گاتھا کی زبان میں خاص طور پر پائی جاتی ہی جو اوستا کا قدیم ترین حصہ ہے، اور جس میں خود زرتشت کی تقریریں درج ہیں، اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ جو لوگ قدیم مشرقی ایرانی زبان بولتے تھے، اور جو زرتشت کی تعلیمات کے براہ راست مخاطب تھے، وہ کسی زمانہ مین اُن آرین لوگوں سے قریبی تعلق رکھتے تھے، جن کے درمیان رگ وید کے گیت تصنیف کئے گئے، زرتشت کا زمانہ ابھی تک صحیح طور پر متعین نہ ہوسکا، اور اس کے گاتھا سے یہ صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس مقام پر پیدا ہوا، یا کہاں اُس نے اپنے مذہب کی تبلیغ کی، لیکن اَوِستا کے دوسرے حصوں سے ان مقامات کی واقفیت ظاہر ہوتی ہے جو ہندوستان اور ایران کی سرحدوں پر واقع تھے، چنانچہ وندیداد (Vendidad) کے پہلے باب میں ایرانی علاقون کی جو فہرست دی ہوئی ہے، اس میں نہ صرف ہرات اور سیستان شامل ہیں، بلکہ رگ وید کے "سپتا سندھوا" یعنی سات دریا" بھی شامل ہیں، اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یاشت (Yashts) میں جو ایران کی ملکی روایات کی ایک نہایت قدیم منظوم کتاب ہی، اور جس کے زیادہ تر حصے زرتشت سے پہلے کے ہیں، پیناہ (Pisinah) کا ذکر ملتا ہے، یعنی کوئٹہ کے قریب کی موجودہ وادی پشین، نیز ایسے مقامات کا ذکر بھی ہے، جن سے کابل اور پشاور کے قریب کے پہاڑی خطوں اور وادی ہلمند کے

چھوٹے چھوٹے دریاؤن سے واقفیت ظاہر ہوتی ہو،

رگ وید کے گیتوں سے اس امر کی جغرافی شہادت ملتی ہے، کہ شمالی ہند کے آرین حملہ آور پنجاب میں قیام پذیر ہونے سے بہت پہلے جہاں ان گیتوں کا بڑا حصہ تصنیف ہوا، موجودہ شمالی مغربی سرحد کے علاقہ سے واقف تھے، رگ وید کے ایک مشہور گیت میں پنجاب کے تمام دریاؤں کا ذکر سوتدرو (ستلج) سے لیکر کوبھا (دریاے کابل) تک صحیح ترتیب کے ساتھ موجود ہے، ان کے علاوہ کرومُوا اور گوماتی یعنی موجودہ دریائے کرم اور گومل کا ذکر بھی پایا جاتا ہو، یہ دونوں چھوٹے چھوٹے دریا ہیں، ان کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے، کہ آرین قبیلے وزیرستان اور اس کے قریب کی وادیوں سے جہاں یہ دریا بہتے ہیں، اچھی طرح واقف تھے، اور یہ واقفیت اس مقام پر اُن کے طویل قیام سے حاصل ہوئی تھی،

افغانستان کے موجودہ دریاے ارغنداب کا اوستی نام ہرہ وتی (Harahvaiti) ہے، یہ دریا قندھار کے زرخیز علاقہ میں بہتا ہی، ہرہ وتی دریائے سرس وتی کا ٹھیک مقابل ہے جو رگ وید کے گیتوں کا ایک مشہور دریا ہے، ویدک سنسکرت کا حرف (س) اوستی زبان کے حرف (ہ) سے ہمیشہ بدل جاتا ہے،

یہ یقینی طور پر نہیں معلوم کہ ہند و ایران کے سرحدی علاقہ میں آرین لوگ کس سمت سے داخل ہوئے، لیکن خواہ وہ شمال کی طرف سے روسی ترکستان سے آئے ہوں، یا مغرب کی طرف سے ایران سے ہوکر، یہ ظاہر ہے کہ ہرات اور وادی ہلمند کا کھلا ہوا خطہ اپنے طبیعی حالات کی بنا پر ان کے پھیلنے کے لئے سب سے زیادہ آسان راستہ رہا ہوگا، موجودہ نظریہ یہ ہے، کہ یہ لوگ شمال مغرب سے آئے، یہ واقعہ کہ بعد کے زمانہ میں بھی ایرانی قبیلے مثلاً ساکا دریاے جیحون کے علاقہ میں پائے جاتے تھے، اس نظریہ کو تقویت پہنچاتا ہو، لیکن ان کے آنے کی دوسری راہ یعنی مغرب کی طرف سے بالکل ناقابلِ توجہ نہیں قرار دیجا سکتی، کیونکہ ایشیاے کوچک میں چودھویں صدی قبل مسیح کے جو کتبے برآمد ہوئے ہیں، اُن سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ

جو قوم متانی (Mitanni) کے علاقہ میں شمالی عراق کے قریب آباد تھی، وہ ان دیوتاؤں کی پرستش کرتی تھی، جو رگ وید کے گیتوں میں نمایاں ہیں، نیز چند ویدک الفاظ بھی استعمال کرتی تھی،

موہنجو دارو (سندھ) میں جو آثار قدیمہ حال میں برآمد ہوئے ہیں، ان سے ایک ایسے تمدن پر روشنی پڑتی ہے، جو تقریباً ڈھائی تین ہزار سال قبل مسیح کا ہے، یہ ایک بلند تمدن تھا، جیسا کہ اکتشافات سے ظاہر ہوتا ہے، مثلاً مکانوں میں حمام، آتشدان، اور موہریان وغیرہ بھی ہوتی تھیں، اور سڑکیں پتھر کی بڑی بڑی تھیں، دھات کی صنعت پوری طرح ترقی کر چکی تھی، چھوٹے چھوٹے سنگ تراشی کے نمونوں اور کندہ کی ہوئی مہروں سے فنی مہارت کا ثبوت ملتا ہے، عمدہ قسم کی پکی مٹی کے برتن بھی عام تھے، لیکن سب سے زیادہ اہم اکتشاف مذہبی خیالات کی قدامت ہے، یہ خیالات ویدک خیالات سے بالکل مختلف ہیں، اور صاف طور پر زمانۂ قبل آرین کے معلوم ہوتے ہیں، پھر بھی ہندوستان کے عام مذہبی نظاموں میں غالب ہیں، اسکی شہادت متعدد چیزوں سے فراہم ہوتی ہے، جو ہندوستان کے پرستش کے طریقوں کے لئے مخصوص ہیں، مثلاً لنگ، یونی، مقدس سانڈ کی تصویریں، اور "شکتی" یا "ما تا دیوی" (Mother Goddess)

اس کے بعد یہ ضروری معلوم ہوا کہ "سندھی تہذیب" اور "مشرق ادنیٰ" کے قدیم مقامات کے ابتدائی تمدن یعنی کلکالیتھک تمدن (Chalcolithic culture) کا درمیانی تعلق دریافت کیا جائے، ۱۹۲۵ء میں مسٹر ہارگریوز (Hargreaves) نے نال کے مقام پر جو ریاست قلات میں واقع ہے، کلکالیتھک (Chalcolithic) عہد کا ایک قبرستان کھود کر برآمد کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اگر دریائے سندھ کے مغرب میں ایک وسیع پیمانہ پر کھودائی کا کام شروع کیا جائے، تو کیا کچھ نہ دستیاب ہوگا، خوش قسمتی سے مجھے اس کا موقع مل گیا، ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ کی طرف سے مجھے برطانوی ہند کی انتہائی مغربی سرحد پر دو مہمیں لیجانی پڑیں، ان میں سے پہلے سفر میں میں نے وزیرستان کی پہاڑیوں کے دامن میں اور پھر ژاب (Zhob) اور پشین کی وادیوں میں

زمانہ قبل تاریخ کے متعدد مقامات پر کھدوائی کرائی، دوسرے سفر میں برطانوی مکران کے ایک وسیع علاقہ میں کھدوائی ہوئی، اور وہاں مجھے بحر عرب کے ساحل تک تقریباً اسّی مقامات پر کلکا لیتھک عہد کی آبادیوں کے آثار ملے، جن علاقوں میں کھدوائی ہوئی تھی، ان کی وسعت شمال مشرق سے جنوب مغرب تک اندازاً (۱۵۰) میل اور جنوب میں تقریباً (۲۵۰) میل تھی، یہاں کے آثار قدیمہ سے یہ ثابت ہو گیا، کہ کلکا لیتھک عہد میں جو تمدن اس سرحدی علاقہ میں جاری تھا، وہ ہندوستان اور ایران کا متحدہ تمدن تھا، بعض مقامات پر مقدس سانڈ اور ماتا دیوی کے بت کثرت سے پائے گئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے، کہ جو مذہب موہنجو دارو میں رائج تھا، اور اصلاً ہندوستانی تھا وہی مغرب میں موجودہ ایرانی ہندی سرحد تک پھیلا ہوا تھا،

۱۹۲۹ء میں ہندوستان کے محکمۂ آثار قدیمہ سے علٰحدہ ہونے کے بعد مجھے ان تحقیقات کے جاری رکھنے کا موقع چار بار اور ملا، اور میں برطانوی مکران کی جنوبی مغربی سرحد سے آگے بڑھ کر جنوبی ایران کی پوری وسعت کو طے کرتا ہوا کردستان تک چلا گیا، انہیں سے پہلے سفر میں میں ایرانی مکران کے درمیان سے ہو کر گذرا یعنی زیر بحث علاقہ کے مغربی حصہ سے اس خطہ میں کلکا لیتھک عہد کے قدیم مقامات پر جو چیزیں برآمد ہوئیں، اُن سے اُن چیزوں کی اہمیت پوری طرح واضح ہو گئی، جو سرحد کی برطانوی سمت میں دریافت ہوئی تھی، لیکن تعجب یہ ہے کہ مقدس سانڈ اور ماتا دیوی کے چھوٹے چھوٹے بت جو ہندوستانی مذہب کے علامات تھے، ان مقامات پر کہیں نہیں پائے گئے، کرمان، فارس، خوزستان، اور کرمان شاہ کے صوبوں سے لیکر کردستان تک تلاش و جستجو سے جو شہادتیں فراہم ہوئی ہیں، ان کی بنا پر کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا، کہ جہاں جہاں مستقل بود و باش ممکن تھی، کلکا لیتھک تمدن یکساں طور پر رائج تھا،

لہذا ان قدیم زمانوں میں بھی ہندوستان اور مشرق ادنیٰ کے درمیان ایران کے راستہ سے پرامن آمد و رفت اور تجارت کا امکان فرض کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے بعد بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے، کہ زمانۂ قبل تاریخ کے اس قدیم تمدن (کلکا لیتھک تمدن) کی نشو و نما، اور ترقی ابتدا کس مقام پر ہوئی، آیا ایران

میں ہوئی، یا کسی اور ملک میں، بحر عرب اور خلیج فارس کے ساحلوں پر میں نے وادی سندھ اور عراق عرب کے درمیان زمانہ قبل تاریخ کی بحری تجارت کے آثار تلاش کئے، لیکن کامیابی نہ ہوئی، تاہم اسلامی عہد کے اس قسم کے آثار کثرت سے پائے گئے، لیکن اس ساحل کے تہ آب ہو جانے سے جیسا کہ بعض مقامات پر میرے مشاہدہ سے ثابت ہو چکا ہے، اس سلبی شہادت کی وہ اہمیت باقی نہیں رہتی، جو بصورت دیگر اسے حاصل ہوتی،

ایران اور ہندوستان کی سرحد کو پار کرکے جو آرین قبیلے سندھ اور پنجاب میں آکر آباد ہوئے، ان کی زبان ویدک سنسکرت تھی، اور ان کی آمد زمانہ قبل تاریخ میں ہوئی، اس زمانہ کے حالات آثار قدیمہ کی مدد سے ابھی تک معلوم نہیں ہو سکے ہیں، اور نہ آرین لوگوں کے حملہ کے وقت وادی سندھ اور اس سے آگے کے علاقہ کا تمدن دریافت ہو سکا ہے، البتہ مغرب کے ان زرخیز علاقوں سے ملے ہوئے جو علاقے تھے، ان کی طبعی حالت کسی قدر معلوم ہوئی ہے، اگرچہ آرین فتوحات کے وقت اس علاقہ کی زمین بہ نسبت موجودہ زمانہ کے کم خشک رہی ہو، تاہم چونکہ قابل زراعت حصہ کم تھا، یہ حملہ آور نیم خانہ بدوشی کی زندگی پہاڑیوں پر بسر کرتے رہے ہوں گے، قدرۃً ان کے دل میں اپنے قلیل وسائل معاش کو بڑھانے کا خیال پیدا ہوا ہوگا اور اس کے لئے میدانوں کے زراعت پیشہ لوگوں پر حملہ کرنے کی خواہش ہوئی ہوگی، ٹھیک اسی طرح جس طرح ان کے بعد پٹھان قوم موجودہ شمالی مغربی سرحد کی طرف سے ان میدانوں پر حملہ آور ہوئی، یہ زراعت پیشہ قومیں جو میدانوں میں آباد تھیں، جسمانی قوت میں ان کے برابر نہ رہی ہوں گی، اگرچہ تمدنی حیثیت سے وہ ان سے بہتر رہی ہوں گی، وادی سندھ کا تمدن اس وقت تک اُس سطح سے نیچے اُتر آیا ہوگا، جس سطح پر موہنجو دارو کے آثار قدیمہ سے تمدن کا پتہ لگتا ہے، لیکن خواہ صورت حال کچھ بھی رہی ہو، یہ ماننا پڑے گا کہ جو قوم آرین حملہ سے مغلوب ہوگئی، اس میں غیر ملکی فاتحوں کو اپنے اندر جذب اور ہضم کرنے کی وہ قوت تھی جسے ہندو مذہب نے اکثر تاریخی ادوار میں ظاہر کیا ہے،

اس میں شبہہ نہیں کہ یہ عمل بڑی حد تک جاری رہ چکا تھا، جبکہ سائرس (۵۵۸ تا ۵۳۰ ق م) کی فتح گندھارا (قندھار) کے ساتھ تاریخ کی روشنی ہندوستان کی انتہائی شمالی مغربی سرحد پر پڑتی ہے، اس

صوبہ میں نہ صرف پشاور کا ضلع شامل تھا، بلکہ پوری وادی کابل اور اس کے جنوبی علاقے بھی شامل تھے، اس فتح کو اور بھی وسعت ہوئی، جب ۵۱۶ ق م کے بعد دارا (Darius) نے صوبہ "ہند" کو قندھار میں شامل کرلیا، چونکہ یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus) لکھتا ہے کہ صوبہ ہند سلطنت ایران کا سب سے زیادہ آباد صوبہ تھا، اور سالانہ خراج بھی سب سے زیادہ ادا کرتا تھا، اس لئے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ اس میں دریائے سندھ کے دونوں جانب کے علاقے سندھ تک شامل تھے، ہیروڈوٹس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ دارا کے جانشین کیخسرو (Xerxes) نے جب ۴۸۰ ق م میں یونان پر حملہ کیا، تو اس کی فوج میں قندھاریوں اور ہندوستانیوں کے دستے بھی شامل تھے، پروفیسر ریپسن (Rapson) نے سچ کہا ہے کہ "غالباً قدیم تاریخ کے کسی دور میں بھی خشکی کے راستے سے آمد ورفت کے ذرائع اس سے زیادہ کھلے ہوئے نہ تھے، اور نہ ہندوستان اور مغرب کے درمیان تبادلۂ خیالات کے لئے حالات اس سے زیادہ موافق تھے"

بدقسمتی سے اس وقت تک کوئی متعین اثری شہادت اس امر کی بہم نہ پہونچ سکی، کہ ان صوبوں میں پوری دو صدیوں کے ایرانی تسلط نے کیا اثر چھوڑا، معلوم ہوتا ہے، کہ سلطنت ایران کے اور حصوں کی طرح ان صوبوں میں بھی ایرانی گورنروں نے براہ راست حکومت کا طریقہ جاری رکھا تھا، ان کے انتظامی عمال اور فوجوں میں زیادہ تر لوگ سلطنت کے مغربی حصوں سے بھرتی کئے جاتے ہوں گے، لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا، کہ ان دو صوبوں کے ملکی تمدن پر اس کا کوئی اہم اثر پڑا ہوگا، ان صوبوں سے متعلق جو متفرق اور قلیل حالات بعد کے عہد کے معلوم ہوسکے ہیں، اُن سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، کہ ان کا تمدن اصلاً ہندوستانی باقی رہا، معلوم ہوتا ہے، کہ مشرق کے ان دور دراز صوبوں پر ایرانی شہنشاہوں کا تسلط رفتہ رفتہ کم ہوتا گیا، لیکن جب سکندر ہندوستان کی مہم پر روانہ ہوا تھا، تو اس نے ان صوبوں کو اس وقت بھی سلطنت ایران ہی کا جزو پایا تھا، اور حق فتح کی بنا پر سلطنت ایران کے ساتھ ان کا بھی دعویدار ہوا تھا،

"ع ز"

اخبار علمیہ

بقائے شباب کا معمل

ڈاکٹر کیرل (Dr. Alexis Carrel) امریکہ کے ایک مشہور فاضل طب ہیں، حال میں انھون نے بیمہ کمپنیوں کی ایک انجمن میں جس کا اجلاس نیویارک میں منعقد ہوا تھا، یہ تجویز پیش کی ہے، کہ دائمی شباب کا راز دریافت کرنے کے لئے ایک مخصوص معمل قائم کرنا چاہئے، کیونکہ بقاے شباب کی فطری خواہش انسان کے دل سے کبھی دور نہیں ہو سکتی، اور اس وقت تک دنیا کے کسی حصہ میں کوئی ایسا معمل موجود نہیں ہے جہان عمر کے انحطاط اور زندگی کی درازی کے مسئلہ پر مناسب طریقہ سے تحقیق ہوتی ہو، ڈاکٹر موصوف کا خیال ہے کہ اگر ایک معمل قائم کر کے سائنٹفک طریقہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کی جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ کامیابی حاصل نہ ہو، یہ خیال ان کے ذاتی تجربہ پر مبنی ہے، انھون نے شریانون کے ٹکڑے جسم انسانی سے علحدہ کر کے تجربہ کیا ہے کہ وہ امتحانی نلی (Test tube) میں ہمیشہ زندہ رہ سکتے ہیں، اور کچھ دن ہوئے انھون نے یہ تجربہ بھی کیا ہے کہ پورے پورے اعضا جسم سے علحدہ کرنے کے بعد بھی زندہ رکھے جا سکتے ہیں، ان تجربات کی بنا پر انھیں امید ہے، کہ انسانی جسم بھی مناسب طریقوں کے دریافت ہونے پر غیر محدود مدت تک زندہ رکھا جا سکتا ہے، موت جن اسباب سے واقع ہوتی ہے، وہی دائمی زندگی کی راہ کی رکاوٹیں ہیں، سائنٹفک تحقیق ابھی تک اس نتیجہ پر پہونچی ہے، کہ موت کا غالبًا ایک ہی سبب ہے، اور وہ سبب اتفاقی حادثہ ہے اتفاقی حادثہ ایک ایسا امکان ہے جس کا وقوع میں آنا عقل کی مدد سے روکا جا سکتا ہے تمام اطبا

کا نتیجہ ہے کہ ہر بیماری کسی خاص سبب کا نتیجہ ہوتی ہے، اور وہ سبب کسی اتفاق سے پیدا ہوتا ہے، جو بیماریاں جرثیم سے پیدا ہوتی ہیں، ان میں تو یہ علت ناقابلِ انکار طور پر نمایاں ہوتی ہے، اب سوال یہ ہے کہ عمر کا انحطاط فطری اور ناگزیر ہے، یا محض اتفاقی ہے جسے مناسب تدبیروں سے روکا جاسکتا ہے، اس باب میں اطبار کا اختلاف ہے، ڈاکٹر کیرل نے جس عمل کی تجویز پیش کی ہے، اس میں اسی مسئلہ کی تحقیق کیجائیگی،

دنیا کے سب سے بہترین ہیرے کا افسانہ

پریٹوریا (ٹرانسوال) میں ایک شخص جیکوبس جونکر (Jacobus Jonker) نامی تھا جو اپنے افلاس سے نہایت پریشان رہا کرتا تھا، اسے قیمتی پتھروں کی تلاش کا شوق تھا، اور اکثر اپنا اوقات سنگریزوں کی چھان بین میں صرف کیا کرتا تھا، ۱۹۳۴ء میں ایک روز اس کے علاقہ میں نہایت تیز بارش ہوئی، جس سے سطحِ زمین کی مٹی دھل کر بہ گئی، اور نیچے کے سنگریزے دکھائی دینے لگے، جونکر حسبِ معمول سنگریزوں کو کھود کھود کر دیکھنے لگا، اتفاق سے اس کی نظر ایک پتھر پر پڑی جس پر مٹی جمی ہوئی تھی، مٹی صاف کی، تو معلوم ہوا کہ ایک چمکدار ہیرا ہے، جو قد میں مرغی کے انڈے کے برابر ہے، اس کا وزن (۷۲۶) قیراط ہے، جونکر نے اسے تین لاکھ پینڈ ہزار ڈالر میں فروخت کر ڈالا، اس کے بعد یہ ہیرا لندن بھیجا گیا، جہاں کے جوہریوں نے فیصلہ کیا، کہ بڑے ہیروں میں یہ دنیا کا بہترین ہیرا ہے، اس کا رنگ نیلگوں سفید ہے جو نادر سمجھا جاتا ہے، جون ۱۹۳۵ء میں امریکہ کا ایک جوہری اسے خرید کر نیویارک لے گیا، اور لانڈ کے مشہور کارخانہ میں اسے تراشنے کے لئے دیا، یہ ہیرا اتنا سخت تھا، کہ اس کا حسبِ خواہش کاٹنا محال معلوم ہوتا تھا، ایک خاص قسم کی آری سے جو فی منٹ پانچہزار چکر کی رفتار سے چلتی تھی کئی مہینوں میں اس کے تراشنے کا کام ختم ہوا، اور اس سے بارہ ہیرے بن کر تیار ہوئے جن میں سب سے بڑا نمبر ۱ جونکر کے نام سے مشہور ہے، اور اس کا وزن (۱۴۲) قیراط ہے جو بہر نوع اس امر پر اتفاق ہے کہ نمبر ۱ جونکر دنیا کا سب سے زیادہ نادر ہیرا ہے، اور اس وجہ سے اسکی قیمت متعین کرنا دشوار ہے، سینٹ پال کمپنی (امریکہ) نے دس لاکھ ڈالر پر اسکا بیمہ کیا ہے

"زہر کھانے والے"

بعض لوگ کسی خاص غرض سے سنکھیا کھانا شروع کر دیتے ہین اور رفتہ رفتہ اس کی خوراک کی مقدار اتنی بڑھا دیتے ہیں، کہ دوسروں کے لئے اس کا خفیف جز بھی ہلاک ہوتا ہی لیکن آسٹریا کے صوبہ اسٹائریا مین آبادی کا بڑا حصہ آرسینک (سنکھیا) کھانے کا عادی ہے جسکی وجہ سے وہ لوگ "سنکھیا کھانے والے" مشہور ہو گئے ہین وہ سنکھیا کے اسی طرح عادی ہیں جس طرح دوسرے لوگ شراب یا اور نشی چیزوں کے عادی ہوتے ہین اُن کا بیان ہو کہ اس سے اُن کی صحت درست رہتی ہے، تکان نہیں محسوس ہوتی اور جسم مین غیر معمولی قوت پیدا ہوتی ہے، وہ لوگ بچوں کو شیر خوارگی کے زمانہ ہی سے آرسینک کھلانا شروع کر دیتے ہین، اور جون جون بچہ بڑھتا جاتا ہی، آرسینک کی خوراک بھی بڑھاتے جاتے ہیں، مشکل یہ ہے کہ جب سنکھیا کھانے کی عادت پڑ جاتی ہے، تو اُسے ترک نہیں کر سکتے، آسٹائریا کے لوگون کا تجربہ یہ ہے کہ اسے بعد مین چھوڑ دینے سے صحت بہت جلد خراب ہو جاتی ہے، اور مریض یقیناً مرجاتا ہے، آرسینک کا ایک اثر جو انسانون اور جانوروں دونوں پر نمایاں طور سے دیکھا جاتا ہے، یہ ہے کہ اس کے استعمال سے جسمانی صحت کے علاوہ جسمانی حسن میں بھی اضافہ ہوتا ہے، کہا جاتا ہے کہ اسٹائریا کی لڑکیان یورپ کے دوسرے حصون کی لڑکیون سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہین، آرسینک چہرے اور بالوں کی خوبصورتی میں خاص طور سے اضافہ کرتا ہے، اسٹائریا کے لوگ کئی پشتوں سے آرسینک کھاتے آئے ہیں، اور یہ زہر اُن کے بچوں کی گھٹی میں داخل ہوتا ہے، آرسینک کا (⅕) گرام ایک معمولی آدمی کو ہلاک کر دینے کے لئے کافی ہے لیکن اسٹائریا کے باشندے بغیر کسی مضرت کے (۳) تین گرام کھا سکتے ہیں، حکومت آسٹریا نے زہر خوری کی اس عادت کو موقوف کرانے کی کوشش کی، لیکن اُسے زیادہ کامیابی نہ ہوئی آرسینک بیچنے والے اسے پنیر کی شکل میں تیار کر کے گھر گھر فروخت کرتے پھرتے ہیں، اور کسان اسے مکھن کی طرح روٹی

پر لگا کر کھاتے ہیں، یہ اسی عادت کا نتیجہ ہے کہ اسٹائریا میں قتل کے واقعات بہت ہوتے رہتے ہیں، لیکن ملزم سزایاب کم ہوتے ہیں، جس شخص کی جان لینی مقصود ہوتی ہے، اسے اس کی معمولی خوراک سے زیادہ مقدار میں آرسینک کھلا دیتے ہیں، چونکہ لوگ عام طور سے آرسینک کھانے کے عادی ہوتے ہیں، اس لئے عدالت کیلئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے، کہ کسی دوسرے نے قتل کی غرض سے آرسینک کھلا دیا تھا،

ترکی مین لڑکیون کی فوجی تعلیم

انگریزی اخبار آبزرور (Observer) کا نامہ نگار قسطنطنیہ سے اطلاع دیتا ہے، کہ ترکی حکومت کے شعبۂ تعلیم کی طرف سے ایک حکم اس مضمون کا صادر ہوا ہے، کہ "ہائی اسکول انٹرمیڈیٹ اور یونیورسٹی کی تمام لڑکیون کے لئے فوجی تعلیم ضروری قرار دی جائے، معلوم ہوتا ہے کہ فوجی نصاب کی مدت دو سال رکھی گئی ہے، پہلے سال کے مضامین یہ ہین: فوجی بھرتی اور نقل و حرکت کے ابتدائی اصول فوجی نظم و تادیب اور فوجی قانون، اس کے بعد لڑکیون کو اسلحہ اور نقشوں کے استعمال کرنیکے طریقے بتائے جائیں گے، اور ہوائی حملوں کی مدافعت طبی امداد، اور فوجی اطلاعات بہم پہونچانے کی تعلیم دی جائے گی، فوجی تاریخ کے اسباق بھی پہلے سال کے نصاب میں داخل ہیں، دوسرے سال کا نصاب حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے، مشین گنون کا استعمال گولوں اور توپخانوں کی تعلیم، شہروں اور دوسرے اہم مقامات کا تفصیلی نقشہ، صف آرائی، اور محاذ جنگ کے پیچھے کام کرنے کی تعلیم، "ع ز"

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی اخلاقی تمدنی سیاسی اقتصادی اور تعلیمی حالات ہندوستانی زبان میں لکھے ہیں، ضخامت ۲۴۲ صفحے قیمت:- عہ "منیجر"

ادبیات

غزل

از جناب سید ناظر الحسن صاحب ہوش بلگرامی (معتمد افواج سرکار عالی حیدرآباد دکن)

بے حجابانہ جب آ جاتا ہے، اک قیامت سی اٹھا جاتا ہے،

حشر اٹھاتا ہے ترا دیوانہ گر کبھی ہوش میں آ جاتا ہے،

لو خبر اپنے مریضِ غم کی، حال کچھ غیر سنا جاتا ہے،

دیکھتا ہوں جو کسی کا جلوہ روح پر نشہ سا چھا جاتا ہے،

اک حقیقت ہے میری حیرانی کوئی آئینہ دکھا جاتا ہے،

دیکھ اس بزم میں اے ہوش نہ جا

سوچ کر کام کیا جاتا ہے،

جذبات اثر

نواب جعفر علی خان صاحب اثر لکھنوی

اک راز ہے تعلیم نہیں ہو سکتا بے معرفتِ میم نہیں ہو سکتا،

احمد کے بغیر احد ملے ناممکن نقطہ کبھی تقسیم نہیں ہو سکتا،

دریا ہوتا ہے چشمہ رفتہ رفتہ | کھلتی ہے نوائے زمزمہ رفتہ رفتہ
بڑھتی ہے یونہی روح بھی منزل کی طرف | ہوتا ہے فروغِ نغمہ رفتہ رفتہ

کچھ بھی نیکی بدی جو سوجھی ہوتی | قطرے سے پتہ کی بات پوچھی ہوتی
اے منکرِ ترتیبِ نظامِ حکمت | پہلے اپنی پہیلی بوجھی ہوتی

جب ڈیری بہار کے پڑے ہوتے ہیں | غنچے بھی نمود پر اڑے ہوتے ہیں
یوں پھوٹتی ہے کے پھریری کونپل | سب جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں

پردہ میں کلی کے مسکراتی آئی | آغوش میں گل کے لہلہاتی آئی
انگڑائیاں لیتی ہوئی جاگی ہر شاخ | البیلی بہار گنگناتی آئی

تم اور غریبوں پہ ترس رہنے دو | آئے بڑے بن کے دادرس رہنے دو
تم اور پشیمان دل آزاری سے | ہاں کیا کہا پھر کہو بس رہنے دو

نقوشِ جذبات

از جناب حبیب صاحب اشعر دہلوی

نہ غفلت میں رہ کر نہ ہوشیار ہو کر | اسے ڈھونڈئیے سب سے بیزار ہو کر
نرالی ہیں بازارِ الفت کی رسمیں | بکے جا رہے ہیں، خریدار ہو کر
تری یاد موقوف ہے بیخودی تک | تجھے بھول جائیں گے ہشیار ہو کر
ودیعت گہِ دولتِ غم بنا ہوں، | یہ دل کام آیا ہے بیکار ہو کر
یہ سب عشق کی کارفرمائیاں ہیں، | دو عالم سے چھوٹے گرفتار ہو کر
عیادت کو میری چلے آرہے ہیں | ملی دولتِ دید بیمار ہو کر
شرابِ خودی سے ہیں سرشار اشعر | ہوئے اور بدمست ہشیار ہو کر

باب التقریظ والانتقاد

رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر

نیسان جوبلی نمبر، مرتبہ پروفیسر سید محمد ضامن علی صاحب، تقطیع بڑی ضخامت ۳۰۰ صفحے، کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت ۶ر، پتہ اردو ایسوسی ایشن الہ آباد یونیورسٹی،

گذشتہ دسمبر میں بڑے تزک و اہتمام کے ساتھ الہ آباد یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی منائی گئی، اس کی یادگار میں یونیورسٹی مذکور کے اردو ایسوسی ایشن کے سہ ماہی رسالہ نیسان کا جوبلی نمبر نکلا ہے، جو ہر لحاظ سے توقع کے مطابق ہے، اس نمبر میں مختلف ذوق کے علمی ادبی تاریخی مضامین ستھرے افسانے اور دلچسپ نظمیں فراہم کی گئی ہیں، ابتدا میں فاضل اڈیٹر کے قلم سے الہ آباد یونیورسٹی اور اس کے شعبۂ اردو کی تاریخ ہے، اس کے بعد مضامین کا سلسلہ ہے، علمی مضامین میں لفظ "نیسان" کی تاریخی تحقیق پر اچھی روشنی ڈالی گئی ہے، "وقت" "بچوں کی تعلیم میں زبان کی اہمیت" "دورِ حاضر کی انگریزی شاعری" "قصیدہ پر ایک نظر" "حیات کی بنیادیں اور ارتقا" اچھے مضامین ہیں "مسلمان اور ریاضیات" بھی مفید مضمون ہے، مگر معلوم ہوتا ہے کسی انگریزی ماخذ سے لیا گیا ہے، اس لئے ناموں کے املا میں غلطیاں ہیں "اردو زبان کی تحقیق میں چند مشکلات" کے سلسلہ میں تحقیق کا قدم بہت آگے بڑھ چکا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اردو کی پیدائش کو کسی خاص زمانے یا خاص غرض کیساتھ مخصوص کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ وہ مسلمانوں کی آمد کے ساتھ ہندو مسلمانوں کے میل جول سے فطری طور سے پیدا ہوئی، اور ان کے تمدن کے فروغ کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی تاآنکہ مغلوں کے زمانہ میں مستقل زبان کی حیثیت اختیار کر لی، ادبی مضامین میں اکبر الہ آبادی "دورِ حاضر کے چند

شاعر اور افسانوں میں "سندری سماج"، "اور اندھیری راتیں" لائق ذکر ہیں،

اردو مسعود نمبر، مرتبہ مولوی عبد الحق صاحب بی اے ضخامت ۲۰۰ صفحے، اس نمبر کی قیمت غالباً ؏ یا ؏ ایک ہوگی، پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن،

اس قحط الرجال کے دور میں سید راس مسعود مرحوم کی قبل از وقت وفات ایک قومی حادثہ ہے، ان کی ساری زندگی علم و تعلیم کی خدمت میں گذری، وہ جہاں جہاں رہے، تعلیم ہی کی خدمت ان کا مشغلہ رہا، گو ان کی نشو ونما انگریزی ماحول میں ہوئی تھی، لیکن ان کی قومی حمیت نے ان کو اپنے تمدن سے بیگانہ نہ ہونے دیا، اپنی زبان سے ان کو دلی لگاؤ تھا، اور وہ اس کا نہایت ستھرا مذاق رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کا "انتخاب زرین" ہے، انھوں نے ہندوستانی زبان کی متعدد بہر خدمت کی، سرکار نظام میں تحریک کرکے "مراثی میر انیس" کا ایک بہترین اڈیشن شائع کرایا، انجمن ترقی اردو کے صدر تھے، ہندوستانی زبان کے سب سے بڑے ادارہ "عثمانیہ یونیورسٹی" کا تخیل اگرچہ بہت قدیم ہے، اور اس کا خاکہ بنانے والے پرانے بزرگ تھے، لیکن اس کا عملی تجربہ اور فروغ راس مسعود ہی کے نظامت تعلیم کے زمانہ میں ہوا، اس لحاظ سے وہ ہندوستانی زبان کے محسنوں کی صف اول میں ہیں، ان کے ان خدمات کا لحاظ کرکے انجمن ترقی اردو کے رسالہ نے ان کی یادگار میں یہ خاص نمبر نکالا ہے جس کے وہ بجا طور سے مستحق تھے،

اس نمبر میں مرحوم کے بہت سے اہل علم ہندوستانی اور انگریز احباب اور تعلق رکھنے والوں نے مرحوم کے حالات اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر مضامین لکھے ہیں، ان لکھنے والوں میں مولوی عبد الحق صاحب بی اے، سر شیخ عبد القادر، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر عابد حسین، مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، سید عبد العزیز بیرسٹر پٹنہ، سید محی الدین صاحب پرنسپل عثمانیہ کالج، مولوی غلام یزدانی صاحب ناظم آثار قدیمہ حیدر آباد، میاں بشیر احمد اڈیٹر ہمایوں، اور متعدد انگریزوں کے نام ہیں، جن کا مرحوم کا یورپ یا ہندوستان میں ساتھ رہ چکا ہے اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے، انگریزوں کے مضامین کا اصل کے ساتھ ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے اس طرح یہ نمبر راس مسعود مرحوم کے حالات کا اچھا مرقع بن گیا ہے، جس میں ان کی سیرت اور ان کے کارناموں کی

پوری تصویر نظر آجاتی ہے،

جامعہ مرتبہ ڈاکٹر عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع بڑی ضخامت ۱۳۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت جنوری نمبر عہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

جامعہ ہندوستان کے سنجیدہ اور ممتاز رسائل میں ہے، اس نے مذاق عام سے اپنا دامن بچائے رکھا اور ہمیشہ اپنے ناظرین کے لئے مفید اور کارآمد لٹریچر پیش کرتا ہے، اس نے غالباً کبھی کوئی خاص نمبر نہیں نکالا ہے لیکن جنوری کا پرچہ مضامین کی نوعیت اور ضخامت کے لحاظ سے خاص نمبر بن گیا ہے، اس میں ۱۹۳۷ء کے ساری دنیا کے سیاسی حالات و مسائل پر تبصرہ ہے، سب سے پہلے اپنے گھر یعنی ہندوستان میں جدید دستور کے قیام اور اس کے نتائج اور یہاں کے اہم معاشی اور تجارتی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اور آئندہ اصلاحی پروگرام میں کانگریسی حکومتوں کو مفید مشورے دیئے گئے ہیں، اس کے بعد بین الاقوامی سیاسیات میں برطانیہ، امریکہ، روس، اٹلی، اسپین، جرمنی، فرانس اور جاپان کے سیاسی مقاصد ان کی باہمی کشاکش اور اس کے نتائج کو دکھایا گیا ہے، پھر اسلامی ممالک میں شمالی افریقہ، طرابلس، مصر، سوڈان، حبش، یمن، نجد و حجاز، شام و عراق، ترکی اور فلسطین کے داخلی اور خارجی حالات، یورپین حکومتوں سے ان کے سیاسی تعلقات اور ان سے ان کے اغراض و مقاصد اور اس کے اثرات و نتائج کو پیش کیا گیا ہے، ان بین الاقوامی سیاسی مضامین کے علاوہ معاشی مضامین میں زمینداری کی تاریخ اور اس کے مستقبل" اور یہاں کے "مہاجنی یا بنیکاری کی تاریخ، اور اس کے کاروباری نظام" پر مفید مضمون ہیں سیاسیات عالم پر جو نئی کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا تعارف ہے، مختلف ملکوں کے موجودہ تعلیمی حالات ہیں، آخر میں ڈاکٹر ذاکر حسین خانصاحب کی مرتب کردہ "واردھا ایجوکیشن کمیٹی کی رپورٹ" ہے، گویا یہ نمبر بین الاقوامی سیاسیات کا اطلس ہے، رسالہ جامعہ کے متعلق ہماری عرصہ سے یہ رائے تھی، جس کے اظہار کا اب موقع ملا، کہ وہ علم و ادب کو چھوڑ کر صرف تعلیم اور سیاسیات کو اپنا موضوع بنا لیتا، علم و ادب کے رسالے تو بہت سے ہیں، لیکن دنیا کے سیاسی حالات بتانے والا کوئی نہیں، یہ چیز جامعہ کے مذاق کے مطابق بھی ہے اور مفید بھی،

علیگڈھ میگزین تعطیلات نمبر، مرتبہ جناب معین الدین دردائی صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،

علیگڈھ میگزین کا یہ خاص نمبر معین الدین صاحب دردائی نے محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے اسکے مضامین معیاری مفید اور پراز معلومات ہیں، لائق اڈیٹر کا لکھا ہوا مضمون "انقلاب اسپین" اسپین کے گذشتہ اور موجودہ حالات کی اجمالی تاریخ اور موجودہ انقلاب کے سمجھنے کے لئے کارآمد ہے "بغاوت یونان اور سیاسیات یورپ" بھی اچھا مضمون ہے، "رجب علی بیگ سرور" کا مقالہ محنت سے لکھا گیا ہے، پروفیسر عبدالباسط صاحب کا مضمون "ہندوستانی زبان اور معاشرت پر انگریزی اثرات" نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہے، علی گڈھ کی فضا کے لئے ایسے مضامین کی بڑی ضرورت ہے، "ہم خدا کو کیوں نہ آزمائیں" افسانے کے رنگ میں خداشناسی کا اچھا درس ہے، یہ نمبر علیگڈھ میگزین کی ترقی کا اچھا نمونہ ہے،

سالنامہ ہمایوں مرتبہ جناب میاں بشیر احمد صاحب بیرسٹر ایٹ لا تقطیع اوسط ضخامت ۱۴۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲/ پتہ لارنس روڈ لاہور،

پنجاب کے رسالوں میں ایک ہمایوں ہی ایسا وضعدار رسالہ ہے، جو شروع سے ابتک ایک روش پر قائم ہے، خاص تقریبوں میں بھی اس کی متانت میں فرق نہیں آتا، چنانچہ اس کے خاص نمبروں میں بھی ظاہری بھڑک نظر نہیں آتی جو سالناموں کا طغرائے امتیاز ہے لیکن جو کچھ پیش کرتا ہے، وہ سب مفید سنجیدہ اور لائق قدر ہوتا ہے اگرچہ اس کا سالنامہ دوسرے رسالوں کے سالناموں کے مقابلہ میں نہایت مختصر ہے لیکن جو کچھ ہے سب پڑھنے کے لائق ہے، فاضل اڈیٹر کے لکھے ہوئے نوٹس اور "انشترکیت" کا مضمون خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے، پروفیسر حمید احمد خاں صاحب کا مضمون "غالب اور بیدل" اچھا مضمون ہے، گو اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے لیکن دیدہ ریزی سے لکھا گیا ہے، افسانے بھی دلچسپ ہیں، غرض ہمایوں کا سالنامہ حشو و زوائد سے پاک ہے،

سالنامہ ادبی دنیا، مرتبہ جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۶ صفحے

کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ کمرشل بلڈنگس مال روڈ لاہور،

ادبی دنیا کا یہ سالنامہ قریب قریب اخباری تقطیع پر ایک ضخیم کتاب کی شکل میں نکلا ہے، ادارہ نے ہر مضمون پر رائے ظاہر کرکے خود ہی تنقید کا فرض انجام دے لیا ہے، بہرحال ظاہری شان و شکوہ بلکہ جثہ میں یہ سالنامہ دوسرے تمام سالناموں سے بڑھ گیا ہے، لیکن ظاہر و باطن میں تناسب کم ہے، پھر بھی مضامین و مواد کے لحاظ سے اس میں خاصہ سامان موجود ہے، ادب و افسانہ کے مقابلہ میں سنجیدہ علمی مضامین بہتر ہیں "بیگمات اودھ کے خطوط"، "فرنگی مبلغ دربار مغلیہ میں"، "گارڈنر خاندان کے شعراء"، اور "خیدی واس" اچھے اور مفید مضامین ہیں، افسانوں میں "جوانی کا خواب"، "عزت"، "ممتا"، "برابر کی چوٹ"، اور "شاعر کی موت" دلچسپ ہیں، نظموں کا حصہ بھی خاصہ ہے،

سالنامہ ساقی، مرتبہ جناب شاہد احمد صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ کھاری باولی دہلی،

ساقی کا سالنامہ ادب اور افسانوں کا اچھا مجموعہ ہے، افسانوں کے انتخاب سے حسن مذاق نمایاں ہے، ساقی کے خاص نمبروں کی یہ خصوصیت لائق ذکر ہے کہ ان میں عموماً فاضل مترجم مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی کے قلم سے دوسری زبانوں کے کسی نہ کسی "ادبی شاہکار" کا ترجمہ ہوتا ہے، چنانچہ اس نمبر میں بھی شکسپیر کے مشہور ڈرامے "میکبتھ" کا ترجمہ ہے، اس طرح ابتک دوسری زبانوں کے متعدد بہترین افسانے اور ڈرامے ہندوستانی میں منتقل ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ اور بہت سے دلچسپ افسانے، ڈرامے، اور بعض ادبی مضامین ہیں، ان میں "بھوجانی"، "سعید"، "تعمیر جنون"، اور "فسادی" بہترین ہیں، خصوصاً فسادی بہت خوب ہے، پروفیسر شادانی صاحب کا مضمون "دور حاضر اور اردو غزل گوئی" غالباً مزاحیہ رنگ میں ہے، اس لئے کہ اسے سنجیدگی پر محمول کرنا، پروفیسر صاحب کیساتھ سوء ظن ہوگا،

سالنامہ عالمگیر، مرتبہ جناب حافظ محمد عالم صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۵ صفحے کاغذ معمولی

کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر رسالہ عالمگیر بازار سید مٹھا لاہور،

عالمگیر نے حسب معمول اپنے ناظرین کی سالانہ ادبی ضیافت کے لئے اپنے سالنامہ میں مختلف رنگ کے دلچسپ افسانوں، مفید علمی اور ادبی مضامین کا ستھرا سامان مہیا کیا ہے، سنجیدہ علمی مضامین میں ہندوستان کا ارزہ خرم افلاس" افضل خان علامی" کچھ اقبال نامۂ جہانگیری سے" اور انسانی پرواز کی تاریخ" مفید ہیں، افسانوں میں "پرائی اولاد" کرکٹ میچ" لنگوڑے مردوے" ایک راز" خانم نے انگریزی پڑھی" بے گناہ کشی" وغیرہ قریب قریب دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں علمی اور ادبی دونوں حیثیتوں سے عالمگیر کا سالنامہ کامیاب نمبر ہے،

سالنامۂ ادب لطیف مرتبہ جناب چودھری برکت علی صاحب بی اے و مرزا ادیب صاحب بی اے،

تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ، پتہ دفتر ادب لطیف،

لوئر مال نمبر ۹، لاہور،

اس سالنامے میں ادب لطیف کی تمام خصوصیات موجود ہیں، ۲۲۰ صفحے کا دلچسپ اور ستھرا سامان مطالعہ ہے، زیادہ تر افسانے ہیں، ان میں "پریم کا جادو" صحرانورد کے خطوط" اور "خاوند کی ضرورت" زیادہ بہتر ہیں، علمی مضامین میں دنیا کی اہم تحریکات" مفید ہے، "التماس بے خود" کے لاتنا ہی سلسلہ بحث میں اگرچہ مفید ادبی باتیں بھی نکل آتی ہیں، لیکن اب اس قضیۂ نامرضیہ کو ختم کر دینا چاہئے،

پیام تعلیم سالگرہ نمبر مرتبہ جناب مولوی حسین حسان صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۱۲۵ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

بچوں کے مشہور و مقبول رسالہ پیام تعلیم نے حسب معمول جامعہ کے یوم تاسیس کے موقع پر سالگرہ نمبر نکالا ہے، اس کے ناظرین اس کی اس خصوصیت سے ناواقف نہ ہوں گے، کہ وہ مضامین میں بچوں کے مذاق کے ساتھ ان کی علمی اور اخلاقی تعلیم کو ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے، چنانچہ اس نمبر میں خالص بچوں کے مذاق کے حکایات و لطائف کے ساتھ، علمی تاریخی اور سیاسی مضامین، سائنس کے ایجادات و اختراعات، جدید تحقیقاتوں اور اکتشافات

اور مختلف قسم کے مسائل و معلومات کو نہایت آسان، سادہ اور بچوں سے خطاب کی زبان میں اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ وہ انھیں قصہ کہانی کے طور پر دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتے ہیں، خالص بچوں کی دلچسپی کے تفریحی مضامین قصہ کہانیاں اور لطائف بھی ہیں لیکن ان میں بھی بیشتر اخلاقی پہلو پیش نظر ہے، کچھ تصاویر اور کارٹون بھی ہیں، اس طرح یہ نمبر گویا ان کے سامان تفریح اور نصاب تعلیم دونوں کا کام دیتا ہے،

سالنامۂ شاہکار مرتبہ حکیم عارف صاحب بلگرامی تقطیع اوسط ضخامت ۰۰۰، صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ دفتر شاہکار گورکھپور،

عام رسم کے مطابق گورکھپور کے ادبی رسالے شاہکار نے بھی غالباً پہلی مرتبہ اپنا سالنامہ نکالا ہے اور اس کے لئے مشہور شعراء اور اہل قلم کے اچھے مضامین و منظومات فراہم کئے ہیں، قاضی تلمذ حسین صاحب کا نیم تاریخی مضمون "نقد و عالم" نہایت دلچسپ ہے "جدید اردو نثر کے رجحانات" مفید مضمون ہے لیکن موضوع کی اہمیت اس سے زیادہ بسط و شرح کی طالب تھی "چاندی کا شمودان" اس سے زیادہ موثر افسانہ کی شکل میں الہلال کے دوسرے دور میں نکل چکا ہے، "باورچی کا انعام" گو مختصر ہے مگر سبق آموز ہے، اور متعدد چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں،

تنویر کراچی نمبر، مرتبہ جناب عبدالحمید صاحب جلیسری ضخامت ۷، صفحے، کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸؍ پتہ تنویر پریس لارنس روڈ کراچی؛

کراچی اگرچہ ہندوستان کا آخری کنارہ ہے، لیکن وہاں ہندوستانی زبان کا خاصہ مذاق ہے، اس کے شاعروں اور ادیبوں کی ایک جماعت موجود ہے، گذشتہ دسمبر میں وہاں سندھ پراونشل اردو کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تھا، یہاں سے ہندوستانی کے متعدد اخبارات اور رسالے نکلتے ہیں، ان میں ماہانہ رسالہ تنویر نے کراچی نمبر نکالا ہے، اس میں کراچی کی گذشتہ عمرانی و سیاسی تاریخ اور موجودہ تجارتی، صنعتی، تعمیری اور علمی و ادبی ترقیوں اور یہاں کی اسلامی جماعتوں اور ان کے مذہبی، قومی، علمی اور ادبی اداروں کے حالات، اور متعدد ممتاز لوگوں کے فوٹو ہیں، یہ نمبر کراچی کے متعلق عام معلومات کا اچھا مجموعہ ہے، "م"

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہے اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہے چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:-

۱- یہ بالکل جدید ترین لغت ہے، انگریزی زبان میں ابتک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اس میں آگئے ہیں،

۲- اسکی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اسمیں ادبی مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ انکے معنی بھی شامل ہیں جنکا تعلق علوم وفنون کی اصطلاحات سے ہے اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوئے ہیں،

۳- ہر ایک لفظ کے مختلف معانی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں، اور امتیاز کیلئے نمبر شمار دیدیا گیا ہے،

۴- ایسے الفاظ جن کے مختلف معنی ہیں اور ان کے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، انکی وضاحت مثالیں دیکر کی گئی ہے،

۵- اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہے کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے، اور اس غرض کے لئے تمام اردو ادب، بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہے، یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی،

۶- ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہے ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں، جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں،

۷- اس لغت کیلئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا، جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہے، طباعت کیلئے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں، جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے،

(ڈمائی سائز صفحات ۱۵۱۳+۲۳) قیمت سولہ روپے، کلدار، علاوہ محصولڈاک،

ملنے کا پتہ:- دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

مطبوعات جدیدہ

نفحۃ العنبر من هدی الشیخ الانور (عربی) مرتبہ مولینا سید محمد یوسف صاحب بنوری تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اچھی قیمت مرقوم نہیں، پتہ مجلس علمی جامعہ ڈابھیل سورت،

حضرت مولینا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے علمی تبحر و وسعت نظر اور زہد و ورع کے لحاظ سے اس دور میں سلف صالحین کا نمونہ تھے، وہ جملہ مذہبی علوم خصوصاً حدیث و رجال کا بحر زخار تھے، ان کی ساری زندگی اس فن شریعت کی خدمت اور اشاعت میں بسر ہوئی، اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں تشنگان علم آپ کے سرچشمۂ فیض سے سیراب ہوئے، آپ کے علمی کمالات اور مذہبی خدمات کا تقاضا تھا، کہ اہل علم کے استفادہ اور اسوۂ عمل کے لئے آپکی سیرت لکھی جاتی، خوشی کا مقام ہے، کہ آپکے تلمیذ رشید مولینا سید محمد یوسف صاحب استاذ معانی و ادب جامعہ ڈابھیل نے نفحۃ العنبر کے نام سے شیخ کے حالات لکھ کر اس اہم فرض کو ادا کیا، اس کتاب میں حضرت مولینا کے سوانح و شمائل مختصر اور ان کی علمی و مذہبی خدمات کسی قدر تفصیل کیساتھ ہیں جس سے آپ کے علمی مرتبہ کا سرسری اندازہ ہوجاتا ہے، علمی کمالات کے سلسلہ میں تفسیر، حدیث اور فقہ میں وسعت نظر ان کے مشکلات و پیچیدہ مسائل میں دقیقہ سنجی اور عالمانہ تحقیق، احادیث سے فقہی مسائل کے استنباط میں مجتہدانہ کمال ائمہ اربعہ کے اختلافی مسائل میں طریقۂ بحث و تحقیق اور اعتدال مسلک، طریقہ درس، علمی مباحث میں نکتہ سنجی اور دقت نظر، تالیفات اور ان کی خصوصیات، غیر مذہبی علوم و ادب و فلسفہ وغیرہ میں آپ کا پایہ اور اس پر عالمانہ و محققانہ نقد و نظر، غرض جملہ علمی کمالات پر اجمالی روشنی ڈالی گئی ہے، ان مباحث میں قرآن، حدیث، فقہ اور دوسرے مذہبی اور غیر مذہبی علوم میں حضرت شیخ کی بہت سی تحقیقاتیں، رائیں اور علمی نوادر و نکات بھی معرض تحریر میں آگئے ہیں، جو اہل علم کے لئے مفید اور لائق غور

ہیں، ان علمی کمالات کیساتھ دوسرے علمی اور مذہبی خدمات کا بھی ذکر ہے، آخر میں حضرت مولینا کے متعلق معاصر علماء کی رائیں ہیں، یہ کتاب نہ صرف سوانح کی حیثیت سے بلکہ علمی حیثیت سے بھی مفید چیز ہے، کتاب کی زبان عربی ہے، اور خوشی کا مقام یہ ہے، کہ وہ فقیہانہ نہیں، بلکہ ادیبانہ ہے کہیں کہیں پر زبان کے بعض مسامحات نظر آتے ہیں، "م"

سرکار کا دربار، مولفہ جناب محمد الیاس احمد صاحب مجیبی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ ر پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

معارف کے صفحات پر الیاس احمد صاحب مجیبی کی مرتبہ سیرت "سرکار کا دربار" کا اس سے پہلے تعارف ہو چکا ہے، اسکو اللہ تعالیٰ نے اتنا حسنِ قبول بخشا، کہ چند سال کے عرصہ میں اس کے آٹھ اڈیشن شائع ہو چکے ہیں، تازہ آٹھویں اڈیشن میں مجیبی صاحب نے بہت سی مفید ترمیمیں اور اصلاحیں کی ہیں، روایات کی صحت میں از سرِ نو سیرت کی مستند کتابوں سے چھان بین کی ہے، زائد باتیں نکال کر بہت سی نئی اور مفید باتیں بڑھائی ہیں، الفاظ اور طرزِ ادا میں مناسب تبدیلی کی ہے، ان اصلاحوں سے کتاب کی معنوی خوبی اور بڑھ گئی ہے، یہ سیرتِ پاک نہ صرف بچوں کے لئے بلکہ بڑی عمر کے معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بھی مفید ہے، اس میں آنحضرت صلعم کی سیرتِ پاک کے جملہ ضروری حالات مختصراً آسان زبان میں جمع کر دیئے گئے ہیں، نوجوان مؤلف اس حیثیت سے مبارکباد کے قابل ہے، کہ اس نے اپنی محنت کا ثمرہ آغاز سے اب تک مقدس دور کی خدمت قرار دیا ہے، اور یہ وہ جوہر ہے جو ہمارے نوجوان ادیبوں میں عنقا ہے، خدا کرے کہ وہ اپنی زندگی کے پورے ایام ان ہی مفید خدمات کے سلسلہ میں بسر کردیں، "س"

جنّت کی کنجی، مولفہ مولینا احمد سعید صاحب ناظم جمعیۃ علمائے ہند تقطیع اوسط ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ پتہ دینی بک ڈپو کوچہ ناہر خان دہلی،

جنت کی کنجی مولینا احمد سعید صاحب کی پرانی تالیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن عرصہ ہوا شائع ہوا تھا، آج

مزید اضافہ کے ساتھ یہ دوسرا اڈیشن نکلا ہے پہلے اڈیشن میں ان حدیثون کا ترجمہ تھا جن میں آنحضرت صلعم نے کسی عمل خیر کے صلہ میں لفظاً جنت کی تصریح کیساتھ جنت کی بشارت دی ہے، اس نئے اڈیشن میں ان حدیثوں کا بھی اضافہ کیا گیا ہے، جس میں عقائد عبادات معاملات اور عام اخلاق وغیرہ میں عمل خیر کی تلقین ہے جس پر عمل کا نتیجہ جنت ہے، اس طرح یہ کتاب اعمال خیر کی ترغیب کا درس بن گئی ہے، ترجمہ کہیں پوری حدیث کا ہے، کہیں صرف اس مقصود کے ٹکڑے کو لے لیا گیا ہے، کہیں لفظی ہے، کہیں صرف مفہوم لے لیا گیا ہے، بعض مجمل حدیثون کی تشریح کر دی گئی ہے، حدیثوں کے ساتھ ماخذ کا حوالہ بھی دیدیا گیا ہے، عام مسلمانوں کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

سبیل الرشاد، مولفہ جناب ڈاکٹر عبدالمجید صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۷۲، صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۸ر علاوہ محصول، پتہ دارالسلام بنیر اسٹریٹ کراچی،

بعض صاحب ذوق اور صاحب قلم حجاج، حرمین شریفین سے عام مسلمانوں کے لئے "سفرنامہ" کا تحفہ لاتے ہیں، مذکورۂ بالا کتاب بھی اسی قبیل کا قلمی تحفہ ہے، اس میں حاجی عبدالمجید صاحب نے اپنے سفر حج کی روداد لکھی ہے، ذاتی حالات کے علاوہ اس میں حج کرنے والوں کے لئے ضروری ہدایات، مفید معلومات مناسک حج کی روداد حرمین کے تاثر و مقامات مقدسہ حکومت کے انتظامی حالات مختلف قوموں کے حجاج کی خصوصیات، سفر حج کے اخراجات اور بہت سی مفید معلومات ہیں، حج ایسے دربار کی حاضری ہے کہ قدرۃً اس سفر میں ہر مسلمان کا دل ذوق شوق اور کیف و وجد کا سرچشمہ بن جاتا ہے، اور زبان و قلم سے بھی بے ساختہ وہی کیفیتیں ٹپکنے لگتی ہیں یہ کیفیتیں جابجا اس سفرنامہ میں بھی ہیں، عام حج کرنے والوں کے لئے اس قسم کے سفرنامے رہنما کا کام دیسکتے ہین،

انور، مصنفہ منشی فیاض علی صاحب ایڈوکیٹ فیض آباد، تقطیع اوسط ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ انڈین پریس الہ آباد،

منشی فیاض علی صاحب موجودہ دور کے اچھے ناول نگارون میں ہیں، ان کا پہلا ناول شمیم کافی مقبولیت حاصل کر چکا ہے، دوسرا تازہ ناول انور اسی کا نقش ثانی ہے، ان دونوں میں نقش اول اور نقش ثانی کا فرق نمایاں ہے

پلاٹ کافی پیچیدہ ہے، لائق مصنف نے اس کو کامیابی سے نباہا ہے، روداد کے لحاظ سے اس میں حسن وعشق کی اُلفت و محبت والفت کی داستانوں، رزم و بزم کے مناظر، ایثار و قربانی، جانبازی و فداکاری، بلندی نظر و حوصلہ مندی، عفت و پاکدامنی، خباثت و بدنفسی، مکر و فریب، سنگدلی و خود غرضی، انسانی فطرت کے تمام مختلف پست و بلند پہلوؤں کی کامیاب مصوری کی گئی ہے، اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جذبات و میلانات اخلاق و معاشرت میں ان کے خیالات کو دلچسپ پیرایہ میں پیش کیا گیا ہے، زبان انشا پردازانہ اور انداز بیان دلآویز ہے، دلچسپ اور پسندیدہ اشعار کی آمیزش نے لطف بیان کو اور بڑھا دیا ہے لیکن جو لوگ آودھ کے نوجوانوں کی باہمی بے تکلفی، ان کی شوخی ظرافت اور مذاق طبیعت سے ناآشنا ہیں، ان کو غالبًا جا بجا شوخی گفتار گراں گذریگی، واقعات میں کہیں کہیں "افسانویت" زیادہ نمایاں ہوگئی ہے، حالانکہ ناول کے واقعات کو روزمرہ کے مشاہدات و تجربات اور فطرت سے اس قدر قریب ہونا چاہئے، کہ "افسانہ بھی حقیقت" معلوم ہو، بیان میں غیر معتدل طوالت ہے لیکن کتاب کی مجموعی خوبیوں کے مقابلہ میں یہ نقائص بہت خفیف ہیں، امید ہے کہ "انور" کو تفہیم سے زیادہ حسن قبول حاصل ہوگا،

چند ہمعصر مصنفہ مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو، ضخامت ۱۵۱ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مرقوم نہیں، غالبًا روپیہ بیس آنہ تک ہوگی، پتہ انجمن ترقی اردو اورنگ آباد، دکن

مولوی عبدالحق صاحب نے متعدد مشاہیر کی وفات پر ان کے حالات لکھے تھے، یا تقریروں میں بیان کئے تھے، بعضوں کی تصانیف پر مقدمہ کے سلسلہ میں ضمناً مصنف کے حالات قلمبند کئے تھے، یہ حالات ان کے ایک ہونہار اور جوانمرگ شاگرد شیخ چاند مرحوم نے کتابی شکل میں مرتب کئے تھے، جسے اب انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ہے، اس میں متعدد مشاہیر امیر مینائی، سید محمود، مولوی چراغ علی، مولوی عزیز مرزا، شمس العلما سید علی بلگرامی، خواجہ غلام الثقلین، مولوی وحید الدین سلیم، نواب محسن الملک، شیخ غلام قادر گرامی، مولینا حالی، مولینا محمد علی اور بعض ایسے لوگوں کے حالات ہیں، جو غالبًا ذاتی تعلق اور شخصی واقفیت کی بنا پر لکھے گئے تھے، مثلاً پروفیسر مرزا حیرت (دہلی) حکیم امتیاز الدین

نورخاں، ان میں سے بیشتر تو قریب قریب معاصر ہیں، لیکن بعض غیر معاصر بھی آگئے ہیں، جیسا کہ اوپر کے ناموں سے ظاہر ہے، گذری ہوئی کہانی موجودہ حالات سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے، اس لئے یہ حالات لطف سے خالی نہیں ہیں، ان حالات سے بہت سے پرانے واقعات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے، واقعات کے علاوہ مولف کے قلم نے اشخاص کی سیرتوں کی اچھی مصوری کی ہے،

نصاب ضبط وانتظام وحفظان صحت مدرسہ | مترجمہ جناب سید محمد ابو یونس صاحب عظیم آبادی تقطیع اوسط ضخامت ۵۵۴ صفحے کاغذ بہتر خط ٹائپ قیمت مجلد ہے، پتہ مترجم ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جگگلور

ہندوستانی میں اصول و نظام تعلیم پر اچھی کتابیں کم ہیں، اب کچھ دنوں سے ماہرین تعلیم نے ادھر توجہ کی ہے، چنانچہ اس سے پہلے خواجہ غلام السیدین نے "اصول تعلیم" ایک ضخیم کتاب لکھی، مذکورۂ بالا کتاب ایک دوسرے مسلمان ماہر تعلیم سلطان محی الدین صاحب ایم اے ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ آف سی پی کے تعلیمی معلومات و تجربات کا خلاصہ ہے، اصل کتاب انگریزی میں ہے، سید محمد ابو یونس صاحب ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول جگگلور نے عام فائدہ کے لئے اس کا ہندوستانی میں ترجمہ کیا ہے، یہ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم ہے، اور موجودہ تعلیمی نظام کے متعلق جملہ معلومات اور جدید مباحث پر محیط ہے، پہلے حصہ میں تعلیم کے بنیادی مقاصد اور نفسیاتی اصولوں کو پیش کیا گیا ہے، دوسرے میں اخلاقی و مذہبی تعلیم، دونوں کے تعلق اور ان کے تمام پہلوؤں پر تفصیلی بحثیں ہیں، تیسرے میں اخلاقی تربیت اور مدرسہ کی اجتماعی زندگی کے تعلق کو دکھایا گیا ہے، چوتھے میں مدرسہ کے تعلیمی نظام کے تفصیلی معلومات ہیں، پانچویں میں مدرسہ کے حفظان صحت کے اصولوں کی تفصیل ہے، یہ کتاب کا سرسری خاکہ ہے، ہر حصہ میں اس کے موضوع کے تمام جزئیات پر تفصیلی بحثیں ہیں، اور بیرونی ملکوں کے نظام تعلیم اور ماہرین تعلیم کے بیانات اور شواہد ہیں، ہر حصہ کے آخر میں اس کے ماخذ دیدیئے گئے ہیں، فنی نقطۂ نظر سے تو اس کتاب کے متعلق صحیح رائے ماہرین تعلیم ہی دے سکتے ہیں، لیکن مباحث کی نوعیت اور کثرت کے لحاظ سے جامع اور نظام تعلیم کے قدیم و جدید نظریوں پر حاوی معلوم ہوتی ہے، ترجمہ اچھا ہے،

فطرتِ انسانی مصنفہ جناب سید اسد اللہ صاحب بی اے تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مرقوم نہیں، پتہ :- اعظم سٹیم پریس چار مینار حیدر آباد دکن،

انسانی فطرت کی تشریح اور اس کے اصول کا انضباط علم النفس کا اہم اور دلچسپ موضوع ہے، اس کتاب میں انسانی جبلت کے تمام پہلوؤں اور عملی زندگی میں اس کے مظاہر پر روشنی ڈالی گئی ہے، کتاب سات ابواب میں تقسیم ہے، (۱) کیا انسانی فطرت کے قوانین بنائے جاسکتے ہیں، (۲) حیات انسانی میں عادت کا مقام (۳) بنیادی خواہشات (۴) غیر تشفی یافتہ خواہشات (۵) میلانات جو انسانی کردار کو ڈھالتے ہیں، (۶) تہذیب فکر و عمل کا راستہ پیدا کرتی ہے (۷) کردار اور شخصیت کا ارتقا، ہر باب میں اس کے موضوع کے تمام پہلوؤں کی علمی اور مثالی تشریح کی گئی ہے، انسانی فطرت کی نیرنگیوں کا مطالعہ نہ صرف علمائے نفسیات کے لئے بلکہ عام لوگوں کیلئے بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے

دعوتِ عمل، مؤلفہ جناب مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب نگرامی تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت مرقوم نہیں، پتہ ناظم انجمن تبلیغ الاسلام نگرام ضلع لکھنؤ،

مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب عرصہ سے اپنی بساط کے مطابق دعوت و تبلیغ کا فرض انجام دے رہے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے شریکِ کار مولوی مطلوب الرحمٰن صاحب نے ایک پندرہ روزہ اخبار دعوت بھی جاری کیا ہے، دعوتِ عمل بھی اسی سلسلہ کی ایک کتاب ہے، اس میں مسلمانوں کو ہندوؤں خصوصاً آریہ سماج کی علمی و عملی تبلیغی سرگرمیوں کو دکھا کر انھیں اس کے مقابلہ پر آمادہ کیا گیا ہے، مقصد نیک ہے لیکن یہی چیز ذرا سی بے احتیاطی سے ہم کو غلط راستہ پر لے چلنے کا باعث بھی ہوسکتی ہے،

شریر لڑکا مولفہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۴ر، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

یہ بچوں کا پانچ ایکٹ کا مختصر ڈراما ہے، اس میں دکھایا گیا ہے کہ شریر بچوں کی شرارت کی جو انکی ذہانت اور جرأت کا نتیجہ ہوتی ہے، انہام وتفہیم سے اصلاح کرکے مفید اور کار آمد بنایا جاسکتا ہے، یہ ڈرامہ بچوں کیلئے دلچسپ بھی ہے اور مفید بھی،

(م)

سیر الصحابہ
سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کے لئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ
ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابۂ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان
کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابۂ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث
و سیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور
ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج
سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل
ہیں، مجموعہ رہتا ہے، لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف میں یہ دسوں جلدیں
کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،
جلد اول، خلفائے راشدین،
جلد ششم، سیر الصحابہ ششم،
جلد دوم، مہاجرین اول،
جلد ہفتم، سیر الصحابہ ہفتم،
جلد سوم، مہاجرین دوم،
جلد ہشتم، سیر الصحابیات،
جلد چہارم، سیر الانصار اول،
جلد نہم، اسوۂ صحابہ اول،
جلد پنجم، سیر انصار دوم،
جلد دہم، اسوۂ صحابہ دوم،
منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، اُن کا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لئے اس غرض سے لکھی ہے، کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو، اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت:- عہ

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی، جو انکو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، [اسکی] زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہاں تمام بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صد[یوں] میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید [ہے] کہ اسکولوں، مدرسوں اور مکتبوں کے کارکن اور منتظم اس کو نصاب تعلیم میں داخل کرینگے، ضخامت ۴۰ صفحے قیمت ۲

مقالات شبلیؒ، جلد ششم

(تاریخی)

یہ حصہ مولانا شبلیؒ مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن و تہذیب، علم و فن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں،

ضخامت ۱۴۴ صفحے، قیمت :- عہ

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

(مطبع معارف میں محمد ادریس وارثی نے چھاپ کر شائع کیا)

رجسٹرڈ نمبر اے ۱۸۱

مارچ سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی بنا عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت کے اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصے میں تکمیل دین، اتمام حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعلق متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں ستے، تقطیع خورد عہ و للعہ، حصہ سوم تقطیع کلاں سے، و للعہ، تقطیع خورد عہ و عہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عے و سے، تقطیع خورد عہ و عہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ و للعہ،

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۱ | ماہ محرم الحرام ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۳۸ء | عدد ۳

مضامین

شذرات

مولنا عبد العلیم صدیقی قادری میرٹھ کے ایک پرجوش مبلغ عالم ہیں، بریلی میں عربی و مذہبی درسیات کی تکمیل کی ہے، اور ایف اے تک انگریزی پڑھی ہے، خلافت کی تحریکات کے زمانہ میں ساتھ کام کرنے والوں میں تھے، پھر ان کو تبلیغ کا شوق پیدا ہوا، اور اپنے لئے ہند و چین کے جزیروں اور ساحلی شہروں کا میدان پسند کیا، جو اسلامی ملکوں میں درحقیقت سب سے زیادہ قابل امداد اور عیسائیوں اور قادیانیوں کی زد میں ہیں، موصوف انگریزی زبان میں اچھی تقریریں کرتے ہیں، اور لوگوں پر ان کا اثر ہوتا ہے، سنگاپور و جاوا سے لیکر چین و جاپان کے سواحل بلکہ افریقہ کے بھی دور افتادہ مقامات میں ان کا سال بسال دورہ ہوتا رہتا ہے،

ان کے کاموں کی روداد اخباروں میں تو پڑھتے ہی رہے، مگر ادھر ان کے چند مسلمان کئے ہوئے یورپین مسلمانوں کو دیکھا، اور حیرت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کس طرح کس کی قسمت میں کوئی سعادت رکھتا ہے، موصوف کی یہ تبلیغی کوششیں علماء کے لئے قابل تقلید اور عام مسلمانوں کے شکریہ اور اعتراف کے قابل ہیں،

اسی بات کی کہ اللہ تعالیٰ کس کی قسمت میں کوئی سعادت کس طرح غیر متوقع طور پر رکھتا ہے، دوسری مثال، علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے ایک نوجوان گریجوایٹ ہیں اب سے چند سال پہلے جب یونیورسٹی میں جانا ہوتا تھا تو ایک نوجوان مسلمان طالب العلم حافظ محمد فضل الرحمٰن انصاری ملا کرتے تھے جو غالباً مظفر نگر کے کسی مردم خیز گاؤں کے باشندہ تھے، موصوف کو تبلیغ سے بڑی دلچسپی تھی، اور ان سے اکثر اسی سے متعلق باتیں ہوا کرتی تھیں، چند سال سے ان کا پتہ نہ تھا، اس ہفتہ کی ڈاک سے دفعۃً ان کا خط سنگاپور سے آیا، کہ وہ مولانا صدیقی کی امداد ان کے کاموں کی تکمیل کے لئے سنگاپور پہنچ گئے ہیں، اور ارادہ رکھتے ہیں کہ ملایا، سیام، فرانسیسی ہندچینی فلپائن

بورنیو، جاوا اور سماترا کا دورہ کرکے تبلیغی نظام کو استوار کرینگے، اور وہاں سے آگے بڑھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے جرمنی کا قصد رکھتے ہیں، ہمارے خیال میں اگر وہ اسی مقدس کام کی عظمت کیلئے پی ایچ ڈی اور ڈاکٹر بننا چاہتے ہیں، کہ ہماری یونیورسٹیوں کے مسلمان ڈاکٹروں کو مذہب کا نام اور کام اپنی شان ڈاکٹری سے فروتر محسوس ہوتا ہے، تو موصوف کا یہ عزم مبارک، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کا یہی کام مسلمانوں کی نگاہ میں ہزار ڈاکٹر کی ڈگریوں سے بہتر ہے،

سنگاپور سے اس وقت دو اسلامی پرچے انگریزی میں نکل رہے ہیں، ایک کا نام "جینیوین اسلام" (اصلی اسلام) اور دوسرے کا "وائس آف اسلام" (صدائے اسلام) ہے، اب انصاری صاحب نے پہلے رسالہ کو اپنے ہاتھ میں لیا ہے، امید ہے کہ وہ اب اسلام کی خدمت میں اور زیادہ سرگرم ثابت ہوگا،

اسی سلسلہ میں سوماترا کے دو معزز عیسائی ذہین نوجوان ابھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، اور وہ مذہبی تعلیم کے نہایت شائق ہیں، تاکہ وہ اپنے ملک میں دین اسلام کی اشاعت کا کام انجام دے سکیں، اور اس غرض کیلئے دارالعلوم ندوہ میں انکی تعلیم کا خیال ہے، کم از کم پندرہ پندرہ ماہوار انکا خرچ ہوگا، اگر ہمارے دو مسلمان صاحب استطاعت بھی توجہ کریں تو یہ رقم وہ بخوبی دے سکتے ہیں، کیا ہمارے ہشیار مسلمان ناظرین میں سے دو نیک دل مسلمان بھی ایسے ہیں، جو اسلام کی یہ خدمت بخوشی بجالائیں،

کئی مہینے ہوئے کہ **جاپان** سے پروفیسر براس صاحب کا ایک مضمون "جاپان میں اشاعت اسلام" کے واقعات و حالات کے متعلق موصول ہوا تھا، مگر چین و جاپان کی لڑائی نے طبائع کو ایسا غیر ملتفت بنادیا ہے کہ اُدھر توجہ نہ دی جاسکی، اب جبکہ اس لڑائی کا سلسلہ ختم ہونے کو نہیں آتا تو مجبوراً اس کو آیندہ نمبر میں دیدیا جائیگا، اور تصور کیا جائیگا کہ اب لڑائی نہیں ہے، اور ہم کو حالات پر غور کرنا ہے،

کلکتہ سے ایک "خادم اسلام" اپنے ایک بے نام و نشان خط میں لکھتے ہیں،

"اس وقت پنجاب میں تین بڑے فتنے ہیں، قادیانی تحریک، منکرین حدیث کی تحریک، اور عنایت اللہ

مشرقی کی تحریک، آپ کا اسلامی فرض ہو کہ آپ ان فتنوں کی تردید میں رسالہ معارف میں مضامین شائع کریں،
معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے دوست معارف کے پرانے ناظرین میں سے نہیں، ورنہ انھیں معلوم ہوتا کہ
معارف نے اپنے رنگ میں ان تینوں سلسلوں کے متعلق اپنا فرض ادا کیا ہے، اور انشاء اللہ آیندہ بھی کرے گا، البتہ
مناظرہ کا شوق اسکو نہیں، اور نہ اس کے لئے اس کا قلم موزوں ہے، تاہم ہم اپنے نادیدہ دوست کے ممنون ہیں کہ انھوں
نے ہم کو ہمارا یہ فرض یاد دلایا ہے،

انگریزی کے اسلامی مذہبی ہفتہ وار اخبار ٹروتھ لاہور کے لائق اور سرگرم عمل اڈیٹر نے اپنے چند معاصروں سے
جنمیں معارف کا نام بھی ہے، ٹھیٹھ اسلام کے وہ سادہ اور مختصر عقائد دریافت کئے ہیں جو فرقہ بندیوں سے بالاتر ہوں اور
خود انھوں نے اپنی طرف سے یہ لکھا ہے کہ اصلی عقیدہ تو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ یعنی خدا کی توحید اور
محمد رسول اللہ صلعم کی نبوت و خاتمیت ہے، باقی کتب، ملائکہ، قیامت اور جنت و دوزخ کی تشریح حقیقت چونکہ
قرآن میں نہیں، اس لئے ہر شخص اپنے فہم و بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھے بشرطیکہ اصول اسلام کے خلاف نہ ہو وہ درست ہے،

اس میں شک نہیں کہ فرقہ آرائیوں نے مسلمانوں کے عقائد مشترکہ کی دھجیاں اڑا دی ہیں، جن دو کلموں
لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ و محمد رسول اللّٰہ پر سارے مسلمانوں کا پورا اتفاق ہے، اگر ان کی جزئیاتی تشریح کیجائے
تو شاید دو مسلمان فرقے بھی باہم متفق نہ نکلیں، ہمارے خیال میں یہ سب جھگڑے امویوں کے اخیر زمانہ سے عقل
و حکمت کے مدعیوں، اور علم کلام کے مناظروں کے بدولت عجمیوں اور عیسائیوں کے مختلف فرقوں کے اثر سے
اسلام میں پیدا ہو گئے ہیں، اور ابتک چلے جا رہے ہیں، علاج یہ ہے کہ ہم تفصیل سے ہٹکر سلف صالحینؓ کے اجمال
کی طرف اور کیف و کم کی تشریح، اور نادیدہ خواب کی تعبیر سے پرہیز کرکے عقائد کی تکثیر کے بجائے انکی شدت یقین کی طرف
رجوع کریں، اور کہدیں کہ ہم ایمان لائے خدا پر، خدا کے رسولوں پر، خدا کے فرشتوں پر، خدا کی کتابوں پر، اور قیامت اور اعمال
کی جزا و سزا پر، اسی طرح اور انھیں معنوں میں جسطرح اور جن معنوں میں خدا نے فرمایا ہے، اس سلسلہ میں حضرت امام مالکؒ کا یہ جواب ہمارے
سامنے ہے، الاستواء معلوم، و کیفہ مجہول، والایمان بہ واجب، والسوال عنہ بدعت، کیا اس اجمال پر ہم اپنے نہایت جو فلسفی نفس کو قانع بنانے کی کوشش کریں گے؟

مقالات

اسلامی نظامِ تعلیم

از مولٰنا سید ریاست علی ندوی

اس کے بعد جن اسلامی شہروں کو سیاسی حیثیت سے بلندی حاصل ہوئی، اور ان کی تمدنی ترقی کا دور آیا، وہی شہر تعلیم کے مرکز بھی قرار پائے، لکھتا ہے:-

"جب بغداد، بصرہ اور کوفہ جیسی علم کی کانیں مٹ گئیں، تو ان سے بڑے بڑے شہر پیدا ہو گئے اور علم کا مرکز وہاں سے عراق عجم میں منتقل ہو کر خراسان و ماوراء النہر میں قائم ہو گیا، اور پھر قاہرہ میں منتقل ہوا، اور چونکہ قاہرہ کی تمدنی حیثیت مسلسل قائم رہی، اسلئے یہاں علم کا مرکز بھی ہزمانہ میں موجود رہا، یہاں تک کہ جو لڑکے علم حاصل کرنے کے لئے مغرب سے مشرق جاتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ مشرق کی عقل و ذہانت اہلِ مغرب سے زیادہ ہوتی ہے، اور وہ فطری طور پر ان سے زیادہ عقلمند اور تیز ہوتے ہیں، اس طریقہ سے وہ مغرب اور مشرق کے باشندوں کی انسانی خصوصیتوں میں فرق سمجھنے لگے، حالانکہ یہ واقعہ صحیح نہیں ہے، مشرق اور مغرب کی اقلیموں میں کوئی فرق نہیں ہے، ...... بلکہ اہلِ مشرق تمدن کی ترقیوں کی وجہ سے اور مسلسل مشق جاری رہنے سے اہلِ مغرب سے بڑھ گئے ہیں، اور ان کی تمام عقلی ترقیوں کا حقیقی سبب صرف اسی قدر ہے"[1]

ایک دوسرے مقام پر اس نے اپنے زمانہ یعنی آٹھویں صدی کے تعلیمی مرکزوں پر نظر ڈالی ہے جس سے اس عہد میں مختلف ملکوں کی تعلیمی حالت کا اندازہ ہوتا ہے، کہتا ہے:-

"اس زمانہ میں مغرب کے تمدن میں اختلال اور یہاں کی حکومتوں میں ابتری پیدا ہونے کی وجہ سے

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ص ۳۴، ۳۴،

یہاں سے تعلیمی اعتماد اور مرکزیت فنا ہونے والی ہے، قیروان اور قرطبہ مغرب اور اندلس میں سب سے متمدن شہر تھے، انھیں پوری تمدنی ترقی حاصل ہوئی، اس لئے یہاں ہر قسم کے علوم اور پیشوں کے بازار گرم تھے، اور ان کے سمندر جوش مار رہے تھے، اور ایک زمانہ گذرنے سے یہاں تعلیم، لوگوں کی طبیعتوں میں راسخ ہوگئی تھی، جب یہ دونوں مرکز برباد ہوگئے، تو مغرب سے تعلیم بھی رخصت ہوگئی، صرف کسی قدر نام ونشان باقی رہ گیا، چنانچہ مراکش میں دولتِ موحدیہ کے عہد میں یہاں کی پچھلی تعلیمی ترقیوں کے اثر سے کچھ نشانات پائے گئے، لیکن حکومت کے ابتدائی زمانہ ہونے اور اس کے جلد ختم ہوجانے کی وجہ سے یہاں حضارت راسخ نہ ہوسکی تھی، البتہ مشرق سے چند اہلِ علم علوم حاصل کرکے لوٹے، اور ان کے ذریعہ سے تونس تلمسان اور بجایہ میں علم کی روشنی پہونچی، لیکن مغرب کے دوسرے حصے جیسے فاس وغیرہ تعلیم کی خوبی سے اس وقت سے خالی ہوگئے، جب سے قرطبہ اور قیروان کے تمدن کو زوال آیا، اور ان باشندوں کی ذہنی ترقی کا موقع باقی نہیں رہا، یہی وجہ ہے، کہ اہلِ مغرب کے مدرسوں میں جو علوم ۱۶ سال میں لڑکوں کو ختم کرائے جاتے ہیں، وہ تونس میں صرف پانچ برس کی مدت میں پڑھا دیئے جاتے ہیں،

اسی طرح اہلِ اندلس بھی رسمِ تعلیم سے بیگانہ ہوچکے ہیں، دو سو سالوں سے وہاں مسلمانوں میں جو تمدنی ابتری پھیلی ہوئی، اس کی وجہ سے علم کی طرف سے ان کی رغبت جاتی رہی ہے، اب ان میں صرف کسی قدر عربیت اور ادب کا ذوق پایا جاتا ہے، ورنہ فقہ کا صرف نام باقی رہ گیا ہے، اور عقلی علوم تو بالکل مفقود ہوچکے ہیں، کیونکہ دشمن اندلس کے صرف تھوڑے سے ساحلی حصّہ کو چھوڑ کر پورے ملک پر قابض ہوچکے ہیں، اس لئے جو مسلمان وہاں موجود ہیں، ان کی توجہ زیادہ تر معاش کے حصول پر بندول رہتی ہے، جس کی وجہ سے انھیں کسی دوسری طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے[1]"

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۲،۴۲۳-۴۲۴،

پھر مشرق کے حال میں لکھتا ہی:۔

"مشرق میں اس زمانہ میں ہم دیکھتے ہیں، کہ علم اور تعلیم کا مرکز قاہرہ بنا ہوا ہے، کیونکہ اس کی تمدنی حیثیت ہزاروں سال سے قائم ہے، اس لئے یہاں کی طبقوں میں صنائع پورے طور پر راسخ ہو چکے ہیں، اور انہی میں پیشۂ تعلیم بھی ہے، خصوصاً پچھلی دو صدیوں سے ترکوں کی دولتِ صلاحیہ ایوبیہ کے زمانہ میں تعلیمی حیثیت سے کمال کے درجہ پر پہونچ گیا ہے،[۱]"

اسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی دہلی علم و تعلیم کے مرکز کی حیثیت سے روشناس تھا، چنانچہ قلقشندی نے آٹھویں صدی کے ہندوستان کے ذکر میں دکھایا ہے، کہ صرف دہلی میں ایک ہزار مدرسے قائم تھے،[۲]

اس کے بعد دورِ حاضر سے کچھ پہلے تک عالم اسلامی میں تعلیم کے دو مرکز رہے، ایک مصر میں قاہرہ اور دوسرے ترکی میں قسطنطنیہ، اور دولتِ عثمانیہ کو اولیت کا یہ شرف حاصل ہے، کہ وہ اسلامی نظامِ تعلیم کو جدید شاہراہ پر لائی، اور نئی اصلاحیں رائج کر کے نئے طریقوں پر مدرسوں کا نظام قائم کیا، اور یونیورسٹی کے طرز پر مدرسوں کو ایک دوسرے سے وابستہ کیا،

عہدِ اسلامی کے ان مختلف دوروں میں تعلیم کے جو اہم مرکز رہے، ان میں وہاں کے ممتاز اساتذہ کو اہمیت حاصل رہی، انہی کا تنہا وجود اس شہر میں خود مستقل یونیورسٹی تھا، اور جس طرح اس زمانہ میں یونیورسٹیوں کی ڈگریاں وقعت رکھتی ہیں، اس زمانہ میں ان اساتذہ کی شاگردی کی سند وقعت رکھتی تھی، کسی کے لئے فخر کا باعث نہ تھا، کہ مثلاً وہ مدرسہ نظامیہ یا مستنصریہ کا سند یافتہ ہے، بلکہ یہ باعثِ امتیاز تھا، کہ فلاں شیخ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے، اور جن شہروں میں ایسے مستند اساتذہ کا وجود قائم رہا، اس وقت تک ان شہروں کی تعلیمی مرکزیت برقرار رہی،

ان میں سے ہر شہر میں سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اہلِ کمال ہوتے تھے، اور ان کے وجود سے

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۴۰۶، [۲] صبح الاعشیٰ جلد ۵ ذکر بلاد الہند،

علم و تعلیم کا سلسلہ قائم رہتا تھا، مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں، کہ

"میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیث لکھی، مگر مجھے (بغداد کے) پل کو (جو دجلہ پر تھا) عبور نہیں کرنا پڑا" [۱]

اسی طرح خلیفہ المقتدر باللہ نے ۳۱۹ھ میں ایک سلسلہ میں شہر کے طبیبوں کو شمار کرایا، تو ان کی تعداد (۸۹۰) سے زیادہ نکلی، جن میں وہ ماہرین فن شامل نہ تھے، جنھیں شہرت عام حاصل تھی، اور جن کی حذاقت اور کمالِ فن پر عام اتفاق تھا [۲]، نضر بن شمیل بصرہ سے روانہ ہوئے، تو تقریباً تین ہزار صرف اہل علم نے انکی مشایعت کی [۳]

(۳)

نظام مدارس و دار الاقامہ

درس گاہ کی عمارتیں، اسلامی نظام تعلیم کے پہلے اور دوسرے دور میں تعلیم مسجدوں کے صحنوں، میناروں کے سایوں، خانقاہوں کے حجروں اور علماء کے مکانوں میں جاری رہی، اس زمانہ میں اگر تعلیم گاہ کے لئے عمارت کی ضرورت پڑی، تو درس گاہ کی شکل کی عمارت کے بجائے نئی مسجد ہی تعمیر کی گئی، ابن حوقل سسلی کے حال میں لکھتا ہے:-

"ان دس مسجدوں میں جس کا میں نے تذکرہ کیا، ایک مسجد ابو محمد قفصی کی ہے، جس میں وہ نماز پڑھتے ہیں، اور اس کے پہلو میں بیس قدم پر ایک دوسری مسجد ہے جسکو انھوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم گاہ کے طور پر تعمیر کرایا ہے" [۴]

چوتھی صدی کے اخیر میں درس گاہوں کے لئے مستقل عمارت بنانے کی ابتدا ہوئی، اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی، کہ ایک ہی صدی میں تمام اسلامی دنیا میں اس کا عام رواج ہوگیا، اور مدرسوں پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کی گئیں، اور اسلامی تمدن نے ان کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کر دیئے اور ان کے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۹۱، [۲] عیون الانباء جلد ۱ ص ۲۲۲، [۳] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۶۱، [۴] معجم البلدان جلد ۵ ص ۳۰۵،

بنا و قیام اور ان میں درس و تدریس کے لئے مفصل نظام عمل تیار ہو گیا،

سب سے پہلا مدرسہ، اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ کون سا تعمیر ہوا؟ اس کا جواب اسلامی مدارس کی تاریخ بیان کرنے والے کے ذمہ عائد ہوگا، ہم بیان بر سبیل ذکر صرف علامہ سبکی کا ذیل کا بیان پیش کر دیتے ہیں جس سے کم سے کم یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی کا مدرسہ نظامیہ بغداد جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے پہلا مدرسہ نہیں ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں :۔

"یہ گمان کیا جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی ہی نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد رکھی ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور نظام الملک کی پیدائش سے بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، نیز مدرسہ سعدیہ نیشاپور جسے سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اوس زمانہ میں تعمیر کرایا تھا جب وہ وہاں کا والی تھا، تیسرا مدرسہ بھی نیشاپور ہی میں تھا، جسے واعظ و صوفی ابو سعید اسماعیل بن علی بن مثنیٰ استر آبادی نے بنایا تھا، چوتھا مدرسہ بھی یہیں تعمیر ہوا، جسے ابو اسحٰق اسفرائنی نے تعمیر کرایا، یہ صریح واقعہ ہے، کہ یہ مدارس اس سے پہلے تعمیر پا چکے تھے، البتہ میرا گمان ہے کہ نظام الملک کو اس اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے، کہ اس نے طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے، کیونکہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا اس سے پہلے بھی مدرسوں میں طالب علموں کے لئے وظیفے ہوتے تھے، یا نہیں[1]"،

حضرۃ الاستاذ مولینا سید سلیمان ندوی نے "خیام" میں اس کے تعلق سے نیشاپور کے مدرسوں پر بھی نظر ڈالی ہے، جن میں مذکورۂ بالا مدرسوں کا بھی ذکر آیا ہے، لیکن موصوف نے سبکی ہی کے ایک دوسرے بیان سے نیشاپور کے پہلے مدرسہ کا بانی وہاں کے سامانی والی ناصر الدولہ ابو الحسن بیجوری متوفی ۳۳۰ھ کو قرار دیا ہے، جس نے امام ابوبکر محمد بن حسن بن فورک متوفی ۴۰۶ھ کے لئے اسے تعمیر کرایا تھا،

اس کے بعد دوسرا مدرسہ بیہقیہ قرار پاتا ہے، جس میں امام الحرمین نے تعلیم پائی، اور نظام الملک کی ولادت

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۳ ص ۱۳۷،

علم و تعلیم کا سلسلہ قائم رہتا تھا، مسلم بن ابراہیم کہتے ہیں، کہ

"میں نے آٹھ سو شیوخ سے حدیث لکھی، مگر مجھے (بغداد کے اہل کو (جو وجلہ پر تھا) عبور نہیں کرنا پڑا"[1]

اسی طرح خلیفہ المقتدر باللہ نے ۳۱۹ھ میں ایک سلسلہ میں شہر کے طبیبوں کو شمار کرایا، تو ان کی تعداد (۸۶۰) سے زیادہ نکلی، جن میں وہ ماہرین فن شامل نہ تھے، جنھیں شہرتِ عام حاصل تھی، اور جن کی حذاقت اور کمالِ فن پر عام اتفاق تھا،[2] نضر بن شمیل بصرہ سے روانہ ہوئے، تو تقریباً تین ہزار صرف اہلِ علم نے انکی مشایعت کی[3]

(۳)

نظام مدارس و دارالاقامہ

درس گاہ کی عمارتیں، اسلامی نظام تعلیم کے پہلے اور دوسرے دور میں تعلیم مسجدوں کے صحنوں، میناروں کے سایوں خانقاہوں کے حجروں اور علما کے مکانوں میں جاری رہی، اس زمانہ میں اگر تعلیم گاہ کے لئے عمارت کی ضرورت پڑی، تو درس گاہ کی شکل کی عمارت کے بجائے نئی مسجد ہی تعمیر کی گئی، ابن حوقل سسلی کے حال میں لکھتا ہے،:-

"ان دس مسجدوں میں جس کا میں نے تذکرہ کیا، ایک مسجد ابو محمد قفصی کی ہے، جس میں وہ نماز پڑھتے ہیں، اور اس کے پہلو میں بیس قدم پر ایک دوسری مسجد ہے جسکو انھوں نے اپنے لڑکے کی تعلیم گاہ کے طور پر تعمیر کرایا ہے"[4]

چوتھی صدی کے اخیر میں درس گاہوں کے لئے مستقل عمارت بنانے کی ابتدا ہوئی، اور اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی، کہ ایک ہی صدی میں تمام اسلامی دنیا میں اس کا عام رواج ہو گیا، اور مدرسوں پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کی گئیں، اور اسلامی تمدن نے ان کے لئے ہر قسم کے سامان مہیا کر دیئے اور ان کے

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۶۱، [2] عیون الاطبار جلد ۱ ص ۲۲۲، [3] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۹۱،
[4] معجم البلدان جلد ۵، ص ۳۰۵،

بنا و قیام اور ان میں درس و تدریس کے لئے مفصل نظام عمل تیار ہو گیا،

سب سے پہلا مدرسہ، اسلام میں سب سے پہلا مدرسہ کون سا تعمیر ہوا،؟ اس کا جواب اسلامی مدارس کی تاریخ بیان کرنے والے کے ذمہ عائد ہو گا ہم یہاں بر سبیل ذکر صرف علامہ سبکی کا ذیل کا بیان پیش کر دیتے ہیں جس سے کم سے کم یہ معلوم ہو جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی کا مدرسہ نظامیہ بغداد جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا ہے پہلا مدرسہ نہیں ہے، علامہ سبکی فرماتے ہیں:۔

"یہ گمان کیا جاتا ہے، کہ نظام الملک طوسی ہی نے سب سے پہلے مدرسوں کی بنیاد رکھی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ مدرسہ بیہقیہ نیشاپور نظام الملک کی پیدائش سے بھی پہلے قائم ہو چکا تھا، نیز مدرسہ سعدیہ نیشاپور جسے سلطان محمود کے بھائی نصر بن سبکتگین نے اوس زمانہ میں تعمیر کرایا تھا جب وہ وہاں کا والی تھا، تیسرا مدرسہ بھی نیشاپور ہی میں تھا، جسے واعظ و صوفی ابو سعید اسماعیل بن علی بن مثنیٰ استرآبادی نے بنایا تھا، چوتھا مدرسہ بھی یہیں تعمیر ہوا، جسے ابو اسحٰق اسفرائنی نے تعمیر کرایا، یہ صریح واقعہ ہے، کہ یہ مدارس اس سے پہلے تعمیر پا چکے تھے۔ البتہ میرا گمان ہے کہ نظام الملک کو اس اولیت کا شرف ضرور حاصل ہے، کہ اس نے طلبہ کے لئے وظیفے مقرر کئے، کیونکہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آیا اس سے پہلے بھی مدرسوں میں طالب علموں کے لئے وظیفے ہوتے تھے، یا نہیں[1]،

حضرۃ الاستاذ مولینا سید سلیمان ندوی نے "خیام" میں اس کے تعلق سے نیشاپور کے مدرسوں پر بھی نظر ڈالی ہے، جن میں مذکورۂ بالا مدرسوں کا بھی ذکر آیا ہے لیکن موصوف نے سبکی ہی کے ایک دوسرے بیان سے نیشاپور کے پہلے مدرسہ کا بانی وہاں کے سامانی والی ناصر الدولہ ابو الحسن سیمجوری متوفی ۳۷۸ھ کو قرار دیا ہے، جس نے امام ابو بکر محمد بن حسن بن فورک متوفی ۴۰۶ھ کے لئے اسے تعمیر کرایا تھا،

اس کے بعد دوسرا مدرسہ بیہقیہ قرار پاتا ہے، جس میں امام الحرمین نے تعلیم پائی، اور نظام الملک کی ولادت

---

[1] طبقات الشافعیہ جلد ۳ ص ۱۳۷،

(۴۵۰ھ) سے پہلے تعمیر ہوا، پھر تیسرا سعدیہ ہے جس کا تذکرہ اوپر گذرا، چوتھا مدرسہ ابو اسحٰق ابراہیم اسفرائنی متوفی ۴۱۸ھ کے لئے بنا، پانچواں استرابادی والا مدرسہ، چھٹا تغرل بیگ نے ۴۳۲ھ میں تعمیر کرایا، اور ساتواں مدرسہ نظامیہ نیشاپور ہے، جسے نظام الملک نے اپنی وزارت کے زمانہ (۴۵۶ھ) کے بعد امام الحرمین (۴۱۹ھ۔۴۷۸ھ) کے لئے بنوایا تھا،[1]

ہندوستان کا پہلا اسلامی مدرسہ

ہندوستان میں مدرسہ کی سب سے پہلی عمارت غالباً ناصر الدین قباچہ نے مولانا قطب الدین کاشانی کے لئے ملتان میں بنوائی، اور اس میں حضرت شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی (مولود ۵۷۸ھ) نے تعلیم پائی،[2]

اسلامی نظام تعلیم کا مذہبی ہونا اور قیام مدارس کی شرط اول

اسلام کے تعلیمی نصب العین سے یہ آشکارا ہو چکا ہے، کہ اسلامی نظامِ تعلیم کی ایک اہم خصوصیت اس کا مذہبی ہونا ہے، اس لئے مدرسوں کے قائم کرنے میں بھی اس کی یہ خصوصیت سب سے نمایاں رہی ہے،

یہ حقیقت ہے کہ قوموں کے عروج اور ترقی میں ان کے مدرسے بڑی اہمیت رکھتے ہیں، قومیں افراد سے بنتی ہیں، اور افراد کی ان کے بچپن ہی سے ذہنی، اخلاقی و روحانی تعلیم و تربیت مدرسوں ہی کے ذریعہ انجام پاتی ہے، اس لئے اگر مدرسے پاکیزہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی تعلیمات کی درس گاہ ہوں گے، تو ان سے ایسی قوم تیار ہوگی، جو زندگی کی صحیح شاہراہ پر چل کر اپنے وجود سے دنیا میں انسانوں کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرے گی،

اس لئے مسلمانوں نے مدرسوں کے قائم کرنے میں یہ اولین نقطہ سامنے رکھا، کہ وہ افراد انسانیت کے لئے صحیح اور پاکیزہ اخلاق و روحانیت کی تربیت گاہ ہوں، اور اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے

---

[1] خیام ص ۳، تا ۷، بحوالہ طبقات سبکی جلد ۳ ص ۵۲، ۱۳۷، ۲۵۲ و تاریخ یمینی عتبی ص ۳۲۴، ابن خلکان جلد ۱ ص ۴ و ترجمہ ابن فورک و امام الحرمین و خطیب، و سفر نامۂ ناصر خسرو ص ۴ [2] تاریخ فرشتہ جلد ۲ ص ۴۰۰،

بڑی بلند نظری سے خود ان مدرسوں کے لئے یہ شرط قرار دی کہ وہ پاکیزہ اخلاقی و روحانی مقاصد حسن نیت اور اخلاص عمل کے ساتھ قائم کئے گئے ہوں، اور ان کا سرمایہ معقول اور جائز ذرائع اور پاک روزی سے حاصل کیا ہوا ہو، ورنہ اگر وہ کسی بری نیت اور دنیاوی غرض جاہ وعزت اور ناموری اور شہرت کے لئے قائم کئے گئے ہوں یا جور وظلم سے حاصل کی ہوئی دولت اس میں لگائی گئی ہو، یا اگر کسی نے اس کی تعمیر کے وقت اپنے اثر واقتدار کو بے محل استعمال کرکے زمین اور تعمیر کے سامان غاصبانہ حاصل کئے ہوں، یا مزدوروں کی اجرت نہ ادا کی ہو، تو ایسے مدرسوں کی عمارتوں میں پاکیزہ اخلاق اور روحانیت کا ماحول پیدا نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے اس عمارت میں پڑھنے پڑھانے والے اور سکونت اختیار کرنے والے بھی محاسنِ اخلاق سے آراستہ نہ ہوسکیں گے، اور صحیح اخلاقی اور روحانی خیالات سے محروم رہیں گے، اور ان میں ایسی ذہنی استعداد مفقود ہو گی، کہ وہ عملی دنیا میں اپنے دل ودماغ سے ایسی شاہراہ پر چلیں، جو انسانیت کی تکمیل تک انھیں پہونچائے، اور ان کے وجود سے انسانی تخلیق کا مقصد پورا ہوا، اسلئے حقیقی تعلیم وتربیت صرف انہی مدرسوں میں حاصل ہوسکتی ہے، جو حسنِ نیت اور اخلاصِ عمل کیساتھ بلند مقاصد پیش نظر رکھ کر قائم کئے گئے ہوں، چنانچہ قاضی ابن جماعہ علما، وطلبہ کے لئے یہ اصول کار بیان کرتے ہیں، کہ

"حتی الامکان تعلیم کے لئے ایسے مدرسوں کو منتخب کرنا چاہئے، جن کے بانی زہد وتقوی سے قریب اور بدعتوں سے دور رہے ہوں، اور یہ گمان غالب ہو کہ وہ مدرسہ اور اس کا وقف جائز پہلوؤں سے قائم کیا گیا ہو، اور اس میں پاک روزی کی کمائی لگائی گئی ہے، کیونکہ جس طرح کھانے اور کپڑوں میں جائز اور ناجائز کی احتیاط ضروری ہے، اسی طرح قیام کی جگہ میں بھی اسے دیکھنا ضروری ہے"[۱]۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی دور میں جو مدرسے قائم کئے گئے، اس عہد کے علما اور طلبہ ان کے بانیوں کے ذاتی خصائل اور اخلاق اور مدرسہ کی تعمیر کی نوعیت کی تحقیق کرتے تھے، اور جو مدرسے بلند مقاصد کیساتھ بہتر طریقے سے تعمیر پاتے، لڑکے ان میں جوق جوق تعلیم کے لئے داخل ہوتے تھے، اور علما ان میں پڑھنے پڑھانے

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۱۹۴، ۱۹۶، وحاشیہ صفحۂ مذکورہ

کو اُخروی سعادت سمجھتے تھے، اور جو مدرسے غلط بنیادوں پر قائم کئے جاتے، ان میں ایک تو متدین اہل علم درس و تدریس کے لئے تیار نہ ہوتے، اور اس کے علاوہ وہ مدرسے طلبہ کے اژدحام سے بھی خالی نظر آتے تھے، مقریزی نے مصر کے بہت سے مدرسوں کا ذکر کیا ہے، اس نے اس سلسلہ میں اسی نقطۂ نظر سے ان کے بانیوں کے صلاح و تقوی اور خصوصاً مدرسہ کی تعمیر جس نوعیت سے عمل میں آئی ہو، اس کا تذکرہ کیا ہے، تاکہ ان کی زندگی کے مطالعہ سے ان کے قائم کیے ہوئے مدرسہ کی حیثیت آشکارا ہو، اور طلبہ کو مدرسوں کے انتخاب میں آسانی حاصل ہو، مثلاً مدرسہ صاحبیہ بہائیہ کے ضمن میں لکھا ہے:۔

"اس مدرسہ کو الوزیر الصاحب بہاء الدین علی بن محمد بن سلیم بن حنا نے ۶۵۴ھ میں تعمیر کرایا،......
اس کی داد و دہش بہت ہے، وہ فقراء سے فراخ دلی سے حسن سلوک کرنے، نیکوں اور پرہیزگاروں کیساتھ حسن عقیدت رکھنے اور ان کی اطاعت کرنے ان کی حالتوں اور ضرورتوں سے باخبر رہنے اور ان کے پورا کرنے اور ان کے حکموں کو جلد ماننے اور مشتبہ مالوں سے پرہیز کرنے اور بہ کثرت خفیہ اور علانیہ صدقات کرنے میں اپنی حد سے بڑھا ہوا تھا، یہانتک کہ اس نے اپنی وزارت کے زمانہ میں کسی شخص سے کوئی ہدیہ قبول نہیں کیا، سوائے اس کے کہ کسی فقیر یا شیخ سے برکت حاصل کرنے کی نیت سے کچھ لے لیا ہو،......"

اس مدرسہ کے بانی کی اس دینداری اور تقوی کا یہ اثر تھا، کہ مقریزی لکھتا ہے کہ

"یہ دنیا کے بڑے مدارس میں سے اور مصر کا سب سے بڑا مدرسہ ہے، لڑکے اس میں داخل ہونے اور اس کے دار الاقامہ میں رہنے کے لئے دوسرے پر سبقت کرتے ہیں"[1]

اسی طرح مدرسہ قطبیہ کی بناء و تعمیر کے متعلق لکھا ہے:

"یہ مدرسہ مونسہ خاتون...... متوفی ۶۹۳ھ کی طرف منسوب ہے، وہ محدثہ تھیں، حافظ ابو العباس

---

[1] خطط مصر مقریزی جلد ۲ ص ۳۷۱،۳۷۰

احمد بن محمد ظاہری ان کے شاگردوں میں سے تھے، وہ عاقلہ دیندار... اور بہت خیرات و صدقات کرنے والی تھیں، انھوں نے وفات کے وقت بہت بڑی دولت چھوڑی، اور ایک مدرسہ کی تعمیر کی وصیت کی، جس میں فقیہ اور قاری درس دیں، اور نیز اس دولت سے جائداد خرید کر وقف کرنے کی وصیت کی، چنانچہ اس مدرسہ کی تعمیر ہوئی، اور اس میں مذہب شافعی و حنفی کے درس قائم کئے گئے، اور تعلیم قرآن کے لئے قاری مقرر کئے گئے، یہ مدرسہ آجتک معمور ہے[۱]"

اسی طرح امیر علاء الدین طیبرس متوفی ۷۱۹ھ نے جامع ازہر کے پہلو میں ایک مدرسہ تعمیر کرایا، جو مدرسہ طیبرسیہ کے نام سے موسوم ہوا، اس کی عمارت ایسی حسین اور نادر تیار کرائی تھی، کہ مقریزی کے بقول اس عمارت کی تعمیری صنعتوں کی نقل اتارنی ممکن نہ تھی، ۷۰۹ھ میں یہ عمارت مکمل ہوئی،

اس مدرسہ کے بانی کے حسن نیت کا اندازہ اس سے ہوگا، کہ عمارت کی تکمیل کے بعد جب اس کے کثیر اخراجات کی فرد حساب اس کے سامنے پیش کی گئی تو اس نے پانی سے بھرا ہوا ایک طشت منگایا، اور حساب دیکھے بغیر حساب کے تمام کاغذات اس طشت میں یہ کہکر ڈال دیئے، کہ

"جو چیز اللہ کے لئے نکال چکے ہم اس کا حساب نہیں کریں گے[۲]"

دوسری طرف جو مدرسے ظلم اور زیادتی کی بنیادوں پر قائم کئے گئے، مقریزی نے ان کے حالات کھول کر لکھے ہیں، جیسے قاہرہ کا ایک مدرسہ اقبغاویہ تھا، جسے امیر علاء الدین اقبغا عبد الواحد نے تعمیر کرایا تھا، مقریزی اس مدرسہ کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہ مدرسہ ظلم کی بنیاد پر قائم کیا گیا، یہی وجہ ہے کہ اس میں مساجد کی سی دینی رونق اور عبادتگاہوں جیسی مذہبی عقیدت و محبت لوگوں کے دلوں میں موجود نہیں ہے، کیونکہ اقبغا عبد الواحد نے زمین غصب سے حاصل کرنے کے بعد اس پر یہ مدرسہ بنوایا، اس نے نائب السلطنت ایدمر اخلی کے وارثوں کو

---

[۱] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۶۸، [۲] ، جلد ۲ ص ۳۸۳،

قرض دیا تھا، اور انھیں اس وقت تک کے لئے چھوڑ دیا کہ وہ سب کچھ خرچ کرلیں، اور ان کے پاس ادا کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہے، چنانچہ جب ان لوگوں کے پاس فوری طور پر قرض ادا کرنے کی کوئی صورت نہیں رہی، تو اس نے اس کے ادا کرنے کا سختی سے مطالبہ کیا، اور وہ لوگ اس کے تند تقاضوں سے اسے اپنا مکان دینے پر مجبور ہوگئے، چنانچہ اس نے اسی مکان کو مسمار کرکے اس کی جگہ یہ مدرسہ تعمیر کرایا، اور اسی طریقہ سے زمین کے چند اور قطعے لوگوں سے چھین کر اس میں ملا دیے، بلکہ جامع مسجد کی فصیل کا ایک حصہ بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔

اس کے بعد اس نے شہر کے تمام معماروں، بڑھیوں، سنگ تراشوں اور مزدوروں کو جمع کیا، اور یہ قرار دیا کہ ان میں سے ہر ایک شخص ہفتہ میں ایک ایک دن یہاں آکر بلا اجرت کام کیا کرے، چنانچہ قاہرہ و مصر میں جتنے معمار اور کاریگر موجود تھے، وہ ہفتہ میں ایک دن اس میں کام کرنے کے لئے آنے لگے، اور اس امیر کے جو کارندے کاریگروں اور مزدوروں سے کام لیتے، وہ بھی اپنے آقا کی طرح بڑے ظالم اور سنگ دل تھے، اور معماروں اور مزدوروں کے ساتھ بڑی سختی کا برتاؤ کرتے تھے،

پھر تعمیر کے لئے جس قدر پتھر، اینٹ، چونے، لکڑی، آلاتِ تعمیر اور دوسرے سامانوں کی ضرورت ہوئی وہ سب بھی بغیر ایک حبہ قیمت ادا کئے ہوئے خواہ غصب کرکے حاصل کئے گئے، یا سلطانی مال میں خیانت کرکے اس عمارت میں چیزیں لگائی گئیں کیونکہ حکومت کی تعمیر کا صیغہ اسی کے ہاتھ میں تھا، پھر ان سب حرکتوں کے علاوہ جب تک اس مدرسہ کی تعمیر جاری رہی، اور وہ جب کبھی اس کی تعمیر کے زمانہ میں اس کو دیکھنے آیا، تو اس نے کاریگروں کو ہر مرتبہ بڑی بے دردی سے پیٹا"

جب یہ عمارت مکمل ہوگئی، اور اس میں درس کا وقت آیا، تو اس نے اس کے افتتاح کا جلسہ منعقد کیا، جس میں مصر کے فقہاء و قضاۃ بلائے گئے لیکن اسے کوئی ایسا متدین عالم دین نہ مل سکا، جس کی تولیت میں اس مدرسہ کو دیتا، البتہ جاہ پسند دنیا دار علماء اس کی جانب متوجہ ہوئے، اور اس کی تولیت کی خواہش

ظاہر کی، انھی میں شریف شرف الدین علی بن شہاب الدین نقیب الاشراف و محتسب قاہرہ بھی تھے، انھوں نے اس مدرسہ کی صدارت اور تولیت کیلئے امیر اقبغا سے گفتگو کی، اور اسے اپنی طرف مائل کرنے کے لئے اس مدرسہ کے ہال کے لئے آٹھ ہزار درہم چاندی کی قیمت کا ایک قالین رشوت میں دیا، جو افتتاح کے جلسہ کے دن ہال میں بچھایا گیا، لوگوں کا عام خیال تھا کہ امیر اقبغا اس موقع پر اس محتسب کے مدرسہ کے صدر مقرر ہونے کا اعلان کر دے گا، لیکن جب مجمع اکٹھا ہو گیا، تو امیر اقبغا نے خلاف توقع اعلان کر دیا، کہ وہ اس زمانہ میں کسی شخص کو اس کی تولیت سپرد نہیں کرے گا، اور لوگ مدرسہ کا افتتاح کئے بغیر منتشر ہو گئے،[۱]

مدرسوں اور تعلیمگاہوں کی مختلف قسمیں، اسلامی عہد میں مختلف قسم کے مدرسے اور تعلیمگاہیں تھیں۔

۱۔ **مکاتب** جن میں ابتدائی تعلیم دیجاتی تھی،

۲۔ **مدارس عامہ** جن میں شرعی علوم، ادب اور عقلی علوم پڑھائے جاتے تھے،

۳۔ **مدارس قرآن** جو قرآن مجید کے درس کے لئے خاص تھے، جیسے سسلی اور واسط میں قائم تھے[۲]

۴۔ **دار الحدیث** کے نام سے علم حدیث کی تعلیم کے لئے عمارتیں بنائی گئی تھیں جن میں صرف حدیث کی روایت و سماع و قرأت ہوتی تھی، جیسے نور الدین محمود بن زنگی نے دمشق میں اور الکامل ناصر الدین نے قاہرہ میں بنوائے تھے،[۳] دمشق کا دار الحدیث صاحب الجواہر المضیہ کے بقول روئے زمین کا سب سے پہلا دار الحدیث تھا،[۴]

۵۔ **مدارس فقہ،** فقہ حنفی اور شافعی کی تعلیم کے لئے علاحدہ علاحدہ مدرسے قائم کئے جاتے تھے، دمشق حلب اور مصر وغیرہ کے حالات میں ایسے بہت سے مدرسوں کا تذکرہ خطط مقریزی اور حسن المحاضرہ سیوطی میں آیا ہے، نیز بعض مدرسوں میں فقہ حنفی و شافعی دونوں کی تعلیم کے لئے درس کے حلقے ہوتے تھے،[۵]

---

[۱] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۴۰۲-۴۰۳ [۲] رحلۃ ابن جبیر ص ۳۳۲، رحلہ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۳۵ [۳] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۷۵ [۴] الجواہر المضیہ جلد ۲ ص ۱۵ [۵] خطط جلد ۲ ص ۳۶۲، ۳۹۲، ۴۰۰، ۳۶۸ وغیرہ

۶۔ مدارس طبیہ، علم طب کے لئے علیحدہ مدرسے قائم ہوئے، جیسے سلرنو اور بغداد اور قاہرہ میں طبی مدرسے کھولے گئے، نیز طب کی تعلیم عام مدرسوں میں بھی دیجاتی تھی، اور ہسپتالوں میں عملی تجربے سکھائے جاتے تھے،

مستقل مدرسوں کے قائم ہوجانے کے باوجود اسلامی دنیا کی مسجدوں میں علما کے درس کے حلقے قائم رہے، جن میں کوئی فن تفسیر پڑھاتا، کوئی حدیث کی روایت کرتا اور کوئی فقہ پر درس دیتا تھا، اسی طرح ادب شعر اور عقلی علوم کے درس کے حلقے بھی قائم ہوتے تھے،

۸۔ بعض اساتذہ ہفتہ میں ایک دفعہ اپنا حلقہ منعقد کرتے تھے، وہ دن ان کے درس اور خطبہ کے لئے مقرر ہوتا تھا، جس میں بڑا اجتماع ہوتا تھا خطیب شیخ ابوبکر سجاد کے متعلق لکھتا ہے:۔

"سچے تھے، علم رکھتے تھے سنن میں ایک بڑی کتاب تصنیف کی، جامع منصور میں ان کا حلقہ جمعہ کے دن قائم ہوتا تھا جمعہ کی نماز کے پہلے فتوی کے لئے اور نماز کے بعد املا اور خطبہ کے لئے"[۱]

حلقوں میں اکابر علماے عصر کی شرکت وکثرت تلامذہ

ان حلقوں میں بلا امتیاز بڑے بڑے علما شریک ہوتے تھے، اور اپنے معاصرین کے علم سے استفادہ کرتے تھے، ابن خلکان حضرت ربیعہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پھر ربیعہ مسجد کو روانہ ہوئے، اور اپنے حلقہ میں بیٹھے، مالک حسن، و دیگر معززین شہر مدینہ اس حلقہ میں شریک ہوئے، اور دوسرے لوگوں کا اس میں ازدحام ہوگیا"[۲]

ان حلقوں میں شاگردوں اور عام سننے والوں کی بڑی جماعت شریک ہوتی تھی، مثلاً ابوالحسن علی بن عاصم واسطی کے جو عراق کے امام وقت تھے، درس کے حلقہ میں تیس ہزار سے زیادہ مجمع ہوتا تھا[۳]، اور یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ کی مجلس میں، ۷ ہزار سے زیادہ آدمی امنڈ آتے تھے،[۴]

علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں:۔

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۸۰، [۲] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۲۹، [۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۹۱، [۴] ایضاً جلد ۱ ص ۲۹۲،

"علامہ ذہبی طبقات میں ابو التقی متوفی ۲۵۱ھ کے ترجمہ کے بعد لکھتے ہیں، کہ اس زمانہ کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے، جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں، رکھی جاتی تھیں، اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے، جو اجتہاد و فتوی دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔"

خطیب مورخ بغداد علامہ ابو حامد اسفرائنی کے حلقہ میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر تھے، فراء نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکھ دیا، تو حاضرین میں ۸۰ صرف قاضی تھے، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس میں، چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر تھے، بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلس املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہاء، خطاط، اہل مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے۔[1]

سلیمان بن حرب بصری قاضی مکہ بغداد آئے، تو خلیفہ مامون نے ان کی حدیث کی مجلس کا اہتمام کیا، قصر خلافت کے پاس منبر کی طرح ایک اونچی جگہ بنائی گئی، اور میدان میں حدیث سننے والے جمع ہوئے، تخمینہ کیا گیا کہ اس میں چالیس ہزار اشخاص شریک ہوئے، خود خلیفہ مامون بھی مجلس میں حاضر تھا، اور شیخ کی حدیثیں اپنے قلم سے لکھتا جاتا تھا،[2]

محدث عاصم بن علی جب بغداد آئے اور شہر کے باہر نخلستان میں درس حدیث کا حلقہ قائم کیا گیا، اس میں ایک خلقت امنڈ آئی، خلیفہ ہارون رشید بھی اس مجلس میں آیا، شیخ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھے تھے، اور خلیفہ ایک خمدار کھجور کے تنہ پر بیٹھ کر حدیثیں لکھتا تھا، اس مجلس کا اندازہ کیا گیا، تو ایک لاکھ بیس ہزار نفوس نکلے۔[3]

ابو مسلم صاحب سنن بغداد آئے تو ان کے حلقہ میں سات مستملی اسطرح کھڑے کئے گئے کہ ایک اپنی

---

[1] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۱۰۰، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۶۰، [3] ایضاً ص ۳۹۳، ۳۶۴،

۷۔ مدارس طبیہ، علم طب کے لئے علیحدہ مدرسے قائم ہوئے، جیسے سلرنوا ور بغداد اور قاہرہ میں طبی مدرسے کھولے گئے، نیز طب کی تعلیم عام مدرسوں میں بھی دیجاتی تھی، اور ہسپتالوں میں عملی تجربے سکھائے جاتے تھے، مستقل مدرسوں کے قائم ہوجانے کے باوجود اسلامی دنیا کی مسجدوں میں علما کے درس کے حلقے قائم رہے، جن میں کوئی فن تفسیر پڑھاتا، کوئی حدیث کی روایت کرتا اور کوئی فقہ پر درس دیتا تھا، اسی طرح ادب شعر اور عقلی علوم کے درس کے حلقے بھی قائم ہوتے تھے،

۸۔ بعض اساتذہ ہفتہ میں ایک دفعہ اپنا حلقہ منعقد کرتے تھے، وہ دن ان کے درس اور خطبہ کے لئے مقرر ہوتا تھا، جس میں بڑا اجتماع ہوتا تھا خطیب شیخ ابوبکر سجاد کے متعلق لکھتا ہے،:۔

"سچے تھے، علم رکھتے تھے، سنن میں ایک بڑی کتاب تصنیف کی، جامع منصور میں ان کا حلقہ جمعہ کے دن قائم ہوتا تھا، جمعہ کی نماز کے پہلے فتوی کے لئے اور نماز کے بعد املا اور خطبہ کے لئے"[1]

حلقوں میں اکابر علماے عصر کی شرکت وکثرت تلامذہ

ان حلقوں میں بلا امتیاز بڑے بڑے علما، شریک ہوتے تھے، اور اپنے معاصرین کے علم سے استفادہ کرتے تھے، ابن خلکان حضرت ربیعہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"پھر ربیعہ مسجد کو روانہ ہوئے، اور اپنے حلقہ میں بیٹھے، مالک حسن، و دیگر معززین شہر مدینہ اس حلقہ میں شریک ہوئے، اور دوسرے لوگوں کا اس میں اژدہام ہوگیا"[2]

ان حلقوں میں شاگردوں اور عام سننے والوں کی بڑی جماعت شریک ہوتی تھی، مثلاً ابو الحسن علی بن عاصم واسطی کے جو عراق کے امام وقت تھے، درس کے حلقہ میں تیس ہزار سے زیادہ مجمع ہوتا تھا[3]، اور یزید بن ہارون متوفی ۲۰۶ھ کی مجلس میں، ۷ ہزار سے زیادہ آدمی امنڈ آتے تھے،[4]

علامہ شبلی مرحوم لکھتے ہیں،:۔

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۸۰، [2] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۲۹، [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۹۱، [4] ایضاً جلد ۱ ص ۲۹۲،

"علامہ ذہبی طبقات میں ابو التقی متوفی ۲۵۱ھ کے ترجمہ کے بعد لکھتے ہیں، کہ اس زمانہ کے بعض حلقۂ درس ایسے ہوتے تھے، جن میں دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں، اور لوگ احادیثِ نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے، جو اجتہاد و فتوی دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔"

خطیب مورخ بغداد علامہ ابو حامد اسفرائنی کے حلقہ میں خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس میں حاضر رہتے، فرا نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکھ دیا، تو حاضرین میں ۸۰ صرف قاضی تھے، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس میں چار سو فارغ التحصیل اہلِ علم حاضر تھے، بصرہ کی جامع مسجد میں امام بخاری نے جب مجلسِ املا منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہا، حفاظ، اہلِ مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگوں نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار ہے[۱]"

سلیمان بن حرب بصری قاضی مکہ بغداد آئے، تو خلیفہ مامون نے ان کی حدیث کی مجلس کا اہتمام کیا، قصرِ خلافت کے پاس منبر کی طرح ایک اونچی جگہ بنائی گئی، اور میدان میں حدیث سننے والے جمع ہوئے، تخمینہ کیا گیا کہ اس میں چالیس ہزار اشخاص شریک ہوئے، خود خلیفہ مامون بھی مجلس میں حاضر تھا، اور شیخ کی حدیثیں اپنے قلم سے لکھتا جاتا تھا[۲]،

محدث عاصم بن علی جب بغداد آئے اور شہر کے باہر نخلستان میں درسِ حدیث کا حلقہ قائم کیا گیا، اس میں ایک خلقت امنڈ آئی، خلیفہ ہارون رشید بھی اس مجلس میں آیا، شیخ ایک اونچے چبوترے پر بیٹھے تھے، اور خلیفہ ایک خمدار کھجور کے تنہ پر بیٹھ کر حدیثیں لکھتا تھا، اس مجلس کا اندازہ کیا گیا، تو ایک لاکھ بیس ہزار نفوس نکلے[۳]،

ابو مسلم صاحب سنن بغداد آئے تو ان کے حلقہ میں سات مستملی اسطرح بیچ کھڑے کئے گئے کہ ایک اپنی

---

[۱] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۸۰۔ [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۳۶۰۔ [۳] ص ۳۶۲، ۳۶۴،

آواز دوسرے تک پہونچائے، اس میدان کی پیمائش کی گئی، اور دواتیں شمار کی گئیں تو ۴۰ ہزار سے زیادہ نکلیں اور جو لوگ کاغذ اور دوات کے بغیر صرف سننے کے لئے شریک ہوئے تھے، وہ ان کے علاوہ تھے[1]

شیخ ابوبکر جعفر فریابی کی مجلس میں ۳۱۶ مستملی اور حاضرین ۳۰ ہزار کے قریب تھے[2]

امام بخاری کے صرف ایک شاگرد سے ۹۰ ہزار طلبہ نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی تھی[3]

اوقاف | جیسا کہ اوپر کہا گیا، مدرسوں کی تعمیر کے ساتھ ان کے مصارف کے لئے بڑے بڑے اوقاف کئے گئے جن سے معلموں اور طالب علموں کے وظیفے جاری کئے جاتے اور مدرسوں کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی تھیں نظام الملک طوسی کے اوقاف جو اس نے مدرسوں کے لئے اپنی جاگیروں کا دسواں حصہ کیا اور دو لاکھ دینار مدرسہ نظامیہ بغداد پر کئے، وہ عام شہرت رکھتے ہیں، اس طرح مستنصر نے مدرسہ مستنصریہ کے لئے جو مواضع وقف کئے تھے، انکی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا تھی، جو آج کل کے حساب سے بقول مولینا شبلی مرحوم ساڑھے چار لاکھ سالانہ ہوتی ہے[4] ابن جبیر بغداد کے مدرسوں کے حال میں لکھتا ہے:-

"یہاں ۳۰ مدرسے ہیں، اور یہ سب مشرقی جانب ہیں، ان میں سے کوئی مدرسہ ایسا نہیں جو عظیم الشان قصر سے کم ہو، ان میں سب سے بڑا اور مشہور نظامیہ ہے، اسے نظام الملک نے قائم کیا تھا، اور ۵۰۴ھ میں اس کی تجدید ہوئی، ان مدرسوں کے لئے بڑے اوقاف ہیں جن کی آمدنی سے یہاں کے استادوں اور طالب علموں کو وظیفے دئے جاتے ہیں"[5]

اوقاف کا یہ سلسلہ اس کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ مشکل سے کوئی ایسا مدرسہ ہوگا جس کے اخراجات کیلئے کوئی آمدنی وقف نہ کی گئی ہو، ان کے ذریعہ امراء اور ارباب خیر خدا کی راہ میں اپنی دولت صرف کرکے اپنی آخرت کیلئے ذخیرہ جمع کرتے تھے خصوصاً پانچویں سے آٹھویں نویں صدی تک اس کا بہت رواج تھا،

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۹۶ [2] ایضاً ص جلد ۲ ص ۲۶۲ [3] مقدمہ فتح الباری ص ۵۰۰، [4] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۷۴، [5] سفرنامہ ابن جبیر ص ۲۲۹،

ابن خلدون نے مصر میں اوقاف کی کثرت کا ایک سبب یہ بھی بیان کیا ہے، کہ دولت صلاحیہ کے زمانہ سے مصر کے امراء جو زیادہ تر غلاموں اور موالیوں میں سے تھے، حکومت کے روز روز کے انقلاب سے خائف تھے، اس لئے وہ بڑے بڑے اوقاف کرکے اپنے لڑکے کے حقوق ان سے متعلق کر دیتے تھے، تاکہ حکومت کے انقلاب کا اثر جائداد کی ضبطی کی صورت میں ظاہر نہ ہو، چنانچہ ان اوقاف کی مدد سے مصر میں بہت سے مدرسے زاویے اور رباط تیار ہوگئے، اور علماء اور طلبہ کے معقول وظیفے جاری ہوگئے، اس کے ساتھ ابن خلدون نے تصریح کیساتھ یہ بھی اقرار کیا ہے، کہ اس زمانہ میں لوگوں میں جائداد دینی وقف کرکے کار خیر انجام دینے کا حوصلہ بھی پیدا ہوگیا تھا۔[۱]

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے ساتھ مختلف شرطیں لگا دیتے تھے، جیسے ان کے وقف سے صرف حنفی طلبہ کو وظیفے دیئے جائیں، خاص طور پر مصر میں حنفیوں اور شافعیوں نے اپنے اپنے مذہبوں کیلئے بڑے بڑے وقف کئے تھے، مصر میں ان اوقاف کا یکجا انتظام تھا، پہلے شافعیوں اور حنفیوں دونوں کے اوقاف کا متولی شافعی قاضی القضاۃ ہوتا تھا، اس رسم میں ایک ہندوستانی عالم سراج ہندی نے جو مصر میں حنفیوں کے قاضی القضاۃ تھے، تبدیلی کرائی، چنانچہ اس کے بعد شافعی مذہب کے اوقاف شافعی قاضی القضاۃ کی نگرانی میں اور حنفی مذہب کے اوقاف حنفی قاضی القضاۃ کی تولیت میں آگئے،[۲]

بعض وقف کرنے والے اپنے اوقاف کے لئے بعض دوسری شرط لگا دیتے تھے، جیسے مصر کے مدرسہ خروبیہ کے بانی بدرالدین محمد بن محمد خروبی نے اس مدرسہ کے وقف میں یہ شرط لگائی تھی، کہ اس سے کوئی وظیفہ بجز عرب کے کسی عجمی کو نہ دیا جائے،[۳]

اسلامی حکومتیں واقف کے شرائط کی پابندی بڑی احتیاط کیساتھ کرتی تھیں،

بعض اوقاف صرف کار خیر کے نام سے کئے جاتے تھے، ان سے بھی علماء کے وظیفے جاری کئے جاتے تھے، کہ وہ شہروں اور دیہاتوں میں رہ کر شرعی علوم کی اشاعت کی خدمت فراغ بالی سے انجام دیں،

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون ص ۳۰۰، [۲] الدرر الکامنہ جلد ۲ ص ۱۵۵ ترجمہ سراج ہندی [۳] خطط مصر جلد ۲ ص ۳۶۹،

اسی طرح "زوایا" "خانات" "رباط" اور "خوانک" وغیرہ کے ناموں سے عمارتیں بنا کر ان پر وقف کئے جاتے تھے اور ان میں مذہبی جماعتیں مقیم رہ کر علم دین کی خدمت میں مصروف رہتی تھیں، مقریزی نے ایسی بہت سی عمارتوں کا تذکرہ کیا ہے،

دارالاقامہ | جس زمانہ تک مدرسوں کے لئے مستقل عمارتیں تعمیر نہیں ہوئی تھیں، نادار سکے انہی مسجدوں کے حجروں اور استادوں کے مکانوں میں رہتے تھے، جب درس گاہ کے لئے عمارتیں تیار ہوئیں، تو ان کے پہلو بہ پہلو دوسری عمارتیں بنائی گئیں، جن میں طلبہ ٹھہرائے گئے، نیز بعض اوقات "حوانیت" "زوایا" "رباط" "خانات" "بیوت" اور "رواق" وغیرہ سے موسوم عمارتیں بھی طالب علموں کے قیام گاہ کے کام آتی تھیں، اور بعض جگہ تعلیمگاہ کی عمارت اس طرز سے بنائی جاتی تھی، کہ اس میں طالب علموں کے قیام کے لئے بھی جگہیں نکل سکیں،

ان اقامت گاہوں میں طالب علموں کے کھانے پینے، پہننے اور زندگی اور تعلیم کی دوسری ضرورتوں کی کفالت کیجاتی تھی، مدرسہ مستنصریہ بغداد کے دارالاقامہ کے حالات میں مولینا شبلی مرحوم یہ بیان فرما چکے ہیں کہ

"مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک ہسپتال اور مزملہ بھی تھا، (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے تھے) دوسو اڑتالیس مستعد طلبہ مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے، جن کو مکان، فرش، خوراک، روغن، کاغذ، قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرنی اور میوے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار الگ وظیفہ کے طور پر مقرر تھی"[۵]

ابن بطوطہ نے واسط کے ایک مدرسہ کا حال لکھا ہے، جسے ایک عالم دین شیخ تقی الدین نے اپنے ذاتی مصارف سے قائم کیا تھا، اور اس میں وہ اور ان کے بھائی، اور ان کے شاگرد علماء درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے وہ لکھتا ہے:۔

یہاں (واسط میں) ایک پر رونق عظیم الشان مدرسہ ہے، جس میں تقریباً تین سو حجرے ہیں جنہیں

---

[۵] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۱۰۴،

پردیسی لڑکے قرآن مجید کی تعلیم کے لئے آکر ٹھہرتے ہیں،...... اور انھیں روزانہ کے اخراجات خورد و نوش اور سالانہ پوشاک دیجاتی ہے[۱]۔

اسی طرح ابن بطوطہ نے ایک دوسرے شہر تستر کے عالم دین شیخ شرف الدین موسیٰ بن صدر الدین سلیمان کے اوصاف بیان کرکے ان کے ایک مدرسہ کا حال یہ لکھا ہے:-

اور ان کا ایک مدرسہ اور زاویہ ہے، جس میں چار نوجوان خدام سنبل، کافور، جوہر اور مسرور انتظام کے لئے مقرر ہیں، ان میں سے ایک زاویہ کے اوقاف کا نگہبان ہے، دوسرا روزانہ کے اخراجات کو دیکھتا ہے تیسرا یہاں کے آنے والوں کی مہمان نوازی کی خدمت انجام دیتا ہے، اور چوتھا باورچیوں، بہشتیوں اور جاروب کشوں کے کاموں کی نگرانی کرتا ہے،

میں یہاں سولہ دن تک مقیم رہا، اور یہ دیکھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ یہاں کے روزانہ کے کھانے نہایت نفیس اور قیمتی ہوتے ہیں، روزانہ چار قسم کے کھانے دسترخوان پر رکھے جاتے ہیں، مرغ روٹی، پلاؤ، اور قورمہ، اور پھر مٹھائی کی تشتری علاوہ چنی جاتی ہے[۲]۔

ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں دارالاقامے ہندوستان کے اسلامی مدرسوں میں بھی دارالاقامے قائم تھے، جن میں طالب علموں کے قیام و طعام کا معقول انتظام تھا،

ابن بطوطہ نے ۷۳۴ھ میں ہندوستان آیا تھا، وہ سندھ کے مقام سیوستان میں ایک بڑے مدرسہ میں اترنے کا تذکرہ کرتا ہے، یہ گرمیوں کا زمانہ تھا، ابن بطوطہ رات کے وقت اس مدرسہ کی چھت پر سوتا تھا[۳]،

دلی کے مدرسہ فیروز شاہی کے متعلق ضیاء الدین برنی لکھتا ہے:-

"وہر روز پیش ہر طائفہ خلیفہ مائدہ نعمت می کشند و چہ مستعدان و متعلمان و حافظان و مصلیان و ذاکران و مشغولان و چہ سایر بندگان خدا مدرسہ فیروز شاہی را اختیار کردہ و راحت ہا و آسایش ہا می گیرند[۴]"

[۱] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۳۵ [۲] ایضاً جلد ۱ ص ۱۴۱ [۳] ایضاً جلد ۲ ص ۸ [۴] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۶۴،

فیروز شاہ کے عہد کے ایک شاعر مطہر کڑوی نے جو صاحب درس بھی تھا، ایک قصیدہ میں اس مدرسہ کے مفصل حالات قلمبند کئے ہیں، اس کے دار الاقامہ کے دسترخوان کے الوانِ نعمت کا ذکر یوں کرتا ہے،:-

همه دراج و کبوتر بچه و کبک و کلنگ　　ماہی و مرغ مسمّن بره کوه و قار

نان دان نوشکر و لوز و حوائج (فوانج) و ترمی　　زعفران صندل و خشک (و) همه بر (گونه) فزار

قرص بریان زلیبا و دگر آرایش (کذا)　　خشت (و) لوزینه تر و خشک بهر سو انبار

راست گوئی که بیار است بهارے ز نعیم　　صحنا برگ صفت کاسه درو نرگس وار

و اندران (و آبداران) همه بر دست قدحها جله　　کرده با شربت حامض شراب آنار

چون بپرداخت زمان محفل از شرب و نوش　　سفره برداشته شد دست کشید ند اخیار

برگ داران شده در دادن تنبول روان　　برگ ان بائی زر و سیم گرفته یک بار،

بیرہا (بیڑہ) چون گل صد برگ چو..... گل　　دوخته آن گل صد برگ بیک سوزن (سوزن) خار

زعفران انگ (رنگ) و بعد (کذا) مزه و عنبر بوی　　حرب بهلو و تر اندام وسط (کذا) رخسار[1]

عادل شاہ نے شاہی مدرسہ کے لڑکوں کے دار الاقامہ کا اہتمام کیا تھا، اور انہیں روزانہ کھانا دیا جاتا تھا، پڑھنے کے لئے کتابیں مہیا کی جاتی تھیں، اور نقد وظیفہ جاری تھا، بساتین السلاطین میں ہے،:-

"شاگردان را از سفرہ آتا و آش نان بوقت صبح بریانی و مزعفر و بوقت شام گندم و کھچڑی فی اسم یک بون بدون این کتاب ہائے عربی و فارسی امداد نمایند"[2]

وظیفے ہندوستان کے مدرسوں میں، جس طرح دوسرے اسلامی ملکوں میں طالب علموں کو وظیفے دیئے جاتے تھے، ویسے ہی ہندوستان کے مدرسوں میں بھی وظیفے جاری تھے، جیسے فیروز شاہ کے متعلق ہے،:-

"وظائفے کہ از طالبان علم محتاج دہ تنکہ بودند صدگان و دویستگان و سیصدگان تنکہ ادرار معین گشت

---

[1] رسالہ اورینٹل کالج میگزین مئی ۳۵ء ۱۲۸ [2] بساتین السلاطین ص ۳۵۱،

وعلما و متعلمان شہر از خرد و بزرگ بانعمت و ثروت شدند[۱]

مظہر کا وی لکھتا ہے :-

ہر جا کہ اہل دانش و اصحاب و زہد بود ، نان داد و دیر داد و در جہانشار کرد ،

پیران کہنہ سال و یتیمان خورد را ، چنداں وظیفہ داد کہ صاحب لیسا کرد[۲]

اسی طرح ہندوستان میں مختلف فرمانروا خاندانوں کے سلاطین نے اپنے اپنے زمانہ میں وظیفے مقرر کئے،

عالمگیر نے ہر صوبہ میں یہ احکام جاری کر دیئے تھے، کہ ہر صوبہ کے طالب علموں اور استادوں کے وظیفے اور تنخواہیں اسی صوبہ سے ادا کی جائیں، اور استادوں سے سیاہہ کی مہریں لیکر اس صوبہ کے خزانچی کے پاس جمع کر دیجائیں[۳]

اساتذہ کا قیام دار الاقامہ میں اور ان کے قیام کے آداب،

ان عمارتوں میں اساتذہ بھی قیام کرتے تھے، اور طلبہ کی راحت رسانی اور تعلیمی فروتون کی نگرانی کرتے، اور ان کی اخلاقی اور دینی تعلیم و تربیت پر وقت صرف کرتے تھے، نیز اپنے بہترین اسوۂ عمل سے لڑکوں کے لئے نمونہ بنتے تھے، اور بعض اوقات مدرسوں، زاویوں اور مسجدوں کی عمارتوں اور ان کے وقف اور وظیفوں کی نگہبانی کرتے تھے،

اساتذہ و علما عموماً دار الاقامہ کی نیچے کی منزل میں رہتے تھے، اور لڑکے اوپر کی منزلوں میں رکھے جاتے تھے، کیونکہ اولاً علما رکو ان کی سن رسیدگی کی وجہ سے اوپر چڑھنے اترنے میں زحمت ہوتی، اس کے علاوہ ان کا تعلق رشد و ہدایت اور فتووں کی وجہ سے شہر کے عوام سے بھی رہتا تھا، اس لئے مسئلے مسائل پوچھنے کے لئے نیچے کی منزل میں بآسانی پہونچ سکتے تھے،

مدرسہ اور دار الاقامہ میں جو اساتذہ قیام کرتے تھے، وہ لڑکوں کی نگاہوں میں اپنا وقار قائم رکھتے تھے، اور ایسی زندگی رکھتے، کہ ایک طرف لڑکوں کے دلوں میں ان کا احترام قائم رہے، دوسری طرف ان سے لڑکوں کو علمی اور تعلیمی فائدے پہونچتے رہیں، مثلاً

---

[۱] تاریخ فیروز شاہی ص ۵۵۵، [۲] اورنٹیل کالج میگزین ستمبر ۱۹۳۳ء ۱۳۱، ۱۳۲، [۳] سیر المتاخرین جلد ۲ ص ۱۴۰، ومرات احمدی جلد ۱ ص ۲۶۲

۱- وہ بلا ضرورت اپنی اقامتگاہ سے باہر نہ نکلتے، کیونکہ بار بار سامنے آنے اور چلتے پھرتے دکھائی دینے سے لوگوں کی نگاہوں میں احترام قائم نہیں رہتا ہے،

۲- نماز التزام کیساتھ باجماعت مسجد میں پڑھتے تھے، تاکہ لڑکوں کے دلوں میں ان کی مذہبی پابندی میں سستی کرنے کا خیال نہ آئے، اور لڑکے بھی پیروی کرکے نماز باجماعت کے پابند رہیں،

۳- شرعی احکام اور چھوٹی مباح اور مستحب کے مسئلوں پر پابندی سے عمل کرتے تھے، اور اخلاق و معاشرت کے عام اصولوں کے پابند رہتے تھے،

۴- اساتذہ لڑکوں کے لئے درس کے وقتوں کے علاوہ کوئی علٰحدہ وقت بھی مقرر کر دیتے تھے، جس میں وہ لوگ ان کے پاس آکر اپنے علمی اور تعلیمی شکوک دور کرتے تھے، مطالعہ کی کتابوں کے مشکل مقاموں میں ان سے استمداد لیتے تھے، اور کتابوں کے نسخوں کی تصحیح، مشکل الفاظ و اسماء کے حروف کے ضبط، ثقیل لغتوں کی تشریح، اور کتابوں کے نسخوں کے اختلاف کی تحقیق میں ان سے مدد لیتے تھے،[۱] بلکہ بعض خاص صورتوں میں رات کے خالی وقتوں میں بھی شوقین لڑکوں کو پڑھاتے تھے، قاضی اسد بن فرات امام محمد کے حلقۂ درس میں شریک تھے، ان کی استدعا پر امام محمد نے انھیں بڑی شفقت سے رات کے وقت پڑھانا منظور کیا تھا، قاضی اسد خود کہتے ہیں کہ

"میں نے محمد بن حسن سے کہا کہ میں پردیسی ہوں اور آپ سے فقہ و حدیث کا بہت کم سرمایہ جمع کر سکا ہوں کیونکہ آپکے شاگردوں کی تعداد زیادہ ہے اسلئے میرے لئے کیا خاص رعایت ہو سکتی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ عراقی لڑکوں کے ساتھ دن کے وقت درس میں شریک رہو اور رات کا وقت صرف تمھارے لئے خاص کرتا ہوں، رات کو میرے ہی پاس رہو میں تمھیں حدیثیں سنایا کروں گا"

چنانچہ میں شب کو امام محمد کے یہاں رہنے لگا، وہ خود کوٹھے پر رہتے تھے، اور میں نیچے کی منزل میں رہتا تھا، لیکن میری خاطر سے وہ نیچے ہی اتر آتے، اور درس کے لئے اپنے سامنے ایک پیالہ میں پانی رکھ کر بیٹھ جاتے، جب پڑھتے پڑھتے رات زیادہ گذر جاتی تو مجھے نیند آنے لگتی، وہ مجھے اونگھتے ہوئے دیکھ کر ایک چلو پانی میرے منہ پر چھڑکتے، اور میں بیدار ہو جاتا، ان کا اور میرا یہی طریقہ بدستور جاری رہا، یہاں تک کہ میں جس قدر ان سے پڑھنا چاہتا تھا، پڑھ لیا"[۲]

(باقی)

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۰۲ تا ۲۰۴، [۲] تاریخ صقلیہ جلد ۲ ص ۲۴۵، ۲۴۶،

تصوف کی تجدید و اصلاح

از

مولانا عبد السلام ندوی

صوفیوں کی اخلاقی اور مذہبی حالت پر جن لوگوں نے تنقید کی ہے، ان کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ لوگ ہیں، جو سرے سے تصوف ہی کے قائل نہ تھے، بلکہ اس کو ایک بدعت سمجھتے تھے، اور معتزلہ، جہمیہ اور مسلمانوں کے دوسرے مبتدعانہ فرقوں کی طرح صوفیوں کو بھی ایک فرقہ سمجھتے تھے، علامہ ابن تیمیہ علامہ ابن قیم اور محدث ابن جوزی وغیرہ اسی قسم کے لوگوں میں شامل ہیں، اس لئے ان لوگوں نے تصوف پر جو کچھ لکھا ہے اس کو تنقید اور تردید تو کہہ سکتے ہیں، تجدید و اصلاح نہیں کہہ سکتے، ان لوگوں کا مقصد حریف کے جسم پر تلوار لگانا تھا، نشتر لگا کر زخم پر مرہم پٹی کرنا نہ تھا، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے، جو تصوف کے منکر نہ تھے، بلکہ تصوف کے ذوق آشنا تھے، البتہ تصوف پر شریعت کو مقدم سمجھتے تھے، اس لئے تصوف میں جو چیزیں شریعت کے خلاف شامل ہوگئی تھیں، ان سے تصوف کو پاک کرنا چاہتے تھے، اس لئے انھوں نے اپنے زمانہ کے مروج تصوف کے خلاف جو کچھ لکھا یا کہا ہے، اس کو تصوف کی تجدید و اصلاح کہہ سکتے ہیں، اور اس مضمون میں انہی بزرگوں کے تجدیدی کارناموں کا بیان کرنا مقصود ہے،

مجاز پرستی کی اصلاح، عشق مجازی اور حسن پرستی بھی تصوف کے دامن کا ایک بدنما داغ ہے، اور خود اکابر صوفیہ نے اس کے خلاف آواز بلند کی ہے، یوسف بن حسین المتوفی ۳۰۳ھ بڑے پایہ کے صوفی تھے، ان کا قول ہے کہ

رأیت آفات الصوفیۃ فی صحبۃ الاحداث[۱]	میں نے صوفیوں کی آفتوں کا سبب نوخیز لڑکوں کی صحبت کو پایا،

ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی فرماتے ہیں:۔

اذا اراد اللہ ھوان عبد القاہ الی ھولاء الانتان والجیف یرید بہ صحبۃ الاحداث[۲]	جب خدا کسی بندے کو ذلیل کرنا چاہتا ہے، تو ان نجاستوں میں یعنی نوخیز لڑکوں کی صحبت میں ڈال دیتا ہے،

شیخ امان پانی پتی المتوفی ۹۹۵ھ اگرچہ تصوف میں فرقہ ملامتیہ کا مشرب رکھتے تھے، لیکن باایں ہمہ

"طالباں را از عشق صورت منع کردے[۳]"

شیخ نظام الدین انبیٹھی المتوفی ۱۰۰۹ھ اگرچہ ایک مجذوب صوفی تھے لیکن

"از سماع پرہیز کردے و مریداں را نیز ازاں و از تعلق بظاہر صوری منع فرمودے و گفتے باز را اگر چشم نہ بندند و ریاضت نفرمایند گنجشکان جنگلی گیرد، واگر ریاضت فرمایند کلنگ شکار کند[۴]"

حضرت مجدد الف ثانی نے اس پر عملی حیثیت سے بحث کی ہے، اور لکھا ہے کہ ایک خاص حالت میں حسین صورتوں پر پہلی نگاہ ڈال لینا عارف کیلئے مفید ہوتا ہے، اور المجاز قنطرۃ الحقیقۃ کے یہی معنی ہیں، شریعت میں بھی پہلی نگاہ معاف ہے، لیکن اس حالت میں دوسری نگاہ ڈالنا مضر ہے، کہ شریعت میں اسکی ممانعت ہے، اور حرام چیز میں شفا نہیں ہے، اسلئے:۔

"جمعے کہ نظرہائے ثانی و ثالث و رابع را کہ بظاہر جمیلہ تعلق کند مفید دانستہ اند و از اسباب عروج تحقیق انگاشتہ اند از ارباب استدراج اند آیۂ کریمہ قل للمومنین یغضوا من ابصارھم و یحفظوا فروجھم دررد ایں جماعہ کافی است[۵]"

۱؎ رسالہ قشیریہ ص ۲۰۶ ۲؎ ،، ص ۲۹ ، ۳؎ اخبار الاخیار ص ۲۲۶ ، ۴؎ ،، ص ۲۰۰ ۵؎ مکتوبات مجدد الف ثانی جلد ۳ ص ۱۰۱

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"مصداق حسن و قبح اشیا آنست کہ ہر چہ رو بآخرت دارد، و برائے آخرت معد است حسن است، اگرچہ بظاہر مستحسن نماید وہر چہ رو بدنیا دارد، و برائے دنیا معد است قبیح است اگرچہ بظاہر حسن نماید و بحلاوت و طراوت ظاہر شود، کالزخرفات الدنیویۃ ازین جاست کہ در شریعت مصطفویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام والتحیۃ منع فرمودہ اند از نظر کردن بمیل و خواہش بحسن امارد و نسار اجنبیہ پس بعضے از صوفیہ کہ بمظاہر جمیلہ و نغمات مستحسنہ گرفتار اند، بتخیل آن کہ این جمال و حسن مستعار از کمالات حضرت واجب الوجود است تعالیٰ و تقدس کہ درین مظاہر ظہور فرمودہ است واین گرفتاری را نیک و مستحسن می انگارند بلکہ راہ وصول تصور می نمایند نزد این حقیر خلاف آن ثابت شدہ است"[1]

نغمہ و سرود کی اصلاح نغمہ و سرود تصوف کا ایک ضروری جزو قرار پا گیا ہے، بلکہ موجودہ دور میں تصوف کی تمام تر گرم بازاری اسی کی بدولت ہے، لیکن اکابر صوفیہ میں چند بزرگ ایسے گذرے ہیں، جو اس کو ناجائز یا کم از کم غیر مفید اور ناپسندیدہ سمجھتے ہیں، ابو علی احمد بن محمد الرودباری المتوفی ۳۲۲ھ قدماء صوفیہ میں ہیں، اور حضرت جنید بغدادی، نوری اور ابن الجلا وغیرہ کے صحبت یافتہ ہیں، ان سے سوال کیا گیا، کہ کچھ لوگ راگ باجا سنتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ وہ ہمارے لئے حلال ہے، کیونکہ ہم اس درجے کو پہونچ گئے ہیں، کہ ہم پر اختلاف احوال کا کوئی اثر نہیں پڑتا، بولے ہاں وہ پہونچ تو گئے ہیں لیکن جہنم میں[2]۔

حضرت مجدد الف ثانی اگرچہ تصوف کے بعض مراتب میں مخصوص شرائط کے ساتھ سماع کو مفید سمجھتے ہیں، تاہم موجودہ دور کے صوفیوں میں وہ شرائط نہیں پائے جاتے، اس لئے ان کے نزدیک موجودہ رقص و سرود مفید نہیں بلکہ مضر ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:۔

"اکثر آنہا (یعنی شرائط) در ابنائے این وقت مفقود است، بلکہ این قسم سماع و رقص کہ درین وقت

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد ۱ ص ۲۵۲، ۲۵۴۔ [2] رسالہ قشیریہ ص ۱۳۱۔

شائع شدہ است و این نوع اجتماع کہ درین آوان متعارف گشتہ ثمرۂ نیست کہ مضر محض است[1]

شاہ ولی اللہ صاحب نے تفہیمات الٰہیہ میں لکھا ہے، کہ صاحب شرح صدر کو اپنے اندر تین اوصاف پیدا کرنے چاہئیں، ایک تو ذکا رحالی جسکو تلطیف السر کہتے ہیں، مثلاً بہت سے لوگ ہیں، کہ جب وہ کسی غمزدہ کے پاس بیٹھ جاتے ہیں، تو اس کا غم ان میں فوراً سرایت کرجاتا ہے، یا کسی شادمان شخص کے پاس بیٹھتے ہیں، تو اس کی شادمانی اُن تک متعدی ہوجاتی ہے، لیکن بہت سے لوگوں میں یہ کیفیت بار بار کی تکرار سے حاصل ہوتی ہے، اس لئے ذکاء حالی سے ہماری مراد وہ بیداری ہے، جو فوراً حاصل ہوجاتی ہے، بہت سے لوگ کبھی تو نشاط انگیز اور کبھی وحشت خیز گانون سے یہ تلطیف حاصل کرتے ہین لیکن ہمارے نزدیک واعظ کے کلام اور غور و فکر کے ساتھ کتاب اللہ کے پڑھنے سے یہ تلطیف حاصل ہوتی ہے، اور اس طریقہ سے عذاب آخرت آنکھوں کے سامنے مجسم ہوکر آجاتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ صلعم نے جب حضرت زید بن حارثہؓ سے پوچھا کہ تمھارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ تو انھوں نے اپنے نفس کی یہی کیفیت بیان کی،[2]

پیر پرستی کی اصلاح اس میں شبہہ نہیں کہ مشائخ و اولیا کی عزت کرنی چاہئے، اور ان کے ساتھ حسن عقیدت رکھنی چاہئے، لیکن یہ عقیدت جب غلو کی حد تک پہنچ جاتی ہے، تو حدود شریعت سے نکل جاتی ہے، عیسائیون نے اسی عقیدت کو غلو کی حد تک پہنچا کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا بنا دیا تھا، اور صوفیہ نے پیر پرستی کو بھی قریب قریب اسی حد تک پہونچا دیا، چنانچہ شاہ ولی اللہ صاحب عیسائیوں کے اس غلو کا ذکر کرکے لکھتے ہیں کہ

"اگر خواہی کہ نمونہ آن ازین فریق ملاحظہ کنی امروز اولاد مشائخ و اولیا را تماشا کن کہ درحق آبائے خود چہ ظنون دارند و تا کجا کشیدہ بردہ اند، وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ،[3]

طاعات شاقہ کی اصلاح صوفیہ کو عوام اور علما پر صرف مجاہدہ و ریاضت شاقہ کی بدولت مزیت و ترجیح حاصل ہے، لیکن شاہ ولی اللہ صاحب شرح صدر کے متعلق اپنے مخصوص الہامی طریقہ کو بیان کرکے لکھتے ہیں،

۱؎ مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول ص ۳۰۷، ۲؎ تفہیمات الٰہیہ ص ۲۲، ۳؎ فوز الکبیر ص ۲۳،

کہ خدا سے قربت حاصل کرنے کا صحیح راستہ وہ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے ہیں، لیکن دورۂ شرحِ صدر میں عام تمعات اور طاعاتِ شاقہ مثلاً صوم وصال، صوم دہر، اخیر رات تک نماز پڑھنا، ہر رات ایک قرآن ختم کرنا، اور اس قسم کے اور بھی دقیق مسائل جو احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت میں مذکور ہیں وہ کوئی چیز نہیں ہیں[1] حضرت مجدد الف ثانی نے بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے،

فرقۂ قلندریہ کی اصلاح صوفیوں میں فرقۂ قلندریہ ایک بے قید فرقہ تھا، جس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی، کہ حاجب ابرو کا صفایا کرواتا تھا، مصر میں اس فرقے کی ایک مستقل خانقاہ تھی، اور اس میں اس فرقے کے بہ کثرت لوگ رہتے تھے، ایک بار ذیقعد ۷۶۱ھ میں سلطان الملک الناصر حسن بن محمد بن قلاؤن اپنے باپ ملک الناصر کی تعمیر کردہ خانقاہ میں آیا، اور اس خانقاہ کے شیخ الشیوخ نے اس کی دعوت کا سامان کیا، اور اس دعوت میں زاویہ قلندریہ کے شیخ شریف علی بھی شریک ہوئے، بادشاہ نے ان کی منڈی ہوئی داڑھی دیکھی تو اسکو ناپسند کیا، اور ان سے توبہ کروائی، اور ایک شاہی فرمان لکھا جس میں اس گروہ کو داڑھی منڈانے سے منع کیا، اور لکھا کہ جو شخص اس بدعت کا اظہار کریگا، اس کو سزا دیجائے گی، اور وہ اپنی جماعت کے شیخ اسی وقت تک رہ سکیں گے جب تک وہ اور ان کے اتباع سنت کے پابند رہیں گے[2]

رسمی تصوف کی اصلاح تصوف کے چند ظاہری و باطنی خصوصیات ہیں جن کا ہر صوفی کو رسماً پابند ہونا پڑتا ہے، ریاضاتِ شاقہ کرنا، عمدہ غذاؤں سے پرہیز کرنا، تاہل اور کسبِ معاش کے کاموں سے علحدہ رہنا، گدڑی پہننا اور اس طرح تصوف کی نمایش کرنا صوفیہ کے لئے لازمی قرار پا گیا ہے، لیکن سید العارفین میر سید لطیف اللہ المعروف بشاہ لدھا بلگرامی المتوفی ۱۱۴۳ھ نے اپنے مریدین کو ان رسمی پابندیوں سے بالکل آزاد کر دیا تھا، اور بالکل سنت کے موافق تصوف کی ایک معتدل روش قائم کی تھی، مولوی غلام علی آزاد ان کے تذکرے میں لکھتے ہیں:-

---

[1] تفہیمات الٰہیہ ص ۲۳ [2] مقریزی جلد ۴ ص ۲۰۲،

طریقہ اینقہ در تربیت طالبان آن بود کہ گاہے بہ کرشمہ کار طالب می ساختند و گاہے بہ ریاضت و مجاہدہ مشغول می گردند، و ریاضات شاقہ کہ آدمی را مزمن سازد نمی فرمودند و اگر در اربعین می نشانند اغذیہ لطیف می دادند، می فرمودند، باعث قوام انسان غذا است اگر تندرست است بجا و نفس ازو خوب می آید، و اگر ناتوان قصور واقع میشود، و از دلق پوشیدن و مرقع دوختن و خود را در نظر خلق وا نمودن منع می کردند، و از تیا اہل و کسب معاش کہ سنت سنیہ انبیا است علیہم الصلوٰۃ والسلام باز نمی داشتند می فرمودند، مرد آن ست کہ ظاہرش با معاملۂ خلق متفق باشد و باطنش دریاد مولیٰ مستغرق"[۱]

علم تصوف میں ربط ان تمام خرابیوں کا اصلی سبب یہ تھا، کہ علم تصوف میں رفتہ رفتہ بیگانگی پیدا ہوگئی، اس کا ایک سبب تو یہ تھا، کہ علم دنیوی وجاہت کا بھی ایک ذریعہ تھا، اور علما اور فقہا، کو دینی پیشوائی کے ساتھ دنیوی حیثیت سے بھی جاہ و اعزاز اور عہدہ اور منصب حاصل ہوتا تھا، اسلئے صوفیہ علم کو ایک دنیوی چیز سمجھ کر علما سے علٰحدہ رہتے تھے، چنانچہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی مولینا نور ترک کے حال میں لکھتے ہیں،:-

"با علماے شہر تعصبے تمام داشت بسبب آن کہ ایشا نرا آلودۂ دنیا دیدے"[۲]

دوسرے یہ کہ صوفیہ کشف و الہام کے مدعی تھے، اور اس طرح جو علم حاصل ہوتا تھا، اس کو تعلیمی علوم پر ترجیح دیتے تھے، امام غزالی نے لکھا ہے، کہ اہل تصوف کا میلان الہامی علوم کی طرف ہے، تعلیمی علوم کی طرف نہیں، لیکن حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوبات میں بار بار لکھا ہے، کہ صوفیہ کے علوم حجت و تقلید کے قابل نہیں، اور جہاں کہیں تعلیمی علوم اور الہامی علوم میں مخالفت ہوگی، وہاں تعلیمی علوم کو ترجیح حاصل ہوگی جس کے معنی یہ ہیں، کہ مذہبی حیثیت سے علما کا درجہ صوفیہ سے بالاتر ہے، اور الہامی اور کشفی علوم اسی وقت قابل قبول ہوں گے، جب وہ شرعی علوم کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوں گے، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"و حق بجانب علماے اہل حق است زیرا کہ علوم علما مقتبس از مشکوٰۃ نبوت است علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ

---

[۱] مآثر الکرام جلد اول ص ۱۱۱ [۲] اخبار الاخیار ص ...،

والسلام والتحیہ کہ موید است بوحی قطعی، مقتدائے معارف این صوفیہ کشف و الہام است کہ خطا را بوے راہ است و مصداق صحت و کشف و الہام مطابقت است با علوم علماے اہلِ سنت اگر سر موی مخالفت است از دائرۂ صواب بیرون است[1]

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:-

باید دانست کہ در ہر مسئلہ از مسائل کہ از علماء و صوفیہ دراں اختلاف دارند چوں نیک ملاحظہ می نماید حق بجانب علماء می یابد، سرش آنست کہ نظر علماء بواسطہ متابعت انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات بکمالات نبوۃ و علوم آن نفوذ کردہ است و نظر صوفیہ مقصور بر کمالات ولایت و معارف آنست پس ناچار علمیکہ از مشکوٰۃ نبوت اخذ نمودہ شود اصوب و احق خواہد بود از انچہ از مرتبہ ولایت ماخوذ شود[2]

لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تلقین کرتے ہیں، کہ کشفی اور الہامی علوم کا سرے سے انکار بھی نہیں کرنا چاہیے، تاکہ علماء اور اولیاء میں باہم بغض و عداوت نہ پیدا ہو، چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں،

"و صوفیہ انچہ بگویند و بکنند مخالف آراء علماء مجتہدین آنرا تقلید نباید کرد و بحسن ظن از طعن ایشان لب باید بست و از شطحیات ایشان باید شمرد، و از ظاہر مصروف باید ساخت عجب است کہ بسیاری کہ از صوفیان عوام را بایمان امور کشفیہ و الہامیہ خود بیچو وحدت وجود و مثلاً دلالت می کنند و ترغیب بہ تقلید آنہا می نمایند و بر عدم آن ایمان تہدیدات می کنند، کاش دلالت بر عدم انکار این امور نمودند و بر منکران تہدیدات می فرمودند چہ ایمان دیگر است و عدم انکار دیگر ایمان این امور لازم نیست اما از انکار این ہا محافظت باید نمود تا مبادا انکار این امور با نکار ارباب این امور کشد و با اولیاء حق جل و علا بغضے و عداوتے پیدا کند[3]

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول ص ۱۳۴ [2] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اوّل ص ۲۲۵ [3] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اوّل ص ۴۴۷،

غرض علوم شرعیہ اور علوم صوفیہ دونوں ایک ہی چیز ہیں، صرف اجمال و تفصیل کا فرق ہے چنانچہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں :۔

"شخصے از خواجہ نقشبند قدس سرہ سوال کرد کہ مقصود از سلوک چیست، فرمودند تا معرفت اجمالی تفصیلی گردد، واستدلال کشفی شود نہ فرمودند کہ تا معرفت زائد، بر معارف شرعیہ حاصل کند اگرچہ در راہ امور زائد پیدا میشود، اما اگر نہایت کار رسانند آن زوائد ہبا منثوری گردند"[۱]

صور غیبیہ کا مشاہدہ | تصوف کی دلفریبی اور دلکشی کی بنیاد دو قسم کی مادی اور روحانی نمایشوں پر قائم ہے، مادی حیثیت سے خرقہ و عمامہ، دلق و سجادہ اور رقص و سرود میں جس قدر تنوع اور رنگینی پیدا کی جائے، اسی قدر تصوف ایک دلفریب شکل میں نمایاں ہوتا ہے، اور روحانی حیثیت سے صوفیوں کو غیبی مشاہدوں میں جو روحانی صورتیں نظر آتی ہیں، وہ تصوف کا حاصل سمجھی جاتی ہیں، اور مولینا روم نے ان کو تزکیۂ قلب کا آخری نتیجہ قرار دیا ہے،

آئینۂ دل چوں شود صافی و پاک   نقشہا بینی بروں از آب و خاک

لیکن حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک نہ یہ کوئی فضیلت ہے، اور نہ ان روحانی صورتوں کے مشاہدہ سے تصوف کا اصل مقصد حاصل ہوتا، چنانچہ انھوں نے مکتوبات میں متعدد مقامات پر اس کو تفصیل کیساتھ لکھا ہے، ایک مکتوب میں لکھتے ہیں،

"مقصود از سلوک طریقۂ صوفیہ نہ آنست کہ صور و اشکال غیبی را مشاہدہ نمایند و انوار و الوان را معاینہ کنند، این خود داخل لہو و لعب است، صور و انوار حسی چہ نقصان دارد کہ کسے ایں ہا را گذاشتہ بریاضات و مجاہدات تمنائے صور و انوار غیبی نماید، چہ این صور و آن صور و ایں انوار و آں انوار ہمہ مخلوق حق اند جل و علا، و از آیات دالہ بر وجود او تعالیٰ"[۲]

---

[۱] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول ص ۴۰، [۲] ۔ جلد اول ص ۳۲۴،

دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں،۔

"سلوک طریق صوفیہ ہم در کار است نہ از برائے آن غرض کہ صور و اشکال غیبی را مشاہدہ نمایند و انوار و الوان را معاینہ فرمائند این خود داخل لہو و لعب است، بلکہ مقصود از سلوک طریق صوفیہ تحصیل ازدیاد یقین است در معتقدات شرعیہ۔"[1]

غرض مجددین تصوف کی اصلاحی تحریروں کو اگر جمع کیا جائے، تو ان کا خلاصہ بھی وہی ہوگا، جو علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن قیم اور محدث ابن جوزی نے لکھا ہے، فرق صرف یہ ہے، کہ یہ لوگ تصوف کے بالکل منکر تھے، اور لب و لہجہ سخت اختیار کیا تھا، اور حضرت مجدد الف ثانی کے اس مشورہ پر عامل نہ تھے،

"اما از انکار اینہا محافظت باید نمود تا مبادا انکار ایں امور بہ انکار ارباب ایں امور کشد و بہ اولیا رحق جل و علا بغض و عداوتے پیدا کند،

[1] مکتوبات مجدد الف ثانی جلد اول ص ۲۱۴،

شبلی کا نظریۂ تاریخ

از

جناب سید محمد عبد اللہ ایم اے ڈی لٹ، پنجاب یونیورسٹی لاہور

"مولوی سید محمد عبد اللہ صاحب ایم اے اس وقت پنجاب کے نوجوان فضلاء کی پہلی صف میں ہیں ان کے محققانہ مضامین اورنٹیل کالج میگزین لاہور میں چھپتے رہتے ہیں، آج کل وہ "اردو کی نثر جدید" پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جس میں ان نثر نگاروں کے سوانح حیات اور زبان و بیان کی خصوصیتوں کے بجائے اُن کے خاص خیالات و تصورات سے بحث کی ہے، تاکہ اس طریق سے اس دور کی ذہنی کیفیت نظروں کے سامنے آجائے،

اسی سلسلہ میں حضرت الاستاذ علامہ شبلی نعمانی کا ذکر قدرتی طور پر مفصل و مشرح کیا گیا ہے کیونکہ بقول مضمون نگار موصوف "وہی درحقیقت اس وقت کی بیدار اسلامی سوسائٹی کے ترجمان ہیں" مضمون کتاب مذکور کے شبلی کے باب کا ایک جزو ہے"،

"س"

شبلی کے نزدیک تاریخ کی تعریف یہ ہے، جو بظاہر کسی یورپ کے مصنف سے لی گئی ہے:-

"فطرت کے واقعات نے انسان کے حالات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں، اور انسان نے عالم فطرت پر جو اثر ڈالا ہے، ان دونوں کے مجموعہ کا نام تاریخ ہے" یا "ان واقعات او حالات کا پتہ چلانا جن سے یہ دریافت ہو، کہ موجودہ زمانہ گذشتہ زمانہ سے کیونکر بطور نتیجہ پیدا ہوا"[1]

[1] الفاروق جلد اص ۱۰ (کانپور اڈیشن ۱۸۹۹ء)

تاریخ کیسے پیدا ہوتی ہے،؟ اس کا تعلق اجتماعِ انسانی سے ہے، جہاں کہیں انسان موجود ہوتے ہیں، اپنی تاریخ خود بناتے جاتے ہیں، وہ اپنی مجالس میں گرمیِ محفل کے لئے اپنے بزرگوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے حالات و واقعات کا کچھ نہ کچھ ذخیرہ زبانی یا تحریری شکل میں موجود ہوتا ہے نسلی اور نسبی فخر و ترجیح کا جذبہ بھی اس کا محرک ہوتا ہے، اور یہی تاریخ و تذکرہ کی بنیاد ہے،

دیگر علوم و فنون کی طرح تاریخ کا ہیولیٰ بھی پہلے سے موجود ہوتا ہے، جب انسانی گروہ زیادہ متمدن ہوجاتے ہیں، تو وہی ابتدائی غیر منظم عناصر ایک قالب اختیار کر لیتے ہیں، اس کے بعد قومیں اس سرمایۂ تاریخی کو اپنے نسلی خصوصیات کو برقرار رکھنے کیلئے محفوظ کر لیتی ہیں، کیونکہ وہ تاریخ ہی قومی جوش کو زندہ رکھ سکتی ہے، اگر یہ نہیں تو قوم قوم نہیں[1]

عرب میں جو اسلام کا سرچشمہ ہے، تاریخ اور علم انساب کو علوم کی باقاعدہ تدوین سے پہلے بھی بہت پسند کیا جاتا تھا، انساب ایام العرب (یعنی عرب کی مشہور لڑائیوں کے واقعات) اور جاہلیت کی شاعری یہی تین عناصر قدیم تاریخ کی بنیاد کا درجہ رکھتے ہیں، عرب میں جب تصنیف و تالیف کا رواج ہوا، تو سب سے پہلے تاریخی تصنیفات لکھی گئیں[2] اس کے بعد یہ ذخیرہ دن بدن بڑھتا گیا، اور اب یہ حالت ہے، کہ علوم اسلامیہ میں تاریخی تصانیف کا شمار نصف سے زیادہ ہوگا، اور آج بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے، کہ "ہمارے لٹریچر کا ہر جملہ گویا قومی تاریخ کا ایک مختصر سا متن ہے"،

قدما اور متاخرین، اسلام کی تاریخ کا روشن زمانہ پانچویں صدی تک قائم رہا، اس کے بعد متاخرین کا دور شروع ہوتا ہے، ان لوگوں نے قدیم مورخین کی اکثر خصوصیات کھو دیں، مثلاً یہ کہ انھوں نے بجائے "اوریجنل" تصانیف کے پرانی کتابوں کے خلاصے کرنے شروع کر دیئے، اور اس اختصار کے دوران میں انھوں نے واقعات کی روح کو حذف کر دیا۔

اسلامی تاریخ میں روایات کا سلسلہ صحت اور سچائی کو پرکھنے کے لئے ایک عجیب و غریب اور عمدہ

---

[1] المامون جلد اص ۴ (افضل المطابع دہلی ۱۸۸۹ء) [2] الفاروق جلد اص ۳،

معیار تھا، پچھلے مورخین نے یہ طریقہ سند بہ سند بات بیان کرنے کا بالکل ترک کر دیا، اس سے علاوہ صحت کو نقصان پہونچنے کے بہت سی سوانحی جزئیات معدوم ہوگئیں، پرانی کتابوں میں تمدن اور معاشرت کے جو حالات ملتے ہیں وہ ان لوگوں نے چھوڑ دیئے، جس سے اسلامی تاریخ کے رجحان کو بہت نقصان ہوا، اب ہماری تاریخیں محض واقعات کی فہرستیں ہیں،

اسلامی تاریخ میں سچائی کے عناصر | اسلامی تاریخ میں قدرتی طور پر حضرت رسول کریم صلعم کی زندگی اور ان کی تاریخ کو سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے، کیونکہ "جامعیت کبریٰ" کا جو وصف آنحضرت صلعم کی ذات میں پایا جاتا ہو، وہ شاید کسی اور انسان میں نہ پایا جا سکے، یہی وجہ ہے کہ دنیا میں صرف آپ ہی کی ذات تھی جن کا کارنامۂ زندگی اس طرح قلمبند ہوا کہ ایک طرف تو صحت کا یہ انتظام تھا کہ کسی صحیفۂ آسمانی کے لئے بھی نہ ہو سکا، اور دوسری طرف وسعت اور تفصیل کے لحاظ سے یہ حالت ہو کہ اقوال و افعال، وضع و قطع، شکل و شباہت، رفتار و گفتار، مذاق طبیعت، انداز گفتگو، طرز زندگی، طریق معاشرت، وغیرہ ایک ایک ادا محفوظ رہ گئی[1]

آپ کی لائف کے تین ماخذ ہیں حدیث سیرت مغازی، ان میں باعتبار صحت حدیث کا درجہ سب سے بلند ہے، سیرۃ ایک جداگانہ فن ہے، اس کی روایتیں حدیث سے کمتر درجہ کی ہوتی ہیں، مغازی بھی جو آنحضرت صلعم کی لائف کی ابتدائی کتابوں کا نام ہے حدیث سے کم درجہ کی چیز ہے،

بہر حال آپ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئیں، انہی کے انداز پر عام تاریخ کی کتابوں کی تالیف کا رواج بھی ہوگیا، اور رفتہ رفتہ حدیث، سیرت مغازی اور تاریخ جدا جدا اور مستقل فن بن گئے،

گذشتہ بیان سے معلوم ہوگیا ہوگا، کہ اسلامی تاریخ کا ابتدائی طرز کس قدر محتاط اصولوں پر رکھا گیا تھا، ایک مسلمان کو آنحضرت صلعم کی ذات سے جتنی محبت ہو سکتی تھی، اسی پیمانۂ محبت کے مطابق آپ کے حالات کی صحت میں احتیاط برتی گئی، پھر یہی اصول عام اسلامی تاریخ کے لئے معمول بہ ہوگیا، جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی

[1] سیرۃ النبی جلد ا ص ۳ (دار المصنفین مختصر ایڈیشن)

تاریخ میں صداقت اور سچائی کی تلاش کو کیا درجہ حاصل تھا؟

تعیین صحت کے اصول — وہ اصول جو تاریخی واقعات کی چھان بین اور ان کی صحت کو معین کرنے کے لئے وضع کئے گئے، ان کا مختصر حال یہ ہے،

۱۔ سب سے پہلے روایت یعنی جو واقعہ بیان کیا جائے، اس شخص کی زبان سے ظاہر کیا جائے، جو خود شریک واقعہ تھا، اور اگر خود شریک نہ تھا، تو اسے یہ معلوم ہونا چاہیئے، کہ اصل واقعہ تک کون کون سے لوگ اس روایت کو بیان کرتے ہیں[1] اگرچہ یہ اصول دراصل حدیث کے لئے مخصوص ہے لیکن فن تاریخ بھی اس کے فیض سے محروم نہ رہا[2] شبلی کہتے ہیں، یورپ بایں ہمہ کمال "اس خاص امر میں مسلمانوں موٗرخوں سے بہت پیچھے ہے[3] بلکہ وہ حقیقت میں اس فن سے آشنا ہی نہیں،

۲۔ موٗرخ کے لئے ضروری ہے، کہ وہ جو واقعہ لکھے اسکے متعلق یہ اطمینان کرے کہ عقلی شہادت کے مطابق بھی ہے یا نہیں، آنحضرت صلعم کی سیرت کے سلسلہ میں اس چیز کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا لیکن بعض بعض صورتوں میں جب کہ روایت مستند اور ناقابل تردید ہو، تو گو وہ بظاہر اصول درایت کے مخالف بھی ہو، مستند سمجھا جائیگا شبلی کہتے ہیں، کہ "عام تاریخ میں اس فن کو جتنی ترقی ہونی چاہیئے تھی، اتنی نہیں ہوئی"

اصول درایت کے معاملہ میں اس امر کو خاص اہمیت دی گئی ہے کہ کوئی بات محسوسات، اصول مسلمۂ عقل اور مشاہدہ کے خلاف نہ ہو، نیز یہ بھی دیکھا جاتا ہے، کہ اس میں تاریخی تناقض، وقت اور مکان میں تفاوت اشخاص متعلقہ میں التباس کا شائبہ تک نہ ہو، واقعہ بذات خود، وزنی ذی قیمت اور قرین قیاس ہو، اور اندرونی تحریکات ایک دوسرے کے مخالف نہ ہوں '

اس بحث سے یہ بخوبی واضح ہو گیا ہوگا، کہ اسلامی تاریخ میں سچائی کی تلاش کیا درجہ رکھتی تھی، اور صداقت کا عنصر کہاں تک موجود تھا!

---

[1] سیرۃ النبی جلد اص ۲۵ [2] الفاروق جلد اص ۱۴، [3] ۵۳ رر

لیکن رفتہ رفتہ یہ خوبیاں معدوم ہوتی گئیں، اور ان کی جگہ وہ خرابیاں داخل ہوتی گئیں، جن کا ذکر گذشتہ سطور میں آچکا ہے، آٹھویں صدی ہجری میں علامہ ابن خلدون نے تاریخ کو ایک اور نقطۂ نگاہ سے دیکھا اور اجتماعِ انسانی کی منظم تحریکات کو تاریخ کی بنیاد اور غرض وغایت قرار دیا، نیز تاریخ پر طبعی اثرات کا سراغ لگایا، اس کے علاوہ یہ بھی ثابت کیا، کہ ہر تہذیب وتمدن کا ایک دور ہوتا ہے، جو کم وبیش ۱۲۰ سال تک قائم رہتا ہے، اسی طرح علامہ مقریزی نے اپنی تاریخ مصر میں تمدنی جزئیات کو شامل کرکے تاریخ کو محض واقعات شماری کے درجے سے بلند کرکے اس کو انسانی تہذیب کی تاریخ کے رتبہ تک پہونچادیا،

اسلامی تاریخ کے نقائص: شبلی نے اسلامی تاریخ کی خامیوں کا ذکر موقع بموقع کیا ہے اور بتایا ہے کہ آہستہ آہستہ تاریخ صحیح روش سے ہٹ گئی، اور کیوں، ؟

اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس پر "دور انحطاط" کا اثر زیادہ ہے، اس میں بادشاہوں اور امیروں کی خارجی زندگی کو زیادہ وقعت دی گئی ہے، سوشل، انتظامی، تمدنی، اور ذہنی جزئیات تقریباً مفقود ہیں، انقلابات سیاسی کے اندرونی اسباب اور ان کے ارتقار ([illegible]) پر بحث نہیں کیجاتی حالانکہ "تاریخ عالم کا ہر واقعہ بہت سے مختلف واقعات کے سلسلے میں بندھا ہے، ان ریشہ دوانیوں کا پتہ چلانا، اور ان سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ تاریخی نتائج کا مستنبط کرنا بھی ایک چیز ہے، جو علم تاریخ کی جان ہے اور یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع وایجاد پر ناز ہے، وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے"[1] غرض ہماری تاریخ تہذیب وتمدن کی تاریخ نہیں، بلکہ محض سیاسی واقعات کا ایک خاکہ ہے، اس پر زیادہ ظلم یہ ہوا کہ بعض مورخین نے اپنی کتابوں میں واقعات کا اندراج باعتبار سنین کیا ہے، جس سے ایک ایک واقعہ جو مسلسل تھا، کٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہے، اسی طرح کے اور بھی کچھ نقائص ہیں جو آنحضرت صلعم کی سیرت کی کتابوں میں بھی موجود ہیں،

ان نقائص کے اسباب کی طویل بحث کا خلاصہ[2] یہ ہے کہ ایشیائی تاریخ پر شخصی سلطنت کا اثر زیادہ پڑا

---

[1] المامون جلد ا ص ۶، ۷، [2] الفاروق جلد ا ص ۱۱ و مابعد،

نتیجہ ہوا کہ شاہی عظمت و جلال کی تصویر زیادہ آب و تاب کے ساتھ کھینچی گئی، آئین کا بیان کرنا اس لئے غیر ضروری ٹھہرا کہ خود بادشاہ کی زبان ہی قانون تھی، سبب کے تلاش کرنے کی طرف اس لئے توجہ نہ کی گئی، کہ مورخین فلسفۂ تاریخ سے آشنا نہ تھے، اسلئے فلسفۂ تاریخی کے اصول و نتائج پر ان کی نظر نہ پڑ سکتی تھی، علامہ ابن خلدون اس معاملہ میں سب سے منفرد ہیں، لیکن "انھوں نے بھی اپنی تاریخ میں ان اصول پر عمل نہیں کیا[1] مورخین ان علوم سے ناواقف تھے، جن کا تعلق فن جنگ، انتظام سلطنت، قانون و دیگر شعبہائے سیاست سے تھا، مورخ اگر ان تمام علوم کا ماہر ہو، تو واقعات کو علمی حیثیت سے دیکھ سکتا ہے، ورنہ اس کی نظر اس قسم کی سطحی اور سرسری ہوگی جیسی کہ ایک عام آدمی کی ہو سکتی ہے"[2]

فن سیرت یعنی آنحضرت صلعم کی لائف کے سلسلے میں بھی اسی قسم کی غلطیاں کی گئی ہیں، مثلاً اس کا ایک حصہ مغازی کے نام سے موسوم ہوا جس میں محض عہد رسالت کی لڑائیوں کے حالات ہیں، حالانکہ "یہ طریقہ سوانح نگار نبوت کے لئے موزوں نہ تھا" کہ یہ سکندر کی لائف نہیں، بلکہ پیغمبر صلعم کی سیرت تھی،[3]

شبلی کے اصول تاریخ شبلی کی اس تنقید تاریخ کے بعد جو چیز سب سے زیادہ سمجھنے کے قابل ہے وہ یہ ہے کہ کہ شبلی نے اسلامی تاریخ کی ان خوبیوں کو کس طرح چمکایا، اس کے نقائص کو رفع کرنے کے لئے کیا اصول پیش کئے، اس اصلاح میں مشرق سے کہاں تک لیا، اور مغرب کا کس حد تک رہین احسان ہونا پڑا، اور مورخین یورپ کی (جو عام تاریخ دانوں اور اسلامی مورخوں پر مشتمل ہیں،) کس پیرایہ میں تنقید کی ہے،؟

شبلی نے جب المامون لکھی تو دیباچہ نگاری کے فرائض سرسید احمد خان نے انجام دیئے، سید صاحب کے نزدیک بھی تاریخ کے لئے ضروری ہے، کہ اس میں صرف واقعات ہی کا ذکر نہ ہو، بلکہ واقعات کے اسباب پر بھی بحث ہو، اور سوشل اور کلچرل تفصیلات بھی ہوں، اور سیاسی تاریخ کے ساتھ ساتھ علمی اور ذہنی ترقیوں کا حال بھی درج کیا جائے،[4]

---

[1] الفاروق جلد ا ص ۱۱ و مابعد [2] ایضاً، جلد ا ص ۱۲ [3] سیرۃ النبی جلد ا ص ۱۹، [4] دیباچہ المامون جلد ا ص ۳،

درحقیقت سید صاحب نے جن امور کی طرف اشارہ کردیا تو شبلی کے اصلاحی اصول بھی کم و بیش یہی ہیں، اس امر کے اعتراف میں کسے کلام ہوگا، کہ مورخ شبلی کی تنقید کا انداز فلسفیانہ ہے، سرسید نے جو باتیں عام معلومات کی بنا پر کہیں ان پر شبلی کی آشنائی فن نے عالمانہ رنگ چڑھایا ہے،

۱۔ شبلی کے نزدیک تاریخ کا سب سے بڑا اصول یہ ہے، کہ تاریخ صرف سیاسی امور پر مشتمل نہ ہو، بلکہ انسانی تہذیب و تمدن کی سرگذشت بھی ہو، جس میں اجتماعات انسانی کی معاشرت اخلاق، عادات، مذہب و دیگر علمی و دینی و تمدنی مشاغل کے متعلق معلومات کا سرمایہ جمع ہو[1] کسی غیر قوم کا کسی غیر ملک پر قبضہ کرنا کوئی جرم نہیں، ورنہ دنیا میں سب سے بڑے فاتح سب سے زیادہ مجرم ہوں گے، دیکھنا یہ چاہئے کہ فاتح قوم نے ملک کی تہذیب و تمدن پر کیا اثر پیدا کیا[2] ایشیائی اقوام بلکہ آج سے دو سو سال قبل خود یورپ کی اقوام کے نزدیک کسی سلطنت کی عظمت شان یا پستی و تنزل کا اندازہ ہمیشہ فتوحات ملکی اور فوجی طاقت سے کیا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ مورخین کی زیادہ توجہ فتوحات کی طرف مبذول رہی لیکن اس طریقہ سے انسانی تہذیب و معاشرت کے بہت سے روایات اور نشانات و آثار مٹ گئے جدید مورخین کے لئے ضروری ہو کہ وہ رزم و پیکار کی داستانوں کے اندر انسانی معاشرت اور کلچر کی یادگاروں کو تلاش کریں اور جہاں تاریخ اس معاملہ میں مدد نہ دیتی ہو، وہاں دوسری متعلقہ کتابوں سے ایسی جزئیات کو مہیا کیا جائے، جو اس کمی کو پورا کردیں،

۲۔ سبب اور مسبب یعنی (Cause) کا سلسلہ تلاش کیا جائے[3] جس کے بغیر کوئی واقعہ اپنی پوری حالت میں ہماری آنکھوں کے سامنے نہیں آسکتا کیونکہ ایک واقعہ واقعات گذشتہ کی مسلسل کڑیوں کا آخری نتیجہ ہوتا ہے، مثلاً یہ کہ کیونکر چند صحرا نشینوں نے ایک دنیا طاقتور حکومتوں کے ہاتھوں سے چھین لی؟ اس عظیم الشان تاریخی حقیقت کے اسباب مادی و روحانی کا تلاش کرنا، اس واقعہ کی صحیح نوعیت پر روشنی ڈالے گا، یا مثلاً یہ کہ بنو ہاشم کے ہوتے ہوئے کیوں غیر بنو ہاشم خلافت پر قابض ہوگئے،؟ وغیرہ وغیرہ، یہی کاوش تاریخی حقائق کی

---

[1] الفاروق جلد ۱ ص ۱۱ [2] مقالات ص ۹۰، [3] رسائل ص ۱، [4] الفاروق جلد ۱ ص ۱۱

نقاب کشائی کرسکتی ہے،!

غرض شبلی کو سب سے زیادہ اصرار اسی بات پر ہے، کہ تمام تاریخ کو فلسفہ اجتماعی کی نگاہ سے دیکھا جائے

۳۔ اگرچہ "ارتقاء" (Evolution) کے نام سے "ارتقاے نوعی" کے مفہوم کو ایک طرح کی خصوصیت حاصل ہوگئی ہے، لیکن اس مسئلہ کو جو عالمگیر حیثیت گذشتہ ایک صدی سے مل گئی ہے، اس کا ایک ثبوت یہ ہے جسکو ہم آگے چل کر ذکر کریں گے، کہ اس اصول کو سائنس کی حدود سے نکل کر اب تاریخ پر بھی منطبق کیا جاتا ہے، شبلی نے اپنی تاریخ میں اس اصول کو اکثر موقعوں پر استعمال کیا ہے، وہ نہ صرف اس خاص معاملہ میں اس مسئلہ کی صحت کے قائل تھے، بلکہ انسان کے "ارتقاے نوعی" کے بعض اجزار کو بھی درست مانتے تھے،

۴۔ شبلی نے اپنی کتابوں میں جابجا "طبعی اور دیگر بیرونی اثرات" کا سُراغ لگانے کی کوشش کی ہے، شبلی کے نزدیک "احول" کا بیان فلسفہ تاریخی کی تکمیل کیلئے بیحد ضروری ہے،

۵۔ تاریخ کی تنقید کے لئے ضروری ہے کہ واقعات کو عقل اور قیاس کے ترازو پر تولا جائے، اس میں شبہہ نہیں کہ یہ اسلامی تاریخ کا اصول مسلّمہ ہے، لیکن تنزل کے زمانہ کے مورخین نے اس اصول کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا، شبلی نے اس اصول پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، اور مورخین کے لئے اس پر عمل کرنا ضروری قرار دیا ہے،

۶۔ تمدنی خصوصیات کی بنا پر تاریخی ادوار مقرر کئے، ہر دور کی تنقید کے لئے یہ دیکھنا ضروری قرار دیا کہ اس "زمانہ کا مذاق کیا تھا" مورخ کا فرض ہے، کہ ماضی کے معاملہ میں اس اصول کا خاص خیال رکھے،

۷۔ شبلی کے نزدیک "ناموروں" اور "ہیروز" کی تاریخ پوری تاریخ کی قائم مقامی کرسکتی ہے، ان کا "سلسلہ ناموران اسلام" بھی اسی امر کی طرف دلالت کرتا ہے،

۸۔ تاریخ کا زاویۂ نگاہ بین الاقوامی ہونا چاہئے، اسلام کی بین الملی حیثیت اس خیال کو تقویت دیتی ہے،

۹۔ تاریخ میں "صداقت" کا پاس رکھنا ایک ضروری فرض ہے، اور افراد کی تاریخ میں خوبیوں کیساتھ انسانی کمزوریوں کا ذکر بھی سوانح نگار کیلئے ضروری ہے،

۱۰۔ صداقت کو قائم رکھنے کے لئے سند اور حوالہ کا ہونا ضروری ہے،

۱۱۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے سلسلے میں حدیث کا سرمایہ مستند ترین ماخذ ہے، اور دوسرے ماخذ ثانوی درجہ رکھتے ہیں،

۱۲۔ جہاں شبلی نے مناظرانہ فرائض انجام دیئے ہیں، وہاں اسلامی تاریخ کا یورپ کی موجودہ اقوام سے اکثر موازنہ کیا ہے، اور گذشتہ حالات کا یورپ کی موجودہ اور قدیم تہذیب سے مقابلہ کیا ہے،

۱۳۔ شبلی کے نزدیک "تاریخ شعبۂ ادبیات سے نکل کر سائنس کے درجے پر پہونچ چکی ہے، اس کا اسلوب تحریر سادہ اور واقعیت سے لبریز ہونا چاہئے، انشاء پردازی تاریخ کا ضروری وصف نہیں، اگرچہ اس کے حسن کو نمایاں کرنے کے لئے انشاء پردازی کام آسکتی ہے،

شبلی کے تصور تاریخ کا تجزیہ مندرجۂ بالا مباحث کو پڑھ کر یہ فیصلہ کرنا آسان ہے کہ شبلی ایک خاص تاریخی تصور رکھتے تھے، جس کو انھوں نے اسلامی تاریخ کی تنقید اور احیاء میں اپنے سامنے رکھا، اس تصور کی ترکیب جن اجزاء سے ہوئی ہے، اس میں خالص اسلامی اثرات بھی ہیں، اور مغربی اثرات بھی، جن کا یہاں مختصراً تجزیہ کیا جاتا ہے،

اسلامی ماخذ۔ روایت، روایت، شہادت، اور تنقید روایت اسلامی تاریخ کا وہ درخشاں کارنامہ ہے جس تک یورپ کی رسائی نہیں ہوئی، علماء اسلام نے اس شعبہ کو ترقی دینے کے لئے جو جانفشانیاں کی ہیں، ان کا مجمل ذکر اس سے پہلے آچکا ہے، ہمارا مورخ شبلی اس اسلامی ورثہ پر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے،

درایت اسی طرح روایات اور واقعات کو عقل کی روشنی میں دیکھنے کا اصول بھی خالص اسلامی اصول ہے، اور اس وقت سے رائج ہے، جب کہ یورپ کے عیسائی مورخ "اپنے بزرگوں کی کرامتوں اور خوارق[1] کے ذکر ہی کو تاریخ نویسی کا کمال سمجھتے تھے" انکے نزدیک ازمنۂ ماضی کی تاریخ بلکہ کل تاریخ کا سارا سرمایہ یونان[2] سے متعلق تھا

[1] Encyclopaedia of Social Sciences "History"

[2] Encyclopaedia Brittanica (14Th ed) "History"

ان کا خیال تھا، کہ مذہبی معاملات میں عقل سے کام لینا جرم ہے،

فلسفہ تاریخ — فلسفہ تاریخ کی بنیاد علامہ ابن خلدون (۱۳۳۲ء تا ۱۴۰۶ء) نے رکھی اس نے دنیا میں پہلی بار تاریخ کے لئے سائنٹفک اصول وضع کئے، اور اس کو انسانی ترقی و تہذیب کی سرگذشت قرار دیتے ہوئے اس پر ماحول کے اثرات اور طبعی اور معاشرتی اسباب کا اثر ثابت کیا[1]

ابن خلدون کے فلسفہ کے اہم نکات یہ ہیں:-

تاریخ کی تنقید کے لئے سب سے زیادہ قابل توجہ سوال یہ ہے؟ کہ واقعہ زیر بحث ممکن بھی ہے، یا نہیں؟ اس کا جواب عقل انسانی اور تجربہ دے سکتے ہیں، واقعات چونکہ محض اتفاقی نہیں ہوتے، اس لئے ان کے اندرونی اسباب کو دریافت کرنا ضروری ہے، ورنہ ہو سکتا ہے، کہ مورخ اصل حقیقت سے بے خبر رہ جائے، دنیا[3] میں ہر چیز ترقی اور تنزل کے اصول کی پابند ہے، تاریخ بھی اس عالمگیر قانون سے آزاد نہیں، طبعی حالات معاشرت انسانی پر نہایت گہرا اثر ڈالتے ہیں، اور اسلامی ممالک کے حالات پر علامہ نے اس اصول کو منطبق بھی کیا ہو، طبقات انسانی دو گروہوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں، تہذیب یافتہ شہری اور ناتربیت یافتہ بدوی، اقوام کی زندگی میں دو عناصر ایسے ہیں جو اکثر محرک عمل ثابت ہوتے ہیں، عصبیت اور مذہب، موخر الذکر کا اثر نسبتہً کم ہوتا ہے، اقوام میں جس قدر عصبیت اور بدویت ہوگی، اسی قدر اس میں زندگی کے جوہر زیادہ ہوں گے، ہر قوم کا عروج کم و بیش ۱۲۰ سال ہوتا ہے اسکے بعد وہ سرمایہ حیات کھو بیٹھتی ہے، اس عروج و زوال کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہوتا[2]

افسوس ہو کہ اس عظیم الشان فلسفہ تاریخ کو ترقی دینے اور بڑھانے کی کوئی کوشش اسلامی ممالک میں نہیں ہوئی، البتہ یورپ کے جدید مورخین مثلاً مشیا فلی، وکو، اور گبن کو ابن خلدون کا صحیح جانشین کہا جا سکتا ہے[3]

---

[1] Encyclopaedia of Social Sciences "History"

[2] Nicholson, Literary History of the Arabs, P. 437 Seq.

[3] ایضاً نکلسن نیز Hint, Philosophy of History vol. P. 18-171

شبلی نے اس نامور فلسفی کا ذکر اپنی کتابوں میں بہت سے موقعوں پر کیا ہے[1] اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے مورخ نے اپنے اس جلیل القدر پیشرو کے تاریخی اصولوں پر ان کو "اپنا ہی ورثہ" خیال کرتے ہوئے اپنی کتابوں میں عمل کیا ہے، اگرچہ اس انمول پونجی کی طرف رہنمائی کا سہرا مورخین یورپ کے سر ہے جنہوں نے اپنے مسلمان پیشرووں کی وراثت پر دو صدی سے "قبضہ مخالفانہ" کر رکھا تھا،

راقم کو شبلی کی تصانیف میں ابن خلدون کے فلسفہ کے اس پہلو کا کہیں پتہ نہیں چلا، جو طبقات انسانی کی تقسیم دوگانہ یا اقوام کی عمر سے متعلق ہے لیکن اور دوسرے اجزاء کا اثر تاریخ کے صفحہ صفحہ پر دکھائی دیتا ہے (باقی)

اعلان

ہندی اور اردو میں مختلف علوم پر تحقیق کیساتھ لیکن دلچسپ پیرایہ اور آسان طرز میں لکھی ہوئی کتابوں کی ضرورت تھی ہندوستانی اکیڈمی نے اس مقصد کو پورا کرنیکی غرض سے انگریزی کی مشہور "ہوم یونیورسٹی لائبریری" کے نمونے پر کتابوں کا سلسلہ طبع کرنیکا ارادہ کیا ہے، اس سلسلے کی ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ رکھی گئی ہے، کتاب کا حجم دو سو صفحات ہوگا، اور تقطیع ڈبل کراؤن سولہ پیجی، ہر سال چھ کتابیں مندرجۂ ذیل مضامین پر شائع ہوں گی :-

پہلے سال (۱) کیمیا کے کرشمے (۲) ہندوستان کا دستور (۳) تہذیب و تمدن کی تاریخ (۴) علم النفس (۵) مالیات (۶) ملکوں کا بیان (یورپ کا کوئی ملک) دوسرے سال (۱) ارتقاء (۲) تاریخ ازدواج (۳) ملکوں کا بیان (کوئی ایشیائی ملک) (۴) تجارت بین الاقوامی (۵) اثریات (۶) سوانحعمری (کوئی عظیم الشان شخص) تیسرے سال (۱) برقیات کے کرشمے، (۲) ملکوں کا بیان (امریکا کا کوئی ملک) (۳) مذہب (۴) علم الانسان (۵) بیمہ، (۶) سوانح عمری (کوئی عظیم الشان شخص)

اس سلسلے کا آغاز ہو چکا ہے، دو کتابیں (۱) ہندوستان کا نیا دور حکومت "از پنڈت کشن پرشاد کول اردو میں" (۲) "ناچ" سوا از سری پت بھگوان داس کیلا ہندی میں شائع ہو چکی ہیں، ہندی اور اردو مصنفین جو اس سلسلے میں قلمی شرکت کرنا چاہتے ہوں جنرل سکریٹری سے خط و کتابت کرکے مزید تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں،

تارا چند جنرل سکریٹری ہندوستانی اکیڈمی، یو، پی، الہ آباد،

[1] الفاروق جلد اص ۱۲ تا ۱۴

عہدِ وسطیٰ کی تاریخِ مصر پر ایک نظر

از

جناب محمد جمیل الرحمٰن صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(۲)

یزید بن عبد اللہ کے بعد احمد بن طولون بطور نائب امیر مصر پہونچا، اور اس نے ملک میں تقریباً نیم خود مختارانہ حیثیت اختیار کرلی، اس کا خاندان ۲۹۲ھ (۹۰۴ء) تک مصر پر حکمران رہا، آل طولون سے تاریخ مصر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اس لئے مناسب ہے کہ ہم گذشتہ دور پر یہاں ایک نظر ڈالین، اور جو کچھ اب تک ہو چکا تھا اسے معلوم کرنے کی کوشش کرین،

آل طولون سے قبل مصر میں دو زبردست تبدیلیاں ہوئیں، ایک یہ کہ ملک میں عربیت پھیلی، اور دوسرے اکثر اہل مصر نے اسلام قبول کرلیا، اور اس کا سلسلہ مملوکوں کے عہد تک برابر جاری رہا، یہان یہ یاد رکھنا چاہئے کہ عربیت اور اسلام کو ایک ہی چیز نہ سمجھ لیا جائے جیسا کہ مصر میں ان دونون کے اثرات مختلف تھے، چنانچہ جو مصری فتح اسلامی کے بعد اپنے مذہب پر قائم رہے، انھون نے بھی جلدی فاتحین کی زبان اور معاشرت اختیار کرلی تھی یہانتک کہ چوتھی صدی ہجری (دسوین صدی عیسوی) میں یہ حالت ہوگئی تھی، کہ قبطی مذہبی پیشوا اپنی تعلیمات کو عوام تک پہونچانے کے لئے اس پر مجبور ہوگئے تھے، کہ اپنی کتابیں بجائے قبطی کے عربی میں لکھیں، مصر کا صدر مقام فسطاط ملک میں قدرتی طور پر عربوں کا مرکز تھا، اس کے علاوہ مختلف صوبوں میں جہان عوام کی زبان قبطی تھی عرب فوجیں اور افسر مقرر تھے، لیکن ان باتوں نے عربیت پھیلانے میں کوئی مدد نہیں کی، اس لئے کہ نہ تو اہل فسطاط

کا اثر شہر کے باہر پڑتا تھا اور نہ ان افسران بالا نے عربیت پھیلانے کی طرف خاص توجہ کی، تقریباً ۸۶ھ (۷۰۵ء) میں دفتری زبان مصر میں عربی قرار پائی، لیکن عملاً دوسری صدی ہجری (آٹھویں صدی عیسوی) کے آغاز تک عربی اور قبطی دونوں زبانیں دفتروں میں رائج رہیں، مگر تبدیلی کا اثر مشکل سے آبادی کے ایک فی صدی حصہ پر پڑا، جب ان تمام باتوں نے عربیت پھیلانے میں مدد نہیں دی، تو قدرۃً سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ پھر مصر میں اسقدر جلد اور اس قدر مستقل عربیت کا عروج کیسے ہوا کہ آج کل بھی مصر عربی تہذیب و تمدن کا بجا طور سے مرکز سمجھا جاتا ہے۔

عربیت کو مصر میں وہی جگہ مل گئی، جو اس سے پہلے یونانیت کو حاصل تھی بلکہ ایک لحاظ سے یہاں تک کہنا چاہیے کہ یونانیت کو بھی وہ جگہ کبھی حاصل نہ ہوئی تھی، جو عربیت نے اپنے لئے مصر میں بنالی، اس کی وجہ یہ ہے کہ یونانی تہذیب ایک شہری تہذیب تھی، اس لئے اس کے معاشرتی اثرات شہروں ہی تک محدود رہے، اور وہاں بھی صرف ان لوگوں نے اسے اختیار کیا جنھیں یونانیوں سے میل جول کا زیادہ موقع ملا، اس لئے اولاً عوام تک اس تہذیب کے اثرات پہونچے ہی نہیں، اور جن لوگوں تک پہونچے اونھوں نے بھی سطحی طور سے اسے قبول کیا، اس لئے اس تہذیب کے بھلا دینے میں بھی دیر نہ لگی، اسی قسم کی دوسری مثال افریقہ کی ہے، یہاں درحقیقت یونانیوں کا قبضہ صرف ساحل بحر تک محدود تھا، اندرونی سرزمین سے یونانی بےخبر اور بے پروا تھے، ساحل بحر تک قبضہ بھی محض اس وجہ سے تھا، کہ بحیرۂ روم میں اپنی بحری قوت کی حفاظت کر سکیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی فتح کے بعد یونانی تہذیب کے اثرات مٹنے میں دیر نہ لگی، اور عربیت نے ان ممالک میں ایسا گھر کیا کہ وہ اب تک عربی تہذیب کے نمایندہ سمجھے جاتے ہیں، اس کے برعکس عربوں کا تمدن شہری نہیں تھا، بلکہ دیہاتی تھا، عرب فطرۃً خانہ بدوش واقع ہوئے ہیں، اور عام طور پر شہروں میں بود و باش پسند نہیں کرتے شہری پابندیوں کی وجہ سے اپنے آپ کو شہروں میں قیدی سمجھنے لگتے تھے[۱]، یہ ضرور ہے کہ شیوع اسلام کے بعد عربوں نے دمشق و مدینہ وغیرہ شہروں میں سکونت اختیار

[۱] معارف: یہ صحیح نہیں ہے، عربوں نے دور بداوت سے نکلتے ہی بڑے بڑے شہر کوفہ اور بصرہ وغیرہ آباد کئے جنکی تمامتر انھی کی آبادی تھی، دوسری قومیں خال خال تھیں،

کرلی تھی، اور اب انھیں شہری سمجھنا چاہئے، لیکن یہ لوگ بھی بے چین واقع ہوئے تھے، اور شہروں کو ایسی جگہ آباد کرتے تھے جہان چراگاہیں قریب ہوں، اور وہ اپنے وطن کی فضا پیدا کرسکیں، اس کی بہترین مثال قیروان کی ہے، اس شہر کی جائے وقوع اس لئے پسند کی گئی تھی، کہ چراگاہیں قریب تھیں، اور مویشی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوتی تھی[۱]، اسی وجہ سے مصر میں بھی عرب بجائے شہروں میں رہنے کے دیہات کی طرف متوجہ ہوئے، اور بیرونی صوبون میں ان کی نوآبادیان برابر بڑھتی چلی گئیں، مگر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو بدوی ابتدائی فاتح فوج کے ساتھ آئے تھے ان میں سے بہت کم ایک جگہ جم کر بسے، بہت ہی کم ایسا ہوا کہ کوئی قبیلہ بنی قیس کی طرح جو ۱۰۷ھ (۷۲۵ء) میں نقل مکان کرکے مصر آگیا تھا، کسی خاص تحریک کے تحت مصر آئے، بلکہ رفتہ رفتہ بغیر کسی اصول کے خانہ بدوش عربوں کی ٹکڑیاں مصر میں آتی رہیں، یہ چھوٹے اور بڑے قبائل دریائے نیل کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ متمدن علاقون کے قریب، مگر شہروں سے دور آہستہ آہستہ جنوب کی طرف پھیلتے گئے، ان کے بعد کاشتکارون کی جماعتین آئیں، کیونکہ اس سرسبز و شاداب ملک میں زراعت بہت ہی منفعت بخش تھی، اکثر و بیشتر ان کاشتکارون نے زمینوں پر بصلح و آشتی قبضہ کیا، لیکن ایک طرف تو بدووں کی بے چین طبیعت کی وجہ سے حکومت کے مالیات میں سخت گڑبڑ واقع ہوئی، اور دوسری طرف پرانے قبطی کاشتکار اپنی زمینوں سے بے دخل ہوئے، اور معاشی ابتری کا باعث بنے، لیکن یہ ابتری زیادہ زمانہ تک جاری نہ رہی، عرب کاشتکار بہت جلد راہ راست پر آگئے، ان ہی قبطیوں کے رسم و رواج اور ان کی ذاتی خوبیان سمجھنے میں دیر نہ لگی، اور اب قبطیوں میں عربون

---

[۱] ابن العذاری جلد ۱ ص ۱۲، ۱۳، کتاب الاستبصار فی عجائب الامصار ص ۴، **معارف**:- چراگاہوں کی قربت سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ عرب اس سے اپنے ملک کی فضا پیدا کرنا چاہتے تھے، بلکہ اس کا سبب جیسا کہ خود کتاب الاستبصار کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے بربر سے مویشیوں کی حفاظت تھی چنانچہ اس کا بیان ہے کہ

عقبہ بن نافع نے جب اس شہر کے بسانے کا ارادہ کیا، تو عام مسلمانوں نے کہا کہ اسکو ترائی سے قریب ہونا چاہئے تاکہ تمھارے مویشی شہر کے دروازے پر اپنی چراگاہوں میں بربر کی دست برد سے محفوظ رہیں (کتاب الاستبصار ص ۱۱۳)

کے خون کی زبردست آمیزش شروع ہوئی، جو آج تک جاری ہے، آج بھی سرحدی علاقہ کے بدو ویسے ہی بے چین ہیں، جیسے اس زمانہ میں تھے، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ نقل و حرکت اب ایک قومی خصوصیت بن گئی ہے اب بھی غیر ضروری زائد آبادی برابر سوڈان میں منتقل ہوتی رہتی ہے، اس نقل و حرکت کے بارے میں ابتدائی زمانے کے متعلق ہمارے معلومات بہت سطحی ہیں، لیکن اس کی تلافی زمانہ مابعد کے تفصیلی حالات سے ہو جاتی ہے، جو مقریزی کے خطط میں محفوظ ہیں۔[1] اس دوران میں پورے قبائل یا افراد بحیرۂ قلزم کو عبور کر کے مصر صعید کو آتے رہے، اس نقل و حرکت پر اب تک پوری طرح غور نہیں کیا گیا، اور نہ یہ بتایا جا سکتا ہے کہ اس کے اثرات کس قدر دور رس تھے، بہرحال یہ عجیب بات ہے کہ استرابونے مصر صعید کے شہر قفط کو نیم عربی شہر بتایا ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فتح کے قبل ہی یہ نقل و حرکت شروع ہو گئی تھی، اسلامی فتح کے بعد جب عرب اور مصر دونوں ایک حکومت کے تحت میں آگئے، تو لازمی طور پر قدیم تجارت اور تمدن کا راستہ اور بھی زیادہ کھل گیا، اور پہلے سے کہیں زیادہ تعداد میں عرب مصر آنے لگے، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ خانہ بدوش آوارہ گرد عرب قبائل تہذیب و تمدن کے بڑے علمبردار تھے، بلکہ وادی نیل کی قدیم آبادی میں یہ لوگ مل جل گئے، اور صرف ان کی زبان یعنی عربی باقی رہ گئی، نسلی اختلاط کا یہ عمل سب سے زیادہ اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے فلاحین اور عہد فراعنہ کے کسانوں میں نسلی اور اخلاقی مشابہت معلوم ہوتی ہے، بہرحال رفتہ رفتہ اطراف و اکناف کے رہنے والے قبطیوں نے مستقلاً عربی زبان اختیار کی، اور عربوں کے اوضاع و اطوار بھی ان کی زندگی کے جزو لاینفک بن گئے، مختصراً یوں سمجھنا چاہئے، کہ وادی نیل کی تہذیب عربوں کو اپنے میں ضم نہ کر سکی، بلکہ عربی تہذیب قدیم قبطی تمدن پر غالب آئی، اور اسکے نتائج ہم اپنی آنکھوں سے آج دیکھ رہے ہیں،

عربیت کی اشاعت کا ایک اور سبب بھی تھا، مصر صدیوں سے اجنبی حکومتوں کے ماتحت رہ چکا تھا ہر قسم کے مظالم اور مصائب سہتے سہتے قبطیوں کے احساسات کمزور ہو گئے تھے، قومی عصبیت کا جذبہ، جو ایران

[1] ج ۱ ص ۱۲۸،

میں ہمیشہ زندہ رہا، اور جس نے ایرانی تمدن کو کبھی مردہ نہ ہونے دیا، قبطیوں میں بالکل مرچکا تھا، چنانچہ بازنطینی حکومت کے تحت ان کے بعض افراد نے بلا پس وپیش یونانی تمدن اختیار کرلیا، لیکن بازنطینی ظلم وتشدد جس میں مذہبی اور معاشی دونوں شامل ہیں، اس تمدن کو دیرپا بنانے میں حائل ہوا، قبطیوں کو یونانیوں سے ہمیشہ نفرت رہی، اس کا اظہار مذہبی لحاظ سے اس طرح ہوا کہ بعض عقائد کو انھوں نے قومی اداروں کی شکل دیکر بازنطینی کے سرکاری عقائد سے انحراف کیا، اور یونانی تمدن کو اختیار کرنے سے بھی متنفر رہے۔ اس کے علاوہ وہ اسباب بھی تھے، جن کا ذکر ہم اوپر کرآئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یونانی تمدن عمومی شکل اختیار نہ کرسکا، اور زوال کے بعد بہت جلد مصر سے غائب ہوگیا، اور جب عرب فاتح مصر پہونچے تو قبطیوں نے ان کے اوضاع واطوار اور ان کی زبان اختیار کرنے میں بھی تامل نہ کیا، لیکن یہ تمدن یونانی تمدن کے برعکس مستقل تھا اس کے اسباب پر ہم اوپر تفصیل سے بحث کرآئے ہیں، اسکی ایک بہترین مثال شام وفلسطین بھی ہین، یہ ممالک بھی مدتوں سے غیروں کے ظلم وتشدد کے شکار رہے، اور یہان کے باشندوں نے بھی اسی وجہ سے قبطیون کی طرح نئے عربی تمدن کو بلا تامل اختیار کرلیا،

عربیت کی نشر واشاعت کیساتھ ساتھ قدرتی طور پر اسلام بھی قبطیوں میں پھیلا لیکن اس کے اسباب بالکل الگ تھے، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے، عربوں نے قبطیوں کو بازنطینیوں کے جبر وتشدد سے نجات دلائی تھی، اور ہم دیکھ چکے ہیں، کہ یہی مذہبی آزادی کی امید تھی، جس نے قبطیوں کو مسلمانوں کا طرفدار بنایا تھا، لیکن فتح کے بعد قبطی مسلمانوں کے اس احسان کو بھی بھول گئے، اور اسلام کے سخت مخالف ثابت ہوئے، فتح مصر کے وقت مصر میں دو کلیسا ایک دوسرے سے برسرپیکار تھے، ایک طرف یعقوبی کلیسا تھا جس کے عقائد قبطیون نے اختیار کرلئے تھے، دوسری طرف ملکی کلیسا جو بازنطینی سلطنت کا سرکاری مذہب تھا جسے منوانے پر یہ حکومت تلی ہوئی تھی، مقوقس اسی ملکی کلیسا کا نمایندہ تھا، عربی حکومت نے قدرتی طور پر حکومت کے عقائد کی مخالفت اور یعقوبی عقائد کی حمایت کی، یعقوبی عیسائیوں نے محسوس کیا کہ مذہبی آزادی کے باوجود

وہ اب ایک مطلق العنان حکومت کے تحت آگئے ہیں، اور اس نئے مذہب کے پیرؤں کو خوش رکھنا، ان کے لئے ضروری ہے، اس لئے یعقوبی فرقے کے عیسائی رفتہ رفتہ اسلام کے زیر اثر آتے گئے، دوسری طرف جب ملکی عقائد کے ماننے والون نے دیکھا کہ امن کی زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری ہے کہ نئی حکومت کو خوش کیا جائے، توان لوگوں نے بھی اپنی خانقاہوں اور گرجاؤں کو خیر باد کہا، اس موقع پر ایک امر بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے، بازنطینی حکومت اپنے مخالف یعقوبی کلیسا کے پیرو وں پر دگنا محصول عائد کرتی تھی، اب جب کہ مسلمانون نے یعقوبی عقائد کی سرپرستی شروع کی، توانھوں نے بھی یہی طریقہ برقرار رکھا، اور ملکی عیسائیوں پر دگنا جزیہ لگایا، اس سے بچنے کے لئے ملکی عیسائی یقیناً بڑی تعداد میں اسلام کے زیر سایہ آگئے ہوں گے، اس کے علاوہ اس میں بھی شک نہیں کہ بعض قبطی ایسے بھی ہوں گے جو نئے حکمرانوں کو اپنا نجات دہندہ سمجھ کر ان کے مذہب کی طرف راغب ہوگئے ہوں گے، اس لئے گو عام حالات سے پتہ چلتا ہے، کہ مسلمانوں نے ابتدائی دس برس میں اسلام کی تبلیغ واشاعت کی طرف خاص توجہ نہیں کی لیکن اس کے باوجود اس زمانہ میں بھی مسلمانون کی تعداد برابر بڑھتی چلی گئی، اس کے برعکس عرب حسب دستور قدیم برابر بطریک مقرر کرتے اور مذہبی معاملات میں اپنی رعایا کو آزاد چھوڑتے چلے آئے تھے، لیکن ذاتی طور سے بعض عمال نے وقتاً فوقتاً عربی اثرات پھیلانے کی کوشش کی، اسی ابتدائی زمانہ مین عربی حکومت کے اثرات اس طرح بھی ظاہر ہوے کہ ملک میں رہبانیت کی مخالفت شروع ہوئی، کیونکہ اس سے ملک کو بہترین کام کرنے والوں سے محروم ہوجانا پڑتا تھا، اس مخالفت نے بھی عیسائیون کو اسلام کی طرف متوجہ کیا،

ان سب باتوں سے قطع نظر شام اور عراق کی طرح عربوں کو مصر میں بھی نظم ونسق کی ابتری سے بچانے کے لئے غیر مسلموں سے مدد لینی پڑی اس غرض سے قبطی ہی ملازمتوں پر مقرر کئے گئے، ابتدا میں مسلمانون نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا، لیکن جب یہ سرپرستی حد سے گذر گئی، اور معاشی حالات بھی اتنے بدل گئے کہ عربوں کو تلوار ہاتھ سے رکھکر قلم سنبھالنا پڑا، تو لامحالہ انھیں یہ ناگوار گذرا کہ عیسائی ہر جگہ حاوی ہیں، اس لئے

انھوں نے اپنی جگہ پیدا کرنے کی کوشش شروع کی، اس سلسلہ میں بعض شورشیں بھی ہوئیں، چنانچہ ساتویں صدی ہجری (تیرہویں صدی عیسوی) میں عوام کی اس وجہ سے شورش ہوئی کہ دفاتر میں عیسائی ملازمین کی تعداد بہت زیادہ تھی[1] اس دار و گیر میں بھی بہت سے عیسائیوں نے اپنے آپ کو معاشی تباہی سے بچانے کے لئے اسلام قبول کر لیا ہوگا،

اسلامی مصر میں ملازمتوں کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے، ملک کے نظم و نسق کا کام اس قدر پیچیدہ تھا کہ عرب جو اس قسم کا کوئی تجربہ نہ رکھتے تھے، اس سے کما حقہ عہدہ برآ نہ ہو سکتے تھے، اس لئے مجبوراً تقریباً سو برس تک قبطیوں کو ملازم رکھنا پڑا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مسلمانوں کو دفاتر میں رکھنے کی کوشش کی، لیکن اس میں ان کو پوری کامیابی نہیں ہوئی، اعلیٰ عہدوں سے لیکر ادنیٰ ملازمتوں تک تمام جگہوں پر مسلمانوں کا تقرر کرنا درحقیقت صدیوں کا کام تھا، اور اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا، کہ مسلمان کسی زمانہ میں بھی غیر مسلموں کی امداد سے مستغنی نہیں ہوئے، چنانچہ خلفائے فاطمیین کے عہد میں ہم دیکھتے ہیں کہ خود وزارت پر جو اسلامی سیاسیات میں سب سے بڑا عہدہ مانا جاتا تھا، یہودی اور عیسائی فائز رہے، اس کا اندازہ کہ اس زمانے میں بھی دفاتر میں عیسائی ملازمین کی کثرت تھی، اس تصویر سے ہوتا ہے، جو مشہور مصنف صیرافی نے کھینچی ہے، یہ حالات حقیقت میں مملوکوں کے زمانہ تک قائم رہے، اور صیرافی کے بیانات کا اطلاق ان کے زمانے پر بھی بخوبی ہو سکتا ہے؛

ان معاشی حالات کا نتیجہ بعض اوقات شورشوں اور بغاوتوں کی صورت میں ظاہر ہوتا تھا مسلمان حکومت میں اپنا حصہ پانے کا مطالبہ کرتے، اور عوام میں بے چینی ظاہر ہوتی، حکومت جہاں تک ہو سکتا، اپنی عیسائی رعایا کی حفاظت کرتی تھی، مگر خواہ کوئی حکومت ہو، جب تک وہ رعایا کے جذبات کا احترام نہ کرے، قائم نہیں رہ سکتی، اس لئے حکومت کو کبھی کبھی عوام کے تعصبات کی رعایت بھی کرنی پڑتی تھی، اُن

---

[1] دیکھو A. Müller کی Der Islam جلد ۲ ص ۲۶۵.

انھیں ٹھنڈا کرنے کے لئے بعض ہنگامی قوانین نافذ کر دیئے جاتے، جیسا کہ فاطمی خلیفہ حاکم بامر اللہ کے عہد میں ہوا، لیکن انتہائی جوش وخروش کے زمانے میں بھی ان قوانین کی پابندی میں سختی نہیں برتی جاتی تھی، اور جون ہی عوام کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا، لوگ ان قوانین کو بھلا دیتے، مقریزی نے اپنی کتاب خطط میں اس موضوع پر بہت سی معلومات جمع کی ہیں، بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ عیسائی ترکی بہ ترکی جواب دیتے تھے، چنانچہ خلیفہ مامون کے عہد میں اس قسم کی ایک شورش قبطیوں کی طرف سے ہوئی، جو قبطیون کی سب سے بڑی بغاوت سمجھی جاتی ہے، خلیفہ کے سپہ سالاروں نے اس شورش کو سختی سے فرو کیا[1] اس کے بعد قبطیوں کی بہت بڑی تعداد نے اسلام قبول کر لیا، اس کے مدتون بعد ناصر بن قلاؤن کے زمانے میں ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) قبطیوں کی وہ شورشیں بڑے پیمانے پر ہوئیں، یہ صرف مصر کے صدر مقام تک محدود نہیں رہیں، بلکہ تمام ملک اس سے متاثر ہوا،

دوسرے مقامات کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے، اس شورش کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ عیسائیوں کا زور بالکل ختم ہو گیا، صرف قدیم قاہرہ اور مصر صعید میں قبطیوں نے اپنی حیثیت قائم رکھی، ایک حساب کے مطابق جس کی تفصیل جزیہ کے ضمن میں دی گئی ہے[2] یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں اسلام کی حیثیت سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں وہی تھی، جو آج کل ہم دیکھ رہے ہیں، گو اب نئے دستاویزات کے دریافت ہونے کے بعد معلوم ہوتا ہے، کہ سلطان صلاح الدین کے زمانہ میں عیسائیوں کی تعداد یقیناً بہت زیادہ ہوگی،

بہرحال مختصر یہ کہ آل طولون کے مصر میں آنے سے پہلے اشاعت اسلام میں بڑی حد تک ترقی ہوئی آل طولون کے وہاں آنے سے اسمیں سرعت پیدا ہوئی، اور مملوکوں کے آخری دور میں اشاعت اسلام کا کام مصر میں ختم ہو گیا،

---

[1] دیکھو Becker کی کتاب Beitragen zur Geschichte Agyptens

[2] دیکھو بیکر کی کتاب مذکورہ بالا ص ۱۱۳ الخ،

(۲)

احمد بن طولون کے خاندان سے اسلامی مصر کی خصوصی تاریخ شروع ہوتی ہے، اب تک مصر کا ملک خلافت کا محض ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا، والیانِ صوبہ کو اہلِ ملک سے نہ کوئی ہمدردی ہوتی، اور نہ گہرا تعلق ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا تھا، کہ مرکزی حکومت کو خوش رکھیں، اور اپنے عرصۂ حکومت میں جہاں تک ہو سکے ذاتی طور پر مال و دولت جمع کر لیں، یہ غرض اس لئے اور بھی آسانی سے پوری ہو جاتی تھی، کہ یہی والی مالیات کے ناظم بھی ہوتے تھے، اس لحاظ سے ان کی حیثیت محصل سے زیادہ نہ تھی، ان کی واحد تمنا یہ تھی، کہ کافی رقم جمع کر لیں، اس کے سوا ملکی معاملات یا معاشیات اور ترقی میں وہ کوئی حصہ نہیں لیتے تھے، جو کچھ محاصل جمع ہوتے ان کا بڑا حصہ بغداد چلا جاتا، اور کچھ والیوں کی جیبوں میں غائب ہو جاتے، چونکہ والیانِ صوبہ جلدی جلدی بدلتے رہتے تھے، اس لئے ملک کی دولت کو اور بھی نقصان پہونچتا تھا، لیکن آلِ طولون کے آنے سے حالات بالکل بدل گئے اور ملک کو پرانی جابرانہ حکومت سے رہائی حاصل ہو گئی، آلِ طولون نے چونکہ ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا، اسلئے تمام محاصل اب یہیں خرچ ہونے لگے، آلِ طولون مرکزی حکومت سے آزاد تھے، ان کا مقصد اہلِ ملک کا خون چوسنا نہیں تھا، بلکہ ملک میں بنا اپنی حکومت قائم کرنا، اور اپنے خاندان کو فروغ دینا تھا، اب مصر بجائے خود ایک زبردست سلطنت بن گیا، وہاں کا نظم و نسق بھی پہلے سے بہتر ہو گیا، مصر کی تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی ملک میں مستحکم اور خود مختار حکومت قائم ہوئی، تو وہاں کی خوش حالی میں اضافہ ہوا، یہی حال آلِ طولون کے زمانہ میں ہوا، اور مصر میں ایسی معاشی ترقی شروع ہوئی جس کی مثال اس سے قبل تاریخِ اسلام میں نہیں ملتی، نہ صرف یہ بلکہ سو برس کے بعد اب پھر شام پر مصریوں کا قبضہ ہوا، تاریخ شاہد ہے کہ مصر اور شام کا ہمیشہ بڑا گہرا تعلق رہا ہے، اور شام ہی ایک ایسا ملک ہے، جہاں ہر خود مختار مصری حکومت اپنی حکومت کو وسعت دے سکتی ہے لیکن طولونی عہد میں مصر میں خواہ کتنی ہی معاشی ترقی ہوئی ہو، یہ خاندان ایک لحاظ سے بالکل ناکام رہا، ہم دیکھتے ہیں کہ اسی زمانہ میں ایران میں چھوٹے اور بڑے حکمران خاندان پیدا ہو رہے تھے، اور بگڑ رہے تھے، ان میں

سے ہر ایک کا مقصد یہ تھا کہ مرکز خلافت سے بے نیاز ہو کر وہ ایک نئے تمدن کی بنیاد ڈالے جس میں قدیم ایرانی عناصر کا احیا ہو، اس کے برعکس آل طولون ہمیشہ محض نقال رہے، ان کی انتہائی کوشش صرف اتنی تھی کہ بغداد اور سامرا کی نقل اتاریں خواہ وہ کتنی ہی بھدی کیوں نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں مصر کا صدر مقام درحقیقت ایک چھوٹا سا بغداد یا سامرا تو بنا، لیکن کسی نئے تمدن کا مرکز نہ بن سکا، اس لحاظ سے فسطاط یا قاہرہ کو ایک مخصوص تمدن و تہذیب کا مرکز مان لینا محض غلط ہے[۵]، لیکن اس کمزوری اور ناکامی کے باوجود اس میں ذرا شبہ نہیں کہ آل طولون کے ساتھ تاریخ مصر کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، اور ان ہی کی بدولت ملک کو یہ فائدہ بھی پہنچا کہ مصریوں نے اسلام کی وجہ سے جو نئی تہذیب اختیار کر لی تھی، اسے ضائع نہیں ہونے دیا،

(۴)

تاریخ تمدن کے لحاظ سے مصر میں ۲۰ھ سے ۱۲۱۳ھ (۶۳۹ء سے ۱۷۹۸ء) تک کا زمانہ چار دوروں میں تقسیم ہو جاتا ہے، پہلا دور عربی تہذیب کا تھا، دوسرا عربی ایرانی تہذیب کا، تیسرا ایرانی ترکی دور ہے، اور چوتھا خالص ترکی، ان سب دوروں کی تاریخ پر غور کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہئے کہ باشندگان مصر کا بڑا حصہ ان قبطیوں پر مشتمل تھا جنھوں نے عربیت اور اسلام دونوں کو قبول کر لیا تھا، آل طولون سے پہلے کا زمانہ درحقیقت عربی تمدن کا دور ہے، اس کے بعد طولون، اخشیدیہ، اور فاطمیین کا زمانہ عربی ایرانی تمدن کا زمانہ ہے، اس عہد میں ہم دیکھتے ہیں، کہ ملک میں ایرانی تہذیب کے اثرات برابر گہرے ہوتے چلے گئے، فاطمیین کے عہد خلافت میں بھی جب کہ خالص شیعی عقائد ملک میں رائج تھے، اس ارتقا کو کوئی اثر نہیں پڑا، اور فاطمیین عربی تمدن کو دوبارہ زندہ نہیں کر سکے، بلکہ ایرانی اثرات برابر وہاں کام کرتے رہے، فاطمیین کی تباہی

[۵] دیکھو ای رچمنڈ کا مضمون (THE SIGNIFICANCE OF CAIRO) مطبوعہ رسالہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۹۱۳ء ص ۲۳،

کے بعد سلطان صلاح الدین اور ایوبیین سے ایک نیا دور شروع ہوتا ہے، یہ لوگ سلاجقۂ اعظم کی سلطنت کی روح اور تہذیب اپنے ساتھ لائے، ان کے آنے سے صنعت و حرفت، سیاسیات، معاشرت بلکہ طرز تحریر میں بھی ایک نیا دور شروع ہوا، اسے ہم ایرانی ترکی تہذیب کا دور کہہ سکتے ہیں، جو مملوکوں کے آخری عہد تک برابر جاری رہا، مملوک ہر معاملے میں اپنے آپ کو ایوبیین کا حقیقی جانشین سمجھتے تھے، اور ان ہی کی طرح بلند نظر تھے، اس لئے قدرتی طور پر درباری آداب میں بھی جہاں تک ہو سکتا ہے، وہ انہی کی پیروی کرتے تھے، ان کا مطمح نظر یہ تھا کہ اس زمانے کے اوضاع و اطوار کو جہاں تک بنے جوں کا توں قائم رکھیں، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ مملوک تمدنی لحاظ سے کوئی نئی چیز دنیا کے سامنے پیش نہ کر سکے، چوتھا دور دولت عثمانیہ کا ہے، یہ خالص ترکی تمدن کا دور ہے، اس زمانہ میں مصر کی خود مختاری ایک مرتبہ پھر ختم ہوگئی وہ دولت عثمانیہ کا محض صوبہ بن گیا، اور قدرتی طور پر مرکزی حکومت یعنی قسطنطنیہ کے تمدنی اثرات اس پر بہت گہرے پڑے۔

(۵)

سیاسی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مصر کی تاریخ تین دوروں میں تقسیم کی جا سکتی ہے ۱ھ سے ۲۲۴ھ (۶۳۹ء سے ۸۶۰ء) تک اور پھر ۹۲۳ھ سے ۱۲۱۲ھ (۱۵۱۷ء سے ۱۶۹۰ء) کے دور وہ ہیں جن میں مصر کی خود مختاری سلب ہو جاتی ہے، اور ملک بڑی زبردست سلطنتوں کا محض ایک صوبہ بن جاتا ہے، ان دوروں کا درمیانی زمانہ وہ زمانہ ہے جب کہ مصر خود مختار رہتا ہے، اسی درمیانی دور میں خلافت فاطمیین کا عظیم الشان زمانہ بھی شامل ہے، فاطمیین سے پہلے دور میں وہ انقلابات پیش آتے ہیں، جن کے نتیجہ کے طور پر ایک ترک امیر ملک کو خلافت عباسیہ سے الگ کر کے اپنے آپ کو خود مختار منا لیتا ہے، آل طولون کی خود مختاری صرف خلافت بغداد کے آئے دن کے سیاسی انقلابات کی وجہ سے ممکن ہوئی، اس زمانہ میں خلفاء عباسیہ کو اپنے غلاموں کی شورشوں اور بغاوتوں سے دوچار ہونا پڑا، اور ان کی وجہ سے خاندان خلافت کی شان و شوکت ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئی، اسی سے فائدہ اٹھا کر احمد بن طولون مصر کو سنبھال بیٹھا جب سب شورشیں

فرو ہو چکیں تو معلوم ہوا کہ خلافت کے مرکزی صوبے ایرانی بنی بویہ اور عرب آل حمدان میں تقسیم ہو چکے ہیں،
طولونیہ کے جانشین اخشیدیہ انہی دونوں خاندانوں کے ہم عصر تھے اور ایک ہی قسم کے حالات میں ظاہر ہوئے تھے
دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ خلافت عباسیہ کی کمزوری کے بعد سلطنت کے مختلف حصوں کے قبضہ اور
تصرف کے لئے جو جنگیں ہوئیں، ان کی وجہ سے یہ تینوں حکومتیں پیدا ہوئیں، خاندانہائے طولونیہ اور اخشیدیہ دونوں
نے مل کر ۲۵۴ھ سے ۳۵۸ھ (۸۶۸ء سے ۹۶۹ء) تک حکومت کی، ان حکومتوں کو نہ تو قومی حیثیت حاصل
تھی، اور نہ مذہبی، ان کی بنیاد در اصل ان کے بانیوں کی قوت بازو پر تھی، انھوں نے حکومتوں کو قائم کیا، اور ان
کی موت کے بعد ان کے جانشینوں نے اپنے نفاق اور نالائقی کی بدولت بہت تھوڑی مدت میں انھیں کھو دیا
یہ دونوں حکومتیں در اصل ایسی سلطنتوں کا نمونہ ہیں جو سیاسی انقلابات کے زمانہ میں بلند حوصلہ سپہ سالار قائم کر لیا
کرتے ہیں، مگر ان کی بنیاد پختہ نہیں ہوتی، احمد بن طولون اور اخشیدیہ دونوں نے خلافت کی فوجوں میں غلاموں
کی حیثیت سے پرورش پائی تھی، اور ترقی کرتے کرتے مصر کے مالک بن بیٹھے تھے، مذہبی اور قومی حیثیتوں سے
قطع نظر قانونی لحاظ سے بھی ان دونوں حکمران خاندانوں کو صرف اتنی حیثیت حاصل تھی کہ عہد انحطاط کے سیاسیین
نے ولایت کے مسئلہ کو وسیع کر کے باقاعدہ مقرر کردہ والی کے علاوہ ایک "والی بالاستیلاء" بھی قرار دیا تھا[1]، تاکہ
کم از کم یہ مغالطہ قائم رہے، کہ خلافت اب تک عام ہے، اور ہر مسلمان خواہ وہ کہیں ہو، اس کے ماتحت ہے، طولونیہ
اور اخشیدیہ اسی ضمن میں آجاتے تھے، چنانچہ اسی مغالطہ کو قائم رکھنے کے لئے خلیفہ راضی نے اس ترک سردار محمد بن
طغج کو اخشید کا لقب بھی دیدیا تھا، حالانکہ وہ اس سے قبل ہی مصر میں خود مختار ہو چکا تھا[2]، بہرحال یہ یقینی امر ہے
کہ خود ان کامیاب سپہ سالاروں کو اس کی پروا نہیں تھی، کہ خلفاء قانوناً انھیں کیا سمجھتے ہیں،

(۶)

خلافت فاطمین کی حالت اس سے بالکل جداگانہ تھی، ان کے تحت مصر میں پہلی مرتبہ ایک ایسی طاقت

---

[1] دیکھو ماوردی کی احکام السلطانیہ، باب ثالث، [2] ابن خلکان تحت ابوبکر محمد بن ابو محمد طغج بن جف،

حکومت قائم ہوئی جس کی بنیاد مذہب پر تھی، کیونکہ یہ خاندان نہ صرف مرکزی خلافت سے بے تعلق تھا، بلکہ خود ایک عام خلافت کا دعویدار تھا، یوں تو خلافتِ فاطمین کا آغاز ۲۹۶ھ (۹۰۹ء) میں افریقہ میں ہوا لیکن فاطمی خلیفہ معز کے سپہ سالار جوہر نے ۳۶۲ھ (۹۷۲ء) میں مصر فتح کرکے خلافت کو مصر میں منتقل کیا، یہ خاندان مخصوص شیعی عقائد کا حامل تھا، مگر اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان خلفاء نے بجبر و اکراہ ان عقائد کو منوانے کی کوشش کی، بلکہ واقعات سے معلوم ہوتا ہے، کہ اہل مصر کے ایک بڑے طبقے نے یہ عقائد اختیار نہیں کئے تھے، اور اگر کئے تھے، تو محض ظاہرداری کے لئے، ۵۶۷ھ (۱۱۷۱ء) میں صلاح الدین ایوبی نے فاطمین کی خلافت کو ختم کرکے جس آسانی سے سنی عقائد کو دوبارہ قائم و رائج کر دیا، اس سے پتہ چلتا ہے، کہ شیعیت کے اثرات ملک پر بہت زیادہ گہرے نہیں تھے، بہرکیف ان خلفاء کی مذہبی حیثیت سے ملک کو یہ فائدہ ضرور پہونچا، کہ کم از کم آغاز خلافت میں بلند حوصلہ سپہ سالار جو موقع ملتے ہی شاہی خاندان اور حکومت پر قابو پا جاتے تھے، اب ایسا کرنے سے رک گئے، احمد بن طولون یا اخشید کی طرح خلیفہ المعز لدین اللہ مرکزی حکومت کے والی یا نمایندہ کی حیثیت سے مصر نہیں آیا تھا، بلکہ اس کے سپہ سالار نے باقاعدہ طور پر مصر فتح کیا تھا، اور جب تمام رکاوٹیں ختم ہو گئی تھیں تب معز مصر میں منتقل ہوا تھا، اس کے علاوہ معز اپنے پیشرووں کی طرح نہ نو دولتا تھا اور نہ ملک حاصل کرنے کیلئے اسے بڑی جد و جہد ہی کرنی پڑی، وہ افریقیہ کے طاقتور حکمراں کی حیثیت سے مصر میں داخل ہوا اور خلیفۂ وقت امام کے عظیم الشان خطابات اپنے ساتھ لایا،

مصر پہنچکر فاطمین نے خلفائے عباسی کے نمونے پر ملک کا نظم و نسق قائم کیا، جس کے معنی یہ تھے، کہ انھوں نے اس معاملے میں قدیم ایرانی روایات کا تتبع کیا، اور ان ہی بنیادوں پر اپنی حکومت کو مستحکم کیا یا یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے قدیم نظم و نسق جوں کا توں باقی رکھا، اور سوائے اس کے اور کوئی تبدیلی نہیں کی کہ پرانے عقائد کے بجائے اپنے مخصوص عقائد کی ترویج اور پیروی کی کوشش کی، اس لحاظ سے ان خلفاء نے بھی مصر میں اتنی نئی چیزیں پیدا نہیں کیں جتنی کہ دوسروں کی اختیار کرلیں، ابتدائی چند خلفاء بالخصوص خلیفہ عزیز کو چھوڑ کر

وہ بذات خود بہت اچھے حکمراں ثابت نہیں ہوسے لیکن ان کی اور مصر کی خوش قسمتی تھی، کہ انھیں نہایت نامور اور مستعد ملازم اور مدبر مل گئے جنھوں نے اپنی جد وجہد سے خاندان خلافت کو سنبھالے رکھا، اور ملک کو بھی خوشحال اور فارغ البال بنادیا، ان کی حکومت بڑی حد تک مطلق العنان بلکہ فوجی تھی، فوج ہی پر ان کے جاہ وجلال اور حکومت کا انحصار تھا، اس صورت حال کے نتائج ہم خلفاے عباسیہ کے زمانے میں دیکھ چکے ہیں، چنانچہ یہاں بھی رفتہ رفتہ فوجیں بے قابو ہوتی گئیں، اور بلند حوصلہ سپہ سالار جو اکثر وبیشتر مملوک ہوتے تھے، اتنے طاقتور ہوتے گئے، کہ انھوں نے انجام کار خلفاء کو بالکل کٹ پتلی بنا لیا، اور بالآخران ہی سپہ سالاروں کی آئے دن کی سازشوں اور کشت وخون میں یہ خلافت اپنے آخری دن گذار کر دنیا سے رخصت ہوگئی، یہ سپہ سالار بڑے بڑے جاگیردار بھی تھے، اس لئے ان کے تاخت وتاراج سے ملک کا ہر حصہ متاثر ہوا، اور جو خوشحالی ابتدائی عہد فاطمین میں مصر کو حاصل ہوگئی تھی، آخری زمانہ میں محض روایات کی صورت میں باقی رہ گئی،

اس کے علاوہ عہد فاطمین کو ہمیں ایک اور نظر سے دیکھنا چاہئے، ان کا دعوی یہ تھا، کہ وہ عامۃ المسلمین کے خلیفہ ہیں اس لئے نا ممکن تھا کہ وہ صرف مصر پر قناعت کریں، اول تو مصر کی حفاظت کے لئے ہی شام پر قبضہ کرنے کی ضرورت تھی، اس کے علاوہ اس دعوی نے انھیں اور بھی تقویت پہنچائی، چنانچہ خلیفہ معز ہی کے زمانہ میں شام فاطمین اور ان کے مخالفوں کا میدان جنگ بن گیا، ان جنگوں کے متعلق دو باتیں یاد رکھنی ضروری ہیں، اول یہ کہ وہ کسی قومی اور مرکزی خلافت کے مقابل میں نہیں تھیں، بلکہ اس وقت فاطمین کے حریف بنی بویہ اور آل سلجوق تھے، بنی بویہ اس وقت تباہی کے قریب تھے، اور آل سلجوق عروج پکڑ رہے تھے، ان حکومتوں اور فاطمی مصر کے درمیان چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستوں کا ایک سلسلہ تھا، جو موقع محل اور ذاتی فائدہ کے لحاظ سے کبھی ایک طرف اور ایک دوسری طرف جھک جاتی تھیں، دوسری بات یہ ہے کہ ان جنگوں کا مقصد صرف یہ فیصلہ کرنا تھا کہ خطبے میں عباسیہ اور فاطمین میں سے کس کا نام لیا جائے ان لڑائیوں کے دوران میں ایک مرتبہ فاطمین کو بڑی کامیابی ہوئی، جب تھوڑی سی مدت کے لئے ایک شیعہ

نامب بساسیری نے بنی بویہ کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر ۴۴۹ھ (۱۰۵۷ء) میں بغداد کی مسجدوں میں فاطمین کا نام خطبہ میں پڑھوایا، سیاسی نقطہ نظر سے یہ واقعہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا، لیکن اس نے فاطمین کے بلند نظرانہ تخیلات کو ایک بڑی حد تک پورا کر دیا،

انتہائی عروج کے زمانہ میں فاطمین مشرقی بحیرۂ روم میں سب سے زبردست اسلامی حکومت کے مالک تھے، صقلیہ ان کے قبضہ میں تھا، اور بحیرۂ روم کے وہ تقریبًا مالک تھے، چنانچہ انہی کے زمانہ میں صقلیہ اور جنوبی اطالیہ کے مسائل بازنطینیوں اور مصریوں میں طے پائے، مختصر یہ کہ فاطمین نے اپنی بری اور بحری کامیابیوں کے ایسے گہرے نقوش مصریون کے دل پر چھوڑے، کہ وہ ان کی تباہی کے بعد صلاح الدین ایوبی بلکہ مملوکوں کے زمانہ تک ان کے دلوں پر یہ نقش قائم رہے، خلیفہ معز سے خلیفہ مستنصر تک فاطمین کا یہ عروج باقی رہا، خلیفہ مستنصر کے زمانہ کے معاشی اور معاشرتی حالات سیاح ناصر خسرو نے تفصیل کیساتھ بیان کئے ہیں،[1] ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سرسبزی اور شادابی میں کوئی اسلامی ملک اس وقت مصر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا، مصری نہایت بے فکری کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، لیکن مستنصر کیساتھ یہ خوش حالی رخصت ہوگئی، اوّل تو مستنصر کے بعد فاطمین کا سابقہ شام میں طاقتور سلجوقیوں سے پڑا، فاطمی انکا مقابلہ نہ کر سکے اور شام پر سلجوقیون نے قبضہ کر لیا، اسی زمانہ میں صلیبی لڑائیاں شروع ہوگئیں اسوقت ایک طرف مصر کی فاطمی خلافت کمزور ہوتی جارہی تھی اور دوسری طرف سلاجقہ کی تباہی کے بعد چھوٹی چھوٹی سلطنتیں قائم ہوگئی تھیں جو عیسائیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں، سب سے بڑھکر مصر میں سخت قحط پڑ گیا جسکا اثر مصر پر بہت بُرا پڑا، خود خلیفہ مستنصر کے عہد میں مختلف سیاسی انقلابات نے مصر کو اور بھی تباہ کر دیا، اس عہد انحطاط میں وزیر بدر الجمالی اور اسکے بیٹے افضل نے بربادی کو روکنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوا، اور نظم ونسق کی خرابی یہانتک پہنچ گئی، کہ محاصل کا انتظام فوجی جاگیرداروں کے ذریعہ سے کیا گیا، جو اور بھی زیادہ تباہی کا باعث ہوا، اس کے بعد صلیبی مجاہدین نے رہی سہی خوشحالی کو بھی ختم کر دیا، اور فاطمین کا ستارہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا، اب مصر کا تیسرا درخشاں دور یعنی آل ایوب اور مملوکوں کا عہد شروع ہوا،

باقی

[1] سیاحت نامہ ناصر خسرو

تلخیص و تبصرہ

مصر کی صد سالہ تعلیم نسوان کی مختصر تاریخ

مصر میں جب پہلے پہل خدیو محمد علی پاشا نے تعلیمی اصلاحات کا آغاز کیا، اسوقت اہالیانِ مصر کی رائے عام نئے طرز کے مدارس سے ناواقف اور ان کی غرض و غایت کے بارہ میں بہت مشتبہ تھی، اس لئے حکومت کو لڑکوں کو مدرسہ میں بھیجنے کے لئے جبر سے کام لینا پڑا، اس زمانہ میں تعلیم صرف مردوں تک محدود تھی، لڑکیون کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا، البتہ بعض صاحب ثروت اور ترقی یافتہ گھرانون کی لڑکیاں اپنے گھروں پر میاں جی سے قرات لکھنا، قرآن اور معمولی حساب و کتاب کی تعلیم حاصل کرتی تھیں،

۱۸۲۷ء میں محمد علی پاشا نے جب کلوٹ بے کی مدد سے طب کا ایک مدرسہ قائم کیا، تو اس مدرسہ اور شفاخانے کے لئے ایسی دائیوں کی اور قابلاؤں کی ضرورت محسوس ہوئی، جو شریف خواتین کو طبی امداد دے سکین، اس ضرورت کیلئے ۱۸۳۱ء میں قابلہ کی تعلیم کا ایک شعبہ قائم کیا گیا، لیکن عام طور پر لوگ لڑکیوں کی تعلیم اور انھیں مدارس میں بھیجنے سے اتنی نفرت کرتے تھے، کہ محمد علی پاشا کو اس شعبہ کے افتتاح کے لئے دس حبشی لڑکیوں کو بھیجنا پڑا،

مدرسہ سنیہ اور لڑکون کے ابتدائی مدارس

خدیو اسماعیل کے ابتدائی دور کی ترقیون اور ملک میں اس کے نمایان مظاہر کو دیکھ کر مصریون کے خیالات بہت کچھ بدل چکے تھے، اس لئے اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم نامانوس نہ رہ گئی تھی، چنانچہ ۱۸۷۳ء میں خدیو اسماعیل کے ایماسے اس کی ایک محترم محل نے اپنے مصارف سے سراے سنیہ میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ کھولا، مصر میں لڑکیوں کی تعلیم کا یہ پہلا مدرسہ تھا، یہی مدرسہ موجودہ مدرسہ سنیہ کی بنیاد ہے،

یہ مدرسہ اقامتی تھا، اور تعلیم مفت تھی، اس کے باوجود شروع شروع میں اسکی طرف بہت کم توجہ ہوئی، پھر رفتہ رفتہ طالبات کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مدرسہ بیرونی لڑکیوں کو لینے پر مجبور ہو گیا، اسمٰعیل پاشا اور ان کے لڑکے توفیق کے زمانہ تک لڑکیوں کا تنہا یہی مدرسہ تھا، پھر ۱۸۹۵ء میں خدیو عباس ثانی کے ابتدائی زمانہ ۱۸۹۵ء میں مدرسہ عباسیہ ابتدائیہ کے نام سے لڑکیوں کا ایک دوسرا مدرسہ قائم ہوا، ان دونوں مدرسوں کی طالبات کی تعداد ۹۴ تھی،

پھر ۱۹۱۷ء میں اسکندریہ میں محرم بک نے ایک پرائمری مدرسہ کھولا، اس کے بعد مصر کا موجودہ دور شروع ہو گیا، اور ۱۹۱۹ء میں سارے ملک میں مدارس کی تعداد بڑھنے لگی، اور ۱۹۲۵ء تک انیس سرکاری مدرسے کھل گئے جن میں (۲۵۰۰) طالبات تعلیم حاصل کرتی تھیں، پھر ۱۹۳۰ء تک ان مدارس میں آٹھ کا اور اضافہ ہوا جن کی طالبات کی تعداد (۳۰۷۴) تھی، یہ سب مدارس سرکاری تھے، مصر کی علمی نہضت کے ساتھ غیر سرکاری مدارس کی تعداد بھی بڑھتی رہی، ۱۹۲۰ء میں غیر سرکاری مدارس کی تعداد کل تین تھی، وہ بھی تینوں قاہرہ میں تھے، ان میں ۴۴۰ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں، ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد چالیس ہو گئی، اور طالبات کی تعداد ۱۹۰۴، پھر ۱۹۲۵ء میں مدارس کی تعداد (۱۱۵) اور طالبات کی تعداد ۹۴۵۴ تک پہنچ گئی،

غیر ملکی مشنری مدارس کا آغاز بھی خدیو اسمٰعیل کے زمانہ سے ہوا، حکومت ان کے لئے آسانیاں فراہم کرتی تھی، مدرسہ کی عمارت کے لئے مفت زمین دیتی تھی، اس قسم کا سب سے پہلا مدرسہ نسواں فجالہ میں قائم ہوا، اسے ۱۸۳۱ء میں ایک انگریز مشنری کی بیوی نے قائم کیا تھا، اس کے بعد امریکن مشن کے مدارس قائم ہوئے، پہلے ان میں صرف یورپین اور دیسی عیسائی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں، مصر میں برطانیہ کے ورود سے پہلے مصریوں نے انکی طرف کوئی توجہ نہ کی، ان مدارس نے مصری عورتوں کی ترقی میں بڑا حصہ لیا،

تعلیمی نظام ابتدا میں لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس کا تعلیمی نظام و نصاب ایک تھا، البتہ لڑکیوں کی تعلیم میں کچھ دستی کام بھی داخل تھے، ۱۹۱۳ء میں وزارت تعلیم نے لڑکیوں کا تعلیمی نظام علحدہ مرتب کیا، جو لڑکوں کی تعلیم سے مختلف تھا، اس میں تعلیم کی مدت چھ سال قرار پائی، نصاب میں حسب ذیل مضامین تھے:-

تلخیص و تبصرے

مصر کی صد سالہ تعلیم نسواں کی مختصر تاریخ

مصر میں جب پہلے پہل خدیو محمد علی پاشا نے تعلیمی اصلاحات کا آغاز کیا، اسوقت اہالیانِ مصر کی رائے عام نئے طرز کے مدارس سے ناواقف اور ان کی غرض و غایت کے بارہ میں بہت مشتبہ تھی، اس لئے حکومت کو لڑکوں کو مدرسہ میں بھیجنے کے لئے جبر سے کام لینا پڑا، اس زمانہ میں تعلیم صرف مردوں تک محدود تھی، لڑکیوں کا اس میں کوئی حصہ تھا، البتہ بعض صاحب ثروت اور ترقی یافتہ گھرانوں کی لڑکیاں اپنے گھروں پر میاں جی سے قرات لکھنا، قرآن اور معمولی حساب و کتاب کی تعلیم حاصل کرتی تھیں،

سنہ ۱۸۲۰ء میں محمد علی پاشا نے جب کلوٹ بے کی مدد سے طب کا ایک مدرسہ قائم کیا، تو اس مدرسہ اور شفاخانے کے لئے ایسی دائیوں کی اور قابلاؤں کی ضرورت محسوس ہوئی، جو شریف خواتین کو طبی امداد دے سکیں، اس ضرورت کیلئے سنہ ۱۸۳۱ء میں قابلہ کی تعلیم کا ایک شعبہ قائم کیا گیا، لیکن عام طور پر لوگ لڑکیوں کی تعلیم اور انھیں مدارس میں بھیجنے سے اتنی نفرت کرتے تھے، کہ محمد علی پاشا کو اس شعبہ کے افتتاح کے لئے دس حبشی لڑکیوں کو بھیجنا پڑا،

مدرسہ سنیہ اور لڑکیوں کے ابتدائی مدارس

خدیو اسمٰعیل کے ابتدائی دور کی ترقیوں اور ملک میں اس کے نمایاں مظاہر کو دیکھ کر مصریوں کے خیالات بہت کچھ بدل چکے تھے، اس لئے اس زمانہ میں لڑکیوں کی تعلیم نامانوس نہ رہ گئی تھی، چنانچہ سنہ ۱۸۷۳ء میں خدیو اسمٰعیل کے ایما سے ان کی ایک محترم محل نے اپنے مصارف سے "سرائے سیوفیہ" میں لڑکیوں کا ایک مدرسہ کھولا، مصر میں لڑکیوں کی تعلیم کا یہ پہلا مدرسہ تھا، یہی مدرسہ موجودہ مدرسہ سنیہ کی بنیاد ہے،

یہ مدرسہ اقامتی تھا، اور تعلیم مفت تھی، اس کے باوجود شروع شروع میں اسکی طرف بہت کم توجہ ہوئی، پھر رفتہ رفتہ طالبات کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ مدرسہ بیرونی لڑکیوں کو لینے پر مجبور ہوگیا، اسمٰعیل پاشا اور ان کے لڑکے توفیق کے زمانہ تک لڑکیوں کا تنہا یہی مدرسہ تھا، پھر ۱۸۹۵ء میں خدیو عباس ثانی کے ابتدائی زمانہ ۱۸۹۵ء میں مدرسۂ عباس ابتدائیہ کے نام سے لڑکیوں کا ایک دوسرا مدرسہ قائم ہوا، ان دونوں مدرسوں کی طالبات کی تعداد ۹۹ تھی،

پھر ۱۹۱۷ء میں اسکندریہ میں محرم بک نے ایک پرائمری مدرسہ کھولا، اس کے بعد مصر کا موجودہ دور شروع ہوگیا، اور ۱۹۱۹ء میں سارے ملک میں مدارس کی تعداد بڑھنے لگی، اور ۱۹۲۵ء تک انیس سرکاری مدرسے کھل گئے جن میں (۲۵۰۰) طالبات تعلیم حاصل کرتی تھیں، پھر ۱۹۳۰ء تک ان مدارس میں آٹھ کا اور اضافہ ہوا جن کی طالبات کی تعداد (۴۰۰۰) تھی، یہ سب مدارس سرکاری تھے، مصر کی علمی نہضت کے ساتھ غیر سرکاری مدارس کی تعداد بھی بڑھتی رہی، ۱۹۱۰ء میں غیر سرکاری مدارس کی تعداد کل تین تھی، وہ بھی تینوں قاہرہ میں تھے، ان میں ۴۰۴ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں، ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد چالیس ہوگئی، اور طالبات کی تعداد ۱۶۰۰۴، پھر ۱۹۲۵ء میں مدارس کی تعداد (۱۱۵) اور طالبات کی تعداد ۲۹۴۵۴ تک پہنچ گئی،

غیر ملکی مشنری مدارس کا آغاز بھی خدیو اسمٰعیل کے زمانہ سے ہوا، حکومت ان کے لئے آسانیاں فراہم کرتی تھی، مدرسہ کی عمارت کے لئے مفت زمین دیتی تھی، اس قسم کا سب سے پہلا مدرسہ نسواں فجالہ میں قائم ہوا، اسے ۱۸۳۱ء میں ایک انگریز مشنری کی بیوی نے قائم کیا تھا، اس کے بعد امریکن مشن کے مدارس قائم ہوئے، پہلے ان میں صرف یورپین اور دیسی عیسائی لڑکیاں تعلیم حاصل کرتی تھیں، مصر میں برطانیہ کے ورود سے پہلے مصریوں نے انکی طرف کوئی توجہ نہ کی، ان مدارس نے مصری عورتوں کی ترقی میں بڑا حصہ لیا،

تعلیمی نظام ابتدا میں لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس کا تعلیمی نظام و نصاب ایک تھا، البتہ لڑکیون کی تعلیم میں کچھ دستی کام بھی داخل تھے، ۱۹۱۲ء میں وزارت تعلیم نے لڑکیوں کا تعلیمی نظام علحدہ مرتب کیا، جو لڑکوں کی تعلیم سے مختلف تھا، اس میں تعلیم کی مدت چھ سال قرار پائی، نصاب میں حسب ذیل مضامین تھے:-

دینیات، تہذیب، عربی زبان وخط، انگریزی زبان وخط، فرانسیسی زبان، ترجمہ، مشاہدۂ فطرت، جغرافیہ، تاریخ، تدبیر منزل، حفظانِ صحت، تربیت جسمانی،

۱۹۲۲ئہ میں وزارت نے لڑکیوں کی تعلیم کا معیار بلند کرنے کے لئے ان کی تعلیمی مدت بڑھا کر آٹھ سال کر دی تاکہ محض پرائمری تعلیم حاصل کرنے والی لڑکیوں کی استعداد ناقص نہ رہے، اور اس نصاب کے دوسرے اور تیسرے سالوں میں بستان الاطفال کا موضوع بڑھا دیا گیا،

جب تعلیم نسواں کا دائرہ زیادہ بڑھنے لگا، تو ۱۹۲۵ئہ میں پرائمری مدارس کا نظامِ تعلیم بدل دیا گیا، اور اوکی مدت تعلیم لڑکوں کی پرائمری تعلیم کی مدت کی طرح ۵ سال کر دی گئی، اور لڑکوں اور لڑکیوں کا نصابِ تعلیم بالکل ایک کر دیا گیا، صرف عورتوں کی ضروریات کا لحاظ کرکے تھوڑا سا فرق قائم رہا، لڑکوں کی تعلیم میں دستی کام اور باغبانی داخل تھے، لڑکیوں کے نصاب میں اس کے بجائے سوزن کاری اور گھریلو ضروریات کی تعلیم کر دی گئی،

۱۹۲۸ئہ میں لڑکیوں کے پرائمری مدارس کی مدت تعلیم ۵ سال کے بجائے ۴ سال کر دی گئی، لیکن مدارس نسواں کی مدت تعلیم علی حالہ قائم رہی، پھر ۱۹۳۰ئہ اور ۱۹۳۱ئہ میں اسکی مدت تعلیم بھی ۴ سال کر دی گئی، اور لڑکیوں کی تعداد بڑھانے کے لئے وزارت نے پانچویں سال کے نصاب میں تربیتِ اطفال اور تدبیر منزل کے مضامین داخل کئے، لیکن اس کے باوجود لڑکیوں نے ادھر توجہ نہ کی، اس لئے یہ اضافہ بیکار ثابت ہوا، اور پھر وہی چار سال کی مدت رہ گئی،

۱۹۳۵ئہ میں جب ثانوی تعلیم کے نصاب میں تغیر و تبدل ہوا، تو پرائمری تعلیم کے نصاب میں بھی تھوڑی سی تبدیلی ہو گئی، اور اس کی تعلیم و امتحان کے نئے طریقے مقرر کئے گئے، لڑکوں اور لڑکیوں کے مدارس کا نصاب تعلیم تقریباً یکساں ہے، فرق اتنا ہے کہ لڑکیوں کے مدارس میں دستی کاموں کے بجائے سوزن کاری، تدبیر منزل اور موسیقی کی تعلیم لازمی ہے، اکثر مدارس میں فرانسیسی زبان بھی لازمی ہے،

عورتوں کے ثانوی مدارس، ۱۹۲۰ئہ سے پہلے وزارت کی جانب سے لڑکیوں کا کوئی ثانوی مدرسہ نہ تھا، لیکن لڑکیاں

کی پرائمری تعلیم کی روزافزوں ترقی کو دیکھ کر اس خیال سے کہ ممکن ہے پرائمری تعلیم ختم کرنے کے بعد لڑکیوں کو آگے تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہو، وزارت نے قاہرہ میں حلمیہ میں لڑکیوں کا ثانوی مدرسہ قائم کیا، اس سے لڑکیوں کی تعلیم کا ایک قدم آگے بڑھا اور ان لڑکیوں کے لئے جو پرائمری تعلیم تمام کر چکی ہوں، نئے علوم کی تحصیل کا دروازہ کھلا، اور ان کے لئے مردوں کے مساوی ترقی کی راہ پیدا ہوئی، اس اقدام سے وزارت تعلیم نے ایک ایسا فرض ادا کیا، جسے مصر میں ابتک غیر قوموں کے مدارس پورا کر رہے تھے،

اس ثانوی مدرسہ کے لئے ایسا تعلیمی نصاب بنایا گیا، جو ان کی اغراض پوری کر سکے، اس میں حسب ذیل مضامین تھے:۔

دینیات، عربی زبان، انگریزی، فرانسیسی، تاریخ، جغرافیہ، ریاضت جسمانی، تدبیر منزل، نقشہ کشی، آرٹس سائنس، سائنس کے علاوہ جملہ علوم عربی زبان میں پڑھائے جاتے تھے، موسیقی اختیاری مضمون کی حیثیت سے تھی جس سال یہ مدرسہ قائم ہوا، اس سال طالبات کی تعداد کل اٹھائیس تھی،

تعلیم کی روزافزوں ترقی اور لڑکیوں کے اعلیٰ تعلیم کے ذوق و شوق نے ثانوی تعلیم کے نظام کو یہیں تک نہیں رہنے دیا، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں وزارت تعلیم کو لڑکوں کے ثانوی تعلیم کے مدارس کے طرز پر لڑکیوں کا ایک دوسرا ثانوی مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، اور مدرسہ حلمیہ شہر میں منتقل ہو گیا، (موجودہ مدرسہ امیریہ فوزیہ بولاق) اس کی کامیابی کو دیکھکر اس کی جانب رجوع بڑھنے لگا، پھر سنیہ اور حلوان کے مدرسے ثانوی ہو گئے، ان کے علاوہ وزارت نے دو نئے ثانوی مدرسے ایک قاہرہ میں اور دوسرا اسکندریہ میں قائم کیا، ۱۹۳۲ء میں ایک ثانوی مدرسہ اسیوط میں اور دوسرا ۱۹۳۳ء میں طنطا میں قائم کیا گیا اور اب لڑکیوں کے ثانوی مدارس کی تعداد سات ہو گئی جن میں ۱۳۷۳ لڑکیاں تعلیم پاتی تھیں، ان سرکاری مدارس کے علاوہ ان پبلک ثانوی مدارس کی تعداد جنھیں سرکاری امداد ملتی ہے ۱۹۳۶ء میں دس تھی، ان میں (۷۳۰) لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں،

ان مدارس کا تعلیمی نظام و نصاب لڑکوں کے ثانوی مدارس کے طرز پر ہے، البتہ ان میں خارج از نصاب

سوزن کاری اور تدبیر منزل کے مضامین اختیاری ہیں ۱۹۲۵ء میں نصاب اور طریقہ تعلیم میں ترمیم و تنسیخ کے وقت وزارت نے لڑکیوں کے مدارس کیلئے مستقل نصاب مقرر کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس جدید ترمیم میں نسوانی ضروریات کے مضامین تدبیر منزل، سوزن کاری، ڈرائنگ، جسمانی ریاضت، موسیقی، اور تربیت اطفال وغیرہ کا زیادہ لحاظ رکھا گیا،

عورتوں کے کالج ۱۹۲۵ء میں وزارت نے اسکی ضرورت محسوس کی کہ مصر کے ترقی یافتہ طبقوں کی لڑکیوں کیلئے ایک ایسی نسوانی تہذیب مہیا کیجائے جو مصری ماحول اور ان کی ضروریات کے مناسب ہو، اور ان لڑکیوں کو عام امتحانوں میں شرکت کے بغیر خانگی زندگی کے قابل بنا سکے، اس ضرورت کی تکمیل کے لئے قاہرہ میں لڑکیوں کا ایک کالج قائم کیا گیا، اور اس کالج کے لئے طالبات تیار کرنے کے لئے ۱۹۲۸ء میں کالج سے ملحق ایک شعبہ قائم کیا گیا، پھر ۱۹۳۰ء میں "روضۃ الاطفال" قائم ہوا، ان کے علاوہ اور شعبے تھے جن میں لڑکیاں مقررہ فیس دیکر اپنی پسند کے مطابق کوئی تعلیم حاصل کر سکتی تھیں،

۱۹۳۴ء میں اسی طرز پر اسکندریہ میں بھی ایک کالج کے قیام کی تجویز ہوئی، چنانچہ ابتدائی اور خاص شعبے قائم کرکے اس کا آغاز کیا گیا، اور گذشتہ سال روضۃ الاطفال قائم کرکے اسے کالج سے ملحق کیا گیا،

دونوں کالجوں کے "روضۃ الاطفال" کا نظام عام روضۃ الاطفال کے نظام کے مطابق ہے، لیکن اس کا ابتدائی شعبہ ایک خاص طریقہ کے مطابق ہے، جس میں انگریزی فرانسیسی زبانیں ابتدائی سالوں میں ساتھ ساتھ پڑھائی جاتی ہیں، اس کا نصاب حسب ذیل ہے، دینیات، عربی، انگریزی، اور فرانسیسی زبانیں تاریخ جغرافیہ، حساب، ہندسہ، سائنس حفظان صحت، ڈرائنگ، آرٹس، تربیت جسمانی، موسیقی، سوزن کاری اور تدبیر منزل،

کالج کی مدت تعلیم چار سال ہے، اس کا خاص نظام و نصاب ہے، اسمیں بھی ثانوی مدارس کے مضامین پڑھائے جاتے ہیں، اتنا فرق ہے کہ اس میں نسوانی مضامین تدبیر منزل، سوزن کاری، تربیت اطفال، موسیقی، ڈرائنگ

مصوری وغیرہ پر زیادہ توجہ کیجاتی ہے،

۱۹۳۶ء میں وزارت تعلیم نے اندازہ کیا کہ ثانوی تعلیم کے دوسرے شعبہ کے امتحان میں کامیاب ہونیوالی طالبات سے مصری یونیورسٹی کے کالجوں میں بھیجنے کے بجائے انہیں خانگی زندگی میں لگانا زیادہ پسند کرتے ہیں، جیزہ کے کالج کا تعلیمی معیار ثانوی مدارس کی تعلیم کے معیار کے قریب تھا، اس لئے وزارت نے ان لڑکیون کے لئے جو کالج کی تعلیم ختم کر چکی ہیں، یا دوسرے شعبہ کا ڈپلوما حاصل کر چکی ہیں، یا اس کے مساوی کوئی غیر ملکی ڈپلوما ان کے پاس ہے، ایک مخصوص اور زیادہ بلند معیار شعبہ قائم کرکے اسی کالج سے ملحق کر دیا، جس میں ان کو جامع مضامین کی تعلیم دیجاتی ہے، انگریزی، اور فرانسیسی زبانون کے علوم، کپڑوں کی تراش وخراش اور بیل بوٹے وغیرہ، تدبیر منزل، نقشہ کشی، دستی کام، اس شعبہ کی مدت تعلیم دو سال ہے، مذکورۂ بالا مضامین سے جس مضمون میں طالبات تخصیص حاصل کریں گی، ان کو اسکی ڈگری دیجائیگی،

اس سلسلہ میں یہ امر لائق ذکر ہے، کہ جیزہ اور اسکندریہ دونوں کالجوں کی معلمات اسسٹنٹ مینز اور ان میں عربی زبان کی اعلیٰ تعلیم کے علاوہ کوئی مرد معلم نہیں ہے، کل کی کل عورتیں ہی ہیں، ان جملہ قسموں کے کالجوں میں طالبات کی تعداد ۱۹۳۶ء اور ۱۹۳۷ء میں (۲۶۸) تھی، (۲۱۱) جیزہ کے کالج میں اور (۵۷) اسکندریہ کے کالج میں،

ریاض الاطفال ۱۹۱۸ء سے پہلے باغبانی کی تعلیم محض پرائمری مدارس کے ابتدائی درجوں تک محدود تھی، پھر مصر کی تعلیمی ترقی کو دیکھ کر وزارت نے بچون کی نو نئی تربیت کے لئے جو ان میں تعلیم کی محبت اور شوق پیدا کرے، ان کے لئے خاص باغوں کی ضرورت محسوس کی، چنانچہ ۱۹۱۸ء میں اسکندریہ میں ایک "ریاض الاطفال" قائم کیا گیا، پھر ۱۹۱۹ء میں قاہرہ میں قائم ہوا، ان دونوں باغبانی کے مدرسوں نے بڑی کامیابی حاصل کی، یہ کامیابی دیکھ کر وزارت کو اس طریقہ تعلیم کی اشاعت کا زیادہ حوصلہ پیدا ہوا،

شروع شروع میں اس تعلیم میں صرف لڑکے تھے، پھر ۱۹۲۴ء سے لڑکیاں بھی ادھر متوجہ ہونے لگین

جب اس کی مقبولیت زیادہ بڑھی، تو مستقل باغون اور لڑکیون کے پرائمری مدرسوں سے متعلق باغون کی تعداد بھی بڑھائی جانے لگی، اور ان میں اتنا اضافہ ہوا کہ اب دونون قسمون یعنی مستقل اور غیر مستقل باغوں کی تعداد ۳۴ تک پہونچ گئی ہے جس میں (۲۵۱۴) لڑکے تعلیم پاتے ہیں،

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے مدارس کا طریقہ تعلیم زیادہ کامیاب ہے، اس کا نصاب ۱۹۲۵ء کے ترمیم شدہ نظام تعلیم کے مطابق ہے، اس میں حسب ذیل مضامین ہیں،

تہذیب، حفظان صحت، عربی زبان، عربی خط، حساب، مشاہدۂ فطرت، بچوں کے افعال واشغال کی مصوری، گانا، کھیل، اس میں کوئی غیر زبان نہیں پڑھائی جاتی،

اس کی مدت تعلیم چار سال ہے، اس میں پانچ سے لے کر آٹھ سال تک کی عمر کے لڑکے اور لڑکیاں داخل کی جاتی ہیں، ان مدارس کے لئے وزارت بہترین تربیت، کھیل اور راحت وآرام کے سامان مہیا کرتی ہے، جو لڑکے آخری سال میں کامیابی حاصل کرتے ہیں، انھیں بغیر امتحان داخلہ ابتدائی مدارس میں داخل کر لیا جاتا ہے،

ان مدارس کی معلمہ "ریاض الاطفال" کے طریقہ تعلیم کی ماہر، اس کے اعلیٰ مدرسوں کی سند یافتہ اور بعض انگلستان کے "ریاض الاطفال" کے مدارس کی پڑھی ہوئی ہیں،

لباس کی تراش وخراش کے مدارس، ۱۹۲۵ء میں وزارت نے ایسے مدارس کی ضرورت محسوس کی، جن میں لڑکیاں کپڑوں کی تراش وخراش اور بیل بوٹے بنانے میں مہارت حاصل کر کے اس کا کاروبار کر سکیں، چنانچہ اس کا ایک شعبہ قائم کر کے شبرا کے مدرسہ سے ملحق کر دیا گیا، اس میں داخلہ کے لئے ابتدائی مدرسہ کی سند یا اولی مدارس کے آخری امتحان میں کامیابی ضروری ہے، اسکی مدت تعلیم تین سال اور نصاب حسب ذیل ہے،

دینیات، لباس کی تراش وخراش، بیل بوٹے بنانا، سوزن کاری، دامنوں کی نئی نئی تراشیں،

نقشہ کشی، کپڑے دھونا، استری کرنا، بیچنے کا طریقہ، دفتری انتظام، جسمانی ریاضت کے کھیل، فرانسیسی زبان اسکی غرض یہ ہے کہ طالبات فرانس کے آئے دن کے نئے نئے فیشنوں سے واقف ہوتی رہیں،

۱۹۳۱ء میں اس تعلیم کے عملی تجربہ کے لئے مدرسہ کی نگرانی میں ایک ایسا ادارہ کھولا گیا ہے جس میں لڑکیاں تعلیمی مدت ختم کرنے کے بعد اس پیشہ کا عملی تجربہ حاصل کر سکیں، اس میں پبلک کے مشورے بھی قبول کئے جاتے ہیں، ماہر تعلیمات کی نگرانی میں عملی تجربہ سے مشاق طالبات کی تعداد روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۱۹۳۵ء میں اسکندریہ کا نسوانی صنعتوں کا کارخانہ بھی وزارت تعلیم سے متعلق کر دیا گیا ہے، اور تنہا اور زقازیق کے تراش وخراش کے مدارس بھی اس سے ملحق ہو گئے ہیں،

اس فن کی عملی مشق و مہارت کے لئے وزارت نے تعلیمی نظام میں ایک سال کا اور اضافہ کر دیا ہے جس میں تین سالہ مدت تعلیم ختم کرنے کے بعد طالبات اپنی پسند کے مطابق زیادہ ترقی یافتہ اور بلند معیار تراش وخراش میں مہارت پیدا کر سکیں، اسی سلسلہ میں جدید وضع کے دامنوں کی تراش خراش اور ٹوپیوں کے بنانے کا ایک علحدہ شعبہ ہے،

ان چاروں مدرسوں کے طالبات کی تعداد ۱۹۳۶ء میں ۷۰۰ تھی، گذشتہ سال وزارت نے ایک مدرسہ کھولا ہے جس میں کل چھ گنی سالانہ فیس دیکر طالبات یہ پیشہ سیکھتی ہیں، اس میں بڑا رجوعہ ہے، " م "

اخبار علمیہ

ہم خواب کیون دیکھتے ہین

خواب کے اسباب کیا ہیں، ؟ وہ کتنی دیر تک قائم رہتے ہیں، ؟ ایک رات میں ہم کتنے خواب دیکھتے ہیں؟ مردوں کے خواب زیادہ صاف دکھائی دیتے ہیں یا عورتوں کے، ؟ عام طور پر جو خواب نظر آتے ہیں یعنی یہ کہ ہم گر رہے ہیں، یا ہوا میں اڑ رہے ہیں، یا جنگلی جانور ہمیں دوڑا رہے ہیں، یا بغیر کپڑے پہنے ہوئے ہم لوگوں کے سامنے جا رہے ہیں، ان کے اسباب کیا ہیں ؟

اہل سائنس نے بعض خوابوں کے اسباب دریافت کئے ہیں، کبھی کبھی کوئی بہت معمولی واقعہ خواب کا سبب بن جاتا ہے، مثلاً سونے کی حالت میں قلب کا دب جانا، بستر کا اپنی جگہ سے کھسک جانا، خون کے دباؤ میں کسی قدر تخفیف کا پیدا ہونا، کسی کھڑکی کا زور سے بند کیا جانا، معملون میں تجربہ کرکے دیکھا گیا ہے، کہ برقی پنکھے کی آواز سے سونے والا ہوائی جہاز کا خواب دیکھنے لگا، جلتی ہوئی دیا سلائی سے گندھک کی بو جب ناک میں پہونچی تو بارود کا دھماکا نظر آنے لگا، روئی کی گدی سے ہاتھ رگڑا گیا، تو ایسا معلوم ہوا، کہ کوئی جھبرا کتا زبان سے چاٹ رہا ہے، اور جب آنکھوں کے سامنے سُرخ روشنی لائی گئی، تو بجلی کے طوفان دکھائی دینے لگے، یہ تجربے بہت سے آدمیون پر کئے گئے اور نتیجہ یکساں نکلا،

بعض لوگ خواب دیکھتے ہیں کہ انھیں کوئی قتل کر رہا ہے، ایسے خواب اکثر قلب یا معدہ کی خرابی

کا نتیجہ ہوتے ہیں، بلندی سے گرنے کا خواب عموماً اس وقت دکھائی دیتا ہے، جب بستر کھسک کر کسی طرف لٹک جائے، بعض آدمیوں کو خواب میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ کوئی درندہ انھیں دوڑا رہا ہے یہ اس غیر شعوری خوف کا نتیجہ ہوتا ہے جو کسی شخص کی طرف سے دل میں بیٹھا رہتا ہے، کبھی کبھی خواب میں ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ہم برف باری کے طوفان میں چلے جا رہے ہیں، یا قطب شمالی کی سیاحت کر رہے ہیں، وجہ صرف یہ ہوتی ہے، کہ نیند کی حالت میں کمبل وغیرہ کے کھسک جانے سے جسم سرد ہو جاتا ہے، یا اوڑھنے کا سامان کافی نہ ہونے کی وجہ سے سردی محسوس ہونے لگتی ہے،

تخمینہ کیا گیا ہے کہ ہمارے خوابوں میں سے ساٹھ فی صدی مناظر سے تعلق رکھتے ہیں، اس کے بعد اُن خوابوں کا درجہ ہے، جو آواز سے متعلق ہوتے ہیں، ایسے خواب زیادہ تر گانے والوں کو دکھائی دیتے ہیں جن خوابوں میں بُو اور ذائقہ کا احساس ہوتا ہے، ان کی تعداد تقریباً سب سے کم ہوتی ہے، تندرست آدمیوں کو عموماً دلچسپ خواب دکھائی دیتے ہیں، بیماروں کے خواب اس کے برعکس ہوتے ہیں، چار سال سے کم کے بچوں کو بہت کم خواب نظر آتے ہیں، سب سے زیادہ خواب بیس، اور تیئیس سال کی عمر کے درمیان دکھائی دیتے ہیں پینسٹھ سال کی عمر کے بعد خوابوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے، اور ان میں بھی اکثر زمانہ گذشتہ کے مناظر اور واقعات سے متعلق ہوتے ہیں،

بعض لوگ ایک رات میں دس دس خواب دیکھتے ہیں جن میں سے بعض زیادہ صاف نظر آتے ہیں، اور بعض کم، عورتوں کے خواب مردوں کی بہ نسبت تعداد میں بھی عموماً زیادہ ہوتے ہیں، اور زیادہ صاف بھی دکھائی دیتے ہیں، ایک خواب کی مدت تقریباً تیس سکنڈ ہوتی ہے،

خواب کی ایک بہترین مثال انگلستان کے مشہور ناول نگار چارلس ڈکنس (Charles Dickens.) کا خواب ہے، اس نے خواب دیکھا کہ وہ مر گیا ہے، اور لوگ اسے ایک تابوت گر کے ہاں لے گئے ہیں، اور وہاں صندوق تیار کرنے کے لئے گھنٹوں تختے چیرتے اور ٹھونکتے رہے، پھر ان میں

سے ایک آدمی کے ہاتھ سے ایک تختہ گر گیا، اور فوراً ہی ڈکنس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ ایک آرام کرسی میں لیٹا ہوا ہے، اور اسے کچھ غنودگی سی آگئی ہے، کھڑکی کے باہر ایک بڑھئی کام کر رہا تھا، اور اسی وقت اس کے ہاتھ سے ایک تختہ چھوٹ کر گرا تھا، ''ع ز''

(ب ۔ س)

جاوہ میں اسلامی تحریکات

اسلامی جہازران کمپنی کا قیام جاوہ کا جزیرہ ہر طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے، اس کے باوجود یہاں کوئی ایسی قومی جہازران کمپنی نہیں ہے، جو جاوی قوم کے لئے مفید ہو، جو غیر ملکی کمپنیاں ہیں، وہ استعمار کا علم بلند کرتی ہیں، ان حالات میں جاوہ کی جمعیۃ محمدیۃ نے جو جاوی قوم کی اصلاح و ترقی کی بہت مفید خدمات انجام دے چکی ہے، اس کمی کو محسوس کرکے، اپنے گیارہویں اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں جاوی حجاج کو اسلامی جہازوں پر لیجانے کے لئے حجاز اور جاوہ کے درمیان بحری راستہ کھولنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کی قرارداد منظور کی، اس کے بعد ہی "جہازرانی کی تجویز کی کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی مقرر کی، استاد محمد شجاع اس کے صدر عبدالقہار مدکر نائب صدر، اور زادین سنو مو اور سوماری اس کے ارکان قرار پائے،

انجمن مذکور کے ترجمان اخبار "عادل" نے اس تجویز کو شائع کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ اس کے مشتہر ہوتے ہی اس کمپنی کے شرکا میں نام لکھانے کے لئے کمیٹی مذکور کے دفتر میں خطوط کا تار بندھ گیا، اور اس کے اتنے خریدار پیدا ہوگئے، کہ سب کو اس میں شریک کرنے کے لئے حصّوں کی قیمت گھٹا دینی پڑی، اس کا کل سرمایہ پندرہ لاکھ ہے، جو تیس ہزار حصّوں میں تقسیم ہے، اس کمپنی کے قیام سے کچھ دنوں پہلے ایک جمعیۃ "اندونیسیا رایا" نے جہازرانی کی تعلیم کے لئے ایک شعبہ قائم کیا تھا، اب "وفلین" کے نام سے ایک بڑی کمپنی کھولی گئی ہے، اس کا صدر مقام سورابایا ہے،

انجمن معلین کی کانفرنس جاوی معلمین کی انجمن کی پچاس سالہ جبلی کی تقریب میں سارے جاوہ کے معلمین شریک

ہوئے، اس کانفرنس میں جاوا کے مدارس کے متعلق بہت سے مسائل پر بحث ہوئی، ان میں جبری تعلیم کے اجرا اور ابتدائی اور ثانوی مدارس کے مسائل خاص طور سے لائق ذکر ہیں،

جاوی عالم نسوان — جاوہ کی انجمن اتحاد نسواں نے ایک عام نسوانی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز منظور کی ہے جس میں جاوہ کی تمام نسوانی انجمنیں شریک ہوں گی، یہ کانفرنس جولائی ۱۹۳۸ء میں ہوگی، اس میں مختلف عنوانوں اور نسوانی مسائل پر خطبے پڑھے جائیں گے،

"م"

بلغاریا کے مسلمان

بلغاریا میں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض و رسوم کے ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، پایۂ تخت صوفیا میں پوری مملکت کے مفتی اعظم کا ایک صدر دفتر ہے، اور مفتی اعظم کی مدد کے لئے تین ذی علم مسلمانوں کی ایک مجلس قائم ہے، جس کے ارکان انتخاب کے ذریعہ سے مقرر کئے جاتے ہیں، صوفیا کا بھی ایک مستقل مفتی ہے، جو شہر اور اس کے حوالی کے مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تعلیمی ضروریات کا نگراں رہتا ہے، بلغاریا میں ایک جمعیۃ اسلامیہ بھی ہے، جس نے منجملہ اور رفاہی کاموں کے بہت سے ہائی اسکول قائم کر دیئے ہیں، جہاں دینیات، حدیث، تفسیر اور فقہ کی پوری تعلیم دیجاتی ہے، ان ہائی اسکولوں کا معاینہ تمامتر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، ملک میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد آٹھ لاکھ ہے، فلپوپس، شوملہ، روسچک کے شہروں اور ورزنا اور برگاز کے بندرگاہوں میں ان کی آبادی زیادہ ہے، ان کا خاص پیشہ تمباکو کی کاشت اور پیداوار ہے،

"ع ز"

سے ایک آدمی کے ہاتھ سے ایک تختہ گر گیا، اور فوراً ہی ڈکنس کی آنکھ کھل گئی، بیدار ہونے کے بعد اُس نے دیکھا کہ وہ ایک آرام کرسی میں لیٹا ہوا ہے، اور اسے کچھ غنودگی سی آگئی ہے، کھڑکی کے باہر ایک بڑھئی کام کر رہا تھا اور اسی وقت اس کے ہاتھ سے ایک تختہ چھوٹ کر گرا تھا، "ع ز"

(س- س)

جاوہ میں اسلامی تحریکات

اسلامی جہازران کمپنی کا قیام | جاوہ کا جزیرہ ہر طرف سے پانی سے گھرا ہوا ہے، اس کے باوجود یہاں کوئی ایسی قومی جہازران کمپنی نہیں ہے، جو جاوی قوم کے لئے مفید ہو، جو غیر ملکی کمپنیاں ہیں، وہ استعمار کا ظلم بلند کرتی ہیں، ان حالات میں جاوہ کی جمعیۃ محمدیہ نے جو جاوی قوم کی اصلاح و ترقی کی بہت مفید خدمات انجام دیچکی ہے، اس کمی کو محسوس کرکے، اپنے گیارھویں اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں جاوی حجاج کو اسلامی جہازوں پر لیجانے کے لئے حجاز اور جاوہ کے درمیان بحری راستہ کھولنے کے مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی کے تقرر کی قرارداد منظور کی، اس کے بعد ہی "جہازرانی کی تجویز کی کمیٹی" کے نام سے ایک کمیٹی مقرر کی، استاد محمد شجاع اس کے صدر عبدالقہار مذکر نائب صدر، اور زادین سنوموا اور سوماری اس کے ارکان قرار پائے،

انجمن مذکور کے ترجمان اخبار "عادل" نے اس تجویز کو شائع کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ اس کے مشتہر ہوتے ہی اس کمپنی کے شرکاء میں نام لکھانے کے لئے کمیٹی مذکور کے دفتر میں خطوط کا تار بندھ گیا، اور اس کے اتنے خریدار پیدا ہو گئے، کہ سب کو اس میں شریک کرنے کے لئے حصوں کی قیمت گھٹا دینی پڑی، اس کا کل سرمایہ پندرہ لاکھ ہے، جو بیس ہزار حصوں میں تقسیم ہے، اس کمپنی کے قیام سے کچھ دنوں پہلے ایک جمعیۃ "اندونسیا رایا" نے جہازرانی کی تعلیم کے لئے ایک شعبہ قائم کیا تھا، اب "دفلین" کے نام سے ایک بڑی کمپنی کھولی گئی ہے، اس کا صدر مقام سورابایا ہے،

انجمن معلمین کی کانفرنس | جاوی معلمین کی انجمن کی پچاس سالہ جبلی کی تقریب میں سارے جاوہ کے معلمین شریک

ہوئے، اس کانفرنس میں جاوا کے مدارس کے متعلق بہت سے مسائل پر بحث ہوئی، ان میں جبری تعلیم کے اجرا، اور ابتدائی اور ثانوی مدارس کے مسائل خاص طور سے لائق ذکر ہیں،

جاوی عالم نسوان جاوہ کی انجمن اتحاد نسواں نے ایک عام نسوانی کانفرنس کے انعقاد کی تجویز منظور کی ہے جس میں جاوہ کی تمام نسوانی انجمنیں شریک ہوں گی، یہ کانفرنس جولائی ۱۹۲۴ء میں ہوگی، اس میں مختلف عنوانوں اور نسوانی مسائل پر خطبے پڑھے جائیں گے،

"م"

بلغاریا کے مسلمان

بلغاریا میں مسلمانوں کو اپنے مذہبی فرائض و رسوم کے ادا کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، پایۂ تخت صوفیا میں پوری مملکت کے مفتی اعظم کا ایک صدر دفتر ہے، اور مفتی اعظم کی مدد کے لئے تین ذی علم مسلمانوں کی ایک مجلس قائم ہے جس کے ارکان انتخاب کے ذریعہ سے مقرر کئے جاتے ہیں، صوفیا کا بھی ایک مستقل مفتی ہے، جو شہر اور اس کے حوالی کے مسلمانوں کی مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تعلیمی ضروریات کا نگراں رہتا ہے، بلغاریا میں ایک جمعیۃ اسلامیہ بھی ہے، جس نے منجملہ اور رفاہی کاموں کے بہت سے ہائی اسکول قائم کر دیئے ہیں، جہاں دینیات، حدیث، تفسیر اور فقہ کی پوری تعلیم دیجاتی ہے، ان ہائی اسکولوں کا معاینہ تمام تر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، ملک میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد آٹھ لاکھ ہے، فلپوپس، شوملہ، روسچک کے شہروں اور ورنا اور برگاز کے بندرگاہوں میں ان کی آبادی زیادہ ہے، ان کا خاص پیشہ تمباکو کی کاشت اور پیداوار ہے،

"ع ز"

ادبیات

جذبِ آثر

از نواب جعفر علی خان آثر لکھنوی

شب کی بیداریاں ارے توبہ چھپ کے میخواریاں ارے توبہ،

دورِ اُس نرگسِ خماری کا اپنی سرشاریاں ارے توبہ

پارسائی کے جرمِ سنگیں پر توبہ کی خواریاں ارے توبہ

لب پہ کرّو بیوں کے تھی فریاد رات کی زاریاں ارے توبہ

کچھ کہا اور چڑھ گئی تیوری، ہم سے بیزاریاں ارے توبہ

بن کے انجان دل دکھا دینا اس پہ غمخواریاں ارے توبہ

کھا کے قسمیں وفا و الفت کی، یہ دل آزاریاں ارے توبہ

توبہ ہے اب جو تجھ کو چاہے آثر

بنہ چکیں یاریاں ارے توبہ

"تحفۂ مورِ ضعیف"

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی

مجھے تو کوئی گلہ اور کوئی ملال نہیں کہ ان سے عرضِ تمنا کی بھی مجال نہیں

یہ آپ اپنے ہی جلوؤں سے مست و بیخود ہے — فقیر راہ نشیں کا کوئی سوال نہیں

یہ زندگی نہ ہو بیدار جس کے پر تو سے — وہ تیرا حسن نہیں، وہ ترا جمال نہیں

فقط تھا ان کے تصور سے ایک ربطِ لطیف — وہ میرے پاس تھے یا دور کچھ خیال نہیں

تری نوازشِ پنہاں کا لطف کیا جانے — وہ دل جو تیری نگاہوں کا پائمال نہیں

گرا رہی ہے یہ کیوں دل پہ بجلیاں پیہم — نگاہِ ناز کو میرا اگر خیال نہیں

وہ ذوق و شوق کی ہو ایک موج پُر ہوا — جنون تو واقفِ تمکین و اعتدال نہیں

رزقی جس سے زمیں، عرش جس سے ملتا ہو — تری نگاہ میں وہ عشق کا جلال نہیں

خرد کے سامنے اک اک قدم پہ مشکل ہو — جنوں کے واسطے کچھ بھی اگر محال نہیں

یہ درد وہ ہی نہیں جس کو آرزوے قرار — یہ زخم وہ ہے جسے فکر اندمال نہیں

جنونِ عشق جہان چاہے مجھ کو لیجائے — کہ فکر سود نہیں، کچھ غمِ مآل نہیں

بس ان کی دید ہے مقصودِ آرزو میرا — وہ آئیں سامنے ان سے کوئی سوال نہیں

ادائے ناز سے مجروح ہو کے مرجانا
کمال ہو، یہ مگر عشق کا کمال نہیں

رباعیاتِ امجد

از حکیم الشعراء سید احمد حسین صاحب امجدؔ

تو ہے کہ ہمیشہ رحم فرماتا ہے — امجدؔ ہے کہ راہ پر نہیں آتا ہے
میں خوگرِ جرم، تو کرم کا عادی — ہم دونوں میں دیکھیں کون بڑھ جاتا ہے؟

ہر ذرہ پہ فضل کبریا ہوتا ہے — اک چشم زدن میں، کیا سے کیا ہوتا ہے
اصنام، دبی زبان سے یہ کہتے ہیں — وہ چاہے تو پتھر بھی خدا ہوتا ہے

دی اسٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری

مرتبہ انجمن ترقی اردو (ہند)

جس قدر انگلش اردو ڈکشنریاں ابتک شائع ہوئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ جامع اور مکمل یہ ڈکشنری ہی اس میں تخمیناً دو لاکھ انگریزی الفاظ اور محاورات کی تشریح کی گئی ہی چند خصوصیات ملاحظہ ہوں:۔

۱۔ یہ بالکل جدید ترین لغت ہی انگریزی زبان میں ابتک جو تازہ ترین اضافے ہوئے ہیں وہ تقریباً تمام کے تمام اسمیں آگئے ہیں

۲۔ اسکی سب سے بڑی اہم خصوصیت یہ ہی کہ اسمیں ادبی مقامی اور بول چال کے الفاظ کے علاوہ ان کے معنی بھی شامل ہیں جنکا تعلق علوم و فنون کی اصطلاحات سے ہی اسی طرح ان قدیم اور متروک الفاظ کے معنی بھی درج کئے گئے ہیں جو ادبی تصانیف میں استعمال ہوتے ہیں

۳۔ ہر ایک لفظ کے مختلف معنی اور فروق الگ الگ لکھے گئے ہیں، اور امتیاز کے لئے نمبر شمار دیدیا گیا ہے،

۴۔ ایسے الفاظ جنکے مختلف معنی ہیں اور انکے نازک فروق کا مفہوم آسانی سے سمجھ میں نہیں آتا، ان کی وضاحت مثالیں دیکر کیگئی ہی

۵۔ اس امر کی بہت احتیاط کی گئی ہی کہ ہر انگریزی لفظ اور محاورے کے لئے ایسا اردو مترادف لفظ اور محاورہ لکھا جائے جو انگریزی کا مفہوم صحیح طور سے ادا کر سکے، اور اس غرض کے لئے تمام اردو ادب بول چال کی زبان اور پیشہ وروں کی اصطلاحات وغیرہ کی پوری چھان بین کی گئی ہی، یہ بات کسی دوسری ڈکشنری میں نہیں ملے گی،

۶۔ ان صورتوں میں جہاں موجودہ اردو الفاظ کا ذخیرہ انگریزی کا مفہوم ادا کرنے سے قاصر ہی ایسے نئے مفرد یا مرکب الفاظ وضع کئے گئے ہیں، جو اردو زبان کی فطری ساخت کے بالکل مطابق ہیں،

۷۔ اس لغت کیلئے کاغذ خاص طور پر باریک اور مضبوط تیار کرایا گیا تھا جو بائبل پیپر کے نام سے موسوم ہی، طباعت کیلئے اردو اور انگریزی ہر دو خوبصورت ٹائپ استعمال کئے گئے ہیں، جلد بہت پائدار اور خوشنما بنوائی گئی ہے،

(ڈیمائی سائز صفحات ۱۵۱۳ + ۲۳) قیمت سولہ روپئے، کلدار، علاوہ محصولڈاک،

ملنے کا پتہ:۔ دفتر انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد (دکن)

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۂ لہب، مولینا حمید الدین فراہی مترجمہ مولینا امین احسن صاحب اصلاحی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد ۶ر، پتہ دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ،

یہ مختصر رسالہ ترجمان القرآن مولینا حمید الدین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے تفسیری رسائل کے ترجمہ کی تازہ قسط ہے، اور ان تمام معارف و حقائق اور نوادر و نکات پر مشتمل ہے، جو مولینا کی تفسیرون کا امتیاز خاص ہیں، عام مفسرین، سورۂ لہب" کو ایک خاص واقعہ سے متعلق کرکے اسے ابولہب اور اسکی بیوی کی مذمت اور بد دعا قرار دیتے ہیں، لیکن مولینا کی فکر سلیم اور تفسیر کے وہبی ملکہ نے ایک ایسی تاویل کی جانب رہنمائی کی ہے، جو بہ لحاظ معنی عام تاویل سے زیادہ جامع اور دلنشین ہے، ان کی تحقیق میں یہ سورہ بد دعا یا مذمت نہیں، بلکہ فتح مکہ کی بشارت اور سرخیل دشمنان اسلام ابولہب کی بربادی اور ہلاکت کی خبر اور پیشین گوئی ہے، اس تاویل کو ابولہب کی سیرت اس کے حالات زندگی، رسول اللہ صلعم سے اس کے تعلق اور عناد و دشمنی، دعوت و تبلیغ کے اصول، اسکے مدارج، اس سے جحود و انکار کے نتائج، قرآن کے انداز انذار و تذکیر، سورہ کے زمانۂ نزول کے حالات، ماقبل و مابعد کی سورتوں کے مضامین، کلام عرب کے شواہد، عربون کی قومی خصوصیات، ابولہب کے اعمال، مختلف آیات قرآنی، اور مختلف عقلی نقلی اور تاریخی دلائل کی روشنی میں نہایت دلنشین انداز میں پیش کیا ہے، پہلے اجمال کے ساتھ اس تاویل کو پیش کیا گیا ہے، پھر تفصیل کے ساتھ ہر آیت کی تفسیر ہے، اور ان کے باہمی ربط و مناسبات کو دکھایا گیا ہے، تمہید میں تمام دشمنان اسلام میں ابولہب کے ذکر کی تخصیص کے اسباب بتائے گئے ہیں، اور یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس سورت کو بد دعا اور مذمت ماننا

اصول تبلیغ اور تہذیب دعوت کے خلاف ہیں، پھر عام تاویل کی غلطی کے اسباب ظاہر کئے گئے ہیں، اس کے بعد آیت کی مستقل تفسیر ہے، ترجمہ نہایت سلیس اور شستہ ہے، اور مترجم مولانا امین احسن اصلاحی کی قوت بیان کا پرزور شاہد ہے ضرورت ہے کہ عام مسلمانوں کے علاوہ علماء اور طلبہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں اور اگر لوگ رسالۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڈھ کے خریدار بن جائیں تو یہ مضامین ان کو بیشتر پڑھنے کو ملیں گے،

غالب نامہ مرتبہ جناب شیخ اکرام صاحب ایم اے آئی سی ایس، تقطیع اوسط ضخامت ۴۴۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ے پتہ :- قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور

ادھر تھوڑے دنوں کے عرصہ میں مرزا غالب اور ان کے کلام پر متعدد اچھی کتابیں نکلیں، ان میں مذکورہ بالا کتاب "غالب نامہ" بھی بعض حیثیتوں سے ممتاز ہے، یہ کتاب شیخ اکرام صاحب نے محنت اور حسن مذاق سے مرتب کی ہے، اسکی تالیف میں انھوں نے یورپ کے بعض کتب خانوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، گو ان کے جن "نوادر" کا حوالہ موصوف نے دیا ہے ان میں سے بعض "تقویم پارینہ" تو ان کو ہندوستان کے معمولی کتب فروشوں بلکہ عجب نہیں کباڑ خانوں سے مل جائیں، تاہم مصنف کی محنت، اور اس سے زیادہ یہ ہمت لائق تعریف ہے، کہ انھوں نے حالی کی "یادگار" اور غلام رسول صاحب مہر کی "غالب" جیسی بلند پایہ کتابوں کے بعد غالب پر ایک مفید کتاب لکھدی، یہ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصہ "تذکرہ" میں مرزا غالب کے سوانح حیات ہیں، جو بیشتر انھیں کے خطوط اور تحریروں سے ماخوذ ہیں، دوسرے حصہ "تبصرہ" میں ان کے اردو اور فارسی کلام پر مبسوط تبصرہ ہے، اور تاریخی حیثیت سے اس کے مختلف دور متعین کرکے ہر دور کے تغیرات اور خصوصیات کو نہایت خوبی سے دکھایا گیا ہے، تیسرے حصہ "انتخاب" میں اسی تاریخی ترتیب کے مطابق ریختہ، نخانہ شباب، بہار عجم اور ارود ے معلی کے نام سے فارسی اور اردو کلام کا انتخاب ہے، جو اس کتاب کی امتیازی خصوصیت ہے،

یہ ایک اتفاقیہ توارد ہے، کہ مہر صاحب اور اکرام صاحب دونوں قریب قریب ایک ہی زمانہ میں اپنی اپنی کتابوں کی تالیف میں مصروف تھے، چنانچہ چند ہی مہینوں کے تقدیم و تاخیر سے دونوں کتابیں شائع

ہوئیں، مہر صاحب کی کتاب ریویو کے سلسلے میں عرصہ ہوا نظر سے گذری تھی، لیکن اکرام صاحب کی کتاب کو اس نظر سے دیکھنے کا اب اتفاق ہوا، جہاں تک غالب کے حالات سوانح اور تصانیف کا تعلق ہے، غالب نامہ کو غالب سے کوئی مناسبت نہیں، غالب نامہ میں بعض جزوی اضافے اور مہر صاحب کے بعض خفیف مسامحات کی تصحیح ضرور ہے لیکن یہ کوئی لائق اعتنا امتیاز نہیں ہے، ایسی خفیف تصحیح و ترمیمیں تو مابعد کی کتابوں میں ہو ہی جاتی ہیں، شیخ صاحب نے مہر صاحب کی کتاب میں ایک بڑی خامی یہ بتائی ہے کہ اس میں سوانحی ترتیب نہیں ہے، اس لئے کہ اس میں واقعات میں سنین کی ترتیب نہیں ہے، اوّلاً پوری کتاب کے متعلق یہ عام حکم لگا دینا صحیح نہیں ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ کل واقعات سنین کی ترتیب کیساتھ نہیں ہیں، لیکن یہ کتاب کی خامی نہیں، بلکہ دونوں کتابوں کی ترتیب کے فرق کا نتیجہ ہے، مہر صاحب کی کتاب کی ترتیب سنین پر نہیں، بلکہ واقعات کی ترتیب پر ہے، ممکن ہے کوئی خاص واقعہ سنین کے لحاظ سے کسی خاص مقام پر نہ ہو، لیکن وہ کسی دوسرے عنوان کے تحت میں ملے گا، کوئی واقعہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، ہاں غالب کی بعض تصانیف کے سنہ کی تعیین میں ایک دو سال کا فرق ہو گیا ہے اور دیوان غالب کے بعض نسخوں کا علم مہر صاحب کو نہیں تھا، یا انھوں نے اس کا ذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا، اس لئے کہ ان میں سے بعض کا حوالہ ڈاکٹر لطیف صاحب کی کتاب میں جو غالب سے پہلے شائع ہو چکی تھی، موجود ہے لیکن یہ دونوں فروگذاشتیں نہایت خفیف ہیں، اس سے "غالب" کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آتا، اس قسم کی تصحیح و تحقیق کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا ہے، اگر آج دیوان غالب کا کوئی ایسا نسخہ مل جائے، جو شیخ اکرام صاحب کے علم میں نہ ہو، تو اس سے غالب نامہ تھوڑا ہی ناقص کہا جائے گا، ہمارے خیال میں تو غالب کی ان خامیوں کو ظاہر کئے بغیر بھی غالب نامہ کی جگہ خالی تھی، کہ اس کے دوسرے اور تیسرے حصے نہایت مفید اضافے ہیں، مگر یہ دونوں غالب کے موضوع سے خالی تھے، یہ دونوں حصے شیخ صاحب نے بڑی تلاش و جستجو، محنت اور حسن مذاق سے مرتب کئے ہیں، اور درحقیقت یہی اس کتاب کی جان ہیں، اگر تنہا یہی دونوں حصے ہوتے تو بھی غالب نامہ کی ضرورت اور اس کے امتیاز کے لئے کافی تھا، دوسرے حصہ میں کلام غالب کے تمام پہلوؤں پر نہایت

بصیرانہ نگاہ ڈالی ہے، اور اس کے تاریخی ادوار کو متعین کر کے ہر دور کی خصوصیات و تغیرات کو بڑے حسن مذاق سے دکھایا ہے، تیسرے حصہ میں ڈاکٹر لطیف کے بنائے ہوئے ادھورے خاکہ کو مکمل کر کے کلام غالب کی بڑی مفید خدمت انجام دی ہے جو اس ترتیب کیساتھ اور کہیں نہیں مل سکتا، اس سے غالب کی شاعری کے تمام تغیرات اور ارتقائی مدارج نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں، ان خوبیوں کے ساتھ ادبی کتاب کے لحاظ سے غالب نامہ کی زبان معیار ادب سے گری ہوئی ہے،

زجر الطعان عن سب معاویہؓ بن ابی سفیان } تقطیع بڑی ضخامت ۳۲۰ صفحے، کاغذ کتابت طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ پروفیسر عبد القوی صاحب فانی ایم اے اسی پریس محمود نگر لکھنؤ و ہارون رشید صاحب مختار عدالت کلکٹری اعظم گڈہ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سوانح عمری "احسن الانتخاب" مرتبہ شاہ علی حیدر صاحب کاکوروی اپنے اصل موضوع سے زیادہ مطاعن صحابہ کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کر چکی ہے، اس میں بہت سے مسائل اہل سنت کے عقائد کے خلاف ہیں، حضرت علیؓ کے مناقب کے ساتھ ساتھ اس میں صحابہ کرام خصوصاً امیر معاویہ کے مثالب کا خاص اہتمام رکھا گیا ہے، اور اس کوشش میں ہر طرح کی رطب و یابس روایات اور تحریف و تدلیس سے کام لیا گیا ہے بعض صاحب علم حضرات نے اس کے جوابات لکھے، پھر صوفی صاحب کی طرف سے ان کے جواب الجوابات دیئے گئے، جو سب صحابہ میں "احسن الانتخاب" کے ہم نوا ہیں، اب کسی نامعلوم بزرگ نے ان دونوں کتابوں کی تردید و تنقید میں "زجر الطعان" لکھی ہے جیسا کہ اس کتاب کے نام سے ظاہر ہے، اس میں امیر معاویہ کے متعلق غلط بیانیوں کی تردید اور ان ناقابل اعتبار روایات کی تنقید ہے جن پر امیر معاویہ کے مطاعن کی بنیاد قائم کی گئی ہے، اس کے علاوہ بعض اور مختلف فیہ مسائل مثلاً آیۂ تطہیر کی شرح بھی معرض بحث میں آگئی ہے، جہاں تک اس کتاب کے موضوع یعنی امیر معاویہ کے متعلق غلط بیانیوں کا تعلق ہے، ان کی نہایت شافی تردید کی گئی ہے، لیکن مباحث میں کوئی نظم و ترتیب نہیں ہے پہلے اس سلسلہ کی پوری تاریخ ہونی چاہئے تھی، پھر مرتب طریقہ سے تردید و تنقید اور جوابات ہوتے اس

قسم کے مباحث اپنے مرتب اور واضح ہونے چاہئیں کہ ناواقف لوگ بھی انھیں پڑھ کر مقصود و مدعا سمجھ لیں اس کتاب کی مباحث تو ایسے گنجلک ہیں، کہ باخبر اشخاص کو بھی پڑھنے میں الجھن ہوتی ہے اور مشکل سے مقصد سمجھ میں آتا ہے،

احکام القرآن، مرتبہ جناب مولوی حبیب حسین صاحب صدیقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۴ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸ر پتہ سجاد حسین عبد الرزاق، نواب بازار رودولی ضلع بارہ بنکی،

احکام القرآن پر اردو میں بسوا کتابیں موجود ہیں، بعض مترجم قرآنوں کی فہرستیں اتنی مکمل ہیں کہ ان سے آسانی کیساتھ احکام القرآن مستنبط کئے جا سکتے ہیں لیکن کم استعداد اشخاص ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ہیں، انکی آسانی کیلئے مولوی حبیب حسین صاحب نے "احکام القرآن" میں اختصار کیساتھ ضروری دینی احکام و مسائل، اوامر و نواہی، وعظ و تذکیر آداب و اخلاق وغیرہ کے متعلق قرآنی تعلیمات کو آسان زبان میں مرتب کر دیا ہے، عام لوگوں کے لئے یہ کتاب مفید ہے،

مضامین رشید، شائع کردہ مکتبہ جامعہ تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۲ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے ملفوظات مختلف رسائل میں بکھرے ہوئے تھے، مکتبہ جامعہ نے انھیں مرتب کرکے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے، رشید صاحب کا مخصوص و منفرد طرز اور انکی مشہور و مسلم ظرافت و ندرت تعارف سے بے نیاز ہے آجکل مزاحیہ نگاروں کی کمی نہیں لیکن انکی تمسخر نگاری اور رشید صاحب کی لطیف اور پرمعنی ظرافت میں وہی فرق ہے جو ایک بے ہنگام قہقہے اور دلکش تبسم زیر لب میں ہوتا ہے جس میں معلوم نہیں کتنے نشتر فصاد چھپے ہوتے ہیں، ان مضامین پر تفصیلی تبصرہ شاید سنجیدگی کیطرف سے ظرافت کا مذاق اڑانا ہوگا، اسلئے ہم ناظرین کو اس زعفران زار تک براہ راست پہنچنے کا مشورہ دیتے ہیں، اس مجموعہ میں کل اٹھارہ ہی مضامین ہیں ضرورت ہے کہ مکتبہ دوسرے مضامین کو بھی تلاش کرکے انکی اشاعت کا سامان کرے،

سوز ناتمام، جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی بی اے ایل ایل بی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۳۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت عہ پتہ دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ، لاہور،

جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی صاحب طرز افسانہ نگار ہیں، سوز ناتمام ان کے بائیس افسانوں کا مجموعہ ہے

بیشتر افسانوں میں نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے جذبات و میلانات ان کے طبائع و مذاق، انکے رنگین مشاغل اور اسکے مختلف اثرات اور نتائج وغیرہ کو نتیجہ خیز شکل میں پیش کیا گیا ہے، سب افسانے دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہیں، زبان صاف و شستہ ہے،

یورپ اور اسلام مولفہ جناب مولوی عبد القیوم صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۸ ر پتہ ملک دین محمد اینڈ سنز تاجران کتب بل روڈ کشمیری بازار لاہور،

اہل یورپ آنحضرت صلعم اور اسلام کے متعلق ایک عرصہ تک غلط فہمیوں یا تعصب میں مبتلا رہے لیکن جسقدر تعصب کا پردہ ہٹتا گیا، اسی قدر ان پر اسلام کی حقانیت و صداقت روشن ہوتی گئی اور انھیں اسکا اعتراف کرنا پڑا، مولوی عبد القیوم صاحب نے ان اعترافات کو مختلف کتابوں سے چن کر جمع کر دیا ہے، اگرچہ اسلام کی صداقت اس قسم کی تعریف و تحسین سے بلند ہے نیاز ہے، لیکن جو لوگ اس قسم کے مرض میں مبتلا ہیں انکی تسکین کیلئے یہ بھی ایک نسخہ ہے، ان بیانات کے بعض ماخذ نہایت ضعیف بلکہ مجہول ہیں، مثلاً آغاز وحی کے متعلق مسٹر امیدر روڈ ورمنگھم کی بعض روایات نہایت ضعیف بلکہ شاید موضوع ہیں، حاشیہ پر ان کی تصحیح کر دینا چاہئے تھا

جواہر العربیہ حصہ اول مولفہ جناب محمد عبد الخالق صاحب بٹالوی بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۵۲ صفحے کاغذ سپید کتابت و طباعت معمولی قیمت ۱۵ ر پتہ ایم اے خالق بٹالوی قریشی اسٹریٹ فیلمنگ روڈ لاہور،

یونیورسٹیوں کے عربی امتحانات میں سہولت کے لئے آئے دن اردو میں عربی صرف و نحو پر کتابیں نکلتی رہتی ہیں، ان میں جواہر العربیہ میں بعض ایسی خصوصیتیں ہیں، جو اس قبیل کی کتابوں میں کم ملیں گی، سہولت پسندی کیلئے ایسی کتابیں عموماً قواعد کے لحاظ سے ناقص ہوتی ہیں لیکن یہ کتاب صرف کے تمام ضروری مسائل پر حاوی ہے، حروف اور خاصیت ابواب کے مباحث مستقل ہیں جو عام کتابوں میں کم یا مختصر ہوتے ہیں، اس کیساتھ کتاب کی تالیف و ترتیب میں جدید تعلیمی اصول اور طلبہ کی استعداد اور انکی تعلیمی رفتار کا لحاظ رکھا گیا ہے، ہر مسئلہ کو اختصار کے ساتھ وضاحت کیلئے مثالوں سے سمجھایا گیا ہے، مسائل کو ذہن نشین کرنیکے لئے انکی عملی مشقیں دی گئی ہیں، اور اس میں جابجا اردو سے بھی مدد لی گئی ہے، ہر بحث کے آخر میں اسکے متعلق سوالات دیدیے گئے ہیں، اور ان میں پنجاب یونیورسٹی کے امتحانات کے سوالات کا خاص طور سے لحاظ رکھا گیا ہے،

"م"

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کیلئے جن مقدس ہستیون کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدین احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کین، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفون کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدون کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ ۲۴؍ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف ۲۰؍ میں یہ دس جلدیں کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد	کتاب	قیمت	جلد	کتاب	قیمت
جلد اول	خلفائے راشدینؓ	سے ر	جلد ششم	سیر الصحابہ ششم	ع ر
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	عہ ر	جلد ہفتم	سیر الصحابہ ہفتم	عہ ر
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	سے ر	جلد ہشتم	سیر الصحابیات	عہ ر
جلد چہارم	سیر الانصار اول	سے ر	جلد نہم	اسوۂ صحابہ اول	عہ ر
جلد پنجم	سیر الانصار دوم	عہ ر	جلد دہم	اسوۂ صحابہ دوم	عہ ر

منیجر

دار المصنفین اعظم گڈھ

دارالمصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولانا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لیے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائیں،

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عہ

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے اسکی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں، مدرسوں، مکتبوں کے کارکن اور معلم اسکو نصاب تعلیم میں داخل کرینگے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عہ

مقالات شبلی، جلد ششم

(تاریخی)

یہ حصہ مولانا شبلیؒ مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن و تہذیب علم و فن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں،

ضخامت ۲۴۰ صفحے،

قیمت :- عمر

مسعود علی ندوی، مینیجر دارالمصنفین اعظمگڈھ

(مطبع معارف میں محمد اویس وارثی نے چھاپکر شایع کیا)

رجسٹرڈ نمبر اے ۴۸ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت :- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جس کا نام سیرۃ النبی تمام عام طور سے مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صرف ... اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

اب تک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جس میں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین اتمام حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اس میں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعلق متعدد اصولی بحثیں کی گئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد للعہ/ حصہ دوم تقطیع کلاں ... تقطیع خورد ... حصہ سوم تقطیع کلاں ... تقطیع خورد ... حصہ چہارم تقطیع کلاں ... تقطیع خورد ... حصہ پنجم تقطیع کلاں ...

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۱ | ماہ صفر المظفر ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۳۸ء | عدد ۴

مضامین

شذرات

ہم نے پچھلے پرچہ میں ملایا کے دو نومسلم نوجوانوں کی تعلیم کے لئے دو وظیفوں کیلئے جو صدا لگائی تھی وہ ملت کے دو بزرگوں کے کانوں تک پہنچی، لیکن چونکہ اظہار نام کے تفاخر کے بجائے اخلاص کے پردہ میں ستر حال کا حکم ہے، اس لئے اسی اخفا کیساتھ شکریہ کا فرض بھی ادا کیا جاتا ہے، ہماری قوم میں یہی چند ہستیاں ہیں جو ہر آواز پر لبیک کہتی ہیں، خدا انکی عمر وعمل میں برکت دے،

یہ دونوں طالب العلم ۶، اپریل کی شام کو لکھنؤ مدرسہ ندوۃ العلماء میں پہنچ گئے، ندوۃ العلماء میں اس قسم کے اور بھی متعدد طالب العلم آئے ہوئے ہیں، جو اردو نہیں جانتے، ان کی مذہبی تعلیم کا کام بہت مشکل ہے، پھر بھی ندوہ اپنی مالی بے مایگی کے باوجود دین کی خدمت کا خاموش جذبہ رکھتا ہے، اور اپنے کام میں لگا رہتا ہے، اے کاش کہ ہماری قوم میں اس "چپ کی داد" دینے کا شوق ہوتا،

ہم نے جب کبھی اپنی قوم کی غیرت کے لئے ان کے دوسرے ہموطنوں کے قابل رشک کارناموں کا حوالہ دیا ہے تو ہمارے بعض حساس دل بزرگوں نے اس میں اپنی قومی توہین سمجھی ہے، اور یہ بات ایک حد تک درست بھی ہے، مگر جب غیروں میں وہ چیز نظر آتی ہے، جو اپنوں میں چاہئے تھی تو رشک وغبطہ کے بوجھ سے خیال کا توازن قائم نہیں رہتا،

ہائے چپ بھی رہا نہیں جاتا،

مسلمانو! تمھارا بھی کوئی گروکل ہے، اور تم اس کے لیے سال میں کیا نذرانہ دیتے ہو؟ ایک لاکھ، پچاس ہزار، پچیس ہزار، کچھ!

آجکل کی نئی وزارتیں اپنے اپنے صوبہ میں ابتدائی تعلیم کے خاکے بنارہی ہیں، جو خاکہ بنے گا وہ عمل میں بھی آئیگا، اور اُس وقت مسلمانوں کی آنکھیں کھلیں گی، وردھا اسکیم اور سی پی کے ودیا مندر کی تجویز سب کے سامنے آچکی ہے، حکومتوں کا یہ خیال معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم کو مذہبی تعلیم سے خالی رکھیں، یہ بات تو اب بھی ہے، یعنی سرکاری ادارے مذہبی تعلیم سے خالی ہیں، مگر چونکہ پہلے تعلیم جبری نہ تھی اور نہ ساتویں برس سے سرکاری تعلیم میں جُت جانا سب پر قانون کے روسے واجب تھا، اس لئے گھروں پر ابتدائی مذہبی تعلیم پاکر مسلمان بچے سرکاری مدرسوں میں جاسکتے تھے، اور جاتے تھے، مگر اب اس جبری تعلیم اور مقررہ عمر میں ایسا ہونا بہت مشکل ہے، اس لئے یہ معاملہ ہمارے لئے بیحد قابلِ غور ہے،

دوسری طرف یہ بات بھی نظرانداز کرنے کے قابل نہیں کہ ملک کی دوسری قومیں جو ناخواندگی کے عیب کو سو فیصدی مٹا ڈالنے کیلئے کوشاں ہیں وہ آپ کا انتظار کئے بغیر چل کھڑی ہونگی، اور کچھ دنوں کے بعد ہمارے ان کے درمیان فیصدی خواندگی کا جو فرق پیدا ہوجائے گا وہ پھر مٹائے نہ مٹیگا، اس لئے اس وقت مسلمان مذہبی تعلیم کا بہانہ جبری تعلیم سے رہائی پانے کے لئے کام میں نہ لائیں، بلکہ ایک عزم والی قوم کی طرح انھیں اور مذہبی اور ملکی دونوں فرضوں کو ایک ساتھ ادا کریں، ان میں سو فیصدی آدمی مذہبی تعلیم اور خواندگی دونوں حاصل کرکے دکھادیں، یہ عزم کے سامنے مشکل نہیں،

لیکن اگر حکومتیں مذہبی تعلیم کے بارے سبکدوشی چاہیں، تو کیا مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہوجائیگا؟ اس وقت ضرورت اس کی ہوگی کہ مسلمان کسی ادارہ کے ماتحت ابتدائی مذہبی تعلیم کا جال پورے ملک میں پھیلادیں، اس کے لئے سرمایہ ہو، کتابیں بنائی جائیں، چھاپی جائیں، اردو خط اور قرآن پاک کی تعلیم کی مشکلوں کو عملاً حل کیا جائے، اس کے لئے ابتدائی اور مذہبی تعلیم کے ماہر مل کر بیٹھیں اور کوئی نظام بنائیں اور

اور اس پر عمل کی راہیں نکالیں،

ایک بات اس موقع پر صاف کہدینی ہے، ہندو بننے کے لئے کچھ جاننے کی ضرورت نہیں، لیکن مسلمان بننے کے لئے کچھ جاننے کی ضرورت ہے، ہندویت ایک سلبی حقیقت ہے، اور اسلام ایجابی، اگر ہندو اپنی نسبت کچھ نہ جانے گا تب بھی ہندو ہی رہیگا، لیکن اگر مسلمان اپنی نسبت کچھ نہیں جانے گا تو وہ مسلمان نہیں رہیگا، اس لئے مذہبی تعلیم کا نقصان ہندو کی ہندوئیت میں خلل انداز نہیں، لیکن مسلمان کے مسلمان ہونے میں خلل انداز ہوگا، حتی کہ چند نسلوں کے بعد (خاکم بدہن) مسلمان نام کا مسلمان بھی باقی نہیں رہیگا، اس لئے،

گر کردن است چارۂ مجنوں کنوں کنید

حلقہ بھوانہ ضلع جھنگ (پنجاب) سے جمعیۃ تعلیم الاسلام محمدی کے ناظم پنجاب کے عربی مدرسوں کی حالت کی طرف توجہ دلاتے ہیں، لکھتے ہیں:-

"مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ مدارس عربیہ کے موجودہ نظام اور مروجہ عربی نصاب سے بہت بیزار اور متنفر ہورہا ہے یا ہوچکا ہے، خاص کر پنجاب کا انگریزی تعلیم یافتہ اور امرا کا طبقہ عربی تعلیم و تعلم سے کوسوں دور بھاگتا اور اسے بیکار و مہمل تصور کرتا ہے (العیاذ باللہ العظیم) اور موجودہ طریق کا اسے سخت بدظن ہے، اور اس کے ساتھ زندقہ و الحاد اور نئے فتنوں کا شباب اور غیر مذاہب کا تبلیغی پروپگنڈا زوروں پر ہے بنا بریں اس وقت نہایت ہی اشد ضرورت ہے کہ مشاہیر حضرات علماے عظام ہندوستان میں عربی مدارس کے تحفظ و بقاء مستقبل میں استحکام کیلئے موجودہ نصاب تعلیم کو حسب ضرورت ترمیم فرمائیں اور نظام تعلیم کی ترقی و تنظیم کے لئے کوئی بہترین لائحہ عمل تجویز فرمائیں"

یہ متن کسی شرح کا محتاج نہیں، کیا ہمارے عربی مدارس کے علما اور مدرسین کسی ایک کو اب بھی جمع ہو کر کچھ سوچنے کی زحمت گوارا فرمائینگے؟

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا سید ریاست علی ندوی

دارالاقامہ میں طلبہ کی کثرت، کبھی کبھی دارالاقاموں میں لڑکوں کی تعداد اس قدر زیادہ ہو جاتی تھی کہ مجبوراً ایک کمرے میں دو دو اور تین تین لڑکوں کو ٹھہرانا پڑتا تھا[1] آٹھویں صدی میں جامع ازہر مصر کے دارالاقامہ میں ۵۰ لڑکے رہتے تھے[2]

دارالاقامہ کے چند قواعد قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو جو آداب سکھائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں دارالاقامہ میں طلبہ کے لئے کس قسم کے آئین و آداب رائج تھے، مثلاً

(۱) کمسن بچے کسی ولی کے بغیر دارالاقامہ میں نہ رکھے جاتے تھے، (۲) لڑکوں پر دارالاقامہ سے باہر جانے میں پابندیاں عائد تھیں، خصوصاً مشتبہ مقاموں میں جانے کی اجازت نہ تھی، محلوں کے لئے بھی ایسے مقاموں سے گذرنا احتراز کے قابل سمجھا جاتا تھا، (۳) اور نہ دارالاقامہ میں ایسے شہریوں کو آنے دینے کی اجازت تھی، جو تہذیب اور اخلاق میں لوگوں کی نگاہوں سے گرے ہوتے تھے، (۴) استادوں، لڑکوں، اور ملازموں کے علاوہ کسی ایسے شخص کو مدرسہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ تھی، جس کا مدرسہ سے کوئی تعلق نہ ہو، (۵) شریعت کے احکام کی پابندی سختی سے کرائی جاتی تھی، (۶) لڑکوں کے باہمی ملنے جلنے کے آداب اور استادوں سے ملنے جلنے میں ادب اور احترام کے آئین کی پابندی کرائی جاتی تھی،

---

[1] خطط مصر جلد ۲ ص ۱۷۱، [2] ص ۲۷۱

دارالاقامہ کے طلبہ کو چند آداب و تہذیب کی تلقین

قاضی ابن جماعہ نے دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکوں کو چند تعلیمی، معاشرتی، اخلاقی اور اجتماعی آداب اور تہذیب کی تلقین کی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اس زمانہ میں لڑکے بورڈنگوں میں کس طور و طریق سے رہتے سہتے تھے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں :-

۱۔ مدرسے اور ان کے اوقاف نہ صرف سکونت اور عیش و آرام کے لئے قائم کئے گئے ہیں، اور نہ خانقاہوں کی طرح محض نماز روزہ کی عبادتوں کے لئے ہیں، بلکہ وہ اس لئے ہیں کہ علم کی تحصیل میں مدد پہنچائیں، لڑکوں کی زندگی کے یہ دن جو مدرسوں اور دارالاقاموں میں بسر ہوتے ہیں، بڑے بیش قیمت ہیں، انھیں ایک لمحہ کے لئے ضائع نہ کرنا چاہئے، اور ان کو ان کے حقیقی اور صحیح مشغلوں میں صرف کرنے پر سب سے زیادہ نگاہ رکھنی چاہئے،

۲۔ ہر طالب علم کا فرض ہے، کہ وہ مدرسہ اور دارالاقامہ میں علم اور تعلیم میں لگے رہنے والوں سے ربط و ضبط رکھے اور ان سے مفید علمی خدمات کا ذخیرہ بڑھاتا رہے،

۳۔ دارالاقامہ میں تفریح و دلچسپی، اور خوش گپی کی جو صحبتیں قائم ہو جاتی ہیں، ان سے علحدہ رہکر تحصیل علم میں مصروف رہے،

۴۔ مدرسہ کے سبقوں اور مذاکروں کی مجلسوں میں پابندی سے شریک رہنا چاہئے، اگر دارالاقامہ میں رہنے والے لڑکے ہی درس اور مذاکرہ کی مجلسوں سے غیر حاضر رہیں گے تو مدرسہ اور دارالاقامہ کے قائم کرنے کا اصل مقصود فوت ہو جائے گا،

۵۔ مجلسوں اور حلقوں کے معلوم و متعین وقتوں میں اپنی قیام گاہ کو نہ چھوڑنا چاہئے، اور نہ مجلسوں سے اٹھ کر بار بار اپنے کمرے میں آنا چاہئے، اور نہ ان وقتوں میں باہر کے کسی شخص کو اپنے یہاں مدعو کرنا چاہئے،

۶۔ رفتار، گفتار، نشست برخاست، اور گفتگو میں آداب و تہذیب ملحوظ رکھے جائیں، چال میں میانہ روی رکھنی چاہئے، پڑھنے اور تکرار کرنے اور بحث اور مباحثہ کرنے میں آواز پست رکھی جائے اور دروازہ کھولنے

اور بند کرنے میں یہ احتیاط رکھی جائے کہ زور کی آواز نہ پیدا ہونے پائے، یہ تمام باتیں تہذیب کے خلاف ہیں،

۷۔ درس کے وقتوں میں کسی مدرس کے حلقہ کے سامنے سے گذرنا نہ چاہئے، تاکہ درس و تدریس میں خلل اندازی نہ ہو،

۸۔ دارالاقامہ کے دوسرے لڑکوں کو سلام کرنے میں پیشقدمی کرنا چاہئے، ان کی ہمسائگی، ہم جنسی، ہم سبقی، دینی برادری، اور ہم پیشگی کا لحاظ کرکے ان سے مناسب سلوک کرنا چاہئے، ان کی برائیوں سے بچنا، ان کی لغزشوں کو معاف کرنا، ان کے عیوب کو چھپانا، انکے ناروا سلوک سے چشم پوشی کرنا، اور ان میں سے احسان کرنیوالوں کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۹۔ اگر مدرسہ یا دارالاقامہ میں کسی کی بدخلقی اور بدطینتی کی وجہ سے رنج پہنچے، تو تھوڑی دیر کے لئے اس جگہ سے علحدہ ہوکر طبیعت میں سکون پیدا کرنا چاہئے، اور اگر پھر تعلقات میں ہمواری پیدا ہوکر حالات سدھر جائیں، تو اس مدرسہ سے منتقل نہ ہونا چاہئے، کیونکہ مدرسہ کو بار بار بدلنا خصوصًا مبتدیوں کے حق میں اچھا نہیں ہوتا ہے،

۱۰۔ جب مدرسہ کے حجرے میں کسی جگہ سے گذرنا پڑے، تو یہ احتیاط رکھنی چاہئے، کہ جوتوں میں سے کوئی چیز چھوٹ کر فرش یا چٹائی پر گرنے نہ پائے، اور نہ جوتے اس طرح ہاتھ میں اٹھائے جائیں، کہ دونوں جوتوں کے تلے باہم ملجائیں، بلکہ دونوں جوتوں کے اوپر کے رخ کو ایک دوسرے سے ملاکر رکھنا چاہئے، اور جوتے کسی علحدہ مقام پر رکھے جائیں لیکن مسجد کی چٹائی کے نیچے اس طریقہ سے نہ رکھے جائیں، کہ چٹائی کے ٹوٹنے کا اندیشہ ہو،

۱۱۔ اوپر کی منزل میں رہنے والوں کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ آہستہ آہستہ چلیں تاکہ تیز چلنے کی وجہ سے نیچے کی منزل والوں کو تکلیف نہ پہونچے،

۱۲۔ زینہ سے اترنے میں اگر دو آدمی ساتھ ہوجائیں تو ان میں سے چھوٹے کا فرض ہے کہ وہ جلد جلد اتر کر راستہ صاف کردے، اور جو اوپر رہ گیا ہو اسکی تہذیب کا تقاضا یہ ہوگا، کہ وہ اپنی جگہ اسی سیڑھی پر کھڑا رہے جب پہلا اترنے والا نیچے اتر جائے تو وہ اترنا شروع کرے،

اور اگر نیچے کی سیڑھی پر اوپر جانے کے لئے دو آدمی اکٹھے ہو جائیں، تو چھوٹے کو چاہئے کہ وہ زینہ سے نیچے اتر آئے، اور جب اس سے بڑی عمر کا چڑھنے والا اوپر چڑھ جائے، تو پھر وہ اوپر چڑھے،

۱۳- مدرسہ کے دروازہ یا دہلیز پر بیٹھنا نہ چاہئے، اور نہ کسی راستہ کو گھیر کر کھڑا ہونا چاہئے، تاکہ آنے جانیوالوں کو زحمت پیش آئے،

۱۴- مدرسہ کے صحن میں بلاضرورت صرف تفریح یا ورزش یا کسی کے انتظار میں چہل قدمی نہ کرنا چاہئے چلنے پھرنے کا سلسلہ امکان بھر کم رکھنا چاہئے،

۱۵- لڑکوں کے لئے جو وضو خانے بنے ہوتے ہیں، ان میں گھس پل کر جلدی وضو کرنے کی کوشش نہ کرنا چاہئے اس سے ابتذال ٹپکتا ہے، وضو کے مقام کے خالی ہونے کا انتظار کرنا چاہئے، اور اگر دروازہ بند ہو تو تین مرتبہ کھٹکھٹا کر آہستہ سے کھولنا چاہئے،

۱۶- مدرسہ اور دارالاقامہ کی دیواروں پر پتھر یا کوئلہ سے نشان نہ بنانا چاہئے، اس سے دیوار خراب ہوتی ہے، اور نہ گندے ہاتھ دیواریں پونچھنے چاہئیں، اس سے دیوار گندی ہوتی ہے،

۱۷- راہ میں گذرتے ہوئے دروازوں کی دراروں اور جھانکوں پر نظر نہ جمانی چاہئے کہ اندر کی چیزیں دکھائی دیں، اور اگر دروازہ کھلا ہو، تو ادھر سے نگاہ پھیر لینی چاہئے، اور اگر اندر سے سلام کی آواز آئے، تو جواب دے کر گذر جانا چاہئے،

۱۸- بلند آواز نہ نکالنی چاہئے، نہ پڑھنے میں اور نہ کسی کو پکارنے میں، تاکہ دوسرے کو تکلیف نہ ہو خصوصاً نمازیوں کے نماز پڑھتے وقت، اور درس کے حلقوں میں بہت آہستہ بولنا چاہئے، اسی طرح تکرار، مذاکرہ، بحث اور مباحثہ کے موقع پر،

۱۹- اگر مدرسہ جانے کا راستہ کسی کھلی راہ سے ہو تو پورے کپڑے پہن کر جانا چاہئے، خاص طور پر سر ننگا نہ رہے،

۲۰- بری عادتوں جیسے راہ چلتے دیکھنا، زور دار قہقہے مارنا، ہر وقت ہزلیات بکتے رہنا، پہلو پر یا چت

لیٹے رہنا، اونگھنا، یا بے وقت سونا، ان سب سے پرہیز کرنا چاہئے۔[۱]

مدارس کے کتب خانے، مدرسوں میں منتظمین کی طرف سے کتب خانے قائم کئے جاتے تھے جن سے علما، اور طلبہ استفادہ کرتے تھے جب بغداد میں مدرسہ مستنصریہ قائم ہوا، تو شاہی کتب خانہ سے ایک سو ساٹھ اونٹوں پر لاد کر چیدہ کتابیں مدرسہ کی عمارت میں منتقل کی گئیں[۲] اسی طرح الحاکم نے مصر میں دار الحکمۃ کے نام سے ایک دار العلم کھولا تو اس میں وسیع پیمانہ پر کتب خانہ بھی قائم کیا، مقریزی لکھتا ہے :-

"اس دار العلم میں امیر المومنین کے خزانہ سے مختلف فنون اور آداب کی کتابوں کا ایسا ذخیرہ جمع کیا گیا جس کی مثال آج تک نہیں دیکھی گئی۔

یہاں ہر شخص کو آکر فائدہ اٹھانے کی عام اجازت دیدی گئی تھی ...... بعض لوگ یہاں کتابوں کے مطالعہ کیلئے آتے بعض انھیں نقل کرنے کے لئے اور بعض سبق پڑھنے کے لئے کتابیں لیتے تھے،

اس میں لکھنے پڑھنے کی عام ضرورت کی چیزیں، روشنائی، قلم، دوات اور کاغذ بھی لوگوں کے لئے مہیا رکھی جاتی تھیں"۔[۳]

اسی طرح دوسرے مدرسوں میں کتب خانوں کے وجود کا پتہ چلتا ہے، جیسے مدرسہ ناصریہ مصر کے متعلق ہے :-

"اس میں اس نے ایک جلیل القدر کتب خانہ قائم کیا"[۴]

مدارس کے شفاخانے مدرسوں کے لئے اسی کی عمارت کے اندر جداگانہ شفاخانے بھی قائم کئے جاتے تھے جن میں مدرسہ کے متوسلین علاج و معالجہ کراتے تھے، مدرسہ مستنصریہ کے سلسلہ عمارات میں اس کے شفاخانہ کے لئے علحدہ عمارت تعمیر کی گئی تھی[۵]

---

[۱] تذکرۃ السامع از ص ۲۰۹ تا ص ۲۲۶ [۲] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۱۶ ، [۳] خطط مصر مقریزی جلد ۱ ص ۴۵۹ [۴] ، جلد ۲ ص ۳۸۲
[۵] مقالات شبلی جلد ۳ ص ۱۶،

ایوانِ درس | مدرسوں میں درس کے لئے علٰحدہ علٰحدہ ایوان (ہال) تعمیر کئے جاتے تھے جنہیں موجودہ زمانہ کا کلاس روم کہا جاسکتا ہے لیکن ان کی تقسیم درجوں کے اعتبار سے نہ تھی، بلکہ ہر استاد کے لئے درس کا ایوان علٰحدہ ہوتا تھا۔ کبھی ایوانِ درس کی دیواروں پر زینت کے لئے اشعار لکھے تھے[۱]

مقاماتِ تدریس | درس کے ہر ایوان میں استاد کے لئے مقامِ تدریس علٰحدہ بنایا جاتا تھا، ابن بطوطہ بغداد کے مشہور مدرسہ مستنصریہ کے متعلق لکھتا ہے:۔

"اس مدرسہ میں چاروں مذہبوں کی تعلیم دیجاتی ہے، ہر مذہب کے لئے مسجد (مدرسہ) میں ایک ایوان اور مقامِ تدریس ہے، مدرس کی نشست لکڑی کے ایک چھوٹے قبہ کے اندر کرسی پر جس پر فرش بچھا ہوتا ہے، ہوتی ہے"[۲]

مدرسوں کے عہدہ دار و ملازمین | اسلامی مدرسوں میں حسب ذیل عہدہ دار و ملازمین کا پتہ چل سکتا ہے:

۱۔ صدر اساتذہ

۲۔ مرتب مدرسہ

۳۔ اساتذہ

۴۔ معید

۵۔ نقیب

۶۔ خازن

۷۔ دربان

صدر اساتذہ | مدرسوں میں اساتذہ و معلمین کے درمیان فرق مراتب قائم تھا، ہر مدرسہ میں رئیس معلم کے لقب سے ایک صدر اساتذہ ہوتا تھا، جو معلمین کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا، ابو اسحٰق شیرازی نظامیہ کے پہلے صدر مدرس تھے، اور اسی کے بعض صدر اساتذہ کا ذکر تاریخ میں آیا ہے[۳]

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳۷۴، [۲] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۷، [۳] مختصر کتاب انباء الرواۃ علی انباء النحاۃ در ا ماری ص ۱۹۴

مرتب مدرسہ، مدرسوں میں مرتب مدرسہ کے لقب سے ایک عہدہ دار ہوتا تھا، جسے شاید موجودہ زمانہ کے مدرسوں کا مہتمم سمجھنا چاہئے، مدرسہ کے انتظامی امور اور نظم و نسق کے مسائل اس سے متعلق رہتے تھے، جیسے شیخ محمد ابن محمد بن احمد معروف بہ ہمام مرتب حریری متوفی ۶۱۰ھ بغداد کے مدرسۂ نظامیہ کے مرتب تھے[1]،

شیوخ و اساتذہ ہر مدرسہ میں مختلف علوم و فنون، قرآن، حدیث، تفسیر، کلام، فلسفہ، صرف و نحو وغیرہ کے لئے علحدہ علحدہ معلم ہوتے تھے جنہیں شیخ کا لقب حاصل ہوتا تھا، وہ اپنے شعبۂ علم کا نگراں ہوتا تھا، اور اس کے ماتحت اس کے نائبین ہوتے تھے،

اساتذہ کا لباس، اساتذہ کا لباس خاص ہوتا تھا، مدرسہ مستنصریہ کے اساتذہ عمامہ باندھتے اور سیاہ عبا پہنتے تھے، درس کے وقت انکے لئے اس لباس میں ملبوس رہنا ضروری تھا، ابن بطوطہ لکھتا ہے،

"مدرس اس مقام تدریس پر عمامہ باندھے ہوئے سیاہ لباس پہن کر بیٹھتا ہے، اس سے ایک خاص شان اور حکمت ظاہر ہوتی ہے"[2]

اساتذہ کا انتخاب اساتذہ کا انتخاب بڑی دیکھ بھال سے کیا جاتا تھا، ملک کے مشہور ارباب فضل ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے جاتے تھے، اور علم و دین کی خدمت کے تخیل کے ساتھ وہ اپنے فرائض انجام دیتے تھے، مدرسہ کے بانی اگر کسی غیر معمولی صاحب فضل و کمال کو کسی گاؤں میں گوشہ نشین پاتے، تو اسے کھینچ کر مدرسہ میں ملا لیتے، مدرسہ نظامیہ کا بانی نظام الملک طوسی کسی ضرورت سے بلخ گیا ہوا تھا، وہاں اسے ایک گاؤں وخش میں ایک صاحب کمال کے عزلت گزین ہونے کی اطلاع ملی، جس نے تحصیل علم میں بڑے بڑے سفر کئے تھے، اور حدیثوں کا قیمتی ذخیرہ سینہ میں محفوظ کر لیا تھا، یہ حافظ امام ابو علی حسن بن علی وخشی تھے، نظام الملک ان کے حالات سنکر ان کا مشتاق ہوا، اور انہیں بلاکر مدرسہ نظامیہ میں حدیث کی مشیخت کے عہدہ پر سرفراز کیا، اور سنن ابو داؤد خود ان سے پڑھی[3]،

---

[1] الوافی بالوفیات صفدی جلد ۱ ص ۱۵۶ [2] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۶۰ [3] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۴۴، ۳۴۵

اساتذہ کی معاشی حالت | جیسا کہ اوپر لکھا گیا، حضرت عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے معلموں کے وظیفے مقرر ہونا شروع ہوئے
پھر جب مدرسوں کا باقاعدہ نظام جاری ہوا تو ان کی تنخواہیں مقرر ہونے لگیں، مولینا شبلی مرحوم نے انکی بیش قرار تنخواہوں
کا تذکرہ اپنے مقالہ میں فرمایا ہے،

لیکن یہ تنخواہیں جس قدر بھی بیش قرار ہوں اس عہد کی عام معاشی فراغ بالی اور ارباب حکومت اور اہل
مناصب کی تنخواہوں کے لحاظ سے وہ کم تر تھیں ابن خلدون نے اپنے مقدمہ میں قاضیوں، مفتیوں، خطیبوں اور
معلموں کو ایک زمرہ میں شمار کرکے دکھایا ہے کہ یہ لوگ غیر معمولی دولت و ثروت حاصل نہیں کر سکتے، وہ لکھتا ہے:

"اس کا سبب یہ ہے کہ کسب اعمال کی قیمت ہوتا ہے، اور اعمال کی ضرورتوں کے اختلاف کے لحاظ
سے ان کی قیمتوں میں فرق ہوتا ہے جن کاموں کی تمدنی زندگی میں لوگوں کو زیادہ ضرورت ہوتی ہے
ان کی قیمت زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ عوام ان کے زیادہ حاجتمند ہوتے ہیں، لیکن ان کاموں یعنی
تدریس اور افتاء وغیرہ کے پیشوں کی عام لوگوں کو زیادہ حاجت نہیں، ان کی احتیاج زیادہ تر خواص
کو ہوتی ہے، عوام عموماً ان سے مستغنی ہوتے ہیں، حالانکہ اپنی جگہ ان کی ضرورت اور اہمیت شدید ہے
اسی لئے حکومت جو معاوضہ کی ذمہ دار ہوتی ہے، وہ ان پیشوں کے فائدوں اور مصلحتوں کا لحاظ کرکے
ان صنفوں کا اہتمام خود کرتی ہے، اس لئے ان کی معیشت کے اہتمام کی ذمہ داری بھی حکومت پر عائد
ہوتی ہے لیکن وہ (بعض دوسرے اسباب کی بنا پر جن کی تفصیل دوسری جگہ بیان کی گئی ہے)
انھیں بڑے عہدہ داروں کے مساوی معیشت مہیا نہیں کرتی ہے، پھر دوسری طرف ان پیشوں کے
لوگ اپنے علم اور فضل کی وجہ سے زیادہ خوددار ہوتے ہیں، اس لئے وہ ذلت نفس اٹھا کر رزق کی
طلب کے وہ وسائل اختیار نہیں کرتے جنھیں عام لوگ کام میں لاکر معیشت بہم پہنچاتے ہیں اسلئے یہ لوگ
عموماً زیادہ دولتمند نہیں ہوتے ہیں"۔

اس کے بعد لکھتا ہے:-

میں نے اپنا یہ نظریہ بعض ارباب فضل سے بیان کیا تھا لیکن انھوں نے اس کے قبول کرنے سے انکار کیا حُسنِ اتفاق کہ مجھے ماموں کے دفتروں کے بعض حسابوں کے پھٹے ہوئے اوراق ہاتھ آئے، جو بہت سے آمد و خرچ کے حسابوں پر مشتمل تھے، ان کے مطالعہ سے تعجب انگیز طور پر میرے اوپر کے بیان کی تصدیق ہوئی" [1]

البتہ جو اہل علم دوسرے ذرائع سے دولت جمع کر لیتے تھے، اور اپنے ذوق سے خود مدرسے قائم کرتے تھے، ان کی مثال اس سے علیحدہ ہوگی، جیسا کہ ابن بطوطہ نے بعض شہروں کے علماء اور فضلاء کی دولتمندی کا تذکرہ کیا ہے، اس کے ماسوا ہر دور میں ایسے اہل علم بھی پائے جاتے تھے، جو اپنی پرہیز گاری کی بنا پر تعلیم کی اجرت لینا جائز نہیں سمجھتے تھے، اور معاش کے حاصل کرنے کے لئے کوئی دوسری سبیل نکالتے، اور بقدر ضرورت حاصل کر کے گذر اوقات کرتے، اور تعلیم اور تعلم میں مشغول رہتے، بلکہ امام غزالی نے احیاء العلوم میں تعلیم کا معاوضہ لینے کی ممانعت کی ہے [2]

معید ہر ایوانِ درس میں ایک یا دو "معید" ہوتے تھے، جو استاد کے درس اور املا کا اعادہ کرتے جاتے تھے، ابن بطوطہ اسی سلسلۂ بیان میں کہتا ہے:

"اس (استاد) کے دائیں بائیں دو معید ہوتے ہیں، وہ ہر فقرہ کو جو استاذ لکھاتا ہے، دہراتے جاتے ہیں،

درس کی ان چاروں مجلسوں میں سے ہر مجلس میں یہی ترتیب اور نظام قائم ہے" [3]

معید کی حیثیت لڑکوں سے بلند اور استاذ سے فروتر ہوتی تھی، حوالہ کی کتابوں کا مراجعہ کرنا بھی اسی کا کام تھا، جیسے ابو اسحٰق ابراہیم بن علی بن یوسف شیرازی جو آگے چل کر مدرسہ نظامیہ بغداد کے سب سے پہلے صدر معلم نامزد ہوئے تھے، اپنے استاذ ابو الطیب طبری کے درس کے حلقہ میں معید استاذ اور بعد میں مدرسہ نظامیہ میں صدر معلم مقرر ہوئے [4]

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۲۴۲ و ص ۲۴۳ [2] احیاء العلوم کتاب العلم [3] رحلۃ ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۱۰۱ [4] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۵

معید کے فرائض اور ذاتی اوصاف میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ نیکوکار اور صاحب فضل ہو، اگر کسی وقت لڑکوں کی طرف سے کوئی نا ملائم برتاؤ ظاہر ہو، تو صبر اور ضبط کر سکتا ہو انہیں فائدہ پہنچانے کا خواہاں ہو اور انھیں اپنے فرائض کی ادائی پر مستعد رکھ سکتا ہو[1] وہ لڑکوں کے ساتھ دارالاقامہ ہی میں مقیم رہتے، اور ان کی تکرار اور مطالعہ میں جب کوئی وقت پیش آئے اور وہ استاذ کے درس اور املا کو بھول گئے ہوں تو اس وقت بھی وہ اس کے ضروری حصے دہرائے بلکہ قاضی ابن جماعہ کا بیان ہے کہ معید کا نام "معید" اسی موقع کی مناسبت سے پڑا ہے، کہ وہ خارج وقتوں میں درس کا اعادہ کرتا ہے[2]۔

معید کا منصب دسویں صدی ہجری تک مدرسوں میں باقی تھا، صاحب الشقائق النعمانیہ مصلح الدین مصطفیٰ معروف بابن البرکی زادہ متوفی ۹۱۹ھ کے متعلق لکھتا ہے:-

"یہ بعض قاضیوں کی اولاد میں سے تھے۔ اپنے زمانہ کے مشہور علماء سے تعلیم حاصل کی، پھر مولیٰ قاسم معروف بہ قاضی زادہ کی خدمت سے وابستہ ہوئے، پھر ان کے درس کے حلقہ کے معید قرار پائے، اس کے بعد بعض مدرسوں میں استاذ مقرر ہوئے، پھر سلطان بایزید نے انھیں اپنے لڑکے سلطان احمد کا معلم بنایا، اسکے بعد سلطنت کے آٹھ مدرسوں میں سے ایک مدرسہ ان کے سپرد کیا گیا[3]"۔

نقیب درس درس کے ہر ایوان میں ایک نقیب ہوتا تھا، اس کے لئے ذہین اور موقع شناس ہونا ضروری تھا، وہ مجلس کی مناسب ترتیب قائم رکھتا، حاضرین کو ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھاتا، لڑکوں کو مجلس کے آداب کے برقرار رکھنے اور درس کو توجہ سے سننے اور مجلس کے حاضرین کو خاموش رہنے کی تلقین کرتا، غرض وہی مجلس کے جملہ انتظام و انصرام کا ذمہ دار سمجھا جاتا تھا[4]۔

قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:-

"ہر حلقہ کے استاد کے لئے ایک نقیب ضروری ہے، جو ہشیار، تیز اور جری ہو، حاضرین میں ترتیب قائم کر سکے، اور جو لوگ حلقہ میں آئیں انھیں ان کے مرتبہ کے مطابق بٹھائے، سونے والوں کو بیدار کرے

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۰۲ [2] ص ۴۰ [3] الشقائق النعمانیہ حاشیہ وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۴۳۴ [4] تذکرۃ السامع ص ۱۴

طالب علموں کو جو کچھ کرنا ہے اس کے نہ کرنے پر، اور جو نہ کرنا چاہیے اس کے کرنے پر تنبیہ و اشارہ کرے، اور سبقوں کے سننے کی ہدایت کرے، اور سبق کے درمیان خاموشی قائم رکھے۔[۱]

خازن اسکی نگرانی میں مدرسہ کا کتب خانہ ہوتا تھا،

دربان اگرچہ درس کے ایوان کا دروازہ ہر صاحب علم و طالب علم کے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا، تاہم مدرسوں کی دہلیز پر دربان مقرر رہتے تھے، جو درس و تدریس کے وقتوں میں مدرسہ میں آنے جانے والوں پر نگاہ رکھتے تھے، اور غیر متعلق اور ضروری اشخاص کو اندر جانے سے روکتے تھے،[۲]

بچوں کے آغاز تعلیم کی عمر اس زمانہ میں بڑی کم عمری کے زمانہ میں بچوں کی تعلیم شروع کرا دیتے تھے، ہندوستان میں ۴ سال ۴ مہینے اور ۴ دن کی عمر میں بچوں کے مکتب کرنے کا جو رواج ہے، اس کا پتہ مغل سلاطین کے عہد سے چلتا ہے، چنانچہ بابر نے ہمایوں کا مکتب اسی عمر چار سال چار مہینے اور چار روز میں کرایا،[۳] پھر ہمایوں نے اپنے لڑکے اکبر کو بھی اسی عمر میں مکتب کے لئے بٹھایا، اکبر نامہ میں ہے:-

"از ہفتم شوال ایں سال کہ از عمر ابد پیوند حضرت شہنشاہی چہار سال و چہار ماہ و چہار روز شدہ بود، بآئین رسم و عادات آن آموختہ درس گاہ الٰہی در موزوان و بتان ربانی را در مکتب بشری درآوردند"[۴]

اگرچہ اس تعیین و تحدید کا ذکر عربی و اسلامی ملکوں کے علما کی طالب علمی کے حالات میں نظر نہیں آیا، مگر ان ملکوں میں بھی اپنے بچوں کو پڑھنے کے لئے تقریباً اسی عمر سے بٹھا دیتے تھے، اور وہ ابتدائی نوشت و خواند سے جلد فرصت پاکر آٹھ دس سال کی عمر میں پہنچتے پہنچتے مختلف علوم کے مبادیات حفظ کر لیتے تھے، اور سن شعور میں داخل ہوتے ہی علوم کے پیچیدہ مسائل سے دوچار ہو جاتے تھے، امام شافعی فرماتے ہیں:-

"میں جب مالک ابن انس کی خدمت میں حاضر ہوا، تو موطا حفظ کر چکا تھا، انھوں نے مجھے دیکھکر فرمایا کہ کسی کو بلاؤ، جو تمھارے لئے موطا پڑھے، میں نے کہا، میں خود موطا کا قاری ہوں، چنانچہ میں نے زبان

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۹۶ [۲] خطط مقریزی جلد ۲ ص ۳۶۲ [۳] پروموشن آف محمڈن لرننگ ترجمہ ناتھ لا ص ۱۲۶ بحوالہ تذکرۃ السلاطین [۴] اکبر نامہ جلد ۱ مطبع نولکشور

ان کے سامنے موطا پڑھی تھی[1]

خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔

میں نے سب سے پہلے گیارہ سال کی عمر میں حدیث سنی، کیونکہ میں یوم شنبہ ۲۴ رجادی الاخری ۳۹۲ھ کو پیدا ہوا، اور میں نے پہلی مرتبہ محرم ۴۰۳ھ میں حدیث پڑھی"[2]

ابو العباس احمد بن یحییٰ معروف بہ ثعلب نحوی کہتا ہے:۔

میں نے عربی زبان اور لغت کی تحصیل ۲۱۶ھ میں شروع کی، اور فرا نحوی کے مسائل پر ۱۸ سال کی عمر میں غور کرنے لگا، اور ۲۵ سال کی عمر تک پہونچکر فرا کا کوئی مسئلہ ایسا نہ تھا جو میرے لئے اچھوتا رہ گیا ہو، بلکہ مجھے یاد نہ ہو گیا ہو"[3]

حضرت حسن فرماتے ہیں:۔

"بچپن میں علم کی تحصیل پتھر کی لکیر کے مانند ہوتی ہے"[4]

مدت تعلیم و تحصیل طلبہ کی تعلیم کے زمانہ کی کوئی حد مقرر نہیں تھی، اور نہ علم کی تحصیل کے لئے کسی عمر کی قید تھی، زرنوجی کہتا ہے "علم کی تحصیل کا زمانہ مہد (گہوارہ) سے لحد تک ہے، بہرحال جب تک جس کے حالات اجازت دیتے، اس زندگی کو قائم رکھتا، چنانچہ اہل علم کے سوانح میں یہ نظر آتا ہے، کہ وہ تعلیم اور تحصیل سے فارغ ہو جانے کے باوجود برسوں استاد کی خدمت میں زندگی گذار دیتے تھے، اور استاذ اور معلم کہے جانے کے بجائے شاگرد اور متعلم کہلانا فخر سمجھتے تھے، لیکن پھر وہ اپنے شیخ کے درس کی مسند سے ایسے بن کر اٹھتے، کہ اس کی وفات پر اس کی جانشینی کر سکتے تھے، مثلاً ابن خلکان کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن وہب مالکی جو مصر میں امام مالک کے جانشین سمجھے گئے، وہ امام مالک کی خدمت میں بیس سال تک تحصیل علم میں مصروف رہے تھے[5]

---

[1] وفیات الاعیان جلد ا ص ۷۷۔ [2] ابن عساکر جلد ا ص ۴۰۹۔ [3] وفیات الاعیان جلد ا ص ۳۴۔ [4] تعلیم المتعلم ص ۴۰
[5] وفیات الاعیان جلد ا ص ۳۱۲۔

ابواسحاق شیرازی جو مدرسہ نظامیہ بغداد کے صدر معلم تھے، اپنے استاذ قاضی ابوالطیب کی مجلس میں دس سے زیادہ مدت تک مسلسل شریک رہے[1]

حاکم صاحب المستدرک نے شیخ ابوالحسین محمد بن محمد بن یعقوب نیشاپوری متوفی ۳۴۴ھ کی صحبت میں تحصیل و تعلم کیلئے ۳۰ سال سے زیادہ گذار دیئے[2]

اسی طرح امام احمد بن حنبل غندر کے متعلق اور ابوالولید طیالسی یحییٰ بن سعید کے متعلق بیان کرتے ہیں کہ ان دونوں نے شعبہ کی صحبت میں کامل بیس سال گذارے تھے، اور ابو عوانہ نے یزید بن زریع کی خدمت میں چالیس سال بسر کر دیئے[3]

نیز طلبہ اپنے استادوں اور دوسرے مصنفوں کی خدمت میں ان کی کتابوں کی قرأت اور سماع کی سند کے لئے قیام کرتے تھے، اور اس میں بھی سالہا سال لگ جاتے تھے، ابن مغربی کا بیان ہے کہ میں ابن حزم کیساتھ سات برس تک رہا، اور ان سے انکی تمام تصنیف سنیں[4] تاہم اس کا یہ مقصد نہیں کہ سست رفتاری سے ساری عمر طالب علمی کا سلسلہ قائم رکھتے تھے، بلکہ جہاں تک ممکن ہوتا، نوجوانی کے زمانہ کو علم کی تحصیل میں پورے انہماک سے صرف کرتے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں "اپنے فراغت نشاط اور عافیت اور نوجوانی کے زمانہ کو غنیمت جانو....."

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "فقہ کی تحصیل بال سپید ہونے سے پہلے کرلو" امام شافعی فرماتے ہیں "سردار بننے سے پہلے حاصل کرلو جب سرداری آجائیگی، تو علم حاصل نہ کرسکو گے" پھر لکھتے ہیں:

لیکن علم کے کمال کے باوجود اپنے کو مشائخ سے مستغنی نہ سمجھو؛

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:

"اپنی جوانی اور عمر کے وقتوں کو تحصیل میں لگانے میں عجلت کرو، کیونکہ عمر کی جو گھڑی گذر تی ہے، اس کا بدل کوئی دوسرا موجود نہیں"[5]

---

[1] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۳ [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۴۴ [3] ایضاً جلد ۱ ص ۱۸۳ غندر، ۲۷۷ (سعید) ۲۲۶ (ابو عوانہ) [4] ایضاً ص ۳۲۲ [5] تذکرۃ السامع ص ۳۱۰

جب جب طالب علم کی تعلیم ختم ہوتی تھی، وہ مدرسہ سے رخصت ہوتا تھا، اور لڑکے مختلف ملکوں میں مختلف عمر کو فارغ ہوتے تھے، جیسے ابن خلدون لکھتا ہے کہ مغرب کے عام شہروں میں مدرسوں میں عموماً ۱۶ سال میں تعلیم ختم کراتے تھے لیکن شہر تونس میں صرف پانچ برس میں لڑکوں کو پڑھا کر تیار کر دیتے تھے،

علماء اور طلبہ کی جسمانی ریاضت اگرچہ موجودہ زمانہ کی ورزشوں کے نظام کے مثل اسلامی مدرسوں کے نظام و دستور العمل میں کوئی مستقل انتظام نہ تھا، لیکن علماء و طلبہ اپنی جسمانی ریاضت کا خاص اہتمام کرتے تھے، تیر اندازی، اور اسپ سواری ان کی مشہور ورزشیں تھیں،

صحیح بخاری میں اس گھوڑ دوڑ کا ذکر آیا ہے جس کا اہتمام آنحضرت صلعم نے خود فرمایا تھا، اور حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ بھی گھوڑے پر سوار تھے، اونٹوں کی دوڑ بھی مشہور ہے جس میں آنحضرت صلعم کی اونٹنی دوڑی تھی[1] حضرت ابن عون کے متعلق روایت ہے، کہ وہ گھوڑے کی سواری کا شوق رکھتے تھے! ور ایک مرتبہ میدان میں گھیر کر گورخر کا شکار کیا تھا[2]، امام شافعی کو تیر اندازی میں ایسا ملکہ حاصل تھا کہ قریش میں کوئی دوسرا شخص ان کے ایسا موجود نہ تھا، وہ ایک ساتھ دس تیروں سے دس نشانے مارتے تھے[3]، امام بخاری اکثر میدان میں گھوڑے پر نکل جاتے، اور تیر اندازی کی مشق کرتے، ان کے متعلق بھی کہا گیا ہے، کہ ان کے تیر کم خطا کرتے تھے[4]، نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمن خانصاحب شروانی نے علمائے سلف میں "جسمانی ریاضت" کا عنوان قائم کرکے اسے تفصیل سے بیان کیا ہے[5]

مدرسوں میں بھی اگرچہ ورزشوں کا انتظام موجودہ زمانہ کے مثل نہ تھا، مگر ماہرین تعلیم نے مدرسہ کے لڑکوں کو جسمانی ریاضت میں خاص طور پر چہل قدمی کرنے کا مفید مشورہ دیا ہے، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

"ٹہلنے اور جسم کی ریاضت کرنے میں کوئی ہرج نہیں ہے کیونکہ وہ حرارت برانگیختہ کرتے ہیں، ردی فضلات زائل کرتے ہیں اور بدن میں نشاط پیدا کرتے ہیں[6]۔"

---

[1] صحیح بخاری [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۴۸ [3] جلد ۱ ص ۳۳۱، [4] مقدمہ فتح الباری ص ۵۹۶ [5] علمائے سلف ص ۱۲۷ و ۱۲۸ طبع دوم [6] تذکرۃ السامع ص ۷۲،

نیز مختلف علما کے سوانح سے معلوم ہوتا ہے، کہ وہ پابندی سے جسمانی ریاضت کا اہتمام کرتے تھے، ابن بطوطہ مصر کے بعض علما کے متعلق لکھتا ہے، :-

"انہی میں قوام الدین کرمانی ہیں، ان کی سکونت جامع ازہر کی اوپر کی منزل میں ہے، ان کے حلقہ میں فقیہوں اور قاریوں کی ایک جماعت ہے، جو ان سے وابستہ رہتی ہے، اور ان سے مختلف فنون کا درس لیتی ہے، اور فتاوی دیتی ہے، ان کے لباس میں موٹے اور بھدے اون کی ایک عبا، اور سیاہ اونی عمامہ ہے،

"ان کے روزانہ کے معمولات میں یہ داخل ہے، کہ وہ عصر کی نماز کے بعد فرحت بخش مقاموں اور تفریح گاہوں میں اپنے ساتھیوں سے علحدہ ہوکر تنہا چلے جاتے ہیں[1]"

حقیقت میں اس زمانہ میں لڑکوں اور معلمون کے ذمہ مختلف فرائض اس قدر تھے، کہ ان کی ورزش آپ سے آپ ہو جاتی تھی، اور وہ موجودہ زمانہ کے لوگوں سے زیادہ صحیح اور تندرست رہتے تھے، انھیں علحدہ ورزش کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، اس کے علاوہ اس زمانہ میں پاپیادہ چلنے کا رواج خاص طور پر علم کی طلب میں بہت زیادہ تھا، لوگ سیکڑوں میل پاپیادہ سفر کر ڈالتے تھے، اسلئے ان کے ٹہلنے اور پیدل چلنے کی مشق جاری رہتی تھی جسکی عادت اس زمانہ کی شہری زندگی میں کم لوگوں کو رہ گئی ہے، اسلئے اگر موجودہ اور پچھلے زمانہ کے لوگوں کی عمر کا اوسط نکالا جائے تو اُس زمانہ کے لوگ بڑی عمروں کے ثابت ہوں گے،

نزہت گاہوں کی سیر اور دوسرے تفریحی مشاغل سیر و تفریح کا مدرسوں میں بھی لحاظ رکھا جاتا تھا، جب لڑکے درس و مطالعہ سے تھک جاتے تو فرصت کے وقتوں میں نزہت گاہوں کی سیر کا مشورہ دیا جاتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:

"اگر دل دماغ اور ذہن اور نگاہ تھک جائے، یا کمزوری معلوم ہو تو سیر گاہوں میں سیر اور تفریح کرنے میں کوئی ہرج نہیں، تاکہ پہلی حالت پھر لوٹ آئے[2]"

---

[1] ابن بطوطہ جلد ۱ ص ۳۱۔ [2] تذکرۃ السامع ص ۷۰،

اساتذہ وعلما بھی سنجیدہ علمی مشغلوں سے تھک کر تفریح کے لئے دوسرے دلچسپ مشاغل اختیار کرتے تھے، حضرت ابن عباسؓ جب حدیث بیان کرتے کرتے تھک جاتے، تو شاگردوں سے فرماتے، کہ "جاؤ شعرائے دیوان اٹھا لاؤ۔[۵۱]

ابن خلکان کا بیان ہے کہ ابو نصر فارابی اپنے دمشق کے قیام کے زمانہ میں زیادہ تر کسی آبشار کے پاس یا کسی باغ کے چمن میں بیٹھکر اپنی کتابیں تصنیف کرتا تھا، اور اس کے حاجتمند وہیں جاکر اس سے فائدہ اٹھاتے تھے[۵۲]

اہل علم کبھی کبھی باغوں میں دعوتوں کا اہتمام کرتے تھے، مشہور محدث ابن خزیمہ نے ۳۰۹ھ میں باغ میں بڑے پیمانہ پر ایک دعوت دی تھی، جس میں شہر کے تمام محدثین اور طلبہ شریک ہوئے تھے،[۵۳]

طریقۂ تادیب، قاضی ابن جماعہ لڑکوں کی سرزنش کا طریقہ یہ بتاتے ہیں، کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی بات تہذیب کے خلاف سرزد ہو تو اس شخص کے سامنے نرمی سے سمجھایا جائے جس کے سامنے بدتہذیبی کی گئی ہو، اگر وہ باز نہ آئے تو پوشیدہ طور پر اسے سمجھایا جائے گر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اسے سخت الفاظ میں علانیہ تنبیہ کیجائے، اور اگر یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئے، تو اس صورت میں اس لڑکے کو علحدہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے خصوصاً اگر اس کا اثر دوسرے طالب علموں میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو۔[۵۴]

یحییٰ بن محمد بن یحیٰ بن سلام کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ قاضی اسد بن فرات درس میں معروف تھے، درس کے اثنا میں رویت باری سے متعلق ایک حدیث آئی، شاگردوں کی صف میں سلیمان الفراء جس نے بعد میں سلیمان المعتزلی کے نام سے شہرت حاصل کی، مجلس کے اخیر میں بیٹھا تھا، وہ اس وقت تک بدعتیوں کے عقیدوں سے کچھ متاثر ہو چکا تھا، اس نے اس حدیث پر کوئی اعتراض کیا، پھر رویت باری کے عقیدہ سے مجلس میں علانیہ انکار کر بیٹھا، اس کا طرز عمل گستاخانہ تھا، یہ دیکھ کر قاضی اسد سخت برہم ہوئے، اور غیظ و غضب میں اٹھ کر سلیمان کی داڑھی اور گردن پکڑ لی، اور بے تحاشا مارتے مارتے لہولہان کر دیا، اس کے بعد اپنے درس کے حلقہ سے نکال دیا،[۵۵]

[۵۱] تعلیم المتعلم ص ۴۔ [۵۲] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۱۰۱۔ [۵۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۲۶۳۔ [۵۴] تذکرۃ السامع ص ۹۱۔ [۵۵] تاریخ صقلیہ جلد ۲ ص ۲۰۷

قاضی اسد بن فرات کا یہ طرز عمل درحقیقت موجودہ زمانہ کے "رسٹیکیٹ" کے طریقہ کے مانند ہے، کہ یہ سزا ایسے موقعوں پر دیجاتی ہے جب کسی طالب علم سے کوئی ایسا جرم سرزد ہو جس کے دوسرے طلبہ میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو، چنانچہ اس موقع پر بھی سلیمان المعتزلی کے رویت باری کے عقیدہ سے انکار کا اثر حلقہ کے دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا تھا اسلئے جیسا کہ قاضی ابن جماعہ نے کہا ہے کہ اگر اس کا اثر دوسرے لڑکوں تک پھیل سکتا ہو تو اسے مدرسہ سے خارج کر دینا چاہئے، قاضی اسد نے اسی کے مطابق اپنا طرز عمل اختیار کیا، ورنہ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں کو عام طور پر پاداش میں سنگین سزائیں دینے کے حامی تھے، جیسا کہ ڈاکٹر دانیال ہانے بیرک نے شیخ سعدی کی گلستاں کے ایک قصہ اور جرمن سیاح اولیاریوس کے ایران کے ایک مکتب میں مشاہدہ سے قیاس کرکے یہ رائے قائم کی ہے، کہ اسلامی مدرسوں میں لڑکوں کے ساتھ سختی اور بے رحمی کا برتاؤ کیا جاتا تھا اس لئے یہ سمجھنا چاہئے، کہ

"اسلامی مکاتب میں بچوں کی محبت کو راہ نہ تھی"[1]

اسلامی مدارس میں استاذ بچوں کے ساتھ کس قسم کی پدرانہ شفقت سے پیش آتے تھے، اس کا اندازہ آگے چل کر ہوگا، یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ مسلمان ماہرین تعلیم لڑکوں پر جبر و تشدد کے کئے جانے اور انھیں سخت سزائیں دینے کے سخت مخالف تھے، قاضی ابن جماعہ کا بیان اوپر گذرا، ابن خلدون اپنے مقدمہ میں لکھتا ہے:

"تعلیم میں سختی طلبہ خصوصاً چھوٹے بچوں کے لئے سخت مضر ہے، طالب علم کی تربیت کا دار و مدار سختی پر ہوگا، تو اس کا انبساط و نشاط فنا ہو جائے گا، اور یہ سختی اس میں کاہلی اور سستی پیدا کرے گی، اور سزا سے بچنے کیلئے اس کو جھوٹ اور نفاق، اور مکر و فریب کی طرف مائل ہونا پڑے گا، اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اس کا خلق بن جائیں گی، اور انسانیت کی اجتماعی خصوصیتیں یعنی حمیت اور مدافعت فنا ہو جائینگی، اور وہ اس میں دوسروں کا محتاج ہو جائے گا،

جس قوم نے اس قسم کے جبر و تشدد کے ساتھ زندگی بسر کی، اسمیں تمام بداخلاقیاں پیدا ہوگئیں،

[1] اسلامی نظام تعلیم ص ۱۴۱،

یہود کو دیکھو کہ ان کی بداخلاقیاں یعنی ان کی خباثت اور مکاری کس قدر ضرب المثل ہو گئی ہے، اس بنا پر طالب علم کے متعلق معلم کا اور بچے کے متعلق باپ کا فرض یہ ہے، کہ ان کی تادیب میں جبر و استبداد کا طریقہ نہ اختیار کریں، محمد بن ابو زید نے معلموں اور متعلموں کے احکام کے متعلق جو کتاب لکھی ہے، اس میں لکھا ہے کہ بچوں کے مودب کو بوقت ضرورت تین بید سے زیادہ لگانا سزاوار نہیں،

تعلیم کا بہترین طریقہ وہ ہے جس کی تلقین رشید نے اپنے بیٹے امین کے معلم کو کی تھی، اس نے کہا کہ اے احمر! امیر المومنین نے اپنی روح اور اپنے دل کا پھل تیرے سپرد، اور تیرے ہاتھ کو اس پر دراز اور تیری اطاعت کو اس پر واجب کر دیا ہے، اب امیر المومنین نے تیرا جو درجہ مقرر کیا ہے، اس پر قائم رہ، اس کو قرآن پڑھا، اس سے اشعار کی روایت کروا، اس کو احادیث سکھا، اور ہنسنے کے اوقات کے علاوہ اس کو ہنسی سے روک، کوئی وقت ایسا نہ گذرنے پائے، کہ تو اس کو کوئی فائدہ نہ پہونچائے لیکن اس کے ساتھ اس کو غمگین نہ کر کہ اس کا ذہن مردہ ہو جائے، اور اس قدر نرمی بھی نہ اختیار کر کہ وہ عیش و فراغ کا خوگر ہو جائے، جہاں تک ممکن ہو تقرب و تلطف کیساتھ اسکی تربیت کر، لیکن اگر وہ اس سے متاثر نہ ہو، تو تو سختی کر سکتا ہے۔"[1]

امام غزالی نے بھی احیاء العلوم میں طلبہ پر سختی کرنے کی ممانعت کی ہے لکھتے ہیں :۔

"چوتھا فرض جو پیشۂ تعلیم کی باریکیوں میں ہے وہ یہ ہے، کہ طالب علم کو بداخلاقی سے اشارہ اور کنایہ میں جہاں تک ممکن ہو، روکا جائے، اور اس کی تصریح نہ کی جائے، اور مہربانی کا طریقہ رکھا جائے، ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے، کیونکہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کر دیتی ہے، اور مخالفت کی جرأت دلاتی ہے، اور اس بداخلاقی پر اصرار کرنے کی حرص پیدا کرتی ہے، اس کے علاوہ اشارہ و کنایہ اچھی طبیعتوں کو اپنے معانی کے سمجھنے اور نکالنے کی طرف مائل کرتی ہے، اور اس کے معنی کا

---

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۶۱۹ تا ۶۲۰،

سمجھنا اس پر عمل کرنے کی ترغیب دلاتا ہے۔[1]

قاضی ابن جماعہ ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں :۔

"اگر کسی طالب علم سے کوئی بات سرزد ہو تو جھڑک دینے اور سختی کرنے کے بجائے نرمی اور مہربانی سے نصیحت کیجائے، اور اس کا مقصد اس میں حسن تربیت پیدا کرنا، اس کے اخلاق کا سنوارنا، اور اس کی حالت کا درست کرنا ہو، اگر وہ طالب علم اشارہ سے سمجھ سکے، تو تصریح سے کہنے کی ضرورت نہیں ہے، اور اگر وہ تصریح کئے بغیر نہ سمجھ سکتا ہو، تو اسی طریقہ سے سمجھایا جائے، اور بتدریج اس کی تربیت کیجائے، اور اسے اچھی عادتیں سکھائی جائیں، اور عمدہ اخلاق اختیار کرنے کا شوق دلایا جائے، اور شرعی طریقہ پر اسے اچھی باتوں کے اختیار کرنے کی تلقین کیجائے"۔[2]

سالانہ امتحان اسلامی ملکوں کے مدرسوں میں سالانہ امتحان کا طریقہ رائج تھا یا نہیں، اسکی تصریح نظر سے نہیں گذری، البتہ ہندوستان میں بیجاپور میں عادل شاہ نے نظام تعلیم کے چند اصول و قواعد بنائے تھے، جن میں طالب علموں کے سالانہ امتحان کے لئے جانے اور انھیں انعامات دیے جانے کی تصریح موجود ہے؛

"وہر سال امتحان می شد و از انعام ہمایون سرفرازی می فرمودند"[3]

تعطیل اسلامی مدرسے موجودہ زمانہ کے برخلاف ہفتہ میں ایک دن کے بجائے سہ شنبہ اور جمعہ کو دو دن بند کئے جاتے تھے، کیونکہ اس زمانہ میں لڑکوں کے ذمہ کتابوں کے نسخ کرنے کی ذمہ داری بھی تھی، اسلئے وہ ان تعطیل کے دنوں میں اس کام کو کرتے، قاضی ابن جماعہ ایک سلسلہ میں لکھتے ہیں :۔

"اگر طالب علم سے یہ روزانہ انجام نہ پا سکے تو چھوٹے ہوئے کاموں کو سہ شنبہ اور جمعہ کی رات میں کریں[4]، (کیونکہ ان دونوں راتوں میں درس کے لئے مطالعہ نہیں کرنا ہوتا)

صاحب الشقائق النعمانیہ اس سے زیادہ واضح طور پر ایک سلسلۂ بیان میں لکھتا ہے :۔

---

[1] احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم، باب اداب المعلم والمتعلم، [2] تذکرۃ السامع ص ۵۰، [3] بساتین السلاطین ص ۳۵۱، [4] تذکرۃ السامع ص ۳۵۱

"اور ان کے حالات میں یہ بھی ہے، کہ ان کے زمانہ تک لڑکوں کو منگل اور جمعہ کے دن چھٹی ہوتی تھی، مولٰی موصوف نے دوشنبہ کا دن بھی اس میں بڑھا دیا، اور اس کا سبب یہ تھا کہ اس زمانہ میں علامہ تفتازانی کی کتابوں کو شہرت حاصل ہوئی، اور لڑکے ان کے پڑھنے کے مشتاق ہوئے، اور یہ کتابیں قیمت سے بھی دستیاب نہیں ہوتی تھیں، کیونکہ ان کے نسخے زیادہ شائع نہیں ہوئے تھے، اس لئے وہ ان کے لکھنے پر مجبور ہوئے، اور جب لکھنے کے وقت میں تنگی دکھائی دی تو مولٰی موصوف نے تعطیل کے دنوں میں دوشنبہ کا اضافہ کر دیا"[۱]

موسمی تعطیلات اسلامی مدرسوں میں تہواروں کے علاوہ موجودہ زمانہ کی طرح موسمی تعطیلات کا رواج تھا یا نہیں اسکی تعیین دشوار ہے، تاہم بعض مستشرقین کا نفی میں فیصلہ کرنا صحیح نہیں ہے، قاضی ابن جماعہ کا یہ بیان اس سلسلہ میں غور کرنے کے لائق ہے، وہ لکھتے ہیں:-

"بعض بڑے علما، اپنے شاگردوں کے ساتھ سال کے بعض حصّوں میں تفریح کے بعض مقامات میں جاتے تھے، اور وہاں تفریح حاصل کرتے تھے"[۲]

اور قاضی ابن جماعہ نے سخت گرمی اور جاڑے کے وقت درس وتدریس کی ممانعت کی ہے[۳]

(باقی)

[۱] الشقائق النعمانیہ برحاشیہ ابن خلکان جلد ا ص ۳۰-۳۱ [۲] تذکرۃ السامع ص ۰۲ [۳] ص ۳۳

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیم گاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا ہمولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تلاش و تحقیق کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، دارالمصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے، ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ۱۲ر "منیجر"

امالی ابی علی القالی

اور

اللآلی

مولینا ابو عبد اللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

اسلامی علوم کی تدوین مسلمانوں کے یہاں ہر قسم کے علوم و فنون کا سلسلہ دوسری صدی میں شروع ہو کر تیسری صدی کے اوائل میں پایۂ تکمیل کو پہونچ چکا تھا، چنانچہ تفسیر، حدیث، فقہ، صرف و نحو، معانی و بیان، لغت و ادبیات، فلسفہ، طب، ریاضی و ہندسہ وغیرہ تمام فنون میں ہر قسم کی تالیفات اس کثرت سے تیار ہو چکی تھیں کہ شمار میں نہیں آسکتیں،

تیسری صدی کے اواخر اور چوتھی صدی میں ماہرین و فضلا، فنون کی تکمیل و تزئین میں مصروف ہو چکے تھے، ہر ایک علم و فن کے متعلق، بلکہ ہر ایک موضوع و جزئیات فن پر سیر کن بحث کرنے کے واسطے پورا پورا سامان تیار ہو چکا تھا، جگہ جگہ عظیم الشان ذخیرے علوم و فنون کے جمع کئے گئے تھے، بالخصوص بغداد، نیشاپور اور اندلس ہر قسم کی تحقیقات کے مرکز بن چکے تھے، اس طرح علوم دینیہ ادبیہ حکمیہ صنائع و حرف پر نہایت وسیع اعلیٰ درجہ کی کتابیں لکھی گئی تھیں،

پانچویں چھٹی صدی میں ان متقدمین کے خوشہ چیں فضلا و علماء نے بطور تحشیہ و تزئین اختصار یا تشریح کے واسطے تالیفات تیار کیں، اس طرح یہ بے مثل علمی سامان کا سلسلہ ختم ہوا اور خوب ہوا! !

تلک آثارنا تدل علینا فانظروا بعدنا الی الآثار

املا کا طریقہ | اس زمانہ میں تالیف کے لئے یہ ضرورت نہ تھی کہ استاد قلم و دوات اور کتابوں کا ڈھیر لیکر کوئی کتاب تیار کرے، بلکہ علم بسینہ تھا، اور ہر ایک تالیف کے لئے چند غور و تدبر کے بعد برجستہ قلم اٹھا لیا جاتا تھا، یہ بھی ایک خاص صورت تھی، کہ استاد اپنے درس کو باقاعدہ تیار کرکے لاتا، اور طلبہ کے سامنے بطور لکچر درس دیتا، طلبہ لکھتے رہتے، جب ایک حصہ یا ایک موضوع ختم ہو جاتا تو یہی اوس کی تالیف بن جاتی، اس پر نظر ثانی کی جاتی، اور یہی تمام علما، اور فضلا میں رائج ہو جاتی، اس کا عام چرچا حسب حیثیت ہوتا، !

کبھی خاص خاص دنوں میں یہ طریقہ انجام پاتا تھا، بعض فضلا متفرق علوم و فنون کے لئے الگ الگ دن مقرر کرتے تھے، اس طرح طلبہ کو مستفید ہونے کا خوب موقع ملتا تھا، اور تعلیم ان کے ذہنوں میں خوب اثر کرتی تھی،

اس مخصوص طریق درس کو "امالی" کہتے ہیں، یہ املا کی جمع ہے، !

تفسیر، حدیث، فقہ، ادب، اور نحو وغیرہ میں اس طریقۂ درس کا گو پتہ چلتا ہے، مگر ادبی دنیا میں اس کی بیحد کثرت ہے، !

وجہ یہ ہے کہ بازار خوش کن اور خیالی باتوں سے ہمیشہ زیادہ مانوس رہتا ہے، دنیا میں جب غور و فکر کرو گے، فضولیات اور خرافات کی کثرت پر تعجب ہوگا، لوگوں کا مذاق ہمیشہ سے اسی طرح فاسد رہا، اور رہے گا، ؟

آج ذرا غور کیجئے، بازار جائیے کتب فروشوں اور مطابع کی سیر کیجئے، اخبار اور رسائل کے دفاتر پر پہونچئے، ہر جگہ عامیانہ خیالات، بیہودہ تالیفات، اور لغویات کا انبار نظر آئے گا یہی چیز تجارت میں چلتی ہے، اور اسی کی قدر تاجر کرتے ہیں، کیونکہ ان کا کوئی علمی مقصد کبھی نہیں رہا، علمی تالیف مفید اور

ضروری مضامین کمیاب، ان کی طرف رغبت کالعدم ہے، سچ ہے قُل لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ
وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ

مصر کو لیجئے جسقدر ناول، ڈرامے اور فسانے اس نے شائع کئے، اور آئے دن ترجمہ کرکے شائع کئے جاتے ہیں، ان کے مقابل علمی مطبوعات یا تراجم عشر عشیر بلکہ کبریت احمر ہیں یہی حال ہندوستان وغیرہ کا ہے، !!

ادب عربی کے عناصر اربعہ | ابن خلدون کا یہ مشورہ مقولہ ہے ہمارے استاذان ادب اپنے درس میں کہا کرتے تھے، کہ جسے فن ادب عربی سیکھنا ہوا سے یہ چار کتابیں جو اس فن کی اصل اصول ہیں پوری طرح یادداشت میں رکھنی چاہئیں،

۱- البیان والتبیین للجاحظ ۲- الکامل للمبرد

۳- الامالی لابی علی القالی، ۴- ادب الکتاب لابن قتیبہ

البیان والتبیین کے تین نسخے مصر سے یکے بعد دیگرے شائع ہوئے، ایک مختصر بھی قسطنطنیہ سے نکلا، مگر اب تک اس کی پوری خدمت نہ ہوسکی، نسخہ بہت غلط اور حل طلب ہے، فہرست اور انڈکس کی الگ ضرورت ہے، !

سچ پوچھئے تو ادب عربی میں ایسی لطیف، دلچسپ اور بلاغت و بیان کے مطالب و مسائل کی جامع کوئی کتاب نہیں معلوم ہوتی، ہونا بھی ایسا ہی چاہئے، جاحظ جیسے علامہ و فاضل نے عبد الملک بن الزیات جیسے وزیر فاضل و بلیغ کے لئے اسے مرتب کیا تھا، اس میں جو کچھ اعتناء ہو کم ہے، !

کامل اور ادب الکتاب کے کئی نسخے مصر و یورپ سے شائع ہوچکے، اور کئی شرحیں بھی طبع ہوچکی ہیں، !

ابو علی قالی کی امالی | الامالی کا نسخہ ۱۳۲۲ھ میں پہلی بار شائع ہوا تھا، پھر دوبارہ خاص اہتمام سے ۱۳۴۴ھ میں کتاب التنبیہ جو امالی کے اغلاط پر ابو عبید بکری کی تالیف ہے، اور متفرق قسم کے انڈکس کے ساتھ شائع ہوا اگرچہ

لغات کا انڈکس نہیں دیا گیا، جو بہت بڑی خامی ہے، تاہم فی الجملہ بہت سی قسم کی فہرستیں طبع ہو چکیں، یہ مضمون دراصل اسی کتاب کے متعلق ہے،

ابو علی قالی امالی کے مولف ابو علی اسمٰعیل بن القسم القالی مشرق کے وہ مایۂ ناز ادیب و لغوی ہیں، کہ امیر عبدالرحمٰن الناصر الاموی، والی اندلس (جس نے اپنا لقب پہلے پہل امیر المومنین رکھا تھا) نے بڑی رغبت اور شوق سے انھیں مغرب بلایا، یہ وہ زمانہ تھا کہ لوگ علم و فن کی ڈگری مشرق سے حاصل کرنا غایت کمال سمجھتے تھے، جس طرح آج ہر ایک علم و فضل یہاں تک کہ حدیث و فقہ وادب عربی اور تاریخ اسلام بلکہ غالباً اسلام کے لئے مغرب کی سند ہر جگہ مطلوب اور قابل قبول ہے، کچھ عجب نہیں کہ چند دنوں کے بعد نفس ایمان و اسلام کی سند کے لئے بھی ان شیدایان مغرب کو وہاں کا طواف و زیارت فرض سمجھنا پڑے گا، اور اس طرح حقائق کا استحالہ اور قلب ماہیت پوری طرح ہو جائے گی، تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ!

القالی کا مغرب میں بڑے زور و شور سے استقبال کیا گیا، انھیں اندلس کے بادشاہ حکم کے ولی عہد المستنصر کے خاص اتالیقوں میں شامل کیا گیا،

یہ وہ زمانہ تھا کہ اندلس اپنے تمدن و شان میں بغداد کا مقابلہ کر رہا تھا، اسکی دولت و سطوت انتہائے عروج و کمال پر پہونچ چکی تھی، بادشاہ کو ارباب فن و کمال سے الفت نہیں خاص شیفتگی تھی، ہر طرف سے تمام اکناف و اقطار عالم سے منتخب لوگ بلائے جاتے، ان کی تالیفات جمع کیجاتیں، ان کی ہر طرح سے خاطر و مدارات کیجاتی تھی،

قالی کے لئے یہ فخر کچھ کم نہیں کہ اندلس کے بڑے بڑے متبحر علما، و فضلا، ان کے شاگردوں میں شامل ہو گئے، ان سے استفادہ کرنا باعث فخر سمجھا، مثلاً ابو بکر محمد بن الحسن الزبیدی وغیرہ،

غور کرنے کے بعد القالی کا علمی سرمایہ لغت اور غریب کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا،

الامالی کا نسخہ قرطبہ کی جامع مسجد میں جمعرات کے لکچروں کا مجموعہ ہے، تقریباً ایک صدی یا کچھ کم و بیش

علما میں اس کا چرچا رہا، پھر یہ بھی دوسری علمی کتابوں کی طرح کسی کتب خانہ کی زینت بن گئی، تاآنکہ مطبع نے اُسے پبلک سے روشناس کیا، کبھی کبھی کسی بڑے فاضل یا کتب بین کے سامنے بھی اتفاقاً پہونچ گئی ہو گی، اس سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتاب خود کسقدر نادر اور اسکی صحت کے واسطے کسقدر محنت درکار ہوگی، کیونکہ جب عام اشاعت نہیں ہوتی اور ذوق بدل جاتا ہو تو کتاب صحیح حالت میں مشکل باقی رہتی ہو، پھر کاتبوں کی اصلاح و تحریف ضرب المثل ہے،

مؤلف کی ولادت ۲۸۸ھ میں ہوئی، یہ دیار بکر میں پیدا ہوئے، راستہ میں قالیقلا ہوتے ہوے بغداد پہونچے، یہاں القالی سے مشہور ہوگئے، کم و بیش ۲۰ برس تک بغداد میں اقامت کرکے علوم و فنون خصوصاً لغت، ادب اور نحو وغیرہ ائمۂ فن سے حاصل کئے، ان کے مشاہیر استادوں میں ابن درید الازدی المتوفی ۳۲۱ھ اور نفطویہ وغیرہ ہیں، یہ ابن درید کے پاس ان کی وفات تک رہے، اور ان کے خاص شاگردوں میں شمار ہوتے ہیں،

جو علم بغداد سے لیا اس کے واسطے قرطبہ کا میدان انھیں خوب ملا، وہاں ان کی خوب قدر ہوئی، انھوں نے بڑے اہتمام و عظمت سے اپنے ذخیرہ کو شائع کیا،

جب بغداد سے اندلس کے لئے چلے، تو راستہ میں قیروان پر گذر ہوا، جوں جوں بغداد سے فاصلہ ہوتا گیا افریقیہ کا حصہ طے کرتے گئے، تو انھیں وہاں یہ خیال پیدا ہوا، اگر فاصلہ کے لحاظ سے اندلس اسی قدر پست رہا جو میں دیکھ رہا ہوں، تو مجھے وہاں اپنی بات سمجھانے کے واسطے مترجم کی ضرورت ہو گی، لیکن قرطبہ پہنچکر انھیں وہاں کے لوگوں کے ذکاء، فہم اور فضل و علم پر بہت تعجب ہوا،

ابن بسام کا مقولہ ہے، کہ قالی بحث و مناظرہ میں طرح دیجاتے، اور کہا کرتے تھے، کہ میں فن روایت کا دھنی ہوں، نہ درایت کا، مجھ سے علم روایہ حاصل کرو، میں پوری صحت و اتقان سے علوم لغت و ادب تمھیں پہونچاؤنگا،

قرطبہ میں ۳۵۶ھ میں وفات پائی، اور وہیں دفن ہوئے،

تصانیف | امالی کے علاوہ ان کی ایک بڑی کتاب لغت میں "البارع" ہے جس میں جمہرہ اور کتاب العین وغیرہ جمع کی ہیں،

"المقصور والممدود" کا نسخہ انھوں نے جو مرتب کیا بہت جامع اور قابل تعریف سمجھا جاتا ہے، مگر افسوس کہ ابتک ہمارے پاس ان میں سے کچھ نہیں ہے، اسلئے ان پر کوئی رائے نہیں لکھ سکتے،

امالی | الامالی میں بعض مشکلات قرآن مجید، حدیث شریف اور اشعار و اخبار و نوادر مذکور ہیں، اور ان کا حل بھی جا بجا مؤلف نے کیا ہے، بعض موادِ لغت پوری تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے علاوہ مؤلف نے جو خاص بات اپنے خطبہ میں لکھی ہے، اس پر ذرا تفصیلی نظر ہونی چاہئے، مؤلف نے لکھا ہے، کہ میں نے ابدال (وہ حرف جو دوسرے کی جگہ عموماً بے قاعدہ اور کبھی باقاعدہ بدل جائے، جیسے لازم، لازب، رفل، رفن، اتل، اتن وغیرہ) کی بحث کو اس قدر استقصار سے لکھا ہے کہ کسی دوسرے نے نہیں لکھا، "مالم یؤرہ احد" اسی طرح اتباع (یعنی تابع خواہ مہمل ہو یا بامعنی مثلاً حسن بسن، شیطان لیطان، وغیرہ) جسے اردو میں عموماً تابع مہمل کہتے ہیں) کو اسقدر جمع کیا ہے، کہ کسی نے نہیں کیا، "مالم یفیدہ بشر"،

ہرچند امام ابو عبید البکری شارح امالی نے مولف کے اغلاط پر کافی بحث و تمحیص کی ہے، مگر نہ معلوم اس جگہ کوئی مفید جملہ لکھنا کیوں چھوڑ دیا، حالانکہ ان کے پاس اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا کافی ذخیرہ تھا، ممکن ہے اسطرف توجہ ہی نہ کی ہو، یا اس سے چشم پوشی کرلی ہو،

ہر شخص کا ذاتی احترام کرتے ہوئے ہر ایک ذی علم کا فرض ہے، کہ حقیقتِ حال پیش کردے، علم کی عظمت سب سے فوق اور حق سب سے اعلیٰ ہے،

ہمارے پاس ائمۂ فن کی کتابوں کی قلت معلوم ہے، پھر بھی اسوقت ایک کتاب "القلب والابدال" کے نام سے ابن السکیت المتوفی ۲۴۴ھ کی مطبوعہ بیروت ۱۹۰۳ء ہمارے سامنے ہے، اس سے جا بجا مقابلہ

کرنے کے بعد صاف معلوم ہوگیا کہ قالی نے اس کتاب کی تلخیص کی ہے، اور بہت سے لغات و مفید شروح ترک کر دیئے ہیں، زیادہ نہیں بلکہ اس سے بہت کم ہے،

اتباع میں ایک رسالہ ابوالحسین بن فارس المتوفی ۳۹۵ھ کا یورپ میں طبع ہوا تھا، جسکی نقل موجود ہے مقابلہ نہیں کیا گیا، مگر وہاں اس سے کسی طرح کم نہیں، کافی مقدار ہو گی، شرح کے علاوہ وہ حروف ہجا پر مرتب ہے، یہ سہولت اس میں الگ ہے،

الغرض مؤلف کے یہ دونوں دعوے اپنی جگہ پر مسلم نہیں معلوم ہوتے[1]، واللہ اعلم،

شرح امالی | امالی کی خدمت ابوعبید البکری عبداللہ بن عبد العزیز الاندلسی المتوفی فی حدود ۴۸۷ھ نے خوب کی بہت بلند پایہ علمی شرح لکھی جسکا نام اللآلی لکھا، اس سے مؤلف کے اغلاط الگ کر کے ایک کتاب "التنبیہ علی اغلاط القالی فی امالیہ" لکھی، اس کا بہترین نسخہ الامالی کے ساتھ ۱۳۴۴ھ ہجری میں مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

ابوعبید اللہ البکری کے علم و فضل کی نسبت علما، یک زبان ہیں، مگر اسکی تالیفات سے جو صحیح رائے اس کے بارہ میں قائم ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ نہایت ذکی، وسیع العلم، سلیم الطبع، نقاد، محقق شخص تھا، انساب، جغرافیہ، اشعار عرب کے مشکلات و مطالب پر پوری نظر تھی، اس اعتبار سے اسکی یہ شرح ایک بڑا علمی خزانہ ہے،

البکری کی معجم ما استعجم اور غالباً المسالک والممالک یا اس کا کوئی حصہ یورپ سے عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے، المعجم اشعار عرب کے مقامات کے لئے بہترین کلید ہے، اور یاقوت کی طویل و عریض کتاب سے اس بارہ میں زیادہ مفید ہے،

مولینا عبد العزیز المیمن | ہمارے پرانے دوست مولوی فاضل مولوی عبد العزیز المیمن مبارکباد کے قابل ہیں، کہ

---

[1] تعجب ہے کہ فاضل میمنی نے آٹھ برس کی طویل محنت و مقابلہ و تحقیق میں اس قسم کے علمی معاملہ کو پس پشت ڈالدیا، نہ اس طرف انکا ذہن منتقل ہوا، حالانکہ اتباع کا نسخہ وہ مجھ سے نقل کر چکے ہیں،

اللآلی کا نسخہ بڑی محنت سے آٹھ برس کی مدت میں تیار کرکے مصر ہو نچکر خود شائع کرایا، اس کے واسطے سینکڑوں کتابیں چھان ماریں، اور ہر جگہ سے اخذ کرکے ایک طویل و عریض حاشیہ السمط کے نام سے لکھا جس میں اشعار کی تخریج بڑی محنت سے کی، اور کتاب کے مشکلات پر کافی بحث و تحقیق کرکے مطالعہ کرنے والے کے لئے میدان صاف کردیا،

اس وقت مجھے اپنے دوست کے اسی کارنامہ پر تبصرہ کرنا مقصود ہے،

میمن صاحب نے مقدمہ کے ص ن پر الاستاذ الامام الشیخ محمد طیب المکی (طیب اللہ ثراہ وجعل الجنۃ مثواہ) کی بابت بیساختہ یہ لکھدیا، کہ انھوں نے لآلی کا نسخہ مکہ مکرمہ میں دیکھا، مگر اپنے عام دستور کے مطابق نہ خریدا،

شیخ مرحوم سے میمن صاحب نے صرف منطق کے چند سبق پڑھے ہیں، سمجھ میں نہیں آتا، کہ "فرغب عنھا وزھد فیھا علی عادتہ" کے جملوں سے کونسا علمی افادہ مقصود ہے، میرے نزدیک اس سے ایک بڑی جلیل القدر استاذ کی توہین ہوتی ہے،

کیا جو کتاب فروخت ہورہی ہو اسے ہر حال میں خریدنا ضروری ہے، یا اگر ایک شخص اپنے مذاق کے مطابق کسی کتاب سے ضروری نوٹ لیلے تو اس پر کتاب نہ خریدنے کا اعتراض ہو سکتا ہے،

اللآلی کا نسخہ میمن صاحب کی نگرانی میں شائع ہوا، اس لئے کافی صحت و اہتمام سے نکلا، سب سے زیادہ محنت جو فاضل میمن نے کی ہے، وہ اشعار کے ان مقامات کا حوالہ ہے، جہاں وہ کسی طرح لکھے گئے ہیں، اس کے واسطے بہت مشقت اٹھانی پڑی ہوگی، اگرچہ ایک شعر کا کئی جگہ ہونا اسکی علمی قدر و قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کرتا، البتہ دیوان کا حوالہ یا اصل ماخذ کا حوالہ کافی تھا، اس طرز تخریج کے واسطے میرے نزدیک یہ بہتر ہوگا، کہ اطراف الاحادیث کی طرح ایک مجموعہ اطراف الاشعار کا بنا دیا جائے، جس کے بعد ہمیشہ کیلئے یہ مرحلہ ختم ہوجائے اور اس قدر پریشانی اٹھانیکی ضرورت ہی باقی نہ رہے،

البکری نے جو قالی پر اعتراضات کئے ہیں ان کی بابت فاضل میمن صاحب اس طرح ریویو کرتے ہیں "
"قالی کے اغلاط پر بکری کے تنبیہات بہت شہرت رکھتے ہیں، مگر بے نتیجہ جیسا کہ کہا جاتا ہے چکی کا زور
وشور بہت سنتا ہوں مگر آٹا ندارد،
اکثر اغلاط کا اثر محض ابو علی کے اساتذہ پر پڑتا ہے، یا وہ اغلاط ہی نہیں ہیں، بلکہ مختلف روایات ہیں
مگر ابو عبید بکری نے ناپسند کرکے ان پر شور برپا کیا ہے، پھر آگے لکھتے ہیں:-
جس قسم کی غلطیاں ابو علی قالی نے کیں، اسی قسم کی خود بکری نے بھی کی ہیں"، (صـــ)
بلکہ بکری نے فاحش اغلاط کئے ہیں، (صـــ)
اس طرح فاضل میمن صاحب ابو علی کے پر زور حمایتی اور معاون و ناصر ہو گئے، آخر میں لکھتے ہیں:-
"میں نے ہر ایک بات کی صفائی کی ہے، "محصت عن کل ما اتی بہ" یہ عبارت غلط ہے صحیح
"محصت کل ما اتی بہ" مگر برائی کی تشہیر یا بدنامی کا شور برپا نہیں کیا، البتہ جہاں ابو علی قالی کی طرف
سے بدلہ لینے کی ضرورت ہوئی ہے، وہاں ایسا کیا ہے"، (صـــ)
کاش میمن صاحب اپنا فرض کتابوں سے مقابلہ انجام دیکر سکوت فرماتے، اور یہ مرحلہ ان لوگوں کے
واسطے چھوڑ دیتے، جو اس میدان کے شہسوار ہیں،
دراصل یہ میدان نہایت مشکل، پُرخطر اور بہت بڑی عقل و تمیز، طبع رسا و فکر نقاد کا محتاج ہے، ایسا نہ
ہو کہ دو کے درمیان اپنے آپ کو ڈال کر ہمیشہ کے لئے راحت سے محروم ہو جائے،
اگر البکری نے ابو علی کے اغلاط پکڑے، بفرض محال مان لیجئے کہ وہ اس کے نہیں اس کے استادوں
کے ہیں، یا زید و عمرو کے، غرض اغلاط تھے، یہی کافی ہے، ابو علی نے انھیں نقل کرکے سکوت کیوں کیا" احد الکاذبین"
کی صورت سے کسی طرح الگ نہیں ہو سکتا، اس تحقیق کی چنداں ضرورت نہیں، کہ دراصل یہ اغلاط کس کے ہیں، یا
کیوں واقع ہوئے، اسے تلاش کرنے والے خود تلاش کر لیں گے، حقیقت تلاش کرنے والے کے لئے صرف "غلط"

ہونا ہر طرح سے کافی و وافی ہے،

بطور مثال فاضل میمنی صاحب کی یہ نقل ملاحظہ ہو، لست ابالی حین اقتل مسلماً کی بابت لکھا ہے لعبیدۃ بن الحرث الھاشمی قتل مع حمزۃ یوم احد ما اتفق لفظہ واختلف معناہ ص۶، یہ الاضداد ابن الانباری سے نقل کیا ہے، اس نقل میں دو غلطیاں ہیں،

ایک یہ کہ شعر لستُ اُبالی حین اُقتلُ مُسلماً، کو عبیدہ کا بتایا حالانکہ یہ غیر معروف ہے،

دوم اصلی غلطی یہ ہے کہ عبیدۃ بن الحرث کو احد میں مقتول بتایا، حالانکہ جمہور اہل مغازی وسیر کے نزدیک بلا کسی شک وشبہہ کے عبیدہ بدر میں زخمی ہو کر راستہ میں بمقام صفرا انتقال کر گئے، وہ اب زندہ کب تھے جو احد میں حمزہ کے ساتھ قتل ہوئے، یہ ابن الانباری کی غلطی ہے، پھر اسے نقل کرنا، فاضل میمن صاحب کی غلطی ہے پس یہ غلط در غلط معاملہ ہو گیا،

ایک جگہ میمن صاحب نے "ابو العلاء وما الیہ" میں ابو عمر زاہد کی بابت کسی جگہ سے اخذ کیا ہے، کہ سوء حفظ کی وجہ سے متہم کئے جاتے تھے، مگر اس کا حوالہ نہیں دیا، یہ بالکل بے معنی اور بے دلیل بات ہے، کثرت حفظ وسیلان ذہن کی وجہ سے لوگ ان پر وضع لغات کا شبہہ کرتے تھے، کجا سوء حفظ اور کجا کثرت حفظ،

اذا دطریق العنصلین فیا منت	بہ العیس فی نائی الصوی متشائم
ان الفرزدق اذ یعوذ بخالہ	مثل الذلیل یعوذ تحت القرمل

یہ کہنا کہ اساتذہ ابی علی کے اغلاط سے ابو علی کی غلطی نہیں ثابت ہوتی، بعینہ اسی طرح ہو گا، کہ مولوی سید بدر الدین علوی صاحب استاذ جامعہ علی گڈھ اپنی "شرح مختار اشعار بشار" کے غلط سلط حواشی کو یہ کہہ کر ٹال دیں، کہ "یہ میرے نہیں، بلکہ جناب المیمنی صاحب کے عنایات و الطاف ہیں" یہ کہنا کوئی صحیح عذر نہیں ہو سکتا، غلطی کی ذمہ داری سے نہ وہ اور نہ خود میمن صاحب بچ سکتے ہیں،

فاضل میمن صاحب اپنے لئے "العاجز الغریب" کا لفظ بہت پسند کرتے ہیں، حالانکہ عجز سے شرع نے

پناہ مانگنے کی تعلیم دی ہے، اور غربت معلوم نہیں ہندی محاورہ کے مطابق وہ بہت غریب یعنی فقیر ہیں جیسے ہندی میں غریب کہا جاتا ہے،

کتاب کی غلطیاں | محشی نے یہ کتاب گو بڑی محنت سے لکھی ہے تاہم یہ دیکھکر تعجب ہوتا ہے، کہ وہ اپنی کتاب میں تحریف و تصحیف تغلیط و تردید کے بکثرت مرتکب ہوئے ہیں، چنانچہ بطور نمونہ چند اغلاط درج کئے جاتے ہیں،

۱۔ص ۵ پر اصل کتاب میں ایک لونڈی کے گانے کا ذکر ہے، پھر دوبارہ لفظ "جاریۃ" آیا ہی تو اسے "لہا" لکھا ہے، جو عام دستور ہے، اس پر فاضل میمن صاحب لکھتے ہیں، "کذا بدل وجاریۃ" ایسا معمولی استعمال کیوں فراموش ہوگیا، جسکی وجہ سے حاشیہ کی ضرورت ہوئی،

۲۔ انظرت قریش وامّا ھامت اصل کتاب میں "افنا" تھا اسے تحریف کرکے "فنا" بنایا، اور حاشیہ پر لکھا، "لا یجی افعل من الفنی" مگر اسکی دلیل نحو لغت وغیرہ سے نہ دی تعجب بالائے تعجب ہے کہ میمن صاحب نے لغات، وہ بھی لغات عرب کو اپنا خاص مملوکہ مکان خیال کرلیا ہے، یا انھے اپنا مفتوحہ علاقہ سمجھ لیا ہے، کہ جسے چاہیں قبول کریں جسے چاہیں رد کریں، اگر ان کا یہ دعوی صحیح ہے، کہ "فنی" سے "افنی" نہیں آتا، تو اسکی دلیل پیش کریں ورنہ یہ سمجھ رکھیں، کہ یہ محض بے دلیل دعوی ہے،

يقولون اقوالا ولا علم عندهم		ولو نحن قلنا حققوا لم يحققوا

۳۔ رُدّ ص ۱۴۴ وغیرہ مؤلف کتاب "رُدّ" بکثرت ایک مضمون کو دوبارہ لانے میں استعمال کرتا ہے، اسپر میمن صاحب جابجا بطور اعتراض لکھتے ہیں، "ردد کی جگہ رُدّ ہے" نہ معلوم اس حاشیہ کی کیا ضرورت پڑی اگر یہ استعمال صحیح ہے، تو اعتراض کا کیا حق ہے، اگر غلط ہے تو اسکی سند پیش کیجائے،

۴۔ اذا صنعت مالا یستحیا من مثلہ فاصنع ما شئت ص ۸۴ اس پر لکھا ہے کہ "کذا وانظر" کاش وہ یہ جملہ نہ لکھتے، حدیث شریف "اذا لم تستحی فاصنع ما شئت" کلام موجہ کہلاتا ہے، اس کے ایک معنی وہ ہیں جو عوام جانتے ہیں "جب تو بیحیا ہوجائے جو چاہے کر"

دوسرے معنی یہ ہیں "جب تو ایسا کام نہ کرے جس میں شرم وحیا کا موقع ہو تو پھر آزادی ہے جو چاہے کر سکتا ہے" یہی معنی شارح نے اس جگہ بتائے ہیں، اس پر "کذا وانظر" لکھنا انتہا غفلت نہیں تو اور کیا ہے،

۵۔ص ۶۰ پر "لیالی الدُّرَع" جسے اصل میں صحیح طور پر ضبط کیا تھا، بضم وفتح اسکی بابت خود شارح نے یہی صاف طور پر لکھا ہے "جمع لَیلۃ دَرعاء علیٰ غیر قیاس" اس پر میمن صاحب فرماتے ہیں "یہاں اور پہلے بھی دُرَع بضم دال وفتح را لکھا گیا ہے، اسکے کوئی معنی نہیں ہیں، حالانکہ تمام ائمہ لغت اسے اسی طرح روایت کرتے ہیں، اگر کسی لغوی نے کوئی کتاب لغت لکھی ہو، اور اس میں انکار کیا ہو اس کا پتہ دیا جائے، اور بتایا جائے کہ وہ کون صاحب ہیں، اور انھوں نے کس اعتبار سے یہ لکھا ہے،

۶۔ص ۱۰۵ پر شارح نے لکھا ہے کہ "وسُمّی ایضًا الجُلبۃ وجمعھا جُلَب" یعنی عُوذہ (تعویذ) کے ہم معنی جُلبہ بھی ہے، میمن صاحب تحریر فرماتے ہیں "یہ کلام مضطرب ہے، شاید اصل یہ ہو کہ اس طرح جمع ہوتے ہیں یہ لفظ ہے، یہ معنی ہیں" میمن صاحب نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کیا انھوں نے لغت عرب کا احاطہ کیا ہے، یا ان کی مادری زبان ہے، جنکی مادری زبان ہو وہ بھی کسی طرح ایسا دعویٰ نہیں کر سکتا، انھیں کہاں سے اور کیونکر یہ حق پہنچتا ہے، کہ بڑے بڑے ائمہ لغت کی بات کو بلا تحقیق رد کر دیں، آپ کو خود اضطراب ہو گیا، اصل کتاب میں کوئی اضطراب نہیں، تمام کتب لغت میں جلبہ اس معنی میں موجود ہے،

یہ کہنا بھی فضول و بے معنی ہے، کہ "ابو علی کی جس طرح کی غلطیاں ہیں، خود البکری نے بھی ایسی غلطیاں کی ہیں" اس سے غلطی کا بار ہلکا نہیں ہوتا، غلطیاں ہر ایک سے ہوا کرتی ہیں، اور ہوتی رہیں گی، مگر ایک علما و فضلا کی غلطیاں ہیں، اور ایک عوام وفضولیین، اور عجزہ و غرباء کے اغلاط ہیں،

جس طرح کسی شہسوار کا گرنا اور کسی اناڑی کا دونوں ہرگز یکساں نہیں ہو سکتے،!

وَمَن ذا الذی ترضی سجایاہ کلّھا ۔۔۔ کفی المرءَ نُبلًا اَن تُعدَّ معایبُہ

میمن صاحب خواہ مخواہ القالی کے حامی اور البکری کے دشمن بن گئے، ورنہ ان کا قدیم دستور ہے کہ جب

کسی کے حالات لکھتے ہیں، یا اس کی کتاب طبع کراتے ہیں، تو اسکی حمایت میں کمی نہیں کرتے، اور جہانتک بن پڑتا ہے اسے معصوم ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، دیکھئے "ابن رشیق" کے حالات میں جس کی بابت عجیب وغریب خبر سُنی گئی ہے، یہ لکھا ہے، "ابن رشیق کی کل تین غلطیاں معلوم ہوئی ہیں"، غالباً یہ پرانے زمانے کی بات ہے جب کہ بی اے کورس کے ترجمہ کے واسطے دو سو کتابیں چھانی گئی تھیں، پھر بھی کئی جگہ بیاض چھوڑ دی تھی،

"ابوالعلاء وما الیہ" کا کیا کہنا، اسکے واسطے میمن صاحب پورے زور وشور سے اٹھے، اور خوب حمایت کی، کتاب کیا لکھی، نری تقریظ و مدح، نہ ابوالعلاء کی کوئی علمی غلطی ملی، نہ مذہبی واعتقادی غلطی ثابت ہو سکی، نہ الحاد کے خیالات کا ثبوت "لزوم مالا یلزم" وغیرہ سے مل سکا، اور نہ نثر و نظم میں کوئی غلطی اس غریب اعمیٰ نے کی، جس کی وجہ سے بصیر اس پر اس قدر فریفتہ ہو گیا، کہ تین سو صفحات سے زیادہ کی تالیف میں اسکی کوئی غلطی نہ نکال سکا، نہ نثر پر اعتراض کیا نہ نظم پر،

کتاب کیا ہے، اول سے آخر تک مبالغہ آمیز مدح وستایش ہے، کتاب کے واسطے پورے نقد کی ضرورت ہے، یہ بات صحف میں نہیں ملتی، جسے نقل کر دیا جائے، اسکی نظم و نثر پر فن کی حیثیت سے صحیح گفتگو کیجاتی اس کے خیالات کی تمحیص کیجاتی، صرف ادھر ادھر سے نقل کرکے غلط سلط رد و قدح کرنا، اور احکام شرعیہ کے واسطے غلط حیلے نکالنا کہ شرع نے سارق کی حد کے لئے کوئی نصاب مقرر نہیں کیا، مرد میدان کا کام نہیں، ہر بات اسکے اصل کے لئے چھوڑ دیجائے تو بہتر ہے،

گذشتہ سال جب اللآلی کا نسخہ طبع ہو کر آیا تو میں نے بھی اس کا مطالعہ کیا، سرسری نظر میں جو اغلاط معلوم ہوئے حسب دستور حاشیہ پر لکھتا گیا، جب انھیں یکجا کرنے کی فکر ہوئی، تو دہشت وافسوس وتعجب کی حد نہ رہی، کہ یہ اغلاط کا ذخیرہ "اللآلی" کے قریب حجم میں پہونچتا ہے، خیال ہوا مصر میں شائع کرایا جائے، کبھی یہ خیال ہوا کہ "الامالی" پر ایک منقح و مہذب کتاب لکھی جائے، جس میں ذیلی طور پر "اللآلی" کا محاکمہ بھی حسب ضرورت ہو جائے، اسی شش و پنج میں تھا کہ چند احباب نے اصرار کیا کہ "مشتے نمونہ از خروارے" ضروری ہے، اگر ایسا نہ ہوا تو ممکن ہے

لوگ غلطی میں پھنس جائیں، اور حق و باطل میں تمیز اٹھ جائے، میمن صاحب اپنے کمال فن سے آیندہ تحریف و تصحیف کا میدان بخاری کی جگہ کہیں قرآن پر نہ قائم کر دیں، اور ان کے عجائب و غرائب سے لوگ مبہوت نہ ہو جائیں

"لیمحص اللہ الخبیث من الطیب ویجعل الخبیث بعضہ علی بعض فیرکمہ فی جہنم"

اس تنقید میں اللآلی کے ۵۰ صفحات تک تفصیلی نظر کی ہے، باقی سرسری طور پر ادھر ادھر سے کچھ لے لیا، اس تحریر کی دو اہم غائتیں اور مصلحتیں ہیں،

۱۔ صحیح اور اعلیٰ علم کی خدمت،

۲۔ میمن صاحب اور ان کے مقلدین کے واسطے تنبیہ اور موعظ و عبرت، کہ آیندہ اپنی تحریر میں احتیاط سے کام لیں، اور بلا تحقیق اپنے خیال کی بنا پر کسی چیز کی تغلیط یا تصحیح نہ کریں، نیز ان لوگوں کو نصیحت و تنبیہ جو ایسے فضلا، کی خام باتوں کو پختہ سمجھ کر تسلیم کر لیتے ہیں، وہ احتیاط سے کام لیں اور بغیر تحقیق و تفتیش کسی بات کو قبول نہ کریں اگر موقع ملا تو اس مضمون کو عربی میں بھی شائع کرا دیا جائے گا،

السمط کی اجمالی غلطیاں اس جگہ پہلے ہم "السمط" کے اہم اغلاط بطور تلخیص پیش کر دیتے ہیں، آیندہ ہر ایک کی تفصیل اپنے اپنے موقع پر آئیگی، اسے بغور ملاحظہ فرمائیں،

۱۔ بے معنی غیر ضروری حوالوں سے حاشیہ کی تطویل،

۲۔ بلا تحقیق و نظر شارح کی تغلیط و تردید،

۳۔ اہل علم اور متقدمین کی طرف غلط نسبتیں، جو باتیں انھوں نے نہیں کہیں، ان کی طرف منسوب کرنا،

۴۔ زبردست علمی خیانت یعنی اصل نسخہ کی تحریف و تصحیف چاہئے تھا کہ اصل نسخہ شائع کیا جاتا اور حاشیہ پر اپنی رائے پیش کیجاتی، متن کو محرف کرکے حاشیہ پر بتانا زبردست خیانت ہے، معمولی اغلاط نہیں بلکہ صحیح بخاری وغیرہ کے اغلاط بھی اپنی طرف سے گھڑ لئے گئے ہیں،

۵۔ اصل کتاب ابی علی قالی میں بہت سے اشکالات باقی ہیں، ان کی طرف کوئی توجہ نہ کی، نیز بہت سے اغلاط باقی ہیں، جنکی اصلاح نہ کی،

۶۔ معمولی اور مشہور شعروں کے حوالہ میں خوب طول دیا ہے، اور ضرورت کے مقام پر سکوت کیا ہے حالانکہ نادر اور غیر معروف اشعار پر خاص توجہ مطلوب تھی،

۷۔ شارح کے سچے بیان کو خواہ مخواہ غلط بنانے کی فکر کی ہے، اور جہاں غلطی صاف صریح ہو اس سے چشم پوشی کی ہے،

۸۔ روایات یا اقوال کی تخریج میں یا غلطی کی ہے، یا غیر ضروری کی تخریج کی، اور ضروری کی طرف بالکل توجہ نہ کی،

۹۔ بہت سے الفاظ جن کا حل ہر جگہ مل سکتا ہے، استفہام کی علامت یا کذا لکھکر چھوڑ دئے حالانکہ آٹھ برس کی مدت کافی تھی نہیں تو مثل سابق ابو عبد اللہ السورتی سے دریافت کرتے، جیسا پہلے ان سے دریافت کیا جاتا تھا،

۱۰۔ حوالہ میں جہان معمولی کتابوں کی کثرت ہے، اعلیٰ درجہ کی کتابوں کا حوالہ کم دیا گیا ہے، جمہرہ ابن درید میں بہت سے اشعار وغیرہ ہوں گے، ان کا حوالہ نہیں دیا گیا، اسی طرح ائمۂ فن مثلاً ابن السکیت وغیرہ کی کتابوں کا حوالہ ترک کر دیا گیا ہے، جو اصول فن ہیں، تلک عشرۃ کاملۃ

لطیفہ میمنی صاحب اپنے استقصار، اور وسعت نظر کے بہت ہی مداح ہیں، اور ایسا ہی ہوا کرتا ہے، قسطنطنیہ مصر وغیرہ کا حج و طواف کیا، وہاں کے کتب خانوں کی خوب سیر کی، خود علی گڈھ کے پروفیسر ہیں نے الواضح المبین حافظ مغلطائی کی شائع کی تعجب ہے کہ وہ ان کے نظر سے غائب رہی اسکے ص ۹۲ پر مغلطائی لکھتے ہیں :۔

"مین نے اللآلی پر ایک کتاب لکھی ہے، جس کا نام القدح العالی فی الکلام علی اللآلی ہے"۔

کاش میمن صاحب اپنے وسیع سفر میں یہ حاشیہ بھی حاصل کر لیتے، تو ان کی بہت سی محنت بچ جاتی، اور ہمیں بھی بحث کے واسطے نیا سامان مل جاتا،

تفصیلی غلطیاں، ہر چند مقدمہ پر بحث کی زیادہ ضرورت نہیں، مگر میمن صاحب کی صناعت ادبیہ پر ایک نظر ڈالنی ضرور مفید ہوگی، اور اس طرح صحیح علمی خدمت انجام پانے کی قوی امید ہے، کیونکہ فاضل راجکوٹی عربی زبان کو بہت مکدر کر چکے اور کرتے جاتے ہیں، تکدر سے بچانا ہر ایک مؤمن و مخلص، اور ہر ایک ذی علم و عقل کا اہم ترین غرض ہے، باقی

شبلی کا نظریۂ تاریخ

از

جناب سید محمد عبد اللہ صاحب ایم اے ڈی لٹ پنجاب یونیورسٹی لاہور

(۲)

مغربی مآخذ | اس خالص اسلامی عنصر کے علاوہ ہمیں اب اس دوسرے پہلو کا سراغ لگانا ہے، جو شبلی کے تصور تاریخ کا ایک بنیادی حصہ ہے گذشتہ اوراق میں اس حقیقت کا کئی بار اعادہ ہو چکا ہے، کہ مشرق اپنے نئے تصورات کیلئے بہت حد تک یورپ کا ممنون ہے، اور کسی شعبۂ زندگی میں ہم اس کے اثر اور احسان سے آزاد نہیں ہو سکتے یہاں تک کہ ممالکِ مشرقی میں احیاے ملی کا پرجوش جذبہ بھی یورپ کی تحریکوں کے عمل اور ردِ عمل سے پیدا ہوا، اقبال اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں،

مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے ۔۔۔ تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی

شبلی پر اس کا کہاں تک اثر ہوا؟ اس کا کچھ حال ہم شبلی پر اثرات کے ضمن میں بیان کر آئے ہیں، اور نہایت وضاحت سے اس چیز کا اظہار کر چکے ہیں، کہ اسی مغربی تحریک نے حقیقت میں شبلی کو شبلی بنایا، اسی طوفان کے تلاطم ہائے بے پناہ نے گوہر کو گوہر بنا کر چمکایا اور اسی سرچشمہ سے اس گلبن علم کی آبیاری ہوئی،

یہ ایک ایسا واقعہ ہے جس کا اعتراف خود شبلی نے متعدد مواقع پر اپنی تصانیف میں نہایت جرأت سے کیا ہے، ایک جگہ لکھتے ہیں، "تصانیف کا شوق ابتداءً مجھے اُن تاریخی تصنیفات کے دیکھنے سے ہوا تھا جو یورپ میں چھپی[۱]

[۱] مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۲۶۶،

ہیں، اور ایک موقع پر مجھ کو بہت سی یکجا مل گئی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا[۱] شبلی اگرچہ رفتہ رفتہ اُن غلط بیانیوں اور تعصب سے لبریز افترا پردازیوں کی وجہ سے جو یورپ کے مصنفین نے اسلام اور بانی اسلام صلعم کے متعلق روا رکھیں، یورپ سے بہت بیزار ہو گئے تھے، لیکن پھر بھی بعض موقعوں پر اپنے جذبۂ تحسین کو چھپا نہ سکتے تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "یورپین مورخوں کی تصنیفات کشتِ زعفران نظر آتی ہیں"[۲]۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ شبلی اس مغربی اثر کو قبول کرنے کے لئے کس قدر آمادہ تھے، اور انھوں نے کس طرح پہلے پہل اپنے آپ کو مغرب کے تخیل سے آشنا کیا، اور پھر ان کے غیر معتدل تصورات کی تردید کی، سب سے پہلے جن مغربی مصنفین کا اثر شبلی (اور دیگر اسلامی مورخین عہدِ حاضر) پر ہوا، وہ گبن، کارلائل، بکل اور ہیگل ہیں کہیں کہیں، رینکی، ہیکی، نبتھم اور ہیوم کے فکر کی آمیزش بھی معلوم ہوتی ہے،

ان میں سے کارلائل اور گبن کا مطالعہ شبلی نے با معانِ نظر اردو اور عربی ترجمہ کے صفحات میں کیا کارلائل کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں، کہ کارلائل پڑھ رہا ہوں، اور وہ "میرے کام کی چیز ہے" گبن کی کتاب "رومن امپائر" کا مطالعہ ۱۸۸۳ء میں ہی شبلی نے کر لیا تھا، جو سید صاحب کے کتب خانہ میں موجود تھی، اور جس کا ترجمہ سید صاحب نے بصرف چھ سو روپیہ کر دیا تھا"[۳]۔

یہ ثابت کرنا کہ شبلی یورپ کے کسی خاص مفکر کے پیرو تھے، نہ صرف مشکل بلکہ غلط بھی ہو گا، شبلی درحقیقت ایک "مسلم مورخ" تھے، اسلامی تاریخ کی تائید و حمایت میں جو خیال انھیں پسند آتا تھا، اسکو حسب مطلب استعمال کر لیتے تھے، جہاں تک راقم کا خیال ہے، وہ کسی خاص مغربی نظریہ اور مسلک کے پابند نہ تھے،

گبن کا وسیع نقطۂ نظر شبلی کے محبوب مفکرین میں جن کے مخصوص تصورِ تاریخی کے متعلق ایک آدھ جملہ بے جا نہ ہوگا، گبن سب سے زیادہ ممتاز ہے، اس نامور مورخ نے جس صدی میں اپنی شاندار تصنیف "رومن امپائر" مرتب کی اس وقت یورپ میں "قومیت" اور "تنگ نظرانہ نسلی امتیاز" کا جذبہ بہت ترقی پر تھا، لیکن یہ عجیب بات ہے، کہ اس عظیم المرتبت

[۱] مکاتیب شبلی جلد ۲ ص ۲۴۲ [۲] جلد ۱ ص ۲۱ [۳] جلد ۱ ص ۹۰،

شخصیت کی کتاب اس محدود انحیال اثر سے بالکل پاک ہے[۵۱] اس کتاب کا نقطۂ نظر وسیع ہے، اور اس نے اپنے دائرۂ عمل کو یورپ اور ایشیا تک پھیلا دیا ہے، اوس نے بعض دوسرے مورخین کی طرح تنہا مغرب کی اقوام ہی کو شایستہ اعتنا نہیں خیال کیا، بلکہ مشرق کی اقوام پر بھی اس کی توجہ یکساں رہی ہے، ہیوم کا یہ خیال گبن کے طریق کار سے کتنا مختلف ہو، کہ "صرف مہذب اقوام ہی ہمارے مطالعہ کے لائق ہیں" اور "دور بربریت" کے بیان کی تکلیف اٹھانا بے سود ہے، گبن نے جس بے تعصبی کے ساتھ اسلام، خلافت راشدہ اور اسلامی تہذیب کا ذکر کیا ہے اس کے لئے اسلامی دنیا ہمیشہ خراج تشکر ادا کرتی رہے گی،

کارلائل کارلائل کی کتاب (Hero & Hero worship) نے اسلامی دنیا کو بہت متاثر کیا، اس نے اس کتاب میں آنحضرت صلعم کا ذکر Hero as Prophet کے طور پر اس ولآویز انداز میں کیا ہے، کہ اس کا ہر ہر فقرہ وجد آور ہے، کارلائل کا ل ایک صدی تک یورپ کے فکر اور تصور پر قابض رہا، اس کا سب سے بڑا خیال جو "تاریخ و تمدن" سے تعلق رکھتا ہے، غیر معمولی شخصیت کا نظریہ (Theory of great men) ہے، کارلائل کہتا ہے کہ تاریخ غیر معمولی شخصیتوں اور ناموروں کے غیر مختتم سلسلہ کا نام ہے[۵۲] جو اپنے عمل اور حرکت سے تاریخ کو مرتب کرتے ہیں، اور ساری انسانی تہذیب اسی محور کے گرد گھومتی ہے، "یہ ناموران عالی مقام" کتاب فطرت کے الہام یافتہ ہوتے ہیں، جو وقتاً فوقتاً دنیا میں نازل ہوکر تاریخ میں ایک ایک باب کا اضافہ کرتے رہتے ہیں[۵۳] کارلائل کی تحسین کا مستحق صرف وہی ہو سکتا ہے، جو "قوت" رکھتا ہو، اور جس میں ہیرو کی خصوصیات پائی جاتی ہوں،

یہاں اس امر کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں، کہ کارلائل جرمنی سے بہت متاثر تھا، اور "مافوق الانسان" کا تصور جرمنی کے نزدیک ہمیشہ ایک پسندیدہ خیال رہا ہے،

---

۵۱ Walker, Outline of Victorian Literature P. 15
۵۲ Encyclopaedia of Social Sciences, "History"
۵۳ Walker, Outline of Victorian Literature P. 5.

کارلائل کا یہ تصور اسلامی ذہنیت کے لئے بہت حد تک جاذب توجہ ہے، شبلی کا سلسلۂ ہیروز آف اسلام گو اس نامور فلسفی کے ہیروز سے مستعار نہیں، لیکن اس سے ملتا جلتا ضرور ہے، بیجا نہ ہوگا، اگر ہم اس سلسلے میں اپنے عہد کے فلسفی "اقبال" کے متعلق بھی یہ کہدیں کہ وہ بھی شبلی کی طرح کارلائل سے متاثر ہیں،

بکل، علامہ ابن خلدون نے جس فلسفۂ تاریخ کی بنیاد رکھی تھی، اس کے حدود یورپ میں جن لوگوں نے وسیع کئے، ان میں بکل کا نام سب سے ممتاز ہے، اسکی معرکۃ الآرا تصنیف "تاریخ تمدن انگلینڈ" (۱۸۵۷ء) نے طبعی حالات کا اثر معاشرت پر کے نظریہ کو نہایت مدلل طریقے سے پیش کیا، اور واقعات اور سیاسی حوادث کے "اسباب" تلاش کرنے کے خیال پر بہت زور دیا، کانٹ اور بکل اور ٹین (Taine) نے اجتماعات انسانی کی نفسیات اور ان کے اجتماعی عمل اور رد عمل کے قواعد مرتب کئے، اور مورخین کو دعوت دی، کہ وہ صرف اشخاص و افراد ہی میں اپنی مساعی کو مرکوز نہ کر دیں بلکہ "تہذیب کے ارتقاء" کی تاریخ کو اپنا اصلی نصب العین بنائیں، اس کے پیش نظر یہ بات صاف کہی جاسکتی ہے کہ ہمارا نامور مورخ بھی اس جماعت سے بہت متاثر ہوا،

ہیگل، تعجب ہے کہ شبلی نے ہیگل کے اثر کا کہیں اعتراف نہیں کیا، حالانکہ ہیگل جس نے مذہب کو ترقی کی اساس اور مبنیٰ قرار دیا ہے[۱]، جس کے خیال میں مختلف مذاہب دنیا میں مختلف فرائض حسنہ کی انجام دہی کیلئے مبعوث ہوئے ہیں، (مثلاً اسلام عدل و انصاف کے لئے) اس قابل تھا، کہ اس "روحانی اساس تاریخ" کے نظریہ کی بدولت شبلی کے اعتراف کا مستحق ہوتا، پھر بھی یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا، کہ اس کے خاموش اثرات شبلی کی تحریروں میں ملتے ہیں، گو اس روحانی خیال کو ایک مسلمان کو دوسرے سے لینے کی ضرورت نہ تھی، کہ یہ تو ایک مسلم کی خصوصیت اور اس کا خاص عقیدہ ہے،

اب اس کا یقین کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے، کہ شبلی جو یورپ کی کتابوں کو "کشتِ زعفران" کہکر ٹالتے ہیں، یورپ کی فکر کو کہاں تک جذب کرنے کے لئے آمادہ تھے، ؟ اس لیے یہ امر بالکل یقینی ہے کہ وہ انیسویں

---

[۱] Encyclopaedia of Britannica (14th ed) "History"

صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے "نظریہ ہائے تاریخ" سے بخوبی آشنا تھے، جو ان کے زمانے میں یورپ کے
وردِ زبان تھا،

ڈارون کا "ارتقاء" | "انیسویں صدی" کے مخصوص خیالات میں دو باتیں ایسی ہیں، جو نہ صرف یورپ میں بلکہ ساری دنیا میں بہت مقبول ہوئیں، ایک "وطنیت" اور "قومیت" کا عام احساس اور دوسرا "نظریہ ارتقاء" جو اس عہد کے مورخین میں یہ بات خاص طور پر پائی جاتی ہے، کہ وہ ہر بات میں قومی امتیازات سے متاثر ہوتے ہیں، اور ہر فعل، ہر تحریک اور ہر انقلاب کی تاریخ "اور ارتقاء" پر بحث کرتے ہیں،

شبلی کی تصانیف میں "ارتقاء" کا نظریہ اکثر موقعوں پر زیر بحث آیا ہے، بلکہ جیسا کہ کسی دوسرے موقع پر بیان ہو چکا ہے خود ڈارون کے "ارتقاء نوعی" کی تائید بھی ان کے مضامین میں ملتی ہے، رہا "قومیت" کا خیال تو اس کے لئے اس مغربی تحریک کے علاوہ بعض داخلی اسباب بھی تھے، جن کا اثر ہمارے مصنف پر ہوا،

سند اور حوالہ | اس زمانے میں انگلستان کے مورخین کا ایک گروہ (Oxford group) کے نام سے مشہور ہوا، اس جماعت کی خصوصیت یہ ہے، کہ اس کے بعض ممتاز افراد نے تاریخی دیانت کو مورخ کا ایک ضروری فرض قرار دیتے ہوئے مآخذ کا صحیح حوالہ اور اقتباس اپنے لئے لازم قرار دیا، چنانچہ آج کل انہی کے تتبع میں اس اخلاقی فرض پر بہت زور دیا جاتا ہے، شبلی نے بھی اس فرض کی ادائیگی میں کوتاہی نہیں کی،

معاونِ تاریخ | اس دور میں سائنس کے عام رواج نے مورخین کو اس نکتہ سے آگاہ کیا، کہ تاریخ کو اپنی تکمیل کے لئے سائنس کے مختلف شعبوں سے کام لینا چاہئے، چنانچہ آثار قدیمہ، پرانے کتبوں، قدیم سکوں اور فرامین سے تاریخ کی تصحیح و ترتیب ہونے لگی، پرانی کتابوں کی تلاش اور نئے ذخیرۂ معلومات کی تحقیق ایک دلچسپ مشغلہ بن گیا، اور محققین اسی شوق و جستجو میں گوشے گوشے اور کونے کونے میں کتاب کے کیڑے بن کر اور مخفی مواد ڈھونڈنے لگے، اس کا اثر ہندوستان میں بھی ہوا، اب تک بعض لوگ اسی کو سب سے ضروری کام سمجھتے ہیں، شبلی نے بھی عموماً اپنی کل تصانیف اور خاص طور سے سیرۃ النبی میں ان نئے تحقیقی طریقوں سے کام لینے کی کوشش کی، اگرچہ

انھون نے اس طریقہ میں خود کوئی اضافہ نہیں کیا، بلکہ سب یورپ کی کتابوں سے ماخوذ ہے، لیکن انھوں نے یورپ کی ان جانفشانیون سے پورا فائدہ اٹھایا،

سائنس یا آرٹ؟ آج کل یہ سوال معرکہ آرا بن گیا ہے، کہ "تاریخ سائنس ہے" "یا آرٹ"؟ شبلی کے دور میں اسکی نوعیت اس سے مختلف تھی، اس وقت مورخین دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے، ایک کا خیال تھا کہ "تاریخ لٹریچر کی شاخ ہے" اور دوسرے کا خیال تھا کہ "سائنس ہے"

شبلی کہتے ہیں کہ مورخ کا فرض یہ ہے، کہ وہ سادہ واقعہ نگاری سے تجاوز نہ کرے، چنانچہ رینکی کے متعلق ان کا بیان ہے کہ "اس نے تاریخ میں شاعری سے کام نہیں لیا"[۱] شبلی کے نزدیک فلسفہ، انشاپردازی اور تاریخ کی سرحدین جدا ہیں، ان میں وہی فرق ہے جو ایک خاکہ، نقشہ اور تصویر میں ہوتا ہے[۲] اگرچہ فلسفہ آمیز انشا پردازانہ تاریخ بہت مقبول ہوتی ہے، لیکن شبلی واقعات کو اصلی سادہ رنگ میں تحریر کرنے کو مذکورۂ بالا طریقۂ تحریر پر ترجیح دیتے ہیں،

مغربی نظریہ کی تنقید، شبلی یورپ کی بعض خوبیوں کے معترف اور مداح تھے، اس کا ثبوت اس سے پہلے دیا جا چکا ہے، اس مقام پر یورپ کی تاریخ دانی کے متعلق ان کی مجموعی رائے کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے، شاید شبلی سے زیادہ کسی نے یورپ کی ان علمی فیاضیون کا ذکر نہ کیا ہوگا، جو یورپ کے علمار کی ایک خاص صفت بن چکی ہے، مقالات میں لکھتے ہین "یورپ کی علمی فیاضیون سے مردہ علوم و فنون زندہ ہو رہے ہیں"[۳] جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں، شبلی تو رخین مغرب کے طریق کار (Method) کو بہت پسند کرتے تھے، اور ان کے فلسفیانہ استنتاج کے بے حد قائل تھے، اسی لئے ان کی تصنیفات کو "کشت زعفران" کے نام سے تعبیر کرتے تھے،

وہ سب سے زیادہ یورپ کی جس چیز کے قائل تھے، وہ فلسفۂ تاریخ ہے، المامون مین لکھتے ہیں "میں علانیہ

---

[۱] الفاروق جلد اص ۱۲ [۲] ایضاً [۳] مقالات ص ۱۲۳،

عتراف کرتا ہوں، کہ موجودہ زمانہ میں تاریخ کا فن ترقی کے جس پایہ پر پہونچ گیا ہے، اور یورپ کی دقیقہ سنجی نے اس کے اصول و فروع پر جو فلسفیانہ نکتے اضافے کئے ہیں، اس کے اعتبار سے ہماری قدیم تصانیف ہمارے مقصد کے لئے بالکل کافی نہیں[1]"

اہل یورپ نے "واقعات کے اسباب" پر بحث کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، اور اس سے فلسفیانہ نکتہ سنجی کے ساتھ جو جو تاریخی نتائج نکالے جاتے ہیں، وہ شبلی کے نزدیک علم تاریخ کی جان ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ "یورپ کو اس فن کے متعلق جس اختراع وایجاد پر زیادہ تر ناز ہے، وہ اسی طلسم کی پردہ کشائی ہے[2]"

مجموعی طور پر یورپ نے تاریخ و تذکرہ کے باب میں جو ترقیاں کی ہیں شبلی کو ان کو پورا اعتراف ہے اور اس خاص خصوصیت میں انھیں اپنی قدیم کتابیں بھی بعض اوقات ناکافی معلوم ہوتی ہیں، چنانچہ ایک موقع پر وہ صاف صاف کہتے ہیں، کہ "تاریخ و تذکرہ کے فن میں آج جو ترقی ہو رہی ہے، اس کے لحاظ سے یہ بے بہا خزانے بھی چنداں کارآمد نہیں[3]"

لیکن اسی کے ساتھ یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوتی ہے کہ وہی شبلی یورپ کی مورخانہ بے اعتدالیوں پر وانشگاف بحث کرتے ہیں، اور اس سارے نظام کی جس کا ظاہر تو بے شک خوشنما اور دلآویز ہے لیکن باطن نہایت بدنما ہے، پوری طرح پردہ دری کرتے ہیں، ملک کے نوجوانوں میں جو یورپ کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں" اور جن کے نزدیک "ہرچہ آید در نظر غیر تو نیست" پر عمل کرنا ضروری ہے، یورپ کی مقلدانہ مداحی کا جذبہ شبلی کے نزدیک بے حمیتی سے کم نہیں، چنانچہ وہ قدم قدم پر ملک کو اس اندھی بہری تقلید سے روکتے ہیں، وہ اپنی روایات کا ہر موقع پر یورپ کی روش سے مقابلہ و موازنہ کرکے یہ ثابت کرتے ہیں، کہ گو آج ہم کچھ نہیں لیکن ہمارے اسلاف بہت کچھ تھے، ہماری علمی ترقیوں نے کسی زمانہ میں یورپ سے بزور اعتراف کا خراج وصول کیا تھا، نیز یورپ کی جدید تہذیب نے ہماری ہی شایستہ اور علم پرور گود میں پرورش پائی ہے

[1] المامون جلد اص ۵ [2] ایضاً جلد اص ۶-۷، [3] الفاروق جلد اص ۱۰

وہ اس استادی کے جس کا مردہ فخر آج بھی مسلمانوں کے دماغ کو مختل کر رہا ہے، قائل ہیں لیکن اس بارے میں ان کا لہجہ کچھ حزم و احتیاط کا پہلو لئے ہوئے ہے، غالباً ہمارا مورخ ان علمی عرق ریزیوں کے تسلیم و اعتراف کے ساتھ ساتھ یورپ کے اس تعصب کو نہیں فراموش کر سکتا، جو صدیوں تک یورپ نے اسلام اور بانیٔ اسلام کے ساتھ روا رکھا، اور یہ ظاہر ہے کہ تعصب اور مورخانہ غیر جانبداری میں اتنا ہی بعد ہے، جتنا مشرق اور مغرب میں اور وہ دونوں کبھی نہیں مل سکتے۔"

یورپ کی بے اعتدالی | فن تاریخ میں "روایت و درایت کے اصول" اور قوانین کی ایجاد کا فخر تو خیر مسلمانوں کو حاصل ہی ہے، اور یہ وہ میدان ہے، جس سے یورپ آشنا ہی نہیں[1]، لیکن خود "علت و معلول" کے اصول کے متعلق یورپ نے بعض ایسی بے اعتدالیاں کی ہیں، جن کی طرف شبلی نے خاص طور پر توجہ دلائی ہے، اس سلسلے میں مورخین یورپ پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے، کہ وہ واقعات کو اپنے اجتہاد کے موافق کرنے کے لئے اسکو ایسی ترتیب دیتے ہیں، کہ واقعہ ان کے اجتہاد کے بالکل مطابق ہو جاتا ہے، اس کے بعد یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے، کہ اصل واقعہ کیا ہے، ؟ اور اس میں مورخ کا اجتہاد کہاں تک ہے[2]؟

شبلی اس طریق کار کو "یورپ کے استدلال کی ملمع سازی" کا نام دیتے ہیں[3]۔

شبلی کو یورپ کی تاریخ میں ایک بہت بڑا نقص یہ نظر آتا ہے، کہ اس میں راوی کے ثقہ یا غیر ثقہ ہونے کی پروا نہیں کیجاتی، بلکہ اگر ایسا کوئی موقع پیش آجاتا ہے، تو ہر قسم کی بازاری افواہیں قلم بند کر لی جاتی ہیں، جن کے راویوں کا نام و نشان تک معلوم نہیں ہوتا، ان افواہوں میں سے وہ واقعات الگ کر لئے جاتے ہیں جو عقل کے معیار پر پورے اترتے ہیں، پھر اس سے ایک کتاب یا تاریخ بنالی جاتی ہے، اور یہی اصول تصنیف ہے جو یورپ کی تصانیف کی بنیاد ہے[4]۔"

شبلی کہتے ہیں کہ یہ تو درست ہے، کہ مغربی مصنف سلسلۂ اسباب کی تلاش میں بہت محنت سے کام

---

[1] الفاروق جلد اص ۱۴، [2] ایضاً جلد ا ص ۲۲، [3] ایضاً جلد ۲ ص ۵۳، [4] سیرۃ النبی جلد ا ص ۳۵،

سیتے ہیں، لیکن اس میں بہت کچھ ان کی "خود غرضی" اور مقاصد مطمح نظر کو دخل ہوتا ہے، وہاں کا مورخ اپنے مقصد کو محور بنا لیتا ہے، اور تمام واقعات اس کے گرد گردش کرتے ہیں[۵]۔

شبلی نے اس خاص معاملہ میں اسلامی مورخ اور مغربی مورخ کا موازنہ بھی کیا ہے، شبلی کے نزدیک اسلامی مورخ اس طرفداری سے الگ رہتا ہے، وہ واقعات کی غیر جانبدارانہ تلاش میں اس بات کی پروا نہیں کرتا، کہ اس کا اثر اس کے مذہب اور معتقدات اور تاریخ پر کیا پڑے گا، "اس کا قبلہ مقصد صرف واقعیت ہوتی ہے، اور وہ اس پر اپنے معتقدات اور قومیت کو بھی قربان کر دیتا ہے[۶]" لیکن اس بے لوث واقعیت کی تلاش میں حد سے زیادہ تفریط کا مرتکب ہو جاتا ہے یعنی واقعات اور رائے کو بالکل ملنے نہیں دیتا، جس سے اسکی تاریخ کے واقعات "خشک" اور "ادھورے" رہ جاتے ہیں،

ہم کو اس موقع پر شبلی کی عام رائے سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں لیکن یورپین تاریخ پر شبلی کی تنقید کے ضمن میں اتنا ضرور کہیں گے، کہ نشأۃ جدیدہ کے یورپ کا سب سے بڑا فلسفی مورخ رینکے جس کی تعریف میں شبلی بھی رطب اللسان ہیں تاریخ کے لئے ایسی قسم کی غیر جانبداری کو ضروری قرار دیتا ہے یہاں تک کہ اسکی تاریخ سے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا، کہ مورخ کس قوم مذہب اور فرقہ سے تعلق رکھتا ہے مگر اس میں بھی کچھ شک نہیں کہ علمی بے تعصبی کی ترقی کے باوجود یورپ کے مورخ اور علما ایک عرصہ تک اس قدیم تعصب آموز ماحول کے اثرات سے آزاد نہیں ہو سکے، اور عجب نہیں کہ اگر آج بھی کریدا جائے تو بعض خوشنما الفاظ کے اندر وہی تلخ معانی پنہاں نظر آئیں، تاہم یہ ایک حقیقت تھی، جس کا اظہار کر دیا گیا،

شبلی یورپ کی "مورخانہ" قابلیت اور بلندی کے ہمیشہ اسی طرح معترف رہتے، جس طرح شروع شروع میں تھے لیکن وہ جس قدر ان مورخوں کی اسلامی تاریخوں کو دیکھتے جاتے تھے، اسی قدر ان کی حیرت بڑھتی جاتی تھی، جو بعد میں پریشانی اور بالآخر غصہ اور احتجاج کی شکل میں تبدیل ہو گئی،

---

[۵] سیرۃ النبی جلد ۱ ص ۵۲، [۶] ایضاً

یورپ کا تعصب عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان "محاربات صلیبی" (Crusades) کے زمانے سے جو زبردست کشمکش چلی آتی تھی، اس کی بنیاد دراصل اس سے بھی قبل مسلمانوں کی فتح اندلس کے وقت پڑ چکی تھی، اور جس کی تکمیل ترکوں کی فتوحات کی شکل میں ہوئی، اس کے زیر اثر اسلام اور مسلمانوں کے متعلق یورپ کا تعصب ایک ایسا جذبہ تھا، جو نسلاً بعد نسلٍ متوارث ہو کر ان کے بچے بچے کے دل میں پیدا ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ اس کا تعلق خون، گوشت اور پوست اور نظام عصبی سے ہو چکا تھا،

جب یورپ کے مورخ نے اپنی پرانی حدود سے باہر جھانک کر دیکھنے کی ضرورت محسوس کی تو اس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق بھی کتابیں لکھیں جن میں تعصبات اور غلط بیانیوں کا حصہ غالب تھا، یہ درست ہے کہ انکے خیالات میں آہستہ آہستہ وسعت پیدا ہوتی گئی، اور صحیح غیر جانبدارانہ تحقیق کی طرف دل مائل ہوتے گئے، لیکن پرانی روش سے ہٹتے ہٹتے بھی ایک عرصہ درکار تھا، ابھی یہ پورا نہ ہوا تھا کہ اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں "مادیت" "ملک گیری" اور ملوکیت کی ایک زبردست لہر پیدا ہو گئی جس نے ایک طرف یورپ میں نسل (Race) اور محدود قومیت (Parochial nationalism) کے تخیل کو بیدار کر دیا، اور دوسری طرف اس جذبہ کے ماتحت ایشیا کی اسلامی سلطنتوں پر قبضہ کرنے کیلئے بانیٔ اسلام صلعم اور نئی پرانی اسلامی حکومتوں کے متعلق وسیع پیمانے پر غلط فہمیاں پھیلائی جانے لگیں، اس "ملوکیت" کی تبلیغ نے مختلف زمانوں میں مختلف شکلیں اختیار کیں، کبھی آزادی جمہور کا صور پھونکا گیا، کبھی شخصی آزادی اور مساوات و اخوت کے نغمے گائے گئے اور کبھی بے تعصبی اور عام رواداری کے خطبے سنائے گئے لیکن اسلام اور شاہان اسلام پر حملے ہر حالت میں جاری رہے،

شبلی کہتے ہیں "اگر دنیا کی عجیب و غریب غلط فہمیوں کی فہرست تیار کیجائے تو ان میں یورپ اور مورخین یورپ کی ان غلط بیانیوں کو سب سے اونچے درجے پر رکھنا پڑے گا[۱]" اگر کوئی شخص صرف ان غلط فہمیوں کو درج کرنا

---

[۱] رسائل کتب خانہ اسکندریہ،

اپنی زندگی کا مقصد قرار دے لے، تو اس کے لئے ایک عمر کافی نہ ہوگی، بلکہ اس کام کی تکمیل کے لئے اسے خدا سے ایک اور عمر کی دعا کرنی پڑے گی، شبلی نے مقالات اور رسائل میں چند موٹی موٹی تاریخی افترا پردازیوں کا جواب دیا ہے، لیکن یورپ نے شاہان اسلام کی جو تاریک تصویر کھینچی ہے، اس کو "تاریکی" سے چھڑانے کے لئے تنہا ان کی کوششیں کافی نہ تھیں، "کتب خانہ اسکندریہ" میں انھوں نے ثابت کیا ہے کہ دراصل اس کو عیسائیوں نے جلایا تھا، لیکن اس الزام کے مورد مسلمان بنائے گئے، ؎ع

ہم الزام ان کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا

جزیہ[1] کی رسم، "اورنگ زیب کے متعلق غلط فہمیاں[2]" "ترکی حکومت کی بدانتظامیاں[3]" یہ وہ موضوع ہیں جس پر مورخین یورپ نے بہت زور قلم صرف کیا ہے، اس کے جواب میں شبلی نے بھی مورخانہ قلم اٹھا کر غلط بیانیوں کی تردید کی ہے،

غلطی کی بنیاد | شبلی کے نزدیک مغربی مصنفین کی ان غلط بیانیوں کی وجہ تعصب کے علاوہ یہ بھی تھی، کہ وہ پرانے زمانہ کا مقابلہ جدید دور سے کرتے ہیں؛ حالانکہ یہ ایک غلط اصول ہے، اور مورخانہ دیانت داری اور ہمدردی کا تقاضا ہے، کہ ہم ماضی کو صرف ماضی کے معیار سے دیکھیں اور "موجودہ طرز سلطنت سے ایشیائی حکومتوں کو نہ ناپیں[4]"

دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ بعض بادشاہوں کے ذاتی افعال کو مذہب کی طرف منسوب کر دیتے ہیں[5]، حالانکہ یہ انفرادی افعال ہیں، جو یورپ کے بادشاہوں سے بھی سرزد ہوتے رہے ہیں، ان کیلئے مذہب کو ملزم نہیں قرار دیا جا سکتا،

ان معاملات کے متعلق جدید تحقیقاتوں نے بڑی حد تک وہی روش اختیار کی ہے جو شبلی نے کی تھی، چنانچہ مستشرقین کی جدید کتابیں ان غلط بیانیوں کے سلسلے میں شبلی کی ہم نوا ہیں،

---

[1] الجزیہ، [2] اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر، [3] سفر نامۂ روم و شام، [4] المامون جلد ا ص ۱۵، [5] ایضاً ص ۱۰۳

آنحضرت صلعم کے مغربی سوانح نگار

یوں تو اسلامی تاریخ کا کونسا شعبہ ہے جس پر یورپ نے قلم نہیں اٹھایا، اور اس میں مسلمان بادشاہوں کی ذات، ان کی طرز سلطنت، اسلامی حکومت کی بد انتظامیوں اور ان کے تاریک پہلوؤں کو نمایاں نہیں کیا، لیکن خود بانئے اسلام صلعم کی ذات مبارک بھی ان حملوں سے نہیں بچی، آنحضرت صلعم کے متعلق تصانیف کا آغاز پلیڈی برٹ سے ہوتا ہے جس نے ۱۶۴۹ء میں سب سے پہلے ایک کتاب لکھی، اس کے بعد اس موضوع سے اس قدر دلچسپی پیدا ہو گئی، کہ آنحضرت صلعم کے سوانح نگاروں کی صف میں جگہ پانا ایک مغتنم چیز سمجھی جانے لگی[۱]، شبلی نے جب سیرۃ النبی کے لئے یورپ کی تصانیف کا مطالعہ شروع کیا، تو انکو پڑھکر وہ روز بروز دل شکستہ ہوتے گئے، چنانچہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں، "یورپین مورخوں پر روز بروز حیرت بڑھتی جاتی ہے[۲]" ولہاوزن نولدکی مارگولیس، فان کریمر، اور دوسرے مورخین کی کتابوں کو پڑھنے کے بعد انھوں نے یہ نتیجہ نکالا، کہ کوئی یورپین مورخ سیرت پر کتاب لکھ ہی نہیں سکتا، کیونکہ اس باب میں جس غیر جانبداری اصول حدیث سے واقفیت اور ہمدردی کی ضرورت ہے، وہ کسی غیر مسلم کو میسر ہی نہیں آسکتی[۳]۔

سوانح نگاروں کی تین قسمیں

شبلی آنحضرت صلعم کے سوانح نگاروں کو تین حصوں میں تقسیم کرتے ہیں، ایک وہ جو عربی زبان اور اصل کتابوں سے واقف نہیں، اور انھوں نے ترجموں اور دوسروں کی تصانیف سے استفادہ کیا ہے، اس جماعت کی تاریخوں کی صحت اور معتبر ہونے کے متعلق کون اچھی رائے قائم کر سکتا ہے، اگرچہ ان ہی میں گبن جیسے صائب الرائے اور انصاف پرست بھی ہیں جو راکھ کے ڈھیر میں سے سونے کے ذرّے نکال لیتے ہیں[۴]، لیکن ایسے بہت کم ہیں۔

دوسرے وہ ہیں، جو عربی زبان کے اور فلسفہ و ادب کے ماہر ہیں، لیکن مذہبی لٹریچر سے آشنا نہیں، ظاہر ہے کہ مذہبی اصول سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے اس گروہ کی نامذہبی طرز کی تالیف کردہ کتابیں، چنداں قابل اعتنا نہیں ہو سکتیں، مثلاً سخاؤ، (Sachau) اس کا مضمون قرآن کتنا زہر سے بھرا ہوا ہے، تیسرا وہ ہیں جو دیکھتے سب کچھ ہیں، لیکن سوجھتا کچھ بھی نہیں،

۱۔ تفصیل کیلئے دیکھو دیباچہ سیرۃ النبی جلد ۱ ص۶ ۲۔ یہ قول مارگولیتھ کا ہے ۳۔ مکاتیب شبلی جلد ۲ ص۱۵۴ جلد ۱ ص۲۱۲ ۴۔ سیرۃ النبی جلد ۱ ص۶۵، جلد ۱ ص۹۰

یہ لوگ عربی زبان اور اسلامی لٹریچر کے بہت بڑے ماہر ہیں، مثلاً مارگولیس وغیرہ، لیکن انکے ترکش سے وہی تیر نکل رہے ہیں، جو عام پادریوں کے پاس ہوتے ہیں، مارگولیس کے متعلق شبلی کا خیال ہے کہ وہ دانستہ سادہ اور معمولی سے معمولی واقعات کو اپنی طباعی کے زور سے بدمنظر بنا دیتا ہے، شبلی سب سے زیادہ اسی مصنف کے شکوہ سنج ہیں جس کا علم بھی اسے تعصب اور جنبہ داری کے مرض سے شفا نہ دے سکا، چنانچہ ایک خط میں جھنجھلا کر اس کی "لائف آف محمد" کے متعلق لکھتے ہیں، "ایک حرف بھی ساری کتاب میں صحیح نہیں"[۵]۔

اصولی غلطی | جہاں تک اصول کا تعلق ہے، یورپ کے سیرت نگاروں کی اس غلطی کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ انھوں نے حدیث کے بجائے مغازی اور سیرت کی کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے، جن کا درجہ حدیث سے کم ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ یورپ سرے سے روایت کے اصول اور اسکی اہمیت ہی سے باخبر نہیں، یورپ میں اگر ایک بازاری راوی ایک جھوٹی بات کو معقول پیرایہ میں بیان کر دیگا، تو وہاں کا مورخ اسکو قبول کرے گا، لیکن مسلمان مورخ کے نزدیک راوی کے سچا یا جھوٹا ہونے کا پہلے پتہ چلایا جائے گا،

اس مضمون کو ختم کرنے سے پہلے ہم ایک بار پھر اس حقیقت کا اعادہ کرتے ہیں، کہ شبلی یورپ کے معتقد تھے نہ عقیدتمند لیکن ان لوگوں کی علمی سرگرمیوں کو دل وجان سے پسند کرتے تھے وہ عام طور پر یورپ ہی کی مثال پیش کرکے اپنے علما و فضلا کو خواب غفلت سے بیدار کیا کرتے تھے، ذیل کا ایک اقتباس ثبوت کے لئے کافی ہے[۶]،

"ایک طرف تو ہمارے مولوی مسلمانوں کے کافر بنانے میں مصروف ہیں اور اس کام میں وہ کوشش کرتے ہیں، جو صحابہ کافروں کو مسلمان بنانے میں کرتے تھے، دوسری طرف یورپ کی علمی فیاضیوں کا بادل عالم پر آب حیات برسا رہا ہے، دنیا کے تمام قوموں کے مردہ علوم و فنون، تاریخ اور یادگار زمین کے طبقے الٹ الٹ کر نکالے جا رہے ہیں، اور دنیا کی نمائش گاہ ان گم شدہ جواہرات سے اس طرح سجا دی گئی ہے، کہ گویا پچھلا زمانہ اس سر و سامان سے دوبارہ سامنے آگیا ہے"

---

[۵] مکاتیب، جلد ۱ ص ۲۱۳، [۶] مقالات ص ۱۲۳،

عہدِ وسطیٰ کی تاریخِ مصر پر ایک نظر

از

جناب محمد جمیل الرحمن صاحب پروفیسر جامعہ عثمانیہ

(۲)

عہدِ فاطمین کا خاتمہ درحقیقت مصر کی خالص قومی حکومت کا خاتمہ تھا، یہ خلفا گو بیرونی سیاسیات میں اکثر پھنس جاتے تھے، مگران کا اصلی وطن مصر ہی قرار پایا تھا، کہ وہ وہین کی فلاح و بہبود کے ہو رہے تھے، اس لئے ان کے زمانہ میں ملک امن و امان کی برکتون سے مالا مال ہو رہا تھا، فاطمین کے جانشین سلطان صلاح الدین کی حالت اس سے جداگانہ تھی، سیاسی لحاظ سے ایوبی درحقیقت سلاجقہ کے سچے جانشین تھے، سلاجقہ نے اول تو اسلامی ایشیا کو مدتوں کے بعد ایک جھنڈے کے نیچے جمع کر دیا تھا، اور دوسرے غیر مسلموں سے مقابلہ کرکے مسلمانوں کی حفاظت کی تھی یہی فرض ایوبیوں کو بھی انجام دینا تھا، چنانچہ اسلام کے دشمنوں کے خلاف لڑنے کا جہاں تک تعلق ہے، یہ خاندان یقیناً شہید کہلانے کا مستحق ہے، کیونکہ ایوبیوں نے اپنی زندگی کا واحد مقصد ہی یہ قرار دے لیا تھا، لیکن سیاسی نقطۂ نظر سے مصر ایوبی قبضہ کی وجہ سے ایک مرتبہ پھر سیاسیاتِ عالم کے چکرون میں پھنس گیا، صلاح الدین کے زمانہ میں صلیبی جنگیں اپنے پورے شباب پر تھیں، اور ایوبیوں کو سلاجقہ کے جانشین اور فاطمین کے بعد مصر کے حاکم ہونے کی حیثیت سے اس مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا، اس طرح مصر مشرق و مغرب کے درمیان میدانِ جنگ بنا اور شام کی قسمت بھی اس کے ساتھ وابستہ رہی،

لیکن افسوس ہو کہ صلاح الدین نے جو زبردست سلطنت قائم کی تھی، اس کے جانشین اُسے سنبھال

نہ سکے، خاندانی اتحاد کا بہت جلد خاتمہ ہو گیا، سلطنت چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم ہو گئی، اور ہر حکمراں اپنے آپ کو خود مختار سمجھنے لگا، واقعات سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ ان مختلف خاندانوں کا واحد مقصد ہی یہ ہو گیا تھا کہ ایک دوسرے سے ٹکرا کر اپنے آپ کو پارہ پارہ کر دیں، صلاح الدین، ملک العادل اور ملک الکامل ایوبیین کے ابتدائی اور نہایت کامراں بادشاہ تھے، ان کی قوت کا انحصار قبیلہ غز پر تھا، اور یہ ممکن تھا کہ جس طرح فاطمیین نے مذہب کی بنیادوں پر حکومت کی بنیاد قائم کی تھی، ایوبی نسلی اساس سے کام لیں لیکن یہ امیدین خاندان کی باہمی جنگوں سے خاک میں مل گئیں، آخر کار حکمراں خاندان کے اتحاد کا خاتمہ ہو گیا، ان سلاطین نے پھر وہی غلطی کی جو مسلمان اس سے قبل اکثر کر چکے تھے، انھوں نے مملوکوں کو فوجوں میں بھرتی کرنا شروع کر دیا، ان نئے سپہ سالاروں نے آپس میں رشتہ داریاں قائم کیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ لوگ بجائے حکومت کی مستقل فوج رہنے کے اسکے مدمقابل بن گئے، ان مملوکوں میں بھی مختلف عناصر شامل تھے، گو ترکوں کی تعداد بہت زیادہ تھی لیکن صقالبہ اور یونانی بھی ان میں مفقود نہیں تھے، ہر طبقہ اپنے اپنے جھنڈے کے نیچے لڑنے کا عادی تھا، اس سے ان کے فسادیں اور اضافہ ہوا، مختصر یہ ہے کہ اس مسلسل خانہ جنگی کے فرو کرنے کی غرض سے حکمرانوں کو روز بروز اپنے افسران فوج پر زیادہ بھروسا کرنا پڑا، یا دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے، کہ وہ مختلف بلند حوصلہ سپہ سالاروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بن گئے، اس کے بعد تاریخ نے ایک دفعہ پھر اپنے آپ کو دہرایا، بادشاہ پہلے ہی صرف نام کے حکمراں رہ گئے تھے، اب وہ بالکل بے دست و پا ہو گئے، اور وہ لوگ جو انھیں بے دست و پا کرنے کے باعث ہوئے تھے، انھوں نے حکومت کی تمام ذمہ داریاں اپنے اوپر لے لیں،

اب مملوک مصر کے حکمراں بنے، انھوں نے رفتہ رفتہ خاندانی حکومت کا خیال بالکل ترک کر دیا، ظاہر ہے کہ ایوبیوں کا نظم و نسق مکمل طور پر قائم اور جاری رہا، بحری مملوک قلاؤن کے زمانے میں یہ بھی ممکن ہوا کہ ایک قسم کی خاندانی حکومت قائم کر لیجائے، لیکن مملوکوں کی حکومت نہ صرف اصولاً فوجی جماعت کی حکومت تھی بلکہ عملاً بھی ایسی ہی تھی، چنانچہ انھوں نے ایک فوجی جاگیری نظام قائم کیا، اور اس کی بنیاد مکمل فوجی نظام پر رکھی

جس سے مصر جاگیری مملکت بن گیا، لیکن فرق یہ تھا کہ ان جاگیروں کی بنیاد زمین کی ملکیت پر نہ تھی، بلکہ زمین کے لگان پر تھی، اسکی تفصیل یہ ہے کہ فوجی نقطۂ نظر سے کاشتکاروں پر نگرانی رکھنا محض بے کار تھا اور یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ جاگیردار اس کام میں اپنا وقت ضائع کریں، چنانچہ ان زرخرید غلاموں کو جو اب تک زمین کاشت کرتے تھے، اس شرط کیساتھ آزاد کر دیا گیا، کہ وہ بدستور سابق جاگیرداروں کو لگان ادا کرتے رہیں، یہ فوجی امرا حقیقت میں مصر کی آبادی کا اعلیٰ طبقہ شمار ہوتے تھے، وہ اپنی معاشی اور معاشرتی برتری کو بعض اوقات نہایت بری طرح استعمال کرتے تھے لیکن باوجود اس انتظام کے مملوک برابر آپس میں لڑتے رہتے تھے، وہ نہ ملک پر حکومت کرتے، اور نہ زمین سے کوئی تعلق رکھتے تھے نسلی طور پر وہ مصر میں اجنبی تھے، اور خالص مصریوں کے مقابلے میں ان کی تعداد بھی بہت کم تھی لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود وہ صدیوں تک اپنی حیثیت سنبھالے رہے، اور مصر ان کے زیر نگیں رہا، یہ محض اتفاقی امر نہیں تھا بلکہ اس سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے، کہ ملک پر ان کی گرفت کس قدر زبردست تھی، اور ان کا نظم و نسق کتنا باقاعدہ تھا، کہ ان خرابیوں کے باوجود اہل مصر ان سے آزاد نہ ہو سکے، خصوصاً ان کا مالی نظام نہایت اعلیٰ درجہ کا تھا،

لیکن ناانصافی ہوگی اگر ہم مملوکوں کی خرابیاں بیان کرنیکے ساتھ انکی ان خدمات کو بھول جائیں جو انھوں نے نہ صرف دنیاے اسلام بلکہ تمام دنیا کے لئے انجام دیں، ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ مملوک ہی تھے جنھوں نے تاتاریوں کے مقابلے میں سد سکندری کا کام کیا، اور مصر کو اس سیلاب سے بچا لیا، ورنہ اس کا وہی حشر ہوتا، جو اس سے قبل عراق اور ایران کا ہو چکا تھا، یہ کوئی بخت و اتفاق نہ تھا، کہ عین جالوت کی جنگ میں سلطان بیبرس نے تاتاریوں کو شکست دی تھی، کیونکہ بیبرس کے بعد قلاؤن اور اس کے جانشینوں نے بھی ایل خانیوں کے مقابلہ میں اسی طرح سد سکندری کا کام کیا تھا، اور تاتاریوں کو مصر سے ناکام و نامراد واپس جانا پڑا تھا، وادی نیل کو ان کا شکر گذار ہونا چاہئے، کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب کہ تمام اسلامی ممالک تاتاری سیلاب سے ایسے برباد ہوئے کہ ان کی تہذیب کے صرف کھنڈر باقی رہ گئے، اور بس مصر کی تمدنی ترقی

کو بلا کسی رکاوٹ کے جاری رہنے کے قابل بنایا، اس کے علاوہ وہ مملوک ہی تھے جنھوں نے صلیبی جنگون کو ختم کیا، اور صلیبی مجاہدوں کو ایسی شکست دی، کہ وہ صدیوں تک ایشیا کا رخ نہ کر سکے تاتاریوں سے مصر کو محفوظ رکھنے کے مقابلہ مین ان کا یہ کارنامہ بہت معمولی معلوم ہوتا ہی، مگر ایشیا کے لئے اسکی سیاسی اہمیت بالکل ظاہر ہے، ان کا تیسرا کارنامہ بھی کچھ کم اہم نہیں یہ کارنامہ فتح نوبیہ ہے، اس کی اہمیت فتح سوڈان سے کچھ کم نہیں، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ مملوکوں کے پورے دور میں ہر طرف زبردست کامیابیوں کا ایک سلسلہ جاری ہے، اور شاید ہی کہیں ان سلاطین کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو،

ان ہی کارناموں کی بدولت سلاطین مملوک نے سلطنت مصر کو نہایت ہی طاقت ور اور منتظم حکومت بنا دیا، اور اسکو بین الاقوامی سیاسیات میں وہ درجہ دیدیا، جو درحقیقت اب تک کبھی مصر کو حاصل نہ ہوا تھا' تاتاریون کے ایک حصہ سے تعلقات بڑھا کر انھوں نے ایل خانیون کے مقابلے میں توازن قوت قائم کیا' اور بازنطینی اور اکثر دوسرے یورپی دول ہمیشہ ان عظیم الشان سلاطین کی دوستی کی خواہان رہے، اسی زمانے مین جب کہ مملوکوں کے آپس میں مسلسل جنگیں جاری رہتی تھیں، اور خود قاہرہ کے گلی کوچے جنگ و جدل کے مرکز بنے ہوئے تھے، اس شہر مین ایک عالیشان عمارت کے بعد دوسری سربفلک عمارت بنتی چلی جاتی تھی، چنانچہ قاہرہ کی وہ عمارتین جن کی وجہ سے اس شہر کو چار چاند لگ گئے ہیں، اور جنھیں دیکھنے کیلئے دنیا کھنچی چلی آتی ہے، وہ تقریباً سب کی سب مملوکوں کے عہد کی ہیں،

یہاں اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان جنگی مھون، فتوحات، اور رفاہ عام کے کامون کے لئے اتنی بڑی رقمیں کہاں سے آتی تھیں؟ اور وہ فوجیں کیسے جمع ہوتی تھیں، جن سے یہ عظیم الشان فتوحات مکمل ہوتی تھیں،؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مصر کی خوش قسمتی سے مملوک سلاطین میں ایک سلسلہ ایسے عظیم الشان حکمرانوں کا گذرا جنھوں نے ملک کو مالا مال کر دیا، اس سلسلہ میں بیبرس، قلاؤن، ناصر، برقوق اور قایتبای شامل ہیں، مملوکوں کی سلطنت میں جہاں ہر فرد بشر خواہ وہ کتنا ہی ذلیل کیون

نہ ہو، اپنے آپ کو ہر وقت دعویدار سلطنت سمجھتا تھا، صرف ایسے ہی لوگوں کو عروج حاصل ہو سکتا تھا جو غیر معمولی قابلیت رکھتے ہوں، فریق بندی کا جذبہ بدرجۂ اتم موجود تھا، لیکن اس کے ساتھ ان میں ایسی عصبیت بھی تھی کہ خطرے کے موقع پر تمام اختلافات بالائے طاق رکھ کر سب مملوک بلاکسی تفریق کے یک جان ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے تھے، اس کے علاوہ مملوکوں میں زیادہ تعداد ترکوں اور چراکسہ کی تھی جنھیں خاص طور پر بردہ فروشی کے بازاروں میں منتخب کیا جاتا تھا، یہ قومیں قدرتی طور پر جنگ جو واقع ہوئی ہیں، پھر ان غلاموں کو مختلف امرا کے تحت بہترین فوجی ترتیب دیجاتی تھی، سلطان بیبرس نے ایک اور بڑا سیاسی کام یہ انجام دیا تھا کہ اس سے قبل خلافت عباسیہ برباد ہو چکی تھی، اور اس خاندان کے افراد بے خانماں ہو کر تباہ حال و آوارہ پھر رہے تھے، بیبرس اسی خاندان کے ایک فرد کو تلاش کر کے قاہرہ لایا، اور وہاں اپنے زیر سیادت اسے تخت و تاج دونوں سے آراستہ کر دیا، ظاہر ہے کہ یہ کام محض برائے نام تھا، لیکن اس زمانہ کی اسلامی دنیا پر اس کا جو اثر پڑا، اس کا اندازہ آج کل ہم نہیں لگا سکتے، اس واقعہ سے وہ لوگ بھی جو اب تک مملوکوں سے الگ رہے تھے، ان کے ہمدرد بن گئے، اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا، کہ ان نام نہاد عباسی خلفا کے تحت مملوکوں کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہو گئی، اس کے علاوہ مملوکوں کی حکومت عام طور پر سخت گیر واقع نہیں ہوئی تھی، وہ زراعت کی ترقی اور وسعت میں کوشاں رہتے تھے، آب پاشی کے لئے نہریں کھدواتے تھے، اور اسی قسم کی دوسری تدبیروں سے کاشتکاروں کی حالت کو درست کرنے کی فکر میں رہتے تھے، ان کاشتکاروں میں ایک عنصر عرب بدوؤں کا بھی تھا، اور وہ رفتہ رفتہ زیادہ طاقتور ہوتا جارہا تھا، بدو اپنی بے چین طبیعت سے مجبور تھے، اور اکثر فساد کا باعث بن جاتے تھے، ان فسادوں کو روکنے اور فرو کرنے میں مملوک سخت تدابیر اختیار کرتے تھے، مگر یہ فساد ایسے نہیں ہوتے تھے، کہ ان کی وجہ سے زراعت رک جائے، یا اسے نقصان پہنچے، بلکہ ان میں برابر ترقی ہوتی رہتی تھی، مملوکوں کی مالیات کی بنیاد محصول آراضی پر تھی، ان کے زمانے میں تہذیب و تمدن کے جو بڑے بڑے کام انجام پائے، ان سب کا انحصار اسی پر تھا، حکومت کی آمدنی کا

ایک اور بڑا ذریعہ ہندوستانی تجارت ہے، مصر قدیم زمانے سے لے کر اب تک یورپ اور ایشیا کے درمیان تجارتی منڈی بنا رہا ہے، ہندوستانی تجارت کا تمام مال اسی سے ہوکر گذرتا تھا، ۱۴۹۲ء کے بعد جب یہ خصوصیت مملوکوں کے ہاتھ سے نکل گئی تو ان کا عروج اور ان کی حکومت بھی ختم ہوگئی، اب پرتگیزوں نے بحر ہند اور بحیرۂ احمر میں اپنے قدم جمائے، اور ہندی تجارت کا رخ راس امید کی طرف پھیر دیا، یہ واقعہ حقیقت میں نہ صرف مصر بلکہ تمام اسلامی دنیا کے لئے پیغام موت تھا، ایک طرف تو مصر کی بربادی کا یہ سامان ہو رہا تھا، دوسری طرف عثمانیوں کی ترقیاں جاری تھیں، انھوں نے وادی نیل پر قبضہ کر لیا، اب یہ ملک سلطنت قسطنطنیہ کا محض ایک صوبہ بن گیا اور اسکی ذاتی شان و شوکت بالکل رخصت ہوگئی، معاشی نقطۂ نظر سے مصر مشرقی بحیرۂ روم کی تجارت کا مرکز تھا مگر اب دنیا کی تجارت کا رخ بدل گیا، اور پھر امریکہ کی دریافت سے دنیا کی تہذیب کا مرکز بھی کہیں کا کہیں جا پڑا، لہذا قدرۃً مصر پر ادبار کی گھٹائیں چھاگئیں،

(۸)

آغاز ربیع الثانی ۹۲۳ھ (۲۲ اپریل ۱۵۱۷ء) کو سلطان سلیم اول قاہرہ میں داخل ہوا، اور مصر کے آخری مملوک سلطان تومان بے کو باب زُویلہ کے سامنے پھانسی دیدی گئی، سلطان سلیم اور اس کے جانشین سلیمان نے نہایت فراست و دانائی سے ملک کے سیاسی حالات کو پیش نظر رکھ کر تمام انتظامات مکمل کئے، اور نئے پاشا کے حاکم کو کسی صورت میں زیادہ طاقتور نہ ہونے دیا، لیکن مملوکوں کے عہد میں فوجی جماعت کو جو فوقیت نظم و نسق میں دوسری جماعتوں پر حاصل تھی، اسے ترکوں نے پوری طور پر نہیں توڑا، اس سے مملوکوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے کا ایک نیا ذریعہ حاصل ہوگیا، ملک پر ایک پاشا مقرر کیا گیا، اور فوج کی چھ پلٹنیں افسروں (بے، آغا) کے ماتحت وہاں بھیجی گئیں، اس کے علاوہ دو دیوان یا مجالس مشاورت تھیں تاکہ ان کی مدد سے تمام معاملات میں توازن قائم رکھا جائے، تقریباً سو برس تک پاشا کے اختیار محدود رہے لیکن بہت سے تلخ تجربوں کے بعد باب عالی نے اپنے والیان مصر کو ہر دو سال کے بعد بدلنا شروع کیا، اس سے یہ فائدہ ہوا کہ کوئی پاشا مستقل قوت

حاصل نہ کرسکا، مگراب پاشاؤں کا ایک سلسلہ نامتناہی شروع ہوتا ہے، یہ پاشا صرف دو سال ملک میں رہتے تھے، اور فوج مستقل تھی، اس کالازمی نتیجہ یہ ہوا کہ فوج کے افسرزیادہ بااقتدار ہوتے چلے گئے، بلکہ ایک لحاظ سے یہ سمجھنا چاہئے کہ مصر میں فوجی حکومت قائم ہوگئی، جس کے سامنے پاشا محض بے دست و پا تھے، اس سے شورشوں کا بازار گرم ہوا، یہاں تک کہ معزولیاں، کشت وخون اور قتل روزمرہ کی چیزیں بن گئیں جب باب عالی مملوکوں کا زور توڑنے میں ناکام رہا، اور یہ محسوس کیا گیا کہ ان کی مدد کے بغیر ملک میں امن قائم رکھنا ناممکن ہے، تو مجبوراً باب عالی نے صرف وہ پاشا مصر میں بھیجنے شروع کئے، جو مملوکوں کے نامزد کردہ ہوتے تھے، یہ پاشا مملوکوں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی تھے، ان کا عزل ونصب انھیں کے رحم وکرم پر منحصر تھا عہدہ داروں میں سب سے زیادہ بااقتدار قاہرہ کا حاکم تھا، جسے شیخ البلد کہتے تھے، اس کے بعد وہ عہدہ دار تھا جو امیر الحج کہلاتا تھا، لیکن یہ سب انتظامات اور تبدیلیاں مصر کو مرفہ الحال نہ بنا سکیں، اور رفتہ رفتہ ملک کی خوشحالی رخصت ہوتی چلی گئی،

کسی زمانہ میں مصر کا خراج چھ لاکھ پاسٹر تھا، لیکن یہ برابر کم ہوتا چلا گیا، اور آخر میں بالکل بند ہوگیا اس دور کی تاریخ میں بہت کم تحقیق کی گئی ہے، اور واقعہ یہ ہے، کہ اس پورے دور میں ایک ہی سے واقعات ہمیشہ ہر پھر کر ہوتے رہتے تھے، اور ان میں مورخ کے لئے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، قسطنطنیہ سے پاشا مقرر ہوکر آتے تھے، ملک میں مسلسل جنگ اور بدامنی پھیلی رہتی تھی، اور ہر عہدہ دار تمام اختیارات پر قبضہ وتصرف کی کوشش میں رہتا تھا، کبھی کبھی مصری فوج باب عالی کی طرف سے شام عرب اور ایران کی جنگوں میں شریک ہوتی تھی، لیکن مصریوں کو ان جنگوں سے نہ کوئی دلچسپی تھی اور نہ فائدہ، اس پورے عہد میں اکثر وباؤں اور قحط کے حالات پڑھنے میں آتے ہیں، اور ہر وبا یا قحط گذشتہ مصیبت سے سخت تر ہوتی چلی جاتی ہے، صرف ایک مرتبہ معلوم ہوتا تھا، کہ ایک زبردست تبدیلی ہونے والی ہے،

۱۱۸۲ھ (۱۷۶۸ء) میں جنگ روس وترکی کے دوران میں ابتری سے فائدہ اٹھا کر علی بے نے بغاوت

کی، اور مصر و شام کی قسمت ایک دوسرے سے وابستہ ہوگئی لیکن ایک واقعہ نے حالات بدل دیئے، ورنہ ممکن تھا کہ شام کو بھی وہی ترقی نصیب ہوتی، جو محمد علی پاشا کی وجہ سے مصر کو بعد میں نصیب ہوئی ۱۱۸۸ھ (۱۷۷۳ء) میں ایک دوست کی غداری کی وجہ سے علی بے کو شکست ہوئی اور باب عالی نے شورش کو مٹانے کی غرض سے ایک فوج کپتان حسان کی سرکردگی میں مصر روانہ کی، یہ دراصل مصر کو دوبارہ قابو میں لانے کی کوشش تھی، مگر اس میں کامیابی نہ ہوئی، کیونکہ باب عالی روس کے معاملات طے کرنے میں اس قدر مشغول تھا، کہ مصر کی طرف پوری توجہ نہ کر سکا، ابراہیم بے اور مراد بے میں اتنی صلاحیت تو ضرور تھی، کہ حالات پر قابو پا لیتے مگر وہ باہمی جھگڑوں میں ایسے پھنسے کہ کچھ نہ کر سکے، ان تنازعات میں عوام بھی آخر دخل دینے لگے، خانہ جنگی شروع ہوگئی، اسی دوران میں جب کہ لامرکزیت آخری حد کو پہونچی ہوئی تھی، مصر پر نپولین حملہ آور ہوا، ابراہیم بے اور مراد بے اس کے مدمقابل تھے، نپولین کی ناکامی کے اسباب پر بحث کرنے کا یہ موقع نہیں ہے، لیکن اس حملہ سے دول یورپ نے مصر کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا، اور مصر کی تاریخ کے نئے دور کا آغاز ہوا،

تلخیص و تبصرہ

ایک قابلِ تقلید تعلیمی تجربہ

ذیل کے مضمون میں لٹریری ڈائجسٹ (۱۹ فروری ۳۵ء) کے ایک مقالہ نگار نے ایک قابلِ تقلید تعلیمی تجربہ کا ذکر کیا ہے جس کا مطالعہ ہر اس شخص کیلئے مفید ہوگا جو بچوں کی ذہنی نشو و نما سے دلچسپی رکھتا ہو، آج کل جب کہ ہمارے ملک کے ماہرینِ تعلیم ابتدائی تعلیم کے میدان میں ایک نیا قدم اٹھانے والے ہیں، ضرورت ہے کہ بچوں کی ذہنی استعداد کی جانچ کر کے نیویارک کے مذکورۂ ذیل اسکول کے نمونہ پر وہ بھی ایک ادارہ یہاں قائم کریں، تاکہ جو بچے غیر معمولی طور پر ذہین پیدا ہوئے ہیں، وہ اپنی فطری استعداد کو آزادی کے ساتھ ترقی دے سکیں، اور ان کی خداداد قوتیں مروجہ تعلیمی نصاب کے دائرہ میں محدود نہ رہ جائیں،:-

اگر آپ کسی روز سہ پہر کو نیویارک شہر کے پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ میں جس کو اسپیئر اسکول (Speyer School) بھی کہتے ہیں، چلے جائیں، تو آپ کو ایک ایسا تعلیمی ماحول نظر آئے گا، جس کی نظیر کسی دوسرے پبلک اسکول میں نہ ملے گی، وہاں پچاس لڑکے اور لڑکیاں جن کی عمریں آٹھ سے گیارہ سال تک ہیں، حیرت انگیز ذہنی قوت کے مظاہرے کرتی رہتی ہیں کوئی شطرنج کی ایک پیچیدہ چال پر غور کر رہا ہے، کوئی کسی مشین کے چلانے کا طریقہ دوسرے کو سمجھا رہی ہے، ایک طرف کچھ بچے ٹیلیفون، ریڈیو اور طاقت کے پیدا ہونے اور منتقل ہونے کے نظریوں کا مطالعہ

رہے ہیں، کچھ موسیقی اور شاعری سے لطف اندوز ہونے کے اصولوں پر بحث کر رہے ہیں، ایک جماعت ایسی ہے جو ایک مستند انسائیکلوپیڈیا میں آٹھ غلطیاں نکالنے کے بعد اس کے مولفین پر برہم ہے، اور بمشکل اس کتاب کو آگ میں ڈال دینے سے باز رہتی ہے، یہ غیر معمولی بچے اپنے پسندیدہ اخبار صبح کو اسکول آتے ہوئے راستہ میں پڑھتے ہیں، اور اہم مسائل پر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں، مثلاً یہ کہ پریسیڈنٹ کی سونا خریدنے کی پالیسی اقتصادی نقطۂ نظر سے کہاں تک صحیح یا غلط ہوگی، یہ بچے اس نئے نیویارک کے لاکھوں اسکول کے بچوں میں سے منتخب کئے گئے ہیں، اور ان کا انتخاب صرف فطری ذہانت کی بنا پر کیا گیا ہے، یہ مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں، ان میں اسکاچ، انگلش، سویڈش، ڈچ، آئرش، پولش، نیگرو، یہودی، جرمن اور ہنگیرین سبھی شامل ہیں، ان میں سے ہر بچہ کی ذہنی استعداد (Intelligence quotient) (۱۳۰) سے زیادہ ہے، (اوسط ذہنی استعداد (۱۰۰) ہوتی ہے) انہیں ایک لڑکا اور ایک لڑکی، ایسے ہیں جن کی ذہنی استعداد (۲۰۰) ہے، اور بیس سال سے جب سے بچوں کی ذہنی جانچ کا طریقہ ایجاد ہوا ہے، اس سے زیادہ استعداد آج تک نہیں پائی گئی ہے (۱۶۰) کی ذہنی استعداد اس بات کی علامت ہے، کہ بچہ اپنے اندر کسی بڑے اور اوریجنل تخلیقی کام کی اہلیت رکھتا ہے،

پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کی تحریک ایک ضعیف العمر خاتون ڈاکٹر لٹیا ہولنگ ورتھ (Dr. Leta Stetter Hollingworth) کی رہین منت ہے، موصوفہ بچوں کی نفسیات کی ماہر اور ایک ممتاز معلمہ ہیں، بارہ سال سے زیادہ ہوئے، انھوں نے مروجہ نظام تعلیم کے خلاف آواز اٹھائی تھی، جس میں لاکھوں روپے غبی بچوں پر صرف کئے جاتے ہیں، اور طباع بچوں کی غیر معمولی ذہانت کو ایک ایسے نصاب تعلیم کے ذریعہ رائگاں کیا جاتا ہے، جو معمولی دماغ والوں کے لئے تیار کیا گیا ہے چنانچہ اسی وقت سے ڈاکٹر ہولنگ ورتھ کمزور دماغ کے بچوں کو دوسروں کے لئے چھوڑ کر خود تمامتر ذہین بچوں

کی تعلیم کی طرف متوجہ ہوگئیں، پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ پر نہ کوئی جائداد وقف ہے، اور نہ اس کے اخراجات خاص طور پر زائد ہیں، یہ ایک معمولی پبلک اسکول ہے، جیسا کہ ہر بڑے شہر میں تعلیمی بورڈ کی طرف سے قائم کیا جاسکتا ہے، جب ضرورت ہوتی ہے، تو زائد سامان اُن اداروں کی طرف سے جو اس کام میں دلچسپی لیتے ہیں بچوں اور بلا معاوضہ فراہم کر دیا جاتا ہے،

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اساتذہ بچوں کی ذہانت کا اندازہ کرنے میں افسوسناک حد تک ناکام ثابت ہوئے، جب تک دماغی جانچ کے طریقے ایجاد نہیں ہوئے تھے، اساتذہ بچوں کی ذہنی استعداد کے دریافت کرنے میں صرف میں سے چالیس فی صدی تک کامیاب ہوئے تھے، وجہ یہ ہے کہ جب ایک ذہین بچہ اسکول کے کام سے جو اس کے لئے آسان ہوتا ہے، گھبرا جاتا ہے، تو پھر وہ بے پروا ہو جاتا ہے، یا شریر ہو جاتا ہے، چنانچہ پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کے بعض بچے بھی جب دوسرے اسکولوں میں تھے طرح طرح سے اپنا وقت ضائع کرتے تھے، کوئی عبارت کو نیچے سے اوپر کی طرف پڑھنے کی مشق کرتا تھا، اور کوئی پیچھے کی طرف، ایک بچہ نقشہ کشی میں اپنا وقت صرف کرتا رہتا تھا، اور استاد کی سخت کوشش اور سرزنش کے باوجود اس عادت سے کسی طرح باز نہ آتا، اس لڑکے کی جانچ کی گئی، اور اس کو اس اسکول میں بھیج دیا گیا، اور اب وہ یہاں سہ پہر کے وقت نہایت عمدہ نقشے کھینچا کرتا ہے،

کارٹون بنانے والے جب کسی حیرت انگیز ذہانت والے لڑکے کی تصویر کھینچتے ہیں، تو اس کا چہرہ سوکھا ہوا اور سینہ دبا ہوا دکھاتے ہیں، یہ تصویر نہایت غلط ہوتی ہے، ذہین لڑکے اوسط درجہ کی ذہانت رکھنے والوں کی بہ نسبت عموماً زیادہ طاقتور، قد و قامت میں زیادہ بڑے اور زیادہ تندرست ہوتے ہیں، جسمانی خوبصورتی میں بھی پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ کے بچے معمولی بچوں سے نمایاں طور پر فائق ہیں، وہ عموماً جماعت میں رہنا پسند کرتے ہیں، اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اس اسکول کے بچے ہائی اسکول میں تو اسی عمر میں پہونچیں گے، جب دوسرے اسکولوں کے بچے پہونچیں گے، لیکن ہائی اسکول میں

داخلہ کے وقت ان کے پاس معلومات کا اتنا بڑا ذخیرہ ہوگا، جو بہتیرے گریجویٹ لڑکوں کے لئے قابلِ فخر ہو سکتا ہے،

پبلک اسکول نمبر ۵۰۰ میں اسکول کا معمولی کام صبح کو ختم ہو جاتا ہے، سہ پہر کا وقت اُن کاموں کے لئے خالی رہتا ہے جن میں بچوں کو خاص طور پر دلچسپی ہوتی ہے، وہ اپنے لئے کام خود ہی پسند کرتے ہیں، یہ کام مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے ہیں، مثلاً روشنی کرنے کا مسئلہ، ہوائی راستوں سے آمد و رفت رسل و رسائل کے طریقے، وغیرہ وغیرہ ان شعبوں میں یہ بچے جن کی عمریں صرف آٹھ سال سے گیارہ سال تک ہوتی ہیں، بطور خود ریسرچ کرتے ہیں، اور بغیر کسی کی مدد کے کتب خانوں میں حوالہ کی کتابوں کو خود تلاش کر لیتے ہیں، اور ان کا مطالعہ کرتے ہیں،

حیرت انگیز بچوں سے متعلق ڈاکٹر ہولنگ ورتھ اور ان کے ساتھیوں نے بہتیرے مشہور خیالات کو غلط ثابت کر دیا ہے، مثلاً یہ خیال صحیح نہیں ہے، کہ گندہ ماحول ہی کی وجہ سے گلی کوچوں کے رہنے والوں میں سے کوئی اعلیٰ دماغ کا لیڈر پیدا نہیں ہوتا، ڈاکٹر ہولنگ ورتھ نے اپنے تیرہ سال کے تجربہ میں یہ دیکھا ہے کہ کسی نیچے خاندان سے اعلیٰ ذہانت کا بچہ کبھی نہیں آیا، ذہین بچوں کی اکثریت کامیاب خاندانوں ہی سے آتی ہے، ایک ایسی دنیا میں جہاں چین و آرام اور عیش و عشرت پسندیدہ چیزیں خیال کی جاتی ہیں عموماً قوم کے اہل ترین افراد ہی ان کو حاصل کر سکیں گے، جو اہلیت کم رکھتے ہیں وہ ان کے حصول میں غالباً ناکام رہیں گے، جیسا کہ ڈاکٹر ہولنگ ورتھ کہتی ہیں" ادنیٰ اوسط، اور اعلیٰ طبقوں میں نوعِ انسانی کی تقسیم جو نہایت قدیم زمانہ سے چلی آ رہی ہے، اقتصادی نقطۂ نظر سے حیاتیاتی بنیادوں پر قائم ہے، اُن تمام کوششوں کے باوجود جو اسے منسوخ کرنے کے لئے مختلف طریقوں سے عمل میں لائی جا رہی ہیں، یہ تقسیم ابھی تک قائم ہے "۔

اوسط درجہ کے ذہین یا غبی والدین کا ایک ذہین بچہ کو پیدا کرنا ایسا ہی محال ہے، جیسا ایک

ٹماٹر کے پودے سے بیر کا پیدا ہونا، اس میں شبہ نہیں کہ کامیاب خاندانوں میں غبی بچے بھی پیدا ہوتے ہیں اور اسی طرح اس کے برعکس بھی کبھی کبھی دیکھا جاتا ہے، اس کا سبب یہ ہو سکتا ہے، کہ ایک ذہین شخص کسی ایسی عورت سے شادی کرے، جو ذہنی قوت میں اُس سے فروتر ہو، اور بچے کو ماں کا دماغ ملے، یا ایک اعلیٰ دماغ کی عورت کسی ایسے شخص سے شادی کرے، جو ذہنی قوت میں اُس سے کم ہو لیکن باوجود اسکے بچہ ماں ہی کا دماغ پائے،

غیر معمولی ذہانت والے بچے عموماً وہی ہوتے ہیں، جو اپنے والدین کے پہلے یا اکلوتے بچے ہوتے ہیں، اور بچہ کی ولادت کے وقت ایسے والدین کی عمریں بھی عموماً اوسط سے زیادہ ہوتی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں، وہ اکثر اُس وقت تک شادی نہیں کرتے، جب تک اپنے لئے کوئی مستقل پیشہ اختیار نہ کرلیں،

جو بچے (۱۴۰) سے اوپر ذہنی استعداد رکھتے ہیں، ان میں لڑکوں اور لڑکیوں کا باہمی تناسب یہ ہے، کہ (۱۱۱) لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیاں (۱۰۰) ہوتی ہیں، (ہر نسبت میں لڑکے لڑکیوں سے زیادہ پیدا ہوتے ہیں) عام خیال کے برخلاف یہود کے بچے دوسری نسل کے بچوں سے زیادہ ذہین نہیں ہوتے، یہ خیال بھی صحیح نہیں، کہ نیگرو بچے سفید نسل والوں سے زیادہ ذہین ہوتے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اوسط درجہ پر آجاتے ہیں، اس اسکول میں تین نیگرو بچے ہیں، جن کی ذہنی فوقیت تمام عمر قائم رہے گی،

سوال ہوتا ہے کہ ذہنی استعداد کی جانچ بجائے خود کہاں تک صحیح ثابت ہوتی ہے چھ سال سے کم اور سولہ سال سے زیادہ عمر والوں کے لئے تو جانچ کا کوئی قابلِ اعتماد طریقہ ابھی تک ایجاد نہیں کیا جا سکا ہے، لیکن ان حدود کے اندر اسٹینفرڈ بنیٹ کے طریقے (Stanford-Binet Test) قابلِ اعتماد ہیں، مختلف ماہروں نے بچوں کو متعدد سالوں کے

کے وقفہ کے بعد جانچا ہے، لیکن اُن کے نتائج میں پانچ پوائنٹ سے زیادہ کا فرق شاذ و نادر ہی پایا گیا ہے،

چونکہ جانچ کے یہ طریقے نسبتہً حال میں جاری کئے گئے ہیں، اس لئے بہت کم بچے ایسے ہیں، جن کی غیر معمولی ذہانت بچپن میں دریافت کرلی گئی، اور پھر کالج کے درجوں تک ان کی ذہنی استعداد کا تجربہ کیا گیا، اُن پانچ بچوں میں سے جن کی ذہنی استعداد ابتدائی مدرسہ کی جانچ میں (۱۸۰) سے زیادہ ثابت ہوئی تھی، گذشتہ سال دو نے علمی پیشوں میں اپنی غیر معمولی حیثیت قائم کرلی ہے، ایک نے تاریخ میں اور دوسرے نے ریاضیات میں اوریجنل ریسرچ کو مکمل کیا تھا، اور تکملہ کے وقت دونوں کی عمریں (۲۲) سال سے کم تھیں، ان پانچ میں سے چار نہایت نمایاں امتیاز کیساتھ کالج کی تعلیم سے فارغ ہوئے ہیں، ذہنی استعداد انسان کی تمام عمر میں یکساں رہتی ہے، اور اعلیٰ دماغ کا انسان بن جاتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ اچھے دماغوں کی نگرانی نہایت اہمیت رکھتی ہے، تعلیم کے ذریعہ آپ فطری ذہانت پیدا نہیں کرسکتے، تعلیم صرف اوزار فراہم کرسکتی ہے جس سے ذہانت کام لیتی ہے، ہمارے آیندہ لیڈر ہمارے سامنے ہیں، اور اب وہ بچپن ہی میں پہچانے جاسکتے ہیں، یہ چیز تاریخ میں پہلی بار دیکھی جارہی ہے، ان لیڈروں کی طرف سے ہماری بے پروائی سخت کوتاہ بینی پر مبنی ہے، ہمارے لئے صرف وہی مستقبل کے لیڈر ہیں، اگر ان کی اہلیت اور قابلیت کو منتشر ہو جانے دیا گیا، تو ہم اس کی تلافی نہ کرسکیں گے، "ع ز"

مبادی علم انسانی

مادیت کی تردید میں برکلے کی مشہور کتاب "پرنسپلس آف ہیومن نالج" کا نہایت فصیح اور سنجیدہ ترجمہ جس میں حواس انسانی پر بحث کرکے مادیت کا ابطال کیا ہے،

ضخامت ۱۳۶ صفحے قیمت:- عہ ر "منیجر"

اخبار علمیہ

تعلیمی رپورٹ

حکومتِ ہند کی تازہ تعلیمی رپورٹ بابت ۳۶-۱۹۳۵ء کا حسب ذیل خلاصہ کلکتہ کے ہفتہ وار "مسلمان" (انگریزی) مورخہ ۲۵ مارچ ۳۸ء میں شائع ہوا ہے:-

ایجوکیشنل کمشنر اس رپورٹ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:- "زیر نظر سال کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ صوبوں، تعلیمی جماعتوں اور افراد کی طرف سے روز بروز زیادہ توجہ تعلیم پر کیجا رہی ہے"۔

موجودہ نظامِ تعلیم کے خلاف ایک عام بیزاری پھیلی ہوئی ہے، تمام لوگوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ابتدائی تعلیم کے انتظام میں کوئی ترقی نہیں ہوئی، اور وہ بالکل ناکافی ہے، جبری ابتدائی تعلیم ابھی اتنی ہی دور نظر آتی ہے، جتنی پہلے تھی، پڑھے لکھوں کی تعداد میں سالانہ ترقی کا اوسط بہت ہی کم ہے، یونیورسٹیوں میں بہت سے طلبہ ایسے ہیں، جو اعلیٰ تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت نہیں رکھتے تعلیم یافتہ طبقوں میں بیروزگاری عام طور پر پھیلی ہوئی ہے، اور لڑکیوں کی تعلیم کا اندازہ حد درجہ ناکافی ہے،

تعلیمی اداروں کی تعداد میں (۲۰۵۲) کی کمی ہوگئی ہے ۱۹۳۵ء میں ان کا شمار (۲۵۶۲۹۳) تھا ۱۹۳۶ء میں (۲۵۴۲۱۱) رہ گیا، یہ تخفیف زیادہ تر ابتدائی مدارس میں ہے، اور اس کا سبب یہ ہے کہ جو مدارس کافی طور پر تعلیم نہیں دیسکتے تھے، وہ بند کر دیئے گئے ہیں لیکن اس کے باوجود طلبہ کی تعداد میں (۳۰۹,۲۸۰)

کا اضافہ ہوگیا ہے، اور ۳۶-۱۹۳۵ء میں اُن کی مجموعی تعداد (۱۳ ،۱۶ ۱۴۹) ہے،

برطانوی ہند میں تعلیم کے مصارف میں تقریباً (۸۱) لاکھ روپیہ کا اضافہ ہوا ہے، سنہ ۱۹۳۵ء میں تعلیمی اخراجات کی مجموعی رقم (۲۶½) کرور سے زیادہ تھی، سنہ ۱۹۳۶ء میں یہ (۲۷) کرور (۳۳) لاکھ ہوگئی، اس اضافہ میں سے صرف (۹½) لاکھ لڑکیوں کی تعلیم پر خرچ ہوئے، لہذا یہ تجویز پیش کی گئی ہے، کہ اضافہ کی رقم میں سے لڑکیوں کی تعلیم پر اور زیادہ خرچ کرنا چاہیئے، اور آیندہ جو اسکیمیں تعلیم کی ترقی کے لئے بنائی جائیں، ان میں لڑکیوں کی تعلیم کا خیال پہلے کیا جائے،

ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں جن میں مخصوص پیشوں کے کالج بھی شامل ہیں، طلبہ کی تعداد میں (۷،۱۰۵) کا اضافہ ہوا، اور سنہ ۱۹۳۶ء میں یہ تعداد (۱۲۴،۵۰۸) تک پہونچ گئی، لڑکوں کے اینگلو ورناکیولر سکنڈری اسکولوں کی تعداد میں (۱۴۰) کا اضافہ ہوا، اور ان کے طلبہ کی تعداد میں (۵۳،۸۸۹) کا، لیکن لڑکوں کے ورناکیولر سکنڈری اسکولوں کی تعداد بقدر (۶۰) کے گھٹ گئی، اوران کے طلبہ کی تعداد میں بھی (۷،۹۳۹) کی کمی ہوگئی، کسی حد تک یہ تخفیف اقتصادی اسباب کی بنا پر ہوسکتی ہے، کہا جاتا ہے، کہ دیہات کے لوگ اس قدر غریب ہوگئے ہین، کہ وہ اپنے بچوں کی فیس بھی ادا نہیں کرسکتے حالانکہ ورناکیولر اسکولوں کی فیس بہت کم ہے، لیکن اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے، کہ ورناکیولر مڈل اسکول اینگلو ورناکیولر (انگریزی) اسکولوں کے مقابلہ میں نامقبول ہیں، ورناکیولر مڈل اسکول کے طلبہ کو اب ملازمتوں میں ترجیح نہیں دیجاتی خواہ وہ نمایاں طور پر اہلیت رکھتے ہوں، علاوہ برین ان اسکولون کے فارغ التحصیل طلبہ اگر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہین، توانھیں زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

لڑکوں کے سکنڈری اسکولوں کے اخراجات مین تقریباً (۲،۷) لاکھ کا اضافہ ہوا سنہ ۱۹۳۶ء میں ان پر (۷،۳۳۵،۴۹۷) روپئے صرف ہوئے،

لڑکون کے پرائمری اسکولوں میں اگرچہ (۱۳۴۸) اسکولوں کی تخفیف ہوگئی تاہم طلبہ کی تعداد

میں (۲۰۱،۱۱۲) کا اضافہ ہوا، اخراجات کی رقم میں بھی اس سال (۵۲، ۲۹ ۱۳) روپیہ کا اضافہ ہوا، اور وہ (۶،۸۲،۸۸،۱۶۰) روپیہ تک پہونچ گئی، پرائمری اسکولوں میں روپیہ اب بھی بہت ضائع ہوتا ہے، تمام برطانوی ہند میں اس کے ضائع ہونے کا اوسط لڑکوں کے اسکولوں میں (۷۳) فی صدی اور لڑکیوں کے اسکولوں میں (۸۶) فی صدی ہے، خوش قسمتی سے چند صوبوں میں کچھ نمایاں ترقی دیکھی جارہی ہے، ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان پڑھے لکھوں کی تعداد میں حسب ذیل ترقی پائی گئی ہے:۔ صوبہ مدراس میں (۳۱) سے (۳۳) فی صدی، بمبئی میں (۴۱) سے (۴۵) فی صدی، صوبہ جات متحدہ میں (۲۵) سے (۲۶) فی صدی، اس لئے امید کیجاتی ہے، کہ اگر ترقی کی یہ رفتار بھی قائم رہی تو حالات بہت کچھ بہتر ہو جائیں گے،

جبری ابتدائی تعلیم برطانوی ہند کے (۱۶۰) شہری حلقوں اور (۱۰۲۵۵) دیہاتوں میں جاری کردی گئی ہے، لیکن مقامی کمیٹیوں کی بے پروائی کی وجہ سے جبری تعلیم کا جو اثر ہونا چاہئے تھا، وہ نہیں ہوا، اس بات کی سخت کوشش کرنی چاہئے، کہ جن بچوں کا داخلہ اسکولوں میں ہوچکا ہے، وہ پابندی کے ساتھ حاضر ہوتے رہیں، تعلیم کا معیار بلند ہو، وہی اساتذہ مقرر کئے جائیں، جو طریقۂ تعلیم سے اچھی طرح واقف ہوں، ابتدائی تعلیم کے انتظام میں زیادہ سختی برتی جائے، اور ایسی عمارتوں میں تعلیم نہ دی جائے جہاں بچّوں کی صحت پر مضر اثر پڑے،

لڑکیوں کی تعلیم میں کافی ترقی ہوئی، زیر تعلیم لڑکیوں کی تعداد (۲۴۶ ۸۹۰ ۲) سے جو ۱۹۳۵ء میں تھی، ۱۹۳۶ء میں (۴۴۰ ۰۱۳ ۳) ہوگئی، گو کہ لڑکیوں کے اسکولوں کی تعداد (۶۰۱ ۳۹) سے گھٹ کر (۳۸،۳۹۰) رہ گئی، اس تعداد میں زیادہ تر تخفیف بنگال میں ہوئی، جہاں بہتیرے اسکول جنکی حاضری کم تعلیم ناکافی اور اخراجات زیادہ تھے، بند کردیئے گئے، اور متعدد اسکولوں کو جن میں لڑکیاں کم تھیں ایک دوسرے سے ملا دیا گیا،

لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط تعلیم کے خلاف جو تعصب تھا وہ فنا ہو رہا ہے، صوبہ جات متحدہ

مدراس اور آسام میں لڑکوں کے ابتدائی مدرسوں میں لڑکیوں کی تعداد بہ نسبت لڑکیوں کے مدرسوں کے زیادہ تھی، لیکن باوجود اس کے مقامی کمیٹیاں جن کے ہاتھوں میں ابتدائی تعلیم کا انتظام ہے لڑکیوں کی تعلیم میں جیسی چاہیئے ویسی مدد نہیں دیتیں، اگرچہ لڑکیوں کے تمام تعلیمی اداروں پر (۹،۲۰،۳۵۷) روپئے زیادہ صرف ہوئے، اور اس سال ان کے اخراجات کی مجموعی رقم (۳،۰۴۳،۹۰،۱۱۴) روپئے تھی، تاہم پنجاب، آسام اور صوبہ جات متوسط کے علاوہ اور تمام صوبوں میں حکومت کی طرف سے جو رقم لڑکیوں کی تعلیم پر صرف ہوئی، اس کا اوسط کم ہوگیا، تقریباً ہر جگہ لڑکوں کے مقابلہ میں لڑکیوں کی تعلیم کی طرف سے غفلت برتی گئی،

اس سال مسلمان طلبہ کی تعداد میں (۲۳،۵۱۷) کا اضافہ ہوا، اور مسلم طالبات کی تعداد میں (۲۶،۳۷۰) کا، یعنی لڑکوں کی تعداد کی بہ نسبت لڑکیوں کی تعداد میں زیادہ تیزی کے ساتھ ترقی ہوئی،

نیچی قوموں کی تعلیم میں بھی کافی ترقی ہوئی ہے، اور طلبہ کی تعداد میں (۸۰،۰۰۰) سے زیادہ کا اضافہ ہوا ہے، ان قوموں کے خلاف تعصب زائل ہوتا جارہا ہے، اور ان کے بچے بھی روز بروز زیادہ تعداد میں عام مدرسوں میں داخل ہو رہے ہیں،

حرفتی اور فنی اداروں میں بھی (۱۲۱) کا اضافہ ہوا ہے، ۱۹۳۵ء میں ان کی تعداد (۸۲۹) تھی، ۱۹۳۶ء میں (۹۵۰) ہوگئی، اور ان کے طلبہ کا شمار بھی (۶۶ ۳۱۹) سے (۷۰۹۶۰) تک پہونچ گیا، زیادہ ترقی تجارتی فنی اور صنعتی اسکولوں میں ہوئی،

"ع ز"

ادبیات

نذرِ آتش

از جناب پروفیسر فراق گورکھپوری الٰہ آباد یونیورسٹی

ہو ختم یہ عتاب کہیں رحم آچکے	گستاخِ عشق خون میں اپنے نہا چکے
مدت ہوئی کہ یاد کسی کی بھلا چکے	حرماں نصیب ہجر کے صدمے اٹھا چکے
کب سے لرز رہی ہے فضائے جہانِ عشق	اے حسن شرمسار تجھے شرم آچکے
سمجھے ہوئے تھے ہم سفرِ زندگی جنھیں	وہ کاروانِ درد بھی منزل پہ جا چکے
اب ماورائے وہم وگماں ہو سکوتِ حسن	وہ سن چکے فسانۂ غم ہم سنا چکے
گذرے گا ہو کے شہرِ خموشاں سے آج کون	لاکھوں طرح چراغِ لحد جھلملا چکے
اب عشق ہی رلائے تو کچھ رو سکیں کہ وہ	ہم بیکسانِ رنج ومحن کو رلا چکے
اے حسن بے نیاز یہ حالت بھی تا بکے	دشمن کو دوست دوست کو دشمن بنا چکے
تجھ کو بھی کچھ ہے معرکہ آرائیوں کا ہوش	لب تشنگانِ برقِ نظر کام آچکے
اب حسن کی کھلیں کہ بڑھیں فتنہ خیزیاں	مدت ہوئی کہ ہوش میں دیوانے آچکے
پُرپیچ اور عقدۂ ہستی کو کر دیا	جب آئینے میں گیسوے پُرخم بنا چکے
اے دل یہ کب کی بات نکالی کہ اب انھیں	اگلے دنوں کے لطف وکرم یاد آچکے
ان کا بھی کیفِ تمکنتِ حسن بڑھ گیا	اپنے بھی نالے عرش کے پائے ہلا چکے

دل پر کبھی فریبِ سکوں کے بھرم کھلیں
یونہی تقاضۂ غم صبر آزما چکے،

اب اور رنگِ عالمِ امکاں نظر میں ہے
آنکھوں میں اس دیار کے جلوے سما چکے،

پھر شوقِ وصل و حوصلۂ دید پوچھنا،
کچھ راہ پر مزاجِ غمِ ہجر آ چکے،

اس شوخیِ نہاں سے پناہ اے خدائے عشق
کھوئے نہ ہم گئے تھے ابھی اور وہ پا چکے،

بیتابِ دید آج بھی بیتاب دید ہیں،
لاکھوں طرح جمالِ خود آرا دکھا چکے،

اے دل حیاتِ عشق کا پانا محال ہے
ہم جان تک تو اپنی اسی میں گنوا چکے،

تقدیر میں ہر اک کی یہ برقِ ادا نہیں
تجھ پر وہ اے فراق حزیں مسکرا چکے

سخنِ ماہر

از جناب ماہر القادری

نالہ ہم رنگ تکلم مری آواز میں ہے
یعنی اب تک غمِ الفت کی خلش راز میں ہے

بیقراری ہی سے پایا ہے تو من نے فروغ
عشق کی جلوہ گری حسن کے انداز میں ہے

کاش سمجھے کوئی کلیوں کی چٹک کا مفہوم
یہ بھی اک "لے" ہے جو شامل تری آواز میں ہے

ہمتِ اہلِ نظر پست ہوئی جاتی ہے،
بے نیازی کا وہ عالم نگہِ ناز میں ہے،

رحم کر! رحم! زمانے پہ مرے دل کو نہ چھیڑ
حشر اک پردہ اسی ٹوٹے ہوئے ساز میں ہے

طالبانِ کرمِ یار جفا پر مٹ جائیں،
وہ تو یہ کہئے کہ مفہومِ کرم راز میں ہے

اس تصور سے عبارت ہے حیاتِ ماہر
جو تصور کہ تری انجمنِ ناز میں ہے

مطبوعات جدیدہ

تفسیر سورۂ کافرون، مولینا حمید الدین فراہیؒ، مترجمہ مولینا امین احسن اصلاحی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۴؍ پتہ دائرۂ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح سرائمیر اعظم گڈھ۔

یہ رسالہ ترجمان القرآن مولینا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ کے تفسیری رسائل کے اردو ترجمہ کے مفید سلسلہ کا ساتواں نمبر ہے، مولینا رحمۃ اللہ علیہ کی تفسیروں کی خصوصیات ارباب علم میں اتنی متعارف ہو چکی ہیں، کہ ان پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہیں، چھوٹی چھوٹی سورتوں کی تفسیر میں جن سے مفسرین عموماً سرسری گذر جاتے ہیں، مولینا کی فکر سلیم نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے باغ لگا دیتی ہے، یہ مختصر رسالہ بھی اس خصوصیت کا حامل ہے، قدیم مفسرین کے نزدیک بھی سورہ کافرون کفار سے برأت جنگ کا اعلان ہے، یعنی تبلیغ اور دعوت الی الحق کے تمام وسائل صرف کردینے کے بعد بھی جب کفار اپنی گمراہی پر اڑے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں ان سے قطع تعلق، ہجرت اور اعلان جنگ کا اذن دے دیا، مولینا نے اس حقیقت کو اس سورہ کے ناموں کی لغوی تحقیق، الفاظ کے معنی، سورہ کے زمانہ نزول، اس کے ماقبل و مابعد کی سورتوں کے مضامین، بعثت کے مراحل یعنی دعوت الی الحق اور اس سے انکار کی صورت میں کامل، تمام حجت کے بعد کفار سے اعلان برأت، ہجرت، اعلان جنگ اور غلبۂ حق، اور دعوت نبوی کے ان تمام مراحل کی دوسرے انبیاء علیہم السلام خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت کے مراحل سے مطابقت کر کے اس طرح پیش کیا گیا ہے، کہ بعثت کے مراحل کے باب میں خدا کی سنت اور سورۂ کافرون کا اعلان برأت ہونا پورے طور سے ذہن نشین ہو جاتا ہے، ترجمہ نہایت شستہ ہے۔

تسہیل البیان فی رسم نظم القرآن، مولفہ جناب قاری محمد نظر صاحب، تقطیع بڑی ضخامت

۱۳۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲/ پتہ محمد راشد امروہوی چوبداری محلہ وشبلی بک ڈپو لکھنؤ،

یہ رسالہ جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے قرآن پاک کے رسم الخط اور اس رسم الخط کے اصول و نظام پر ہے ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ ہے جس میں قرآن پاک کے تدریجی نزول کے مصالح سورتوں کے ناموں ان کی اور آیات کی ترتیب کے توفیقی ہونے آنحضرت صلعم کی حیات مبارک میں قرآن پاک کی تدوین صحابۂ کرام کے جمع حفظ اور کتابت قرآن، حفاظ صحابہ "أنزل القرآن على سبعة أحرف" کا مقصد و مدعا جماعت صحابہؓ اور تابعین کے اکابر قراء، نمازوں میں ترتیل، تدویر اور حدر کے ساتھ قرأت، حضرت عثمانؓ کی اشاعت قرآن کے اسباب اور قرآن پاک کے رسم الخط کے منجانب اللہ ہونے کے متعلق معلومات و مباحث کو جمع کر دیا گیا ہے، اس کے بعد قرآن پاک کے رسم الخط یعنی حروف مقطوع موصول تائے تانیث، ہمزۂ وصل، محذوفات، زوائد، الف کی کتابت، اس کے متعلق جزئیات اور ان سب کی مختلف صورتوں میں طریقۂ کتابت کی تفصیلات ہیں، آخر میں پورے کلام اللہ کے رسم الخط پر اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے، یہ کتاب قاری اور غیر قاری سب کے مطالعہ کے لائق ہے رسالہ عربی زبان میں ہے، ساتھ ساتھ اردو ترجمہ بھی دیدیا گیا ہے،

دکن میں اردو، مولفہ جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۰۰ صفحے کاغذ اچھا کتابت وطباعت معمولی قیمت ہے، پتہ:۔ مکتبہ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن،

دکن میں اردو مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کی پرانی اور مشہور تالیف ہے، اس کا پہلا اڈیشن آج سے بارہ تیرہ سال پہلے شائع ہوا تھا، پھر ایک ہی سال کے اندر ترمیم و اضافہ کے ساتھ دوسرا نکلا، اب یہ تیسرا اڈیشن ہے، اور جدید معلومات کے اضافہ اور ترتیب کتاب کے لحاظ سے پہلے دونوں اڈیشنوں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ جامع اور مکمل ہے، یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ کی حیثیت سے ایک خاص مرتبہ رکھتی ہے اہل دکن کی کاوشوں نے اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ کے پرانے نظریوں کو بہت کچھ بدل دیا ہے ممکن ہے آئندہ تحقیقات سے اور نئے انکشافات ظہور میں آئیں، اردو زبان نے جس سرزمین میں بھی جنم لیا ہو،

لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ لکھنؤ اور دہلی کے دوروں کو چھوڑ کر قدیم اور جدید دونوں دوروں میں اردو زبان کی سب سے زیادہ خدمت اور ترقی دکن میں ہوئی، اس لئے اس کو اردو زبان کا گہوارہ کہنا بالکل بجا ہے؛

اس کتاب کے آغاز میں اردو زبان کے مولد، دکن میں اسکی ابتدا، اور نظم و نثر کے آغاز پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے، اس کے بعد سنین اور دکن کے حکمران خانوادوں اور فرمانرواؤں کے لحاظ سے دور مقرر کرکے ہر دور کے شعراء کے بقدر تعارف حالات، ان کے کلام کے نمونے، اس عہد کی نثر کی تصانیف اور اس کے نمونے اور نظم و نثر پر تبصرہ ہے، آصفی دور کی اردو زبان کی ترقیوں کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، مرثیہ گو شعراء کے حالات علٰحدہ ہیں، پہلا دور ۷۴۸ھ سے ۹۰۰ھ تک بہمنی، دوسرا دور ۹۰۰ھ سے ۱۱۰۰ھ تک میں تین خانوادے ہیں، قطب شاہی، عادل شاہی اور برید شاہی، تیسرا ۱۱۰۰ھ سے ۱۱۳۶ھ تک مغلی، اس کے بعد آصفی دور کے حالات ہیں، یہ دور کئی دوروں پر تقسیم ہے، چوتھا دور ۱۱۳۶ھ سے ۱۲۲۰ھ تک آصفجاہ اول اور آصف جاہ ثانی کا زمانہ، پانچواں دور ۱۲۲۰ھ سے ۱۳۰۱ھ تک آصفجاہ ثالث سے آصفجاہ خامس تک، چھٹا دور ۱۳۰۱ھ سے ۱۳۳۶ھ آصفجاہ سادس سے قیام جامعہ عثمانیہ کے قبل تک، ساتواں دور ۱۳۳۶ھ قیام جامعہ عثمانیہ سے موجودہ عہد تک، ان تمام دوروں کو اردو کی لسانی حیثیت اور اسکی وسعت و ترقی کے لحاظ سے دو موٹے دوروں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے، پہلا دور آغاز سے لیکر مغلوں کے خاتمہ تک، اس دور میں اردو زبان کی ترقی زیادہ شعر و شاعری تک محدود رہی اگرچہ نثر کی کتابیں بھی لکھی گئیں، لیکن زبان کا رنگ وہی قدیم رہا، آصفی دور میں نمایاں انقلاب ہوا، اور اس دور کے ہر حکمراں کے زمانہ میں اردو کا قدم آگے بڑھتا گیا، اس لحاظ سے یہ دور کئی دوروں پر تقسیم کیا گیا ہے، اسی دور میں سنجیدہ تصانیف کا آغاز ہوا، اخبارات و رسائل کا مذاق پیدا ہوا، اور عہد بعہد اسمیں برابر اضافہ ہوتا گیا، سنجیدہ تالیفات و تراجم کا سلسلہ شروع ہوا، اردو زبان دفتری زبان قرار پائی، سررشتہ علوم و فنون قائم ہوا، انجمن ترقی اردو کی بنیاد پڑی، کالج اور جامعہ عثمانیہ کا قیام عمل میں آیا، دار الترجمہ قائم ہوا، مختلف علوم و فنون پر سینکڑوں کتابیں تالیف و ترجمہ ہوئیں، متعدد علمی اور ادبی انجمنیں قائم ہوئیں، اور حیدر آباد کی سرزمین

اردو زبان کی ترقی کا تماشا گاہ بن گئی، لائق مولف نے ان تمام دوروں کی ترقیوں کو سطح علحدہ علحدہ دکھایا ہے

کہ دکن میں اردو زبان کے تمام مدارج سامنے آجاتے ہیں لیکن دکن کے اردو زبان کے مولد ہونے اور شمالی ہند

میں شاعری کی ابتدا کے بارہ میں فاضل مؤلف کا بیان بہت کچھ بحث طلب ہے،

رسالہ علمیہ (عربی) مرتبہ مولینا سید محمد ہاشم صاحب ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۳۲ صفحے کاغذ اچھا،

ٹائپ خوشنما، پتہ :- دائرۃ المعارف، حیدرآباد دکن،

گذشتہ سال جامعۂ ازہر مصر کا وفد ہندوستان آیا تھا، سیاحت کے سلسلہ میں وہ حیدرآباد بھی گیا،

اس کے اعزاز میں وہاں کے مشہور علمی ادارہ دائرۃ المعارف نے ایک جلسہ ترتیب دیا، جس میں ارکان دائرہ

کے علاوہ متعدد ارباب علم نے علمی موضوعوں پر تقریریں کیں اور مضامین پڑھے، مولینا ہاشم ندوی نے ان

تقریروں اور مضامین کو رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا ہے، اس کا سرنامہ دائرۃ المعارف کے نام

اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہ کے پیام سے مزین ہے، اس کے بعد ارکان وفد کے خیر مقدم میں ارکان دائرہ

کا ایڈریس اور رئیس الوفد شیخ ابراہیم الجبالی کی جوابی تقریر ہے، پھر اور مقررین کی تقریریں ہیں، پرانے زمانہ

میں علماء کے باہمی ارتباط کی علت" مولوی شیخ عبد الرحمن یمانی رفیق دائرۃ المعارف" دولت آصفیہ کے علمی ادارے

مولوی حبیب عبد اللہ صاحب رفیق دائرۃ المعارف" اسلامی حضارت اور ہندوستان میں اس کے

آثار" مولوی مسعود عالم صاحب ندوی سابق مدیر الضیاء" معجم المصنفین" مولوی عبد القدوس صاحب ہاشمی ندوی

اقتباس تقریر استاذ عبد الوہاب رکن وفد "نظام امت اسلامیہ کا جز" مولینا محمد ہبتہ اللہ صاحب پروفیسر نظام کالج

اور "حیدرآباد میں عربی زبان کی خدمت" ڈاکٹر عبد الحق پروفیسر جامعہ عثمانیہ، یہ سب تقریریں اور مقالے عربی

میں ہیں، یہ رسالہ نہ صرف مصری وفد کے ورود کی یادگار کی حیثیت سے، بلکہ علمی حیثیت سے بھی لائق قدر ہے،

ابن مریم، مولفہ جناب حاجی رحیم بخش صاحب ایم اے، پنشنر ڈسٹرکٹ وسشن جج تقطیع اوسط،

ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ نمبر ۲ فرید کوٹ روڈ لاہور،

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، صلیب پر چڑھائے جانے اور موت کے بارہ میں جمہور اہل اسلام کا صحیح عقیدہ یہ ہے، کہ آپ بے باپ کے پیدا ہوئے، آپ کو سولی نہیں دی گئی، اور آسمان پر زندہ اٹھالئے گئے لیکن بعض جماعتیں تینوں مسائل میں اس سے مختلف عقیدہ رکھتی ہیں، ان کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باپ تھے، اور سولی پر آپ کی موت واقع ہوئی اور دونوں جماعتیں اپنے عقائد آیات قرآنی سے مستنبط کرتی ہین، یہ نہایت پامال مسائل ہیں، اور اس پر اتنا لکھا جا چکا ہے، کہ مشکل سے اس پر کوئی نیا اضافہ کیا جا سکتا ہے، تاہم حاجی رحیم بخش صاحب کے دینی جذبہ نے آپ کو اپنے طریقہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کرنے پر آمادہ کیا، چنانچہ انھون نے جمہور اہل اسلام کے عقیدہ کو آیات قرآنی سے ثابت کیا ہے، اور اس باب میں بائبل کے بیان کے اختلافات دکھا کر صحیح اسلامی عقیدہ کی تائید کی ہے، اور اسکے عقلی استحالوں کو دور کیا ہے، یہ کتاب مناظرانہ ذوق رکھنے والوں کے لئے دلچسپی سے خالی نہیں ہے،

آداب حق، مولفہ مولانا محمد ایوب صاحب باغ، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ شیخ ابرار حسین منیجر آزاد اینڈ کوڈگی بازار اجمیر شریف،

اس کتاب میں فاضل مؤلف نے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، تصوف، انسانی فضائل و رذائل اوامر و نواہی وغیرہ انسان کی اخلاقی تعلیم و تربیت کے متعلق بہت سے حکیمانہ اقوال و نصائح جمع کر دیئے ہین، انکی ترتیب حروف تہجی پر ہے، پہلے ہر تعلیم یا نصیحت کے متعلق مؤلف کی ایک رباعی ہے، اسکے بعد اسکے متعلق حکیمانہ اقوال اور اولیائے کرام کے مقولے اور نصائح ہین،

زمین کربلا، ترجمہ مولوی محمد ایوب صاحب عثمانی، تقطیع بڑی ضخامت ۴۴ صفحے کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت عہ، پتہ: مدرسہ معارف القرآن اورنگ آباد، ضلع گیا،

مصر کے ایک اہل قلم علی جلال حسینی نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات میں ایک کتاب لکھی ہے، مولوی محمد ایوب صاحب نے زمین کربلا کے نام سے اسکے اس حصہ کا جو واقعہ شہادت سے متعلق ہے، ترجمہ کیا ہے اردو

تم

میں حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے حالات میں متعدد مستند کتابیں موجود ہیں، علی جلال کی مذکورہ بالا کتاب میں کوئی خاص اضافہ اور امتیاز بھی نہیں معلوم ہوتا، تاہم فائدہ سے خالی نہیں ہے، لیکن ترجمہ اور زبان نہایت خراب ہے، تذکیر و تانیث تک کی غلطیاں ہیں، ناہمواری کے لحاظ سے یہ ترجمہ اس زمانہ کا ترجمہ ہی نہیں معلوم ہوتا،

گلدستہ مضامین و انشا پردازی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت اوسط، قیمت مرقوم نہیں، پتہ ایجوکیشنل بک ہاؤس سول لائن علیگڈہ،

اس کتاب کی تکمیل میں تین معلمین کی کوششیں شامل ہیں، رمضان علی صاحب ایم اے نے تالیف کی ہے، اختر علی صاحب ایم اے نے ترتیب دی ہے، اور محمد چراغ حسن صاحب ایم اے نے نظر ثانی کی ہے، اس اہتمام سے یہ تیار ہوئی ہے، کتاب کئی حصوں پر تقسیم ہے، ایک حصہ میں جو دو سو صفحوں میں پھیلا ہوا ہے، مختلف النوع مفید اشیاء کے متعلق معلومات اور اخلاقی تعلیم پر چھوٹے چھوٹے مفید مضامین ہیں، اسکے بعد مختلف مفید موضوعوں کی تحریر و تکرار انکے متعلق مضامین کے اجزا، بتا کر نمونہ کے مختصر مضامین ہیں، پھر خطوط نویسی کے اصول و قواعد، مختلف قسم کے خطوط اور تحریروں کے نمونے ہیں، آخر میں چند مشہور ادیبوں کے خطوط ہیں، اس کتاب کے مضامین اوسط درجہ کے طلبہ کیلئے مفید ہیں،

قصص الامثال، مولفہ جناب خواجہ باقر حسن صاحب قادری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت ۱۲؍، پتہ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی،

ہر زبان میں ضرب الامثال کا ایک ذخیرہ ہوتا ہے، ان میں سے بعضوں کے متعلق کچھ واقعات و حکایات بھی ہوتے ہیں، جو انھیں ضرب الامثال بناتے ہیں، اردو میں بھی صدہا ضرب المثلیں ہیں، اور انکے متعلق کچھ نہ کچھ قصص و حکایات بھی ہیں، خواجہ باقر حسین صاحب نے اس قبیل کی ڈھائی سو ضرب المثلوں اور انکے متعلقہ قصوں کو اس کتاب میں جمع کر دیا ہے، اور جن جن اردو ضرب المثلوں سے ملتی ہوئی عربی فارسی یا انگریزی کی ضرب المثلیں مل گئی ہیں، انھیں بھی درج کر دیا ہے، کتاب کوئی تاریخی تو ہے نہیں کہ اس کے تمام واقعات صحیح مانے جائیں، یا انھیں تاریخی معیار پر جانچا جائے، بلکہ محض ادبی کتاب ہے، اور اس لحاظ سے نہایت دلچسپ ہے، اور ایک حیثیت سے اردو زبان کی اچھی خدمت ہے،

"م"

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانوں کیلئے جن مقدس ہستیوں کے کارنامے اور سوانح حیات مشعلِ راہ ہو سکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دارالمصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث و سیر کے ہزاروں صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بحسن و خوبی شائع کیں، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفوں کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی میں چلیں، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدوں کی علٰحدہ علٰحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ ۲۶؎ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف ۲۰؎ میں یہ دس جلدیں کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دارالمصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدینؓ	ے/	جلد ششم	سیر الصحابہؓ ششم	۱؎
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	۸/	جلد ہفتم	سیر الصحابہؓ ہفتم	۲؎
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	ے/	جلد ہشتم	سیر الصحابیاتؓ	۳؎
جلد چہارم	سیر الانصارؓ اول	ے/	جلد نہم	اسوۂ صحابہؓ اول	۲؎
جلد پنجم	سیر الانصارؓ دوم	۲؎	جلد دہم	اسوۂ صحابہؓ دوم	۸/

منیجر

دارالمصنفین اعظم گڈھ

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، انکا لب ولہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض وعناد پیدا ہوجاتا ہی؛ مولنا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لیے اس غرض سے لکھی ہو کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب وملت معلوم ہو جائیں۔

ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عمر

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اسکی زبان بچوں کے لائق دلچسپ و پسندیدہ ہے، ان تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں، مدرسوں، مکتبوں کے کارکن اور معلم اسکو نصاب تعلیم میں داخل کرینگے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عمر

مقالات شبلی، جلد ششم،

(تاریخی)

یہ حصہ مولانا شبلیؒ مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن وتہذیب علم وفن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں، ضخامت ۲۴۰ صفحے،

قیمت :- عہ

مسعود علی ندوی، منیجر، دار المصنفین اعظم گڑھ

(مطبع معارف میں محمد اویس وارثی نے چھاپکر شائع کیا)

رجسٹرڈ نمبر ا ۸ے
مئی ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس المصنّفین دارالمصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مُرتّبہ

سیّد سُلیمان ندوی

قیمت:- پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی ہے عام طور سے مشہور ہے مسلمانون کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر صحت و اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہین، پہلے میں ولادت سے لے کر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصہ میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے تیسرے حصہ میں آپ کے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعلق متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپ کے ذریعہ مسلمانون کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادات کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے۔

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے۔

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اول تقطیع خورد للعہ، حصہ دوم تقطیع کلاں سے، تقطیع خورد صہ و سے، حصہ سوم تقطیع کلاں سے رللعہ، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ چہارم تقطیع کلاں عہ روسے، تقطیع خورد معہ و صہ، حصہ پنجم تقطیع کلاں صہ رللعہ

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈہ)

جلد ۴۱ | ماہ ربیع الاول ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ مئی ۱۹۳۸ء | عدد ۵

مضامین

ماتم اقبال

وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ آخر موت اور حیات کی چند ہفتوں کی کشمکش کے بعد ڈاکٹر اقبال نے دنیائے فانی کو الوداع کہا، صفر کی بیسویں اور اپریل کی اکیسویں کی صبح کو عمر کی اکسٹھ بہاریں دیکھ کر اور شاعری کی دنیا میں چالیس برس چہچہا کر یہ بلبلِ ہزار داستان اب ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت، اور اسلام کا فخر تھا، آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی، ایسا عارف فلسفی، عاشقِ رسول شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان، اور کاروانِ ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہو، اس کے دہن کا ہر ترانہ بانگِ درا، اسکی جانِ حزیں کی ہر آواز زبورِ عجم، اس کے دل کی ہر فریاد پیامِ مشرق، اس کے شعر کا ہر پرِ پرواز بالِ جبریل تھا، اسکی فانی عمر گو ختم ہوگئی، لیکن اسکی زندگی کا ہر کارنامہ جاوید نامہ بنکر انشاء اللہ باقی رہے گا، امید ہے کہ ملت کا یہ غمخوار شاعر اب عرشِ الٰہی کے سایہ میں ہوگا، اور قبول و مغفرت کے پھول اس پر برسائے جا رہے ہوں گے، خداوندا! اس کے دلِ شکستہ کی جو ملت کے غم سے رنجور تھا، غمخواری فرما! اور اپنی ربانی نوازشوں سے اس کے قلبِ حزیں کو مسرور کر،

مرحوم کی زندگی کا ہر لمحہ ملت کی زندگی کیلئے ایک نیا پیام لاتا تھا، وہ توحید خالص کا پرستار، دینِ کامل کا علمبردار، اور تجدید ملت کا طلبگار تھا، اسکے رونگٹے رونگٹے میں رسول انام علیہ السلام کا عشق پیوست تھا، اور اسکی آنکھیں جسمِ اسلام کے ہر ناسور پر اشکبار رہتی تھیں، اس نے مستقبلِ اسلام کا ایک خواب دیکھا تھا، اسی خواب

کی تعبیر میں اسکی ساری عمر ختم ہوگئی، ع

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں

کہنے کو تو ہم میں ملت کے غمخواروں کی کمی نہیں، اور نہ امت کے دوستداروں کی قلت، مگر واقعہ یہ ہے کہ نئی تعلیم نے اپنے ساٹھ ستر برس کے طویل عرصہ میں دو ہی سچے مسلمان غمخوار پیدا کئے، ایک محمد علی مرحوم اور دوسرا اقبال مرحوم، دونوں مرحوموں پر خدا کی بڑی رحمت ہو، ان کے دلوں میں اسلام کا حقیقی سوز تھا، اور رسول رحمت صلعم کے ساتھ سچا عشق، نئے زمانہ کی جھوٹی آب و تاب، اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک سے ان کی آنکھیں خیرہ نہ تھیں، آفتابِ اسلام کی ضیا باری کے مقابلہ میں اُن کے سامنے جدید تہذیب و تمدن، اور زمانۂ حال کی تجدیدات کی نئی روشنی مہِ نخشب کے مصنوعی نور سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی، خدا ان کی قبروں کو اپنے نور سے بھردے،

اقبال کی قومی شاعری بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ شروع ہوئی، بیسویں صدی کے اس پیغام بر سال نے اپنے اڑتیس برس کے شاعرانہ پیغاموں سے ملت کے نوجوانوں میں نئی امنگ بھردی اور نئے سفر کے قطعِ منزل کے لئے ان میں نئے سر سے ہمت پیدا کردی، اقبال کا یہ دعویٰ حرف حرف سچا تھا،

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا

ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

اقبال کی تصنیفات زمانہ میں یادرہینگی، وہ اسلام کا غیر فانی لٹریچر بنکر انشاء اللہ رہیگا، ان کی شرحیں لکھی جائینگی، تشریحیں کیجائینگی، نظریئے ان سے بنیں گے، ان کا فلسفہ تیار ہوگا، اسکی دلیلیں ڈھونڈھی

جائیں گی، قرآن پاک کی آیتوں، احادیث شریفہ کے جملوں، مولانا رومی اور حکیم سنائی کے تاثرات سے اُن کا مقابلہ ہوگا، اور اس طرح اقبال کا پیام اب دنیا میں انشاء اللہ ہمیشہ زندہ رہے گا، اور اقبال زندۂ جاوید!

اقبال صرف شاعر نہ تھا، وہ حکیم تھا، وہ حکیم نہیں جو ارسطو کی گاڑی کے قلی ہوں، یا یورپ کے نئے فلاسفروں کے خوشہ چیں، بلکہ وہ حکیم جو اسرارِ کلامِ الٰہی کے محرم اور رموزِ شریعت کے آشنا تھے، وہ نئے فلسفہ کے ہر راز سے آشنا ہو کر اسلام کے راز کو اپنے رنگ میں کھول کر دکھاتا تھا یعنی بادۂ انگور نچوڑ کر کوثر و تسنیم کا پیالہ تیار کرتا تھا،

وفد کابل جن تین ممبروں سے بنا تھا، افسوس ہے کہ اس میں یکے با دیگرے دو چل دیئے، سر راس مسعود اور اقبال، اب صرف ایک رہ گیا ہے، اور معلوم نہیں کہ وہ بھی کتنے دن کے لئے ہے؟

حریفاں بادہ ہا خوردند و رفتند

مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغِ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے، چنانچہ انھوں نے پیشگوئی کی تھی کہ حالی و آزاد کی جو کرسیاں خالی ہونگی ان میں سے ایک اقبال کی نشست سے پُر ہوجائیگی، افسوس کہ آج اٹھائیس برس کے بعد وہ کرسی خالی ہوگئی اور اب اسکے بھرنے کی کوئی صورت نہیں،

اقبال! ہندوستان کا فخر اقبال! اسلامی دنیا کا ہیرو اقبال! فضل و کمال کا پیکر اقبال! حکمت و معرفت کا دانا اقبال! کاروانِ ملت کا رہنما اقبال! رخصت رخصت! الوداع الوداع سلام اللہ علیک و رحمتہ الی یوم التلاق!

مقالات

اسلامی نظام تعلیم

از مولینا ریاست علی ندوی

اساتذہ کے فرائض اسلامی مدارس کے معلموں کے فرائض چند نوعیتوں کے تھے، ایک خود ان کی سیرت و کردار پر چند قیود عائد تھے، دوسرے اساتذہ اور طلبہ کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ان کے ذمہ چند واجبات تھے، پھر اُن کے حلقۂ درس میں ان کے بعض معمولات مقرر تھے، ان میں سے دونوں اوّل الذکر کا اجمالی بیان ذیل میں پیش ہے اور آخر الذکر کی تفصیل حلقۂ درس کے بیان میں آئے گی،

اساتذہ کی ذاتی سیرت و اوصاف اسلامی دورِ تعلیم میں استادوں اور لڑکوں کے تعلقات روحانی باپ اور بیٹوں کے طور پر قائم تھے، اساتذہ لڑکوں کے صرف تعلیمی مشاغل کے ذمہ دار نہ تھے، بلکہ ان میں روحانی پاکیزگی اور بلند اخلاق پیدا کرنا بھی ان کے فرائض میں داخل تھا، اس لئے جس طرح ایک گھر میں باپ اپنے بچوں کی آیندہ زندگی کیلئے نمونہ ہوتا ہے، اسی طرح اساتذہ کی زندگی طلبہ کے لئے اسوۂ عمل تھی، اس لئے ضروری تھا کہ اساتذہ بھی ذاتی طور پر کامل دیندار اور محاسن اخلاق اور تہذیب و شائستگی کے سراپا پیکر ہوں، اس لئے اسلام کے تعلیمی دستور العمل میں شاگردوں کو ان کے تعلیمی فرائض کے ساتھ تربیت اور تہذیب نفس کے اصول بتائے گئے ہیں، اسی طرح استادوں کی دینداری، تہذیب اخلاق، اور طرز زندگی پر نگاہ رکھی گئی ہے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے اپنی کتاب میں استادوں کے آداب میں جو باب باندھا ہے، اس میں انہی

اصول کی تشریح کی ہے، تقریباً انہی اصولوں کے مانند امام غزالی نے بھی احیاء العلوم جلد اکتاب العلم میں اساتذہ کے اوصاف اجمال کے ساتھ بیان کئے ہیں، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں :۔

استادوں کے لئے ذیل کے چند ذاتی اوصاف ضروری ہیں :۔

خوف خدا علما اور اساتذہ پر واجب ہے کہ وہ بزم و خلوت ہر جگہ اپنے تمام اقوال و افعال اور حرکات و سکنات میں خوف خداوندی ملحوظ رکھیں، کیونکہ جو علوم انہیں ودیعت کئے گئے ہیں، ان کے حقیقی نگہبان اور امانت دار وہی ہیں، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے،

لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوا	اللہ اور رسول کی خیانت نہ کرو، اور نہ
اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ،	اپنی امانتوں میں خیانت کرو، تم (خیانت
(انفال۔ ع ۳)	کے وبال سے) واقف ہو،

ایک دوسری جگہ فرمایا :۔

بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ وَ	کیونکہ وہ اللہ کی کتاب کے محافظ ٹھہرائے
كَانُوْا عَلَيْهِ شُهَدَآءَ فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ	گئے تھے، اور وہ اس کی حفاظت کرتے بھی
وَاخْشَوْنِ، (مائدہ۔ ع ۵)	رہے، لوگوں سے نہ ڈرو ہم سے ڈرو،

وقار و متانت علما کی زندگی متانت اور وقار کی ہونی چاہئے، امام شافعی فرماتے ہیں :۔

" علم صرف یہی نہیں ہے کہ علم کی چیزیں رٹ لیجائیں، علم کے لئے متانت، وقار، خشوع و خضوع اور خاکساری پر عمل کرنا اور قائم رہنا ضروری ہے"[1]

قتیبہ امام مالک کے درس کی مجلس کے متعلق کہتے ہیں :۔

" امام مالک کی مجلس وقار، حلم، اور علم کی مجلس تھی، وہ پر وقار اور اچھی خصلتوں والے تھے، ان

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۵، ۱۶،

کی مجلس میں شور اور ہنگامہ نہ تھا، اور نہ آواز بلند ہوتی تھی۔[ا]

امام مالک خلیفہ ہارون رشید کے نام ایک نصیحت نامہ میں فرماتے ہیں:

"جب تم علم حاصل کرو، تو علم کی نشانیاں، متانت، وقار اور علم بھی اپنے اندر پیدا کرو، کیونکہ آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے، کہ علماء رسولوں کے وارث ہوتے ہیں۔"

• حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:۔

"علم حاصل کرو، اور اس کے لئے متانت اور وقار پیدا کرو۔"[۲]

شریعت کی پابندی شریعت کی پابندی کرنا معلموں اور عالموں کا سب سے پہلا فرض ہے، وہ اسلامی شعائر اور ظاہری احکام کے پورے پابند ہوں، خاص طور پر مسجدوں میں نماز با جماعت پابندی سے پڑھتے ہوں، ہر خاص و عام کو سلام کرنے میں پیش دستی کرتے ہوں، مصیبت کے وقت صبر کرتے ہوں، سنتوں پر عمل کرتے ہوں، بدعتوں سے دور رہتے ہوں، مسلمانوں کو نیکی کی تلقین کرتے ہوں اور برائی سے بچاتے ہوں، اور مسلمانوں کی قومی اور ملی مصلحتوں کی مذہبی طریق پر پاسداری کرتے ہوں کیونکہ علماء اور اساتذہ ہی عام مسلمانوں اور طالب علموں کے پیشوا ہیں، اگر ایک عالم اپنے علم سے خود فائدہ نہ اٹھائے، تو دوسرے اس سے کیونکر فائدہ اٹھائیں گے، اسلئے عالم کی گمراہی کا جرم زیادہ سنگین اور پر معصیت ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ سے برائیوں کے پھیلنے کا زیادہ امکان ہے، عوام اسکی معصیت سے جری ہو کر زیادہ جرأت کیساتھ علانیہ گناہوں کے مرتکب ہوں گے،

اسی طرح علماء کا فرض ہے، کہ وہ کلام پاک کی تلاوت پابندی سے کریں، اور دل کو بیدار رکھ کر اللہ تعالی کے ذکر میں مشغول رہیں، اور تلاوت قرآن میں اس کے معنوں اور مطلبوں، اس کے حکموں اور ممانعتوں اور اس کے وعدوں اور دھمکیوں پر غور و فکر کرتے رہیں،

اخلاق حسنہ اختیار کرنا اس کے ساتھ انھیں محاسن اخلاق کے زیور سے آراستہ ہونا چاہئے، ان کی سرا پا زندگی

[ا] تذکرۃ الحفاظ جلد اصـ ۱۹۷، [۲] تذکرۃ السامع ص ۱۶۔ یہ اثر کنز العمال ج ۵ ص ۲۰۲ میں موجود ہے،

پاکبازی اور قناعت میں بسر ہو، خیرات او صدقات کریں، لوگوں کو کھانا کھلائیں، لوگوں سے کشادہ پیشانی سے پیش آئیں، غصہ کو پی جائیں، دوسروں کی مصیبتوں میں ہمدردی کریں، اور ان کے دور کرنے کی کوشش کریں، اپنے اثر و اقتدار کو لوگوں کے فائدہ پہونچانے اور ان کی جائز سفارشیں کرنے میں صرف کریں، فقیروں کیساتھ لطف اور نرمی سے پیش آئیں، پروسیوں اور رشتہ داروں سے محبت کریں، طالب علموں سے نرمی کا سلوک کریں، ان کی ہر قسم کی دستگیری کریں، اگر کسی کو دیکھیں کہ وہ نماز کا پابند نہیں، طہارت کا لحاظ نہیں کرتا یا دوسرے واجبوں کو علانیہ ترک کرتا ہے، تو اسے لطف اور نرمی سے سمجھائیں، جیسے کہ رسول اللہ صلعم نے اس اعرابی کو جس نے مسجد نبوی میں پیشاب کر دیا تھا، نرمی سے سمجھایا تھا مجموعی طور پر اچھے اخلاق اور عمدہ عادتیں توبہ استغفار، اخلاص ویقین، صبر و تقویٰ، قناعت و رضا، زہد، توکل، صفائی باطن، حسن ظن، تجاوز و درگذر، حسن خلق احسان، شکر نعمت، مخلوق پر شفقت، شرم وحیا، اور محبت الٰہی ایسے جامع خصائل ہیں جنھیں پیدا کرنا چاہئے اور جو صرف حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اتباع ہی سے حاصل ہو سکتے ہیں، ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم ذنوبکم، (آل عمران ع ۴)

اخلاق رذیلہ سے اجتناب دوسری طرف انھیں ہر قسم کے بُرے اخلاق سے اپنا دامن پاک اور صاف رکھنا چاہئے، خصوصاً بغض، حسد، کینہ، تکبر، بخل، خباثت نفس، خود پسندی، فخر، غیبت، چغل خوری، جھوٹ، بہتان، حرص، طمع، مداہنت، نمود و نمائش، فحاشی، ہزل گوئی، ٹھٹھا، بیہودہ مذاق اور دنیا طلبی یہ ایسے برے اخلاق ہیں جن سے علماء کو بلند اور برتر رہنا چاہئے، اس کے بعد قاضی ابن الجماعہ فرماتے ہیں،

"بہت سے علماء زمانہ الا ماشاء اللہ ان عیبوں خصوصاً حسد، تکبر، ریاکاری، اور دوسری لوگوں کو حقیر اور کمتر جاننے میں مبتلا ہو جاتے ہیں، ان بلاؤں کی دعائیں زہد اور اخلاق کی کتابوں میں موجود ہیں، جو شخص اپنے آپ کو ان عیبوں سے پاک کرنا چاہے، وہ ان کتابوں کی طرف رجوع کرے، ان میں سب سے مفید محاسبی رحمہ اللہ تعالیٰ (متوفی ۲۴۳ھ) کی کتاب الرعایۃ ہے[1]"

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۸، ۲۰، ۲۱، ۲۳، ۲۴، کتاب الرعایۃ،

احترام علم | اساتذہ اور علماء کا فرض ہے، کہ وہ خود بھی علم کی عزت کریں، اور اپنے کسی طرز عمل سے کوئی ایسا موقع نہ آنے دیں، کہ علم کے احترام کو صدمہ پہونچے، امام اعظم ابو حنیفہ نے اپنے شاگردوں سے فرمایا:۔

"اپنے عماموں کی عظمت کرو، اور اپنی آستینوں کو وسیع کرو"[1]

امام زہری فرماتے ہیں:۔

"علم کے لئے یہ بھی کسر شان ہے کہ اسے اس کے حاصل کرنے والے کے گھر پہونچایا جائے"

عام اس سے کہ وہ دنیاوی وجاہت اور مرتبہ میں وہ جس قدر بھی بلند درجہ ہو"[2]

البتہ اگر کوئی خاص مجبوری ہو یا کسی دینی مصلحت کا تقاضا ہو تو تعلیم دینے کیلئے استاذ متعلم کے گھر پر جاسکتا ہے، چنانچہ مختلف ائمہ سلف سلاطین اور امراء کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے ان کے محلوں میں تشریف لے گئے، خود امام زہری خلیفہ ہشام کے لڑکوں کو پڑھانے کے لئے قصر خلافت میں تشریف لیجاتے تھے، امام شافعی مصر کے جلیل القدر خانوادۂ بنو عبد الحکم کے یہاں مقیم تھے، اور ان دونوں بزرگوں کے متعلق یہ تصریح سے معلوم ہے کہ انھوں نے ان لوگوں سے مالی مدد قبول فرمائی، ہشام نے امام زہری کے سات ہزار دینار کا قرض اوتارا، اور بنو عبد الحکم نے بعض موقعوں پر ۳ ہزار دینار سے امام شافعی کی مدد کی،

لیکن ان ائمہ کو دینی حیثیت سے جو مرتبہ حاصل تھا، اور ان کی پوری زندگی، دین کی خدمت میں جس اخلاص و حسن نیت سے صرف ہوئی، اسے دیکھتے ہوئے یہ سمجھنا چاہئے، کہ ان لوگوں کا علم سکھانے کے لئے دربارو میں جانا کسی دنیاوی غرض سے نہ تھا، ورنہ دنیاوی اغراض، جاہ و منزلت، عزت و شہرت، نام و نمود اور ہمعصروں سے سبقت اور فضیلت حاصل کرنے کی خواہش اسلامی دستور تعلیم کے رو سے بدترین اخلاقی گناہ ہے[3]

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

"میں چاہتا ہوں کہ مخلوق، علم کا ایک حرف بھی میری طرف منسوب کئے بغیر اس علم کو مجھ سے

---

[1] تعلیم المتعلم ص۱۱ [2] تذکرۃ السامع ص ۱۶، ۱۷، و تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۰۳ و مقدمہ سیرۃ عمر بن عبد العزیز لابن عبد الحکم ص۱۱

حاصل کرے،

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے قرآن کا فہم عطا کیا گیا تھا، لیکن جب میں نے ابوجعفر (المنصور) سے تھیلی لے لی، تو وہ فہم مجھ سے چھین لیا گیا، ہم اللہ سے اپنی اس مسامحت پر عفو چاہتے ہیں"[1]

چھوٹے پیشوں سے اجتناب علم کے احترام کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ ایسے چھوٹے پیشوں کو اختیار نہ کریں جو اہل علم کے شایان شان نہ ہوں، جیسے حجامت، دباغت، صرافہ اور زرگسازی وغیرہ،

تہمت کے موقعوں سے اجتناب انھیں تہمت کے مشتبہ موقعوں سے بھی بچنے کی ضرورت ہے، اگرچہ فی نفسہ وہ ان سے دور ہوں، اور نہ کوئی ایسا کام کرنا چاہئے، جو اخلاق کے بلند اصولوں کے منافی ہو، اور یا جو کام اصل میں برے نہ ہوں، مگر لوگ ظاہر میں انھیں برا سمجھتے ہوں، ان سے بھی دامن بچانا چاہئے، ورنہ لوگوں کو ان کے خلاف اپنے دلوں میں بدگمانی پیدا کرنے کا موقع ملیگا، اور وہ لوگوں کی نظروں سے گرجائیں گے،

اور اگر ایسے موقعے پر جانے یا کوئی ایسا کام کرنے کی ضرورت پڑجائے، تو کچھ لوگوں کو اس سے مطلع کر دینا چاہئے، تاکہ وہ لوگ اصل حقیقت سے پہلے سے آگاہ رہیں، اور بدگمانی پیدا ہونے کی نوبت نہ آئے[2]

مشاغل کی پابندی اور اوقات کی حفاظت علما، و اساتذہ کا فرض ہے، کہ وہ کوشش اور محنت میں ہمیشہ مصروف رہیں، اور ان کے عبادت کرنے پڑھنے پڑھانے اور غور و فکر کرنے تصنیف و تالیف اور بحث و نظر کرنے میں ان کے جو معمولات ہوں، انھیں پابندی سے قائم رکھیں، ان کے سلسلہ کو نہ توڑیں،

انھیں اپنا وقت سب سے زیادہ عزیز رکھنا چاہئے، مختلف غیر علمی و تعلیمی مشغولیتوں، کھانے پینے، ملنے ملانے روزی حاصل کرنے راحت و آرام کرنے اور خانگی زندگی میں وقت گذارنے میں کم سے کم وقت صرف کریں، ربیع بن سلیمان مرادی، امام شافعی کے متعلق بیان کرتے ہیں، کہ

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۹ [2] ۱۹، ۵۲، صفحات ۲۰،

• "میں نے انہیں دن کے وقت کھاتے اور رات کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ اپنے وقت کا بڑا حصہ تصنیف میں گذارتے تھے"

حقیقت یہ ہے، کہ علم کا مرتبہ رسولوں کی جانشینی کے درجہ تک پہنچاتا ہے، یہ بلند مرتبہ تکلیفیں اور مشقتیں اٹھائے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا صحیح مسلم میں روایت ہے،

• "جسم کی آسایش کے ساتھ علم کو تابع نہیں بنایا جاسکتا تھا"

ایک دوسری روایت میں ہے،

"جنت تکلیفوں اور مصیبتوں سے حاصل ہوتی ہے"[۱]

مطالعہ کا استمرار علما اور اساتذہ کو مطالعہ کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھنا چاہئے، حضرت سعید بن جبیر فرماتے ہیں

"عالم اسی وقت تک عالم رہ سکتا ہے، جب تک وہ طالب علم ہے، جب وہ پڑھنا چھوڑ دے اور سمجھے کہ وہ علم سے بے نیاز ہوگیا، اور جو کچھ اس نے حاصل کرلیا، وہ اس کے لئے کافی ہے، تو لیا سمجھنے والا سب سے بڑا جاہل ہے"[۲]

چھوٹوں سے استفادہ علما کیلئے تو یہ بھی معیوب نہیں کہ وہ اپنے چھوٹوں سے استفادہ کریں، علم کی تحصیل خواہ کسی صورت اور شکل میں کسی سے بھی ہو، وہ معیوب نہیں ہے "حکمت مومن کی کھوئی ہوئی دولت ہے، اسے جہاں پائے اٹھالے"، ایک دوسری روایت میں ہے: "حکمت کا کلمہ جہاں ملے، حاصل کرو، خواہ وہ مشرکوں کے ہاتھوں سے"[۳]

ابوبکر عبد اللہ بن زبیر حمیدی متوفی ۲۱۹ھ جو امام شافعی کے شاگرد تھے، فرماتے ہیں:-

"میں شافعی کی معیت میں مکہ سے مصر تک گیا، راستہ بھر ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے، میں ان سے فقہ کے مسئلے پوچھتا، اور وہ مجھ سے حدیثیں سنتے تھے"

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں،

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۲۶ و ۱۹۲ [۲]، ص ۹۲ و ص ۲۸ [۳]، ص ۲۷ [۴] مختصر جامع بیان العلم

"تم لوگ مجھ سے حدیث زیادہ جانتے ہو، اگر تمہارے پاس کوئی صحیح حدیث نکلے، تو مجھے بتا دیا کرو میں تم سے لے لوں گا۔"[51]

اشہب بن عبد العزیز کہتے ہیں، :-

"میں نے ابوحنیفہ کو مالک کے سامنے ایسا دیکھا جیسے کوئی بچہ اپنے باپ کے سامنے ہو۔"

اس پر امام ذہبی فرماتے ہیں، کہ "یہ ابوحنیفہ کے حسن ادب اور تواضع کی بڑی دلیل ہے، حالانکہ وہ مالک سے تیرہ سال بڑے تھے۔"

تصنیف و تالیف کا شغل، علماء کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ تصنیف اور تالیف میں مشغول رہیں لیکن یہ دشوار گذار راہ اسی وقت اختیار کریں جب اس پر چلنے کی پوری استعداد آگئی ہو، اور اثنائے راہ کی منزل کی دشواریوں سے پوری آگاہی ہو، علوم و فنون کے حقائق بیان کرنے کے لئے تفتیش و مطالعہ غور و فکر و تدبر اور کتب کے مراجعہ کی ضرورت ہوتی ہے،

اپنی تصنیف کے لئے ایسا موضوع منتخب کریں، جس کا نفع عام ہو اور لوگوں کو اس کی ضرورت ہو، خصوصاً ایسی چیزیں لکھیں، جس پر پہلے سے کوئی تصنیف موجود نہ ہو، عبارت میں اعتدال قائم رکھیں نہ زیادہ طویل ہو، اور نہ زیادہ مختصر کہ مفہوم واضح نہ ہو سکے،

اپنی تصنیف اس وقت تک شائع نہ کریں، جب تک اس پر نئے سرے سے نظر ثانی نہ کر ڈالیں اور اس کے مسائل و مباحث اور سیاق و سباق پر کامل غور و خوض نہ کریں،

اگر تصنیفی استعداد موجود نہ ہو تو ہرگز قلم ہاتھ میں نہ اٹھائیں، کیونکہ ہر عالم کے لئے مصنف ہونا ضروری نہیں ہے،[53]

اساتذہ و طلبہ کے باہمی تعلقات اوپر بیان کیا جا چکا ہے، کہ اسلامی دور تعلیم میں استادوں اور شاگردوں کے

---

۵۱ تذکرۃ السامع ص ۲۹، ۵۲ تذکرۃ الحفاظ جلد ا ص ۱۹۵، ۵۳ تذکرۃ السامع ص ۲۹، ص ۳۰،

تعلقات خالص روحانی بنیادوں پر قائم تھے، استاد روحانی باپ اور شاگرد ان کے روحانی بیٹے تھے، چنانچہ ان دونوں کے باہمی تعلقات اور مراسم میں سب سے زیادہ یہی رشتہ نمایاں ہے، وہ ان کے اخلاق اور سیرت کے کامل نگہبان تھے جس موقع پر شفقت و محبت کی ضرورت ہوتی شفقت سے پیش آتے، جہاں تنبیہ و تادیب کا موقع ہوتا، تنبیہ کرتے تھے، اشاروں و کنایوں میں نصیحت کارگر ہوتی، تو اشاروں سے کام لیتے اور تصریح سے روکنے کی ضرورت ہوتی، تو صاف گوئی سے کام لیکر روک دیتے، اساتذہ کے سامنے شاگردوں کی آئندہ زندگی کا سوال مستقل طور پر رہتا، اور اسی کے مطابق وہ ان کی تعلیم و تربیت کرتے تھے، بلکہ اساتذہ کا دستور سا مقرر ہوگیا تھا، کہ ہر طالب علم کو چند وصیتیں اس کے حسب حال لکھ کر اس کے سپرد کرتے تھے جنھیں شاگرد اپنی آئندہ زندگی میں مشعل راہ بناتے تھے، چنانچہ مختلف ائمۂ اسلام کی وصیتیں سیرت کی کتابوں میں محفوظ ہیں[1]،

استاد کی شفقت، استاد شاگردوں کے ساتھ غیر معمولی شفقت، لطف اور محبت سے پیش آتے تھے، ان کے اخلاق و عادات کی نگرانی اور ان میں اسلامی پاکبازی اور پرہیزگاری پیدا کرنے کے علاوہ ان کی ہر قسم کی ضرورتوں پر نگاہ رکھتے تھے، اگر وہ درس کے حلقہ میں خلاف معمول نہ آتے، تو ان کے متعلق دریافت کرتے، اور کسی معقول عذر کی صورت میں اُسے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی طرح نادار لڑکوں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، وہ بیمار پڑتے تو ان کی عیادت کو جاتے، ان کے گھر میں کوئی سانحہ پیش آتا، تو تعزیت کرتے، غرض معاشرتی زندگی میں جس نوعیت کے باہمی مخلصانہ تعلقات کی ضرورت ہوتی ہے، استاد اور شاگرد کی باہمی معاشرت میں ان کا صحیح نمونہ موجود تھا،

امام غزالی نے جہاں اساتذہ کو شفقت کرنے کی تلقین کی ہے، اس موقع پر وہ کہتے ہیں کہ معلم کا حق والدین کے حق سے زیادہ ہے، اور جس طرح والدین لڑکوں پر شفقت اور مہربانی کرتے ہیں اسی طرح ان کا بھی فرض ہے کہ وہ متعلمین سے شفقت اور مہربانی سے پیش آئیں[2]،

---

[1] مختصر جامع بیان العلم ص ۶۴ و تعلیم المتعلم، [2] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۳۶

قاضی ابن جماعہ استادوں کے لئے لکھتے ہیں:۔

"استاد کو چاہئے کہ طالب علم کی ضرورتوں کا لحاظ رکھے اور اس کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آنے میں، اس پر احسان کرنے، اور اگر کبھی اس کی کوئی ایسی زیادتی ہو جو لوگوں سے پیش آجاتی ہے، تو اس پر صبر کرنے میں اور بعض وقت اس کی بدتمیزی برداشت کرنے میں، اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنا چاہئے، جو عزیز سے عزیز اولاد کے ساتھ کیا جاتا ہے"[۹]

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں:۔

"اساتذہ کو چاہئے کہ وہ طالب علموں کی مصلحتوں اور ضرورتوں کا لحاظ کرنے اور ان میں دل کی یکسوئی پیدا کرنے، اور اپنی استطاعت کے مطابق ان کی مالی مدد کرنے کی کوشش کریں کیونکہ جب تک کوئی بندہ اپنے بھائی کی اعانت کریگا، خدا اس کی اعانت کرے گا، اور جو اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرے گا، خدا اس کی حاجت روائی فرمائے گا، اور جو کسی تنگی کے لئے آسانی پیدا کرے گا، خدا قیامت کے دن کا حساب اس پر آسان کرے گا، خاص طور پر علم طلب کرنے میں اعانت کرنا افضل ترین ثواب کا کام ہے،

استاذ کو چاہئے کہ اگر کوئی طالب علم حلقہ سے خلاف معمول زیادہ غیر حاضر ہو جائے تو اس کا سبب دریافت کرنا چاہئے، اور جو لوگ اسے جانتے ہوں، ان سے اس کے حالات پوچھنے چاہئیں، اور اگر کسی سے اس کا حال معلوم نہ ہو سکے، تو کسی کو اس کے پاس بھیجنا چاہئے، بلکہ اگر وہ خود اس کے گھر جا کر اس کے حالات پوچھے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا"[۱۰]

سلسلۂ تعلیم کے جاری نہ رکھ سکنے کے موانع کو دور کرنا،

طالب علموں کی تعلیمی زندگی کے دور میں ایسے موانع پیش آتے ہیں کہ وہ اپنے تعلیمی ذوق کے باوجود مختلف خانگی وجوہ خصوصاً معاشی دقتوں کی وجہ

[۹] تذکرۃ السامع ص ۴۹ و ۵۰، [۱۰] ص ۶۱، ص ۶۲،

سے اپنی تعلیمی زندگی کے سلسلہ کو توڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اسلامی عہد میں اگر اس قسم کی دقتیں کسی طالب علم کو پیش آتی تھیں، تو اساتذہ ذاتی طور پر اس کی دستگیری کر کے اس کے سلسلۂ تعلیم کو جاری رکھتے تھے، قاضی ابو یوسف اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ،

"میں علم حدیث و فقہ کی تحصیل میں مصروف تھا، اور میری مالی حالت کچھ اچھی نہ تھی، ایک دن میرے والد میرے پاس تشریف لائے، میں اس وقت ابو حنیفہ کی خدمت میں حاضر تھا، والد کے ارشاد کے مطابق مجلس سے اٹھ کر ان کے ساتھ ہو لیا، انھوں نے فرمایا کہ تم ابو حنیفہ کو اپنے لئے نمونہ نہ بناؤ، وہ خوشحال ہیں، اور تم معیشت کے لئے محتاج ہو، اس کے بعد میں نے مجبوراً تعلیمی مشاغل میں کمی کر دی، اور والد کی اطاعت میں روزی کے سامان میں بھی لگا رہنے لگا"،

ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے مجھے حلقہ سے غائب پاکر میرے متعلق دریافت فرمایا:

"اس واقعہ کے بعد جب میں پہلی مرتبہ پھر ان کے حلقہ میں پہونچا تو انھوں نے مجھ سے غیر حاضری کی وجہ پوچھی، میں نے اصل واقعہ بیان کر دیا، اس کے بعد جب لوگ حلقہ سے اٹھ کر چلے گئے تو انھوں نے ایک تھیلی میری طرف بڑھائی، اور فرمایا کہ اس سے کام نکالو اور حلقہ سے غیر حاضر مت ہو، جب یہ رقم خرچ ہو جائے، تو مجھے بتا دینا، چنانچہ اسکے بعد میں پابندی سے حلقہ میں شریک ہونے لگا، اس تھیلی میں سو درہم تھے، پھر تھوڑے ہی دنوں کے بعد انھوں نے سو درہم کی ایک اور تھیلی عنایت فرمائی"،[1]

طلبہ کی پوشیدہ مالی امداد اساتذہ بوقت ضرورت طالب علموں کی پوشیدہ مالی مدد کرتے تھے، امام ابو حنیفہ کا واقعہ اوپر گذرا، ابوزکریا تبریزی کا بیان ہے، کہ وہ علامہ خطیب بغدادی سے ان کے درس کے حلقہ (جامع دمشق) میں علم ادب کی تعلیم حاصل کرتے تھے، اور ان کا اسی جامع کے منارہ کے اوپر کے حجرے میں قیام تھا، ایک

[1] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۴۰۱،

مرتبہ ناگاہ شیخ خطیب بغدادی، اوپر کی منزل میں تشریف لے گئے، اور اپنے عزیز شاگرد سے کہا "آج جی چاہا کہ تم سے مل لوں"، اس کے بعد ایک گھنٹہ تک باتیں کرتے رہے، چلنے کے وقت انھوں نے ایک ورق میری طرف بڑھا کر کہا کہ "یہ مسنون ہدیہ ہے، ان سے چند قلم خرید لینا" یہ کہہ کر وہ تشریف لے گئے، اس میں پانچ دینار تھے، پھر اس کے بعد دوسری مرتبہ آئے اور اتنی ہی رقم رکھ کر چلے گئے"[1]

قاضی اسد بن فرات امام محمد کی شفقتوں کے سلسلہ میں کہتے ہیں، ہ

"میں ایک دن محمد بن حسن کے حلقہ درس میں بیٹھا تھا، ناگاہ سبیل لگانے والے کی آواز آئی، میں جلدی سے اٹھ کر گیا، اور پانی پی کر حلقہ میں واپس چلا آیا، اس پر محمد نے مجھ سے پوچھا مغربی! تم سبیل کا پانی پیتے ہو؟ میں نے عرض کیا خدا آپ کو فلاح دے، میں تو ابن سبیل ہوں، درس ختم کرکے میں گھر چلا گیا، رات کے وقت کسی نے دروازہ پر آواز دی، دروازہ کھولا تو معلوم ہوا، امام محمد کا خادم ہے، اس نے مجھ سے کہا، آقا نے آپ کو سلام کہا ہے اور آپ سے کہا ہے کہ مجھے آج سے پہلے بالکل معلوم نہ تھا، کہ تم ابن سبیل ہو، اس لئے اس نفقہ کو لیلو، اور اپنی ضرورتیں پوری کرو"۔

اس کے بعد اس نے ایک بھاری تھیلی میری طرف بڑھائی، میں دل میں خوش ہوا کہ اس میں درہموں کی بڑی تعداد ہے، جب میں نے آکر تھیلی کھولی تو دیکھتا ہوں کہ اس میں اسی اشرفیاں بھری ہوئی ہیں"[2]

طلبہ کی عیادت، تعزیت اور غم گساری

اگر کوئی طالب علم بیمار پڑتا یا کسی غم میں مبتلا ہوتا تھا تو استاذ اس کے مکان پر جاکر اس کی عیادت کرتا، اور اس مصیبت میں ہمدردی کرکے تعزیت کا فرض ادا کرتا تھا، اور اس موقع پر اسے کسی مدد کی ضرورت ہوتی تو امداد کرتا تھا، قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں، ہ

---

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۳۱۵، [2] معالم الایمان ابن ناجی،

"اگر طالب علم بیمار پڑے، تو استاد کو اس کی عیادت میں جانا چاہئے، اور اگر وہ کسی غم میں مبتلا ہو تو اس کا غم ہلکا کرنا چاہئے"[1]

اسلامی عہد میں اساتذہ طالب علموں کے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کیا کرتے تھے، چنانچہ شیخ ابو وداعہ کا بیان ہے، کہ وہ حضرت سعید بن مسیبؒ کے حلقۂ درس کے طالب علم تھے، شیخ نے انکی ایک مصیبت کے وقت جیسی ہمدردی اور غمگساری کی، اسکی مثال کم نظر آئے گی، ابو وداعہ کا بیان ہے کہ وہ اپنی بیوی کے سانحۂ وفات کی وجہ سے چند دنوں کے لئے حضرت سعید بن مسیب کے حلقۂ درس میں شریک نہ ہو سکے، اس کے بعد جب وہ حلقہ میں حاضر ہوئے، اور شیخ نے غیر حاضری کا سبب پوچھا، اور انھوں نے بیوی کے انتقال کی خبر سنائی، تو شیخ کو ملال ہوا، اور فرمایا کہ تم نے مجھے اطلاع نہ دی کہ میں جنازہ میں شریک ہو سکتا،

اسکے بعد حضرت سعید بن مسیبؒ نے ان سے ان کی دوسری شادی کے متعلق دریافت کیا، انھوں نے افسوس کے ساتھ اپنی ناداری بیان کی، کہ ان کے پاس اخراجات کے لئے دو تین درہم سے زیادہ رقم موجود نہیں، حضرت سعید نے پوچھا کہ اگر وہ سامان کر دیں تو نکاح کر سکتے ہیں؟ ابو وداعہ نے اثبات میں جواب دیا، یہ سنتے ہی حضرت سعید نے اسی مجلس میں صرف دو یا تین درہم پر اپنی صاحبزادی کو ابو وداعہ کی زوجیت میں دے دیا،

ابو وداعہ حلقہ سے اٹھنے کے بعد گھر آئے، اس دن روزہ سے تھے، شام کو افطار کر کے گھر میں بیٹھے تھے، کہ کسی نے دروازہ پر دستک دی، ابو وداعہ نے نام پوچھا، تو باہر سے جواب آیا کہ "میں سعید ہوں"، ابو وداعہ کو تعجب ہوا کہ اس نام کے کئی بزرگ شہر میں موجود ہیں، سعید بن مسیب ہو نہیں سکتے، کہ وہ چالیس سال سے سوائے اپنے گھر سے مسجد جانے کے کہیں اور جاتے دکھائی نہیں دیئے، اسی خیال میں انھوں نے دروازہ کھولا، دیکھتے ہیں کہ ان کے استاد سعید بن مسیب ہی سامنے موجود ہیں، ابو وداعہ نے شرم کے ساتھ معذرت کی، کہ انھوں نے خود کیوں تکلیف کی، کسی کے ذریعہ طلب فرما لیا ہوتا، حضرت سعید بن

[1] تذکرۃ السامع ص ۹۲، ۹۳،

مسیب نے فرمایا کہ

"میں اس لئے چلا آیا، کہ آج تمہارا نکاح ہوا ہے، یہ اچھا معلوم نہیں ہوا کہ تم اپنے گھر میں تنہا رات گذارو، یہ میرے ساتھ تمہاری بیوی موجود ہیں"

یہ کہہ کر اپنی صاحبزادی کو دروازہ کے اندر کر دیا، ابو وداعہ کہتے ہیں کہ حضرت سعید کی یہ صاحبزادی وہی تھیں جن سے خلیفہ عبدالملک بن مروان نے اپنے ولی عہد ولید کیلئے پیغام بھیجا تھا، اور حضرت سعید نے یہ رشتہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا، اور یہ خود بھی عالمہ فاضلہ محدثہ اور حافظ قرآن تھیں[۱]

مذاکرہ و مناظرہ اساتذہ، علوم کے تازہ رکھنے کے لئے باہمی مذاکرہ کرتے تھے، نیز مختلف مسائل پر تبادلہ خیال کرکے ان کے پوشیدہ گوشوں کو نمایاں کرتے تھے، اسلامی عہد میں ان مذاکروں کا بڑا رواج تھا، انہی سے مناظروں کی ابتداء ہوئی، ان مذاکروں اور مناظروں میں بہت سے مسئلے معلوم ہو جاتے تھے، اس لئے ان میں وہ بڑی توجہ اور انہماک سے وقت صرف کرتے تھے، علی بن حسن بن شقیق کا بیان ہے، کہ ایک مرتبہ وہ اور ابن مبارک مسجد سے عشا کی نماز پڑھکر مکان جانے کے لئے اٹھے، سردیوں کا زمانہ تھا، تیز سردی پڑ رہی تھی، ابن مبارک نے چلتے وقت ابن شقیق سے مسجد کے دروازہ کے پاس کسی حدیث کا تذکرہ کیا، انھوں نے جواب میں کوئی بات کہی اور گفتگو کا سلسلہ جاری ہو گیا، اس وقت سے وہ دونوں مسجد کے دروازہ پر اسی طرح ٹھنڈی رات میں شبنم میں کھڑے گفتگو کرتے رہے، یہاں تک کہ مؤذن آیا، اور اس نے صبح کی اذان دی، اسوقت انھیں اس قدر دیر ہو جانے کی خبر ہوئی[۲]

جب اہل علم کسی دوسرے شہر سے آتے تھے، تو وہاں کے احباب اس شہر کے علمی تحفہ کو بڑے اصرار سے اپنے رفیق سے طلب کرتے تھے، ابو علی نیشاپوری کا بیان ہے، کہ وہ بغداد آئے، یہاں مختلف اہل علم ابو احمد غسال، ابو اسحٰق بن حمزہ، ابو طالب بن نصر اور ابو بکر جعابی جمع ہوئے، اور ابو علی سے ایک مجلس میں نیشاپور

---

[۱] وفیات الاعیان جلد ۱ ص ۲۵۹، [۲] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۲۵۵،

کی حدیثوں کی روایتیں سنانے کے لئے کہا گیا، انھوں نے پہلے تامل کیا، لیکن جب لوگوں کا اصرار بڑھا تو انھوں نے اس مجلس میں تیس حدیثیں روایت کیں جن میں ایک حدیث کے سوا کوئی ایسی نہ تھی، جو ان میں سے کسی کے پاس پہلے سے موجود ہو، البتہ ابو حمزہ نے صرف ایک حدیث کے متعلق اپنی واقفیت کا اظہار کیا [۱]

علماء کی شرکت اساتذہ کے حلقوں میں

اس زمانہ میں علماء کو اس کی عام اجازت تھی، کہ وہ اپنے معاصرین کے درس و تعلیم کے حلقوں میں شریک ہوں، اور درس کے درمیان میں استاذ کی تقریر پر ٹوکیں اور سوال و جواب سے مسئلوں کی چھان بین کریں، ایسے مواقع دراصل بڑے نازک ہوتے تھے، طالبعلموں کی بھری محفل میں استاذ کی خفت کا سامان ہوتا تھا، اساتذہ اپنے خطبوں پر خود اس قدر تیار ہو کر آتے تھے، کہ وہ بڑے سے بڑے فاضل اجل کے درس کے حلقہ میں آجانے پر بھی مرعوب نہ ہوتے تھے، اور سوالوں کے تشفی بخش جوابات دیتے تھے،

البتہ سیرت کی کتابوں میں ایسے واقعات بھی ہیں، کہ کبھی کبھی بعض مناظرہ پسند طبائع درس کے حلقہ میں استادوں پر ناروا حملے کرتے، اور طعن و طنز سے محفلوں کو مکدر کر دیتے، اساتذہ بھی ایسے لوگوں کی طبیعتوں اور عادتوں سے واقف ہو گئے تھے، جب کوئی ایسا موقع آتا، تو بڑی خوش اسلوبی سے نباہ لیتے تھے، سیوطی نے محمد بن منصور سمعانی کے حلقہ درس کا ایک دلچسپ واقعہ لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ ان کے حلقہ درس میں ایک مغربی اہل علم شریک ہوئے، جو کسی قدر تیز اور مناظرہ پسند واقع ہوئے تھے، اور اہل علم میں ان کے مناظروں کی شہرت ہو چکی تھی، ان کے ایک اعتراض کے جواب میں سمعانی نے شاگردوں کو کہا

"جو کچھ آپ فرماتے ہیں اسے لکھ لو، آپ اس سے زیادہ واقف ہیں"

شاگردوں نے بلا تامل تصحیح کر لی یہ طرز عمل دیکھ کر تھوڑی دیر کے بعد نو وارد اہل علم نے پھر کہا

"میرے آقا مجھ سے خطا ہوئی، صحیح وہی ہے جو آپ نے املا کرایا تھا"

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۱۱۱،

سمعانی نے پھر دوبارہ تصحیح کرادی، اس کے بعد جب وہ مجلس سے چلے گئے، تو سمعانی نے شاگردوں سے کہا

"یہ حضرت سمجھے تھے، کہ میں بھی ان سے دوسروں کی طرح الجھ پڑوں گا، اور میرے ساتھ بھی

یہ ایسی ہی تیز زبانی سے پیش آئیں گے جیسے دوسروں کیساتھ کرتے رہے ہیں، اسی لئے میں خاموش

ہوگیا، اور بالآخر وہ خود رجوع کرنے پر مجبور ہوئے"

مجالسِ مناظرہ ان مذاکروں سے اس زمانہ میں مناظروں کا عام رواج ہوگیا تھا جن میں استاد اور شاگرد دونوں شریک ہوتے، اور مختلف علوم حدیث، فقہ، کلام اور ادب پر مناظرے کی علٰحدہ علٰحدہ مجلسیں منعقد ہوتیں، اہل علم سلاطین و امراء کے درباروں میں یہ مجلسیں زیادہ گرم ہوتی تھیں، ملک شاہ کے دربار کے وہ مناظرے یادگار کی حیثیت رکھتے ہیں، جو امام غزالی اور دوسرے علماے زمانہ سے ہوئے تھے، ان مناظروں میں اگرچہ کبھی کبھی طرفین حق سے ہٹ کر مناظرانہ ردوکد میں مبتلا ہو جاتے تھے لیکن عموماً اس زمانہ میں صحیح علمی مذاق اور حق کو حق سمجھ کر قبول کرنے، اور باطل کے باطل ٹھہرنے پر اس سے رجوع کرلینے کی خوبیاں موجود تھیں، اسلئے مناظروں کی ان مجلسوں سے علما، اور طالب علموں دونوں کو فائدے حاصل ہوتے، اور دقیق علمی حقائق آشکارا ہوتے تھے،

پانچویں صدی تک مناظروں کی مجلسوں میں جو بے عنوانیاں پیدا ہو چکی تھیں، اور ردوکد کے مناظروں سے جو برائیاں پیدا ہوتی تھیں، انھیں امام غزالی نے احیاء العلوم میں بیان کیا ہے، اور ان سے احتراز کرنے کی تلقین کی ہے بلکہ وہ ایسی مناظرانہ مجلسوں کے سرے سے مخالف تھے[۱] کیونکہ وہ خود تلخ تجربے اٹھا چکے تھے،

(۵)

طلبہ کے فرائض

اسلامی مدرسوں کے طالب علموں کے ذمہ جو فرائض تھے، ان کا اندازہ قاضی ابن جماعہ کی ان

[۱] بغیۃ الوعاۃ سیوطی ص ۵۰ ـ ۱۵ احیاء العلوم جلد ا کتاب العلم

تلقینوں سے ہوتا ہے، جو انھوں نے ایک مستقل باب میں طالب علموں کے لئے مختلف فصلوں طالب علم کے آداب اپنی ذات کے متعلق طالب علم کے آداب اپنے استاذ کے ساتھ، طالب علموں کے درسوں کے آداب درس کے حلقہ میں پڑھنا، اور حلقہ میں استاد اور شاگرد کے ساتھ اس کا برتاؤ، پھر محشی نے تاریخ اور سیر کی کتابوں سے جا بجا مثالیں دی ہیں، طلبہ کے یہ آئین و آداب چار قسموں میں کئے جا سکتے ہیں، ایک تو طالب علموں کے فرائض اپنی ذات کے متعلق، دوسرے استادوں اور شاگردوں کے باہمی معاشرتی اور تعلیمی تعلقات اور تیسرے طالب علموں کے واجبات دار الاقامہ میں، اور چوتھے طلبہ کی ذمہ داریاں ان کے حلقۂ درس میں ان میں سے تیسری قسم یعنی دار الاقامہ میں طلبہ کے فرائض کی تفصیل اوپر گذر چکی، حلقۂ درس میں ان کے جو واجبات ہیں، ان کا بیان آگے آئے گا، بقیہ اول الذکر دونوں قسموں کے فرائض اجمالاً ذیل میں بیان کئے جاتے ہیں،

طلبہ کے ذمہ خود ان کی ذات کے متعلق جو فرض عائد تھے، انکی بھی دو قسمیں کیجا سکتی ہیں، ایک خود ان کی شخصی اخلاقی تعلیم و تربیت، اور دوسرے ان کے تعلیمی فرائض،

دل کی پاکی اور نیت کا اخلاص

طلبہ کی سیرت کے نشو و نما کے لئے پہلی شرط یہ تھی، کہ ان کے دل اور دماغ معصومانہ طور پر پاک اور صاف رہیں، برے اخلاق اور اوصاف سے دامن بچائیں، دل کی پاکی کے ساتھ ان کی تعلیمی زندگی کا آغاز پورے حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوا ہو، اور اسلام نے جو تعلیمی نصب العین مقرر کیا ہے، وہ ہر وقت انکی نگاہوں کے سامنے ہو[۱]

علم کے لئے سفر

اس زمانہ میں ہر طالب علم کا فرض تھا، کہ وہ علم کی طلب کے لئے کوئی نہ کوئی سفر ضرور کرے علم حاصل کرنے کیلئے سفر کرنے کی ابتدا صحابہ کے زمانہ ہی میں ہوئی تھی، جیسا کہ پہلے گذر چکا صحابہ ایک ایک حدیث کی تصدیق کیلئے حجاز سے شام اور شام سے مصر کا سفر کرتے تھے، پھر تابعین نے انہی کے طریقہ کی پیروی کی، بسر بن عبد اللہ حضرمی کہتے ہیں کہ وہ صرف ایک حدیث کے لئے شہر بہ شہر پھرتے رہے ہیں، حضرت

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۷۰، [۲] احیاء العلوم ج ۱ ص ۳۲ و تذکرۃ السامع،

سعید بن مسیب نے بھی صرف ایک حدیث کیلئے کئی دن اور رات کا سفر کیا،[1] طلبہ بلا تکلف مغرب سے مشرق اور مشرق سے مغرب صرف علم کی طلب میں جایا کرتے تھے، مقری صاحب نفح الطیب، ابن ناجی صاحب معالم الایمان اور صاحب ریاض النفوس وغیرہ نے ایسے طالب علموں کا حال اپنی کتاب میں مستقل باب قائم کر کے لکھا ہے، جو علم کی تحصیل میں اسپین اور افریقہ سے شام، حجاز، عراق اور مصر گئے، اور پھر ان مقاموں سے افریقہ اور اسپین میں داخل ہوئے

یہ علمی سفر طلبہ عموماً پیدل طے کرتے تھے، اور ان سفروں میں سینکڑوں میل چل لیتے تھے، مثال کے طور پر ابو حاتم رازی کو پیش کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں ،:-

"میں نے سفر میں پہلے سات برس قیام کیا، اور ایک ہزار فرسخ سے زیادہ چلا، پھر میں نے فرسخ کو شمار کرنا چھوڑ دیا، اور بحرین سے مصر تک پیدل چلا، پھر وہاں سے رملہ پیدل آیا، اور اس کے بعد پیدل ہی طرطوس پہنچا، اس سفر میں میرے بیس سال پورے ہو گئے"[2]

حافظ ابو یوسف یعقوب بن سفیان فسوی نے تیس سال سفر میں گذار دیئے،[3]

حضرت ابو عبد الرحمٰن بقی بن مخلد قرطبی نے دو سو اسی شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، لیکن اسکے باوجود ان کا بیان ہے کہ انھوں نے ہر استاد سے پیدل چل کر حدیث سنی ہے یہ اساتذہ مختلف ملکوں اور شہروں کے تھے،[4]

امام بخاری نے سولہ سال کی عمر میں اپنے شہر کی حدیثیں سننے کے بعد علم کی طلب کے لئے سفر شروع کیا، باپ کا سایہ موجود نہ تھا، ضعیف ماں اور بہن اس طالب علم کی نگہداشت کیلئے اس کے ساتھ ہو گئیں، اور مختلف شہروں بلخ، بغداد، بصرہ، کوفہ، شام، عسقلان، دمشق اور مصر وغیرہ میں پہونچکر وہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا،[5]

امام دارمی نے حرمین، خراسان، شام، عراق، اور مصر جا کر علم کی تحصیل کی،[6]

---

[1] جامع بیان العلم ص ۴۶، ۴۷، [2] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۶۴ [3] ایضاً ص ۱۶۰، [4] ایضاً ص ۲۰۴-۲۰۵ [5] ایضاً ص ۱۳۴ [6] ایضاً ص ۱۱۵،

اس زمانہ میں طالب علم، علم کی طلب کے لئے سفر کرنے کا دلی شوق رکھتے تھے، حافظ ابوبکر بن ابراہیم اسماعیلی اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ

"جب محمد بن ایوب رازی کی وفات کی خبر پہونچی تو میں رونے اور چیخنے لگا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے، اور سر پر خاک ڈالنے لگا، یہ دیکھکر میرے گھر کے لوگ جمع ہو گئے، اور اس مصیبت کا حال پوچھا، میں نے کہا کہ محمد بن ایوب آخر وفات پا گئے، اور تم لوگوں نے مجھے ان کے یہاں تک پہونچنے سے باز رکھا، یہ سن کر لوگوں نے مجھے تسلی دی اور مجھے طلب علم کیلئے نکلنے کی اجازت دی، اور میرے ماموں کو میرے ساتھ کر دیا، اور میں شہر نسا، حضرت حسن بن سفیان کی خدمت میں روانہ ہو گیا، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب یہاں (اپنے چہرے کی طرف اشارہ کرکے) ایک بال بھی نہ تھا"[۱]

حافظ ابوعلی حسن بن صاحب ابن حمید شاشی متوفی ۳۱۴ھ خراسان کے شیوخ سے حدیث لکھنے کے بعد عراق، شام اور مصر کا سفر کیا[۲]، حافظ محمد بن ابراہیم بن حیون اندلسی متوفی ۳۰۵ھ نے اندلس کے شیوخ سے پڑھنے کے بعد عراق، حجاز اور یمن اکر علم کی تحصیل کی[۳]، حافظ ابوبکر محمد بن ابراہیم معروف با بن مقری نے تحصیل علم میں اصفہان، بغداد، موصل، حران، عسقلان، کوفہ، تستر، مکہ، بیت المقدس، دمشق، بیروت، عکا، رملہ، اذنہ، واسط، عسکر، حمص، رقہ اور مصر کی خاک چھانی، وہ کہتے ہیں "میں نے مشرق و مغرب کا چار مرتبہ طواف کیا ..... اور میں نے ابن فضالہ کے ایک نسخہ کی خاطر ستر مرحلے طے کئے، اور وہ نسخہ اگر نان بائی کو دیا جاتا، تو اس کے بدلہ میں وہ ایک روٹی بھی نہ دیتا، .... میں صرف بیت المقدس دس مرتبہ گیا ہوں[۴]، حافظ ابن مفرج ابو عبداللہ محمد بن احمد قرطبی شہر قرطبہ میں تحصیل علم کرنے کے بعد مزید تحصیل کیلئے

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ صفحہ ۱۶۱ [۲] ایضاً ص ۳۰ -

[۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۱۵ [۴] ایضاً ص ۱۵۲ و ص ۱۵۳

روانہ ہوئے، طرابلس، مصر، دمشق، جدہ، صنعاء، زبید اور بیت المقدس پہونچکر حدیث کی تحصیل کی[1]، حافظ ابو العباس احمد بن محمد رازی متوفی ۳۹۲ھ پیدائشی نابینا تھے، تاہم انھوں نے تحصیل علم کے شوق میں بخارا، نیشاپور، بغداد اور بلخ کا سفر کیا، اور یہاں کے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا[2]، حافظ ولید بن بکر بن مخلد سرقسطی اندلس کے دور دراز مقام سے خراسان تک آئے، اور تحصیل علم میں مصروف رہے، اور دینور (ایران) میں ۳۹۲ھ میں وفات پائی[3]، حافظ ابو زکریا عبد الرحیم بن احمد تمیمی بخاری متوفی ۴۶۱ھ، بخارا میں حدیث سننے کے بعد خراسان، شام، یمن، مصر، اور افریقہ کا سفر کیا[4]، حافظ محمد بن طاہر مقدسی بیت المقدس کے شیوخ حدیث سے پڑھنے کے بعد اس عہد میں جہاں علم کی خوشبو سونگھی، پا پیادہ دوڑے گئے، چنانچہ مشہور مقامات بغداد، مکہ، تنیس، دمشق، حلب، جزیرہ، اصفہان، نیشاپور، ہرات، جرجان، آمد، استرآباد، بوشنج، بصرہ، دینور، رے، سرخس، شیراز، قزوین، کوفہ، موصل، مرو، حرمین، نہاوند، ہمدان، واسط، اہواز اور بسطام وغیرہ میں انھوں نے شیوخ سے علم حدیث حاصل کیا، اور جہاں گئے، وہاں نہ صرف پا پیادہ گئے، بلکہ کتابوں کا پشتارا بھی پیٹھ پر لادے رہتے، ان کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ روزانہ ۲۰ فرسخ (۶۰ میل) پیدل چل لینے پر قادر تھے[5]، ایک مرتبہ حافظ ابو عبد اللہ محمد بن عبد الواحد اصفہانی جن شہروں تک طلب علم میں پہونچے تھے ایک مرتبہ ان کے نام گننے لگے، تو ایک سو بیس مقامات نکلے[6]،

امام شعبی فرماتے ہیں، :-

”اگر کسی شخص نے شام کے اس سرے سے یمن کے اس سرے تک صرف اسلئے سفر کیا کہ وہ حکمت کا ایک کلمہ سن لے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنا سفر ضائع نہیں کیا[7]“

پھر خود فرماتے ہیں ”میں صرف ایک حدیث کی طلب میں رات رات اور دن دن بھر چلا ہوں[8]“۔

[1] تذکرۃ الحفاظ جلد ۳ ص ۲۱۴، [2] ” ص ۲۳۲، ۲۳۳، [3] ” ص ۲۰۰، ۲۰۱، [4] ” صفحہ ۳۵۱، [5] ” جلد ۴ ص ۳۹ تا ۴۱، [6] ” صفحہ ۵۳، [7] مختصر کتاب العلم ص ۴۷، [8] تذکرۃ الحفاظ جلد ۱ ص ۸۰،

امالی ابی علی القالی اور اللآلی

از

مولینا ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

(۲)

۱۔ص ۲ "کان یمسکھا فی سبابی الشرب" حاشیہ پر لکھا ہے "کذا و فی تصحیح الحلۃ سبانی" پھر لکھتے ہیں "ولا اعرفہ الا سبائب الشرب" تصحیح حلہ پر اعتراض سے قبل اس لفظ کو لغات سے دریافت کر لیتے تو "لا اعرف" کا جملہ نہ نکالا جاتا، "سبانی" جمع "سبنیۃ" ایک قسم کا عمدہ کپڑا ہے، جو سن وغیرہ سے تیار ہوتا ہے، یہ سبن کی طرف منسوب ہے، خود فاضل میمن صاحب نے ص ۴ پر اسے نقل کیا ہے، پھر "لا اعرفہ" چہ معنی دارد؟ "سبابی" سے "سبانی" کس قدر قریب ہے! اسبائب کی طرف جانا بعید از عقل ہے، اور اسی کے تتبع میں سارا وقت صحفی حضرات صرف کرتے رہتے ہیں،!

۲۔ص "والیک یعمل ادنی ظلم" اس پر میمن صاحب "کذا" لکھ کر روانہ ہو گئے ہیں، حالانکہ فصیح ثعلب جیسی اطفال کی کتابوں میں یہ لفظ مل جائے گا، دیکھئے "لقیتہ ادنی ظلم، وادنی ذی ظلم، ای اول کل شیئ"!

۳۔ص "وابزعھم فی العلوم طلقا" قولہ "الطلق النصیب" اس جگہ الطلق اس معنی میں نہیں بلکہ شوط و جری یعنی ایک دوڑ کے معنی میں ہے،

۴۔ص "ولہ تقدم سبق، وسلف صدق" لفظ "سبق" پر "کذا" لکھنا عجز کا ثبوت ہے، "سبق"

یا بکسر السین ہو، جو نظیر اور مثل کے معنی میں ہے، یا سنق بالنون ہو، جو خوش حال کے معنی میں ہے،

۵۔ ص ح "من البغیض مرضا" اس پر بھی کذا لکھکر آگے بڑھ گئے ہیں "یہ ترِبا" ہے جو اتراب کے معنی میں آیا ہے،

۶۔ ص ح "اذا مرضت ارض الا حبة حادها" "حادہا" یا "جادہا" دونوں غلط ہیں، شاعر طباق کا بہت گرویدہ ہے، مرض کے واسطے عیادت کی ضرورت ہے، اسی کو "عادہا" سے بتا رہا ہے،

۷۔ "یضوع بوادیک الا غن اغانیا" یضوع مہمل ہے صحیح "یصوغ" ہے،

اب اصل کتاب "اللآلی" پر بحث شروع ہوتی ہے، وباللہ التوفیق،

۸۔ ص ۴ پر شارح نے "مرتفع بناہ" کو بتقدیم با لکھا ہے، جو بالکل صحیح اور ناقابل اعتراض ہے مگر میمن صاحب اسے "نباہ" بنانے کے درپے ہوگئے، اور اصل کو جو ہر طرح صحیح تھی مصحف بتا دیا، تصحیف "بناہ" نہیں "نباہ" ہے، اور اس کے وجوہ حسب ذیل ہیں،

اولاً صحیح اصول میں "بناہ" موجود ہے، اس کے بدلنے کی کوئی ضرورت نہیں،

ثانیاً اس کے معنی ہر طرح سے صحیح ہیں، "ارتفاع بنا" بکثرت مستعمل اور شرف و علو حقیقی و مجازی دونوں معنوں میں عام ہے،

ثالثاً شارح غریب لغات حل کر رہا ہے، خود غریب لغات کا کوئی مجموعہ نہیں تیار کر رہا ہے،

رابعاً سیکڑوں مقامات پر رفیع العماد، عالی البناء، مرتفع البناء، وغیرہ ملے گا، "نباہ" میمن صاحب کے نزدیک صحیح ہو تو ہو، اور کسی جگہ اس کا استعمال نادر ہوگا، کم از کم وہ ایک ہی شعر اسکی سند میں پیش کر دیں،

خَلِّ الطَّرِیْقَ لِمَنْ یَّبْنِی الْمَنَارَ بِہٖ وَابْرُزْ بِبَرْزَةٍ حَیْثُ اضْطَرَّكَ الْقَدَرُ

۹۔ ص ۴ "واذا اعطی اقنع" "قنع بالقاف" مال کثیر، بعضے "اقنع" بالقاف روایت کرتے ہیں، حاشیہ پر میمن صاحب لکھتے ہیں، ایک تو "اقنع" کو شارح نے ذکر نہیں کیا، دوم کتب لغت میں یہ نہیں ملتا، ا

- شارح نے خطبہ میں صرف دو لفظ غریب سمجھ کر ان کی تحقیق کی ہے، حالانکہ اور بھی بہت سے الفاظ ان دونوں جیسے یا ان سے زیادہ مشکل ہوں گے، یہ ان لوگوں کا مذاق علمی تھا اس سے کوئی استدلال نہیں کیا جاسکتا، مثلاً "السحا" "الحسب" "الامہاد" "الفعال الازل" "المقصرہ" وغیرہ الفاظ خطبہ میں آئے ہیں، غرض اس بیان سے عدم ذکر افنع کی بناپر قنع ہونا کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا،

- کتب لغت میں "قنع" اور "قنیع" وغیرہ الفاظ موجود ہیں، یہ استیناس کے لئے کافی ہیں، پھر کسی کتاب میں لغات و محاورات کا استقصا نہیں کیا گیا، نہ اس کا کسی نے دعویٰ کیا ہے، نیز میمن صاحب یہ بتائیں کہ ان کے پاس اصول و لغت کی کتنی کتابیں ہیں، اور "افعال" کے متعلق جو اہم کتابیں ہیں، وہ انھوں نے دیکھی ہیں؟ اور ان میں اس لفظ کی تحقیق ہے، بہر حال افنع کی جگہ "قنع" لانے کی ضرورت نہیں تصحیف ہو گی!!

لطیفہ: - (۱) عرصہ ہوا کتاب الالفاظ ابن السکیت کا نسخہ بیروت کے عیسائیوں نے بڑی محنت سے شائع کیا، اس کے حواشی و انڈکس بنائے، اس کا مختصر بھی شائع کیا، اس کے ص ۱۰ پر بھی "قنع" کو "قنع" بالقاف لکھ کر پوری طرح اس کی تصحیف کی، شعروں کو بگاڑا، انتہا یہ ہے کہ فہرست میں بھی "فنع" کی جگہ "قنع" ہی رکھا، حالانکہ ایک نسخہ حاشیہ پر بالفا بھی ہے، اب لویس یسوعی، او راس کے ساتھی عربی ذوق سے بالکل نابلد تھے، اپنی تبشیر کی دھن میں انھوں نے وہ وہ عجیب کام کئے ہیں کہ بجز افسوس اور ان کے جہل مرکب کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا، یہ لفظ دو شعروں میں آیا ہے، ان میں سے ایک کو بسکون النون لکھا، اور دوسرے کو بفتح النون، پہلا حاتم طائی کا ہے،

ولا اُعتل فی فنع بجنع، اذا نابت نوائب تعترینی

دوسرا ابو محجن الثقفی کا،

وقد أجود وما مالی بذی فنع واکتم السر فیہ ضربۃ العنق

لطیفہ: (۲) یہ کوئی عجیب غلطی نہیں، مستشرقین جن کے پاس دنیائے مشرق آج سند لینے کے

واسطے پہونچی ہے، اس طرح کے عجائب و غرائب کا منبع و معدن ہیں، چنانچہ افعال ابن القوطیہ کے فاضل مصحح نے کئی الفاظ اسی قسم کے اصل میں مصحف و محرف کئے، پھر فہرست میں انھیں اسی طرح لکھدیا مثلاً:-

۱- "صدم" کی جگہ ص ۲۵۲ پر "صرم" طبع کیا، اور فہرست میں بھی یہی رکھا،

۲- ص ۲۵۳ پر "صدف" کی جگہ "صرف" لکھا، اور اسی طرح فہرست میں بھی لکھا،

۳- ص ۳۱۶ پر "وخذة" بالذال لکھا، اور اسی طرح فہرست میں، حالانکہ "وخز" بالزاء ہے،

۴- ص ۳۰۰ پر "تخر الکلب الاناء" حالانکہ صحیح "لجذ" ہے، ذلک مبلغهم من العلم وکم لهم من امثال هذه الطامات وما یعقلها الا العالمون،

۱۰- ص ۵ پر ابو موسیٰ اشعری کی حدیث کا شارح نے حوالہ دیا ہے، جسکی بابت میمن صاحب حاشیہ تحریر فرماتے ہیں:-

"اس حدیث کو احمد و شیخین، اور ترمذی نے انس سے اور احمد و شیخین نے ابن عباس سے اور بخاری نے ابن الزبیر سے، اور ابن ماجہ نے ابو ہریرہ سے اور احمد نے ابو واقد سے اور بخاری نے تاریخ میں اور بزار نے بریدہ سے روایت کیا"

فاضل محشی نے یہ نہیں سمجھا کہ یہ حدیث کس مضمون کی ہے، جس کی تخریج مطلوب ہے، شارح نے ابو موسیٰ اشعری کی مخصوص حدیث پیش کی ہے، پہلے اس کی تخریج کرتے، پھر اس کے شواہد پر زور دیتے، بجائے اس کے ادھر ادھر کی روایتوں کے ذکر سے کیا فائدہ،

اوردها سعد وسعد مشتمل ما هکذا تورد یا سعد الابل

اولاً شارح نے جس مضمون کی حدیث جس صحابی سے پیش کی ہے، اسکی تخریج کیجاتی،

ثانیاً:- دوسری روایتیں جو پیش کی ہیں، کیا وہ اس مدعا کے واسطے سند ہیں، جسے شارح نے پیش کیا، اگر نہیں ہیں تو ان کا ذکر فضول ہے، اگر ہیں تو پیش کیا جائے، هذا موضع المثل لیس بعشك

فادرجی، اشعار کا حوالہ دیتے دیتے میمن صاحب فن حدیث پر پہونچ گئے، یہ الگ میدان ہے اس کے واسطے تیاری کی ضرورت ہے، ورنہ یہ مقولہ صادق آئے گا، !

من تحلی بغیر ما ھو فیہ فضحتہ شواھد الامتحان

۱۱۔ ص ۷، حدیث زہری عن ابی امامہ بن سہل بن حنیف کی تخریج چھوڑ دی، اسی طرح اس صفحہ پر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی حدیث تھی، ص ۸ پر بجز ایک روایت کے کسی کی تخریج نہ کی، اور ابو سعید انصاری کی روایت پر غیر ضروری حاشیہ لکھدیا، کاش اسکی تخریج کیجاتی!

۱۲۔ ص ۹ "نسیٔ" کی بابت شارح نے لطیف بحث کی ہے، میمن صاحب بغیر سمجھے ہوئے غلط در غلط استدلالات پر اس کو غلط بتانے کی فکر میں ہیں، دراصل شارح نے "نسیٔ" کی صورت بتائی ہے، جو عموماً "کبیسہ" کی صورت میں ہوتی تھی، اس کے علاوہ بھی وہ بلا تقیید ردوبدل کیا کرتے تھے، ہم اس جگہ میمن کے اغلاط تمام کرتے ہیں، !

الف :۔ ص ۹ "وفی التاج عن ابی کناسۃ کما قال البکری" یہ غلط ہے صحیح "عن ابی کناسۃ عن شیوخہ" ہے، °

"ب" :۔ ص ۱۰ "اولھم علی ما فی السیرۃ والتاج عن المفضل عباد بن حذیفہ" سیرۃ اور تاج دونوں پر صریح بہتان ہے، ان دونوں کی جگہ حذیفہ بن عبد ہے، جیسا کہ ابن حبیب نے کہا ہے،

ج :۔ ص ۱۰ "وقال اللیثی" یہ جاحظ ہے، مگر میمن صاحب فضول تخریجات میں پوری قوت صرف کرنے کے باوجود ایسی ضروری تخریج چھوڑ گئے،

۱۳۔ ص ۱۱ "لابن جذل الطعان عمیر بن قیس الکنانی" اس جگہ میمن صاحب نے کمال کیا ہے، یہاں اصل نسخہ میں "لجذل الطعان" مرقوم تھا، حاشیہ نمبر ۱ پر میمن صاحب نے یہ لکھا، پھر حاشیہ نمبر ۲ پر لکھے ہیں "الاصل لجذل الطعان عمیر" یہ کتنا کھلا تناقض ہے، !

اس کے علاوہ دو زبردست تحریفیں فاضل مذکور نے کی ہیں، ایک عمرؓ کو عمیرؓ لکھنا دوم جذل الطعانؓ کو ابن جذل الطعانؓ بنانا، کاش اصل نسخہ کو اپنی حالت پر چھوڑنے کے بعد حاشیہ پر جس طرح چاہتے گفتگو کرتے، اس میں ایک تو امانت داری ہوتی، دوم تحقیق کرنے والے کیلئے میدان صاف ہوتا اس طرح اصل کتاب کو مسخ کرنا اہل علم کی شان سے بعید ہے !

البکری نے جذل الطعانؓ اور عمروؓ کہا دوسروں نے کبھی اس طرح کہا کبھی عمیرؓ اور ابن جذل الطعانؓ عمرو اور عمیر کی بحث چنداں قابل اعتنا نہیں، ہو سکتا ہے کہ ایک ہی شخص کو دو طرح سے پکارتے ہوں، یا روایت کا اختلاف ہو، اس کا آخری فیصلہ اس وقت ممکن ہے، جبکہ یہ شخص خود ہمارے پاس آکر اپنے صحیح نام کو پیش کرے، وذلک امر محال۔

رہا جذل الطعانؓ دراصل کسی کا لقب ہے، میمن صاحب نے جذل الطعانؓ کو ابن جذل الطعان بنایا اس پر بھی بس نہیں کیا، اور سیرۃ کی عبارت کی نقل میں بھی جس میں عمیر بن قیس جذل الطعانؓ ہے ابن کا لفظ اپنی طرف سے اضافہ کر دیا، آخر اس قدر رد و بدل کی ضرورت کیا تھی؟

ائمہ نسب نے علقمہ بن فراس کو جذل الطعانؓ کا لقب دیا ہے، اگر یہ لقب ان کے خاندان میں عام ہو جائے تو ہر ایک فرد جذل الطعانؓ ہو سکتا ہے، شاید اسی بنا پر عمروؓ یا عمیرؓ کو یہ لقب دیا گیا ہو ورنہ دراصل یہ انکے جد کا لقب ہے۔

۴۲۔ ص ۲ "قیل انہ للشویعر ربیعۃ بن عبس اللیثی" اس پر میمن صاحب نے کوئی حاشیہ نہیں لکھا حالانکہ یہاں بحث کی بہت کچھ گنجائش تھی، آمدی نے المختلف والموتلف ص ۱۴۲ پر شویعر کنانی کا نام سعید بن عثمان لکھا ہے، الجاحظ البیان کے جلد ۲ ص ۲۳ پر لکھتا ہے، الشویعر ایضا صفوان بن عبد یالیل من بنی سعد بن لیث، یقال ان اسمہ ربیعۃ بن عثمان، اغانی جلد ۱۹ ص ۱۰ میں البکری کی طرح الشویعر اللیثی کا نام ربیعہ لکھا ہے، مگر وہاں عبس کی جگہ "علس" طبع ہو گیا ہے، الغرض یہ چیز لائق

تحقیق تھی جسے میمن صاحب طرح دے گئے !

۱۵۔ ص ۱۲ " امیۃ بن العسکر" کے نسب میں "عبد اللہ بن سرابیل الموت" لکھا ہے، جو غلط ہے، عبد اللہ خود "سربال الموت" سے ملقب تھا، "سرابیل الموت" اگرچہ طبقات ابن سلام الجمحی وغیرہ میں اسی طرح ہے مگر یہ صحیح نہیں دیکھو اکمال ابن ماکولا و کتب انساب،

۱۶۔ ص ۱۳ " وزعم ابو زید انہ جاھلی" قتال کلابی کی بابت یہ خیال ابو زید نے کس کتاب میں ظاہر کیا ہے، اس کا حوالہ اگر میمن صاحب بتا سکیں تو اسکی ضرورت ہے !

۱۷۔ ص ۱۵ " ان ابغض الرجال الی اللہ الخصم الالد" حدیث سفیان ص ۱۴ وغیرہ کی تخریج کی طرح حسب دستور اسکی تخریج بھی میمنی صاحب چھوڑ گئے، ایسے مقام پر جہاں شارح پر ایک صحیح نقد وارد ہوتا ہے، اغماض سے کام لیا جاتا ہے، یہ روایت صحیحین میں مختلف طریقوں سے ہے بعض مین ابغض الرجال اور بعض میں ان ابغض الرجال الی اللہ الالد الخصم" ہے جیسا کہ مسلم کے الفاظ ہیں اکبر کا "الخصم الالد" لکھنا سبق قلم ہے !

۱۸۔ ص ۱۵ حدیث "من خاصم فجر، ومن فجر کفر" کی تخریج سے میمن صاحب نے حسب دستور اغماض کیا ہے، میرے نزدیک یہ روایت موضوعات میں سے معلوم ہوتی ہے، واللہ اعلم،

۱۹۔ ص ۱۷۔ قولہ:۔ قد انتصر ابو حیان التوحیدی لہذا القول الذی اعترف الجاحظ بخطائہ فیہ" یہ تمام تطویل لغو اور فضول ہے، دنیا کی کسی زبان میں فصحاء کے یہاں کسی وقت عاقل و بالغ سے اغلاط پسند نہیں کئے جاتے، کچھ توتلا پن اور ایسے ہی بعض اغلاط بچپن میں مستحسن سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی از قبیل ندرت، سن بلوغ کے بعد کسی قسم کے لحن یا غلط کا استحسان کسی عاقل کے یہاں نہیں ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے، جاحظ کا اقرار کمال معرفت پر دال ہے اور لوگوں کا حیلہ سفاہت و جرأت سے زیادہ نہیں !

۲۰۔ ص ۱۷۔ "وعلامہ فی الملاحن متردد بین المعنیین" یہ خواہ مخواہ ابن درید پر افترا ہے "الملاحن" طبع یورپ کے ص ۳ پر ان کا کلام بالکل صاف ہے، "یرید انہا تعرض فی کلامہا وحدثہا فتزیلہ عن جہتہ فتجعل ذلک لحنا" اسی کو القالی نے ص ۱۹ پر ذرہ فرق سے اس طرح نقل کیا ہے، "یرید تعرض" تعرض" کی جگہ "فتزیلہ عن جہتہ لیلا یفہمہ الحاضرون ثم قال" وخیر الحدیث ما کان لحنا" ای خیر الحدیث ما فہمہ صاحبک الذی تحب افہامہ وحدہ وخفی علی غیرہ" اس واضح بیان کے بعد تردد کا خیال "المعنی فی بطن الشاعر" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!

۲۱۔ ص ۲۱۔ ابنی مالک بن حنظلۃ قال وابناء مالک یا مر کمران تنذر وھم یہاں میمن صاحب چکرا گئے ہیں، حاشیہ پر "کذا بلفظ الجمع عند الجمیع" لکھ کر اپنی تحقیق کے سمند کو چھوڑ بھاگے ہیں، اور کمال فن وصناعۃ کی شہادت اچھی طرح دی ہے، الجمیع میں معلوم نہیں کون کون لوگ ہیں اگر "عقد الفرید" ملاحظہ فرماتے تو یہ "کذا" کا فضول ولغو کلمہ زبان و قلم سے نہ نکلتا، صحیح "بنی مالک" ہے، اسی طرح "ابنا ر مالک" نہ "ابنا مالک"

اذا ضیعت اول کل امر ابت اعجازہ الا التواء

۲۲۔ ص ۲۱۔ یوم الوقیط کی بابت لکھا ہے، "کان فی فتنۃ عثمان" ج ۳ ص ۳۳۶ والعمدہ ۲ ص ۱۶۷ اکثر لوگوں کا یہی خیال ہوگا، مگر میرے نزدیک یہ محل بحث و نظر ہے، کیونکہ اس جنگ میں ابجر بن جابر رئیس شریک تھا، جو اسلام سے قبل مر چکا تھا، اس کا بیٹا حجار بن ابجر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمان ہوا، نیز اس جنگ میں جن لوگوں کا ذکر آیا ہے، وہ اکثر جاہلیت میں مر چکے تھے، کسی کا زمانہ اسلام میں پتہ نہیں چلتا، اگر یہ لوگ مسلمان ہوتے تو صحابہ میں ان کا ذکر ہوتا، عقد الفرید وغیرہ میں حکیم نہشلی کا اس واقعہ میں شریک ہونا قتل ہونا، اور یہ شعر پڑھنا مذکور ہے،

کل امری مصبح فی اھلہ والموت ادنیٰ من شراک نعلہ

صحیحین میں ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہجرت کے بعد یہ شعر پڑھنا مذکور ہے نیز عنترہ کا اس واقعہ کی بابت یہ کہنا آخری فیصلہ ہے، کہ یہ واقعہ جاہلیۃ کا ہے،!

وغادرنا حکیمًا فی مجالٍ صریعًا قد سلبناہ الازارا

۲۳- ص ۱۲۔ "الدھنا" کی بابت کامل مبرد سے مقصور لکھکر میمن صاحب لکھتے ہیں "قال العاجز وجدتہ انا ممدودًا فی قول ابی زبید "ما طاف المطیّ بالدھناء"

الدّھنا مقصور و ممدود دونوں طرح ائمہ لغت نے لکھا ہے محض اس شعر سے عاجز کا استدلال صحیح نہیں، کیونکہ اس میں صحیح روایت "بالدھما" ہے، نہ "بالدھنا" اس کے واسطے الجمہرہ وغیرہ ملاحظہ ہو،

۲۴- ص ۲۲ فصبحت القوم من بنی بکر بن حنظلۃ میں شارح کے لفظ "بنی بکر" پر میمن صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے، کہ لہازم قیس تیم اللہ، عجل اور عنترہ چاروں ہیں، عنترہ بکر سے نہیں ہے باقی ہیں، اس لئے اس موقع پر "بنی بکر" صحیح نہیں، یہ ایک معمولی بے معنی سی بات ہے، زیادہ جماعت بنی بکر کی تھی، اور وہی میدان حرب میں قوت عاملہ تھی، اسلئے تغلیبًا انھیں ذکر کرنا کوئی قابل اعتراض نہیں ہے

۲۵- ص ۲۲ لیس فی قولہ ان العرفج قد ادبی دلیل علی ما ذکرہ ابو علی عن الحرب الخ

اس جگہ شارح نے ابو علی اور ان کے شیوخ پر نہایت مفید نقد کیا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ ادبی العرفج وغیرہ دشمنوں کی تیاری کا کنایہ ہے، نہ یہ کہ وہ حقیقۃ ہتھیار بند ہو گئے تھے، جیسا ان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، کلام طرز بیان پر ہے، اس پر شارح نے بہت اچھی گفتگو کی ہے، ابو علی کی غلط حمایت کوئی مفید نہیں

۲۶- ص ۲۳۔ "لو وصل الغیث" الخ ان ابیات کو ابن قتیبہ نے الشعراء کے ص ۲۵ یورپ میں ذکر کیا ہے، جب "ابنین" صحیح ہے، تو "ابنیا" بنانے کی چنداں ضرورت نہیں!

۲۷- ص ۲۴ "یا ابن ھشام" الخ اس شعر کو ابن درید نے الجمہرہ جلد ۲ ص ۴۰۸ وغیرہ میں کئی جگہ لکھا ہے، اور روایت مشہورہ "نقوس و قرن" ہے،

۲۸۔ ص ۲۶ شارح نے لکھا ہے "ومن ھذا اللحن ما رواہ غیر واحد الخ" اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں، "کما فی الاذکیا" تعجب ہے کہ انھیں دوسری جگہ تلاش کی ضرورت ہوئی حالانکہ القالی جلد ۲ ص ۲۲۲ میں یہ پوری حکایت مذکور ہے،

۲۹۔ ص ۲۶ "وذکر اللیثی ان رجلا الخ" تعجب ہے کہ میمن صاحب اسکی تخریج سے کترا گئے، حالانکہ اس میں انھیں شارح پر قدرے نقد بھی ملتا، یہ قصہ الجاحظ نے جلد ۲ صفحہ ۲۶ پر دوسرے الفاظ کیساتھ نقل کیا ہے، غالباً شارح نے اپنی یاد سے اُسے نقل کیا ہے، اسی واسطے یہ غلطی سرزد ہوئی، "زق خمر" کی جگہ وہاں "نحی صغیر فیہ سمن" ہے اور یہ پیغام بھیجا گیا تھا، "اخبرہ ان الشھر محاق وان جدینا الذی کان یطالعنا وجدناہ ارثم ثوما"

۳۰۔ ص ۲۶ "والرثم بیاض الشفۃ العلیا، ھذا اصلہ ثم استعمل فی الھتم" البکری نے اس جگہ ایک علمی غلطی کی ہے، جس کی طرف فاضل میمن صاحب کا ذہن نہیں پہونچ سکا، وہ تو ہمیشہ غلطی پکڑنے میں غلطی کرنا پسند کرتے ہیں، انھیں اصل اغلاط سے کیا سروکار؟

رَثَمَ وَرَتَمَ بِنَاءٍ مثلہ وبثنائۃ دونوں کے معنی توڑنا، بعضوں نے ناک اور منہ سے مخصوص کیا ہے، پھر اوپر کے ہونٹ کی سپیدی کے واسطے استعمال کیا گیا ہے، کیونکہ یہ رنگ دوسرے رنگوں سے الگ ہوتا ہے، دراصل زخمی مقام کا رنگ سپیدی مائل ہو جاتا ہے، اس نسبت سے یہ استعمال کیا گیا ہے،

پھر البکری کا یہ کہنا، "الرثم ھو الھتم" ائمہ لغت کے نزدیک صحیح نہیں کیونکہ "رثم" اور "ہتم" میں بڑا فرق ہے، "ہتم" صرف دانتوں کے توڑنے کے واسطے خصوصاً اگلے دانتوں کے واسطے آتا ہے، "رثم" اسے ہرگز نہیں کہتے !

۳۱۔ ص ۲۶ "السحیم مصغر اسحم بمعنی الاسود، وھو علم لکثیر من سودان العجم" کے

متعلق یہ کہنا کہ بہت سے کالوں کا علم ہے صحیح نہیں بلکہ بہت سے آدمیوں کا علم ہے جنہیں کالے بھی ہوں گے، دراصل اسحم ہر ایک سیاہ چیز کو کہتے ہیں، خواہ وہ پہاڑ ہو، مشک ہو، رات ہو، بادل ہو، یہ استعمال کلام عرب میں معروف ہے!

۳۲۔ ص ۹۱ جمیل بن معمر کے نسب میں اختلاف بتا کر پھر نہایت غلط اور محرف نسب لکھا ہے یا اصل کو چھوڑ دیتے، یا جہاں تک ممکن تھا تصحیح کر کے لکھتے، حبتر، قیس بن جزر ضبہ، کثیر، سعد بن ہذیم، معمر بن صباح، یہ تمام تحریفات و تصحیفات ہیں جنہیں متفرق کتابوں سے بغیر سوچے سمجھے نقل کر لیا گیا ہے، ان تمام اغلاط کی صحت ملاحظہ فرمائیے،

الف :۔ "حبتر" یہ "خیبری" کی تصحیف ہے، جیسا کہ ابن ماکولا وغیرہ نے اسے صحیح طور پر ضبط کیا ہے

ب :۔ قیس بن جزر ایجاد کردہ نام اور محض تحریف ہے، صحیح "خنبس" یا "سنبس بن حُن" ہے، جیسا کہ الاکمال ابن ماکولا وغیرہ میں ہے،

ج :۔ "ضَبّة" مصحف ہے، صحیح "ضِنّة" بالنون وکسر الضاد ہے، اسکے واسطے الاشتقاق ابن درید اور ابن ماکولا وغیرہ ملاحظہ ہو،

د :۔ "کثیر" نام کا اس نسب نامہ میں کوئی شخص نہیں، یہ لفظ "کبیر" بالباء الموحدہ ہے،

ہ :۔ "سعد بن ہذیم" کسی جگہ نہیں، یہ خاص فاضل میمن کی صناعت ہے، ورنہ سب جگہ سعد ہذیم بغیر لفظ "ابن" ہے،

و :۔ "معمر بن صباح" صحیح نہیں، "صباح" عبد اللہ کا لقب ہے،

ز :۔ ظَبْیان نہیں، ظِبیان بکسر ظاء ہے، جیسا ابن ماکولا وغیرہ نے تصریح کی ہے،

اب ہم صحیح نسب ابن الکلبی وغیرہ کی روایت سے جسے حافظ ابن حزم نے جمہرۃ الانساب میں لکھا ہے، اور امیر ابن ماکولا نے جا بجا اسے ضبط کیا ہے، درج کرتے ہیں "جمیل بن عبد اللہ بن معمر

ابن الحرث بن خیبری بن ظبیان، وھو سنبس (خنبس ؟) ابن حن بن ربیعہ بن حرام
ابن ضِنّۃ (بالنون وکسر الضاد) ابن عبد بن کبیر (وبالباء) ابن عذرۃ بن سعد
ھذیم بن زید بن لیث بن سود بن اسلم (بضم اللام) ابن الحاف بن قضاعۃ!
عبداللہ کو صباح کہتے ہیں، جیسا اغانی وغیرہ میں ہے، کبھی ابن قمیہ بھی کہتے ہیں، قمیہ دراصل
عبداللہ کے باپ معمر کی ماں ہے، جسکی طرف جمیل یا عبداللہ منسوب ہوتے ہیں،!

۳۲- ص ۲۰، الجیح الاسدی شاعر کے نسب میں دو فاحش اغلاط ہیں،
ایک: "ظریف" بفتح طاء کو "طُریف" مصغراً ضبط کیا ہے،
دوم: "قعین" کے بعد طریف کے نسب میں اضافہ کیا گیا ہے، صحیح قعین بن الحرث بن ثعلبہ ہے
جیسا کہ ائمہ نسب کا اس پر اتفاق ہے،!   (باقی)

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیمگاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا، مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا جسکو اہل نظر نے بیحد پسند کیا، اب دار المصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کیساتھ شائع کیا ہے، ضخامت ۱۲۴ صفحات قیمت ۱۲؍

مقالاتِ شبلی حصہ سوم

مولانا شبلی مرحوم کے تعلیمی مضامین کا مجموعہ ضخامت ۱۱۰ صفحے، قیمت :- ۱۲؍

"منیجر"

ایساغوجی

از

جناب ایم اے حفیظ صاحب، پٹنہ،

فن منطق میں اس نام کا رسالہ صدیوں سے عربی درس گاہوں میں متداول رہا ہے، اس کے مؤلف اثیر الدین ابہری نے ۶۶۳ھ میں وفات پائی، اور پہلی شرح اس پر حسام الدین حسن الکافی المتوفی ۷۶۰ھ نے لکھی، بعدازاں یہ شارحین و حاشیہ نویسوں کا بازیچہ بن گیا،

بعضوں نے رسالہ کے نام ایساغوجی پر بھی روشنی ڈالی ہے،

مرآۃ المنطق میں جو ہندوستان میں ۱۲۴۴ھ کے بعد لکھی گئی ہے اور اکثر منطق کے مجموعوں میں پائی جاتی ہے، مؤلف کہتا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں نہیں دیکھا، مگر استادوں کی زبانی سنا ہے، کہ ایساغوجی ایک یونانی لفظ ہے، اور اس کے معنی میں اختلاف ہے بعض کہتے ہیں کہ یہ ایک قسم کا گلاب ہے جس میں پانچ پنکھڑیاں ہوتی ہیں بعض کے نزدیک یہ تین جدا لفظوں سے مرکب ہے، ایس، اغو، جی، جن کے معنی ہیں: تو، میں، وہ، پہلی شرح تو ایک شاعرانہ خیال ہے، اور باعتبار موضوع رسالہ ایسی ناموزوں بھی نہیں، دوسری شرح میں علاوہ اس امر کے کہ یونانی زبان میں لفظ ایگو بیشک واحد متکلم ہے، مگر بقیہ اجزاء، ایس وجی[۱] مندرجہ بالا معنوں میں نہیں پائے جاتے، ان ضمیروں کو فن منطق یا اس کے کسی حصہ سے بظاہر کوئی خاص تعلق نہیں،

[۱] ایس، صد، جی، ارض۔

قال اقول میں سیّد السّند، میر شریف کہتے ہیں کہ یونان میں اسی نام کا ایک حکیم گذرا ہے، جس کی طرف کلیات خمس منسوب ہے، لیکن شارحین عموماً اس لفظ کو کلیات خمس کا مترادف بتاتے ہیں، کشف[1] الظنون میں فارسی کا ایک شعر منقول ہے،

جنس و فصل و نوع و خاصہ عرض عام   جملہ را ایساغجی کردند نام

ذیل کی سطروں میں اس لفظ کے اصلی مفہوم اور منطق کی تاریخ میں اس کی اہمیت واضح کرنے کی کوشش کیجائے گی وباللہ التوفیق،

حکیم فرفوریوس کے نام سے حکمائے اسلام اور چند صوفیائے کرام بخوبی واقف تھے، حکمت اشراقی و حکمت مشائی میں اس نے معرکۃ الآرا تصنیفیں چھوڑی ہیں، جو یونانی سے عربی میں ترجمہ ہو کر ان لوگوں تک پہونچیں، ہندوستان میں عبدالعلی بحر العلوم جو دونوں حکمتوں کے جامع اور ہر ایک کے متبحر تھے، اپنی شرح مثنوی مولینا روم اور شرح میر زاہد ملا جلال میں جا بجا اس کا حوالہ دیتے ہیں،

یہ حکیم[2] ۲۳۲ئہ میں ملک شام کے شہر طرابلس میں پیدا ہوا، قیصریہ اور اثینیہ (ایتھنز) میں تعلیم پائی، اصلی نام ملکوس تھا، جو لاطینی بھیس میں لفظ ملک ہے، اس نام کے لحاظ سے اور اس مناسبت سے بھی، کہ وہ اکثر بیگنی رنگ کا لباس پہنا کرتا تھا، جس رنگ کا قیاصرۂ روم کا درباری جبّہ ہوا کرتا تھا، اس کے استاد نے اس کو پورفایرس یعنی بیگنی لباس والے کا لقب دیا اور وہ اسی لقب سے مشہور ہوا،

اس کے عہد میں روم (رومۃ الکبری) کے حکیم فلوطینس کی شہرت عالم گیر تھی، اس سے شرف

---

[1] کشف الظنون جلد اول ص ۵۰۲،

[2] فرفوریوس و فلوطینس کے حالات انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا و بالڈون، ڈکشنری آف فلاسفی وغیرہ میں ملینگے، شہرستانی کتاب الملل والنحل جلد ۲ صفحہ ۲۲۳ و ۲۲۵ میں فرفوریوس کا فلسفہ جو درحقیقت اس کے استاد کا فلسفہ ہی، اور بنام شیخ الیونانی آخر الذکر کے رموز و امثال درج ہیں،

تلمذ حاصل کرنے کے لئے یہ علم کا پیاسا روم پہونچا، اور چھ سال تک اس کے حلقۂ درس میں شامل رہا، پھر جزیرہ صقلیہ میں پانچ برس گذار کر روم واپس آکر خود فلسفہ کا درس دینا شروع کیا، اور اپنے استاد فلوطینس کے فلسفہ کی توضیح و ترویج میں سرگرم رہنے لگا، اسی اثنا میں ایک سات بچوں والی بیوہ مرسلا نامی سے شادی بھی کر لی، جو اسی کی طرح فلسفہ کی بڑی دلدادہ تھی، فرفوریوس قریب ستر برس کی عمر پاکر فوت ہوا،

اس نے بہت سی تصنیفیں چھوڑیں، مگر ان میں سے زیادہ تر آج ناپید ہیں، یہاں پر صرف تین قابل ذکر ہیں،

۱۔ ایڈورسس کرسٹی اینوس یعنی الرد علی النصاری جو غالباً اس کی سب سے زیادہ اہم تصنیف تھی، وہ مسیحیت کا سخت دشمن اور یونانی بت پرستی کا بڑا حامی تھا،

۲۔ استاد کی سوانح عمری اور اس کی تعلیمات کی شرح، فلوطینس بظاہر اپنی قومی بت پرستی پر ثابت قدم تھا، مگر وہ ایک خاص عقیدہ کا بانی بھی گذرا ہے، جو بعد کو مسیحیت اور اسلام کے کئی فرقوں میں سرایت کر گیا، وہ کہتا ہے، کہ ذات باری تعالی مادہ سے اس قدر پاک اور برتر ہے، کہ تکوین کا اس سے براہ راست ظہور پانا عقلاً محال ہے، اس نے عقل کل پیدا کی جس سے بتوسط یکے بعد دیگرے نفس کل طبیعت ہیولیٰ صورت اور جسم وجود میں آئے، فتوحات مکیہ میں شیخ اکبر محی الدین ابن عربی نے نفس کل و عقل کل کو لوح و قلم سے تعبیر کرکے اس عقیدہ کو صوفیائے کرام کے اس گروہ میں رواج دیا، جو وحدت الوجود کا بھی قائل تھا، اگرچہ ان دونوں عقیدوں میں کسی طرح کا لگاؤ نہیں، کچھ عرصہ ہوا، کہ انگلستان کے مشہور فیلسوف ورکن کلیسا ڈین انگ نے فلوطینس کی تعلیمات پر ایک مبسوط تصنیف شائع کی ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگر اس سے متفق نہیں تو اسکے مخالف بھی نہیں،

۳۔ ایساغوجی و شرح قاطیغوریاس ارسطو سبب تالیف ایساغوجی یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ

کہ ایک امیرزادہ، کرائی سا اوریس نے جو فرفوریوس کے شاگردوں میں سے تھا، اپنے استاد سے تلینا کے کوہ آتش فشاں کی تاریخ مرتب کرنے کی فرمایش کی، جس کی تعمیل کے لئے فرفوریوس جزیرۂ صقلیہ گیا جہاں اِٹینا واقع ہے، اس اثنا میں امیرزادہ کو ارسطو کی تصنیف قاطیغوریاس (مقولات عشرہ) کہیں سے ہاتھ لگی، جب وہ اس کے مطالب کو سمجھ نہ سکا، تو اس نے اپنے استاد کو خط لکھا کہ اگر تاریخ اِٹینا اختتام کو پہونچ گئی ہو تو روم واپس چلے آئیے ورنہ قاطیغوریاس پر ایک ایسا مضمون تحریر کیجئے کہ اس کے مطالعہ سے اصل کتاب کا مفہوم بآسانی ذہن نشین ہو جائے چونکہ فرفوریوس اس وقت روم واپس نہ جا سکتا تھا، اس نے ایساغوجی تصنیف کرکے امیرزادہ کے پاس بھیجدی، یہ لفظ مرکب ہے، دو یونانی لفظوں سے جس کے معنی ہیں وہ شے جو کسی دوسری شے کی طرف رہبری کرے، یہاں پر اس نام سے وہ رسالہ مراد ہے، جو ارسطو کی تصنیف قاطیغوریاس کے واسطے دلیل، ہادی اور رہبر کا کام دینے کو فرفوریوس نے مرتب کیا تھا،

ابتدا میں جب یونانی کتابیں عربی زبان میں منتقل ہونے لگیں، تو یہ رسالہ بھی ترجمہ ہوا، مترجموں نے ایساغوجی کا ترجمہ مدخل کیا، چنانچہ کتاب الفہرست ابن ندیم[۵] میں پورا نام یوں مذکور ہے،

کتاب ایساغوجی فی المدخل الی الکتب المنطقیۃ،

بہتوں نے اس کی تلخیص کی، یا شرحیں ترتیب دیں جن کا مجمل بیان کشف الظنون وغیرہ میں ملیگا، کتب خانہ برٹش میوزیم واقع لندن میں عربی زبان کا ایک قلمی نسخہ[۵] محفوظ ہے، جس کے شروع کے چند

---

۵ ترجمہ انگریزی ارغنون ارسطو از ٹامس ٹیلر مطبوعہ لندن ۱۸۱۲ء اس کمیاب تالیف کا ایک مکمل نسخہ امپیریل لائبریری کلکتہ میں موجود ہے، مترجم کا حال ڈکشنری آف نیشنل بایگرفی میں درج ہے، ۵ ص ۲۴۵، ۵ ضمیمہ فہرست کتب قلمی عربی ص ۹۲ نسخہ نمبر ا،

اوراق ضائع ہوگئے ہیں، اور مؤلف کے نام کا پتہ نہیں، مگر مقدمہ میں اس نے تصنیف فرفوریوس کا نام اور اس کی غرض وغایت ذیل کی عبارت میں بیان کی ہے:-

"فاما اسمہ فالمدخل اذ کان غرضہ فیہ ان یعلمنا عن اشیاء تسہل لنا فہم ما فی قاطیغوریاس والصناعۃ المنطقیۃ، فہو اذن المدخل لہا۔ فاما مرتبتہ فیجب ان یقرأ قبل قاطیغوریاس اذ کان مدخلا ومسہلا لاشیاء مستصعبۃ فیہا، فاما واضعہ ففرفوریوس وذلک نمط کلامہ ومن شہادۃ المفسرین الموثوق بہم، واما من ای العلوم ہو، فمن المنطق اذ کان مدخلا الی الصنائع المنطقیۃ"

اور یہی نام رسالہ کے اخیر میں بھی پایا جاتا ہے،

وھھنا ینقطع فرفوریوس الکلام فی المدخل

یہ لفظ اس زمانہ کی دوسری کتابوں کے نام کے ساتھ بھی ملتا ہے، مثلاً المدخل الی القیاسات، المدخل الی صناعۃ النجوم، بعد کو جب اصطلاحیں وضع ہونے لگیں، تو اس طرح کی مختصر تالیفات یا کتابوں کے ابتدائی حصّوں کا نام مقدمہ پڑا، پھر یہ دو قسموں پر منقسم ہوا، ایک مقدمۃ الکتاب یعنی کسی کتاب کا ایسا ابتدائی حصہ جو اس کتاب کے مطالب دریافت کرنے میں معین و مددگار ہو، دوسرا مقدمۃ العلم یعنی ان مسائل کی تفصیل و توضیح جن پر کسی علم کا دار و مدار ہو، ظاہر ہے کہ ایساغوجی پہلی قسم سے ہے، اسی لئے منطق کے نو بابوں میں پہلا باب اس کا قرار پایا ہے، پھر مقولاتِ عشر، قضایا، تعریفات وغیرہ جو خود ارسطو کی تصنیفات میں سے ہیں، اس سلسلہ میں یہ رسالہ قرونِ وسطیٰ کے یورپ میں لاطینی زبان میں ترجمہ ہو کر مدتوں داخلِ درس اور علماء میں زیرِ بحث رہا،

فلسفہ کی تاریخ میں اس رسالہ کی اہمیت کے دو اسباب ہیں،

۱- ارسطو کے بعد منطق میں چند ایسی بحثیں تخلیط پا گئی تھیں، جن کا تعلق منطق سے زیادہ فلسفہ الٰہیات[1] سے ہے، فرفوریوس اس الزام سے بری ہے، کیونکہ وہ ایساغوجی فصل اوّل میں لکھتا ہے، کہ میں اس رسالہ میں صرف سہل مسائل پر بحث کروں گا، اور ان مسائل سے احتراز کروں گا، جو دقیق ہیں، مثلاً یہ کہ اجناس و انواع محض ذہن میں وجود رکھتے ہیں یا خارج میں بھی، اور اگر خارج میں بھی وجود رکھتے ہیں، تو اجسام ہیں یا غیر اجسام، اور یہ کہ محسوسات میں ہیں یا محسوسات سے جدا، کیونکہ ان مسائل کیلئے ایک مستقل تصنیف کی حاجت ہے،

۲- ارسطو کہتا ہے، کہ ایک معمولی قضیہ موجبہ کلیہ پر غور کرو، مثلاً یہ کہ کل ب ج ہیں، اگر یہ قضیہ صادق ہے، تو ممکن ہے کہ اس کا عکس کل ج ب، بھی صادق ہو یا نہ ہو، اگر صادق ہے تو موضوع و محمول تساوی ہوئے، اسکی صرف دو صورتیں ہیں، اگر محمول موضوع کی عین ماہیت بیان کرتا ہے، تو وہ موضوع کا معرّف ہوا، ورنہ خاصّہ اگر کل ب ج صادق ہے، اور کل ج ب کاذب تو محمول موضوع کے معرف کا کوئی جزء ہو یا نہ ہو، اگر اس کا ایک جزء ہے، تو محمول جنس ہوگا یا فصل، اگر محمول موضوع کے معرف کا کوئی جزء نہیں ہے تو یہ عرض عام ہے یعنی ایک ایسی شے ہے، جو موضوع و غیر موضوع میں مشترک ہے قضیہ مذکور کی ان صورتوں کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہو سکتی یعنی یہ تقسیم جامع و مانع ہے، پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ کسی قضیہ موجبہ کلیہ کا محمول موضوع کا خواہ معرف ہے خواہ خاصہ، جنس فصل عرض عام میں سے ایک، ارسطو کی اس تقسیم قضایا کو فرفوریوس نے یوں ترمیم کیا، کہ پہلے تو معرف کو خارج کر دیا، اس لئے کہ یہ مرکب ہی جنس و فصل سے ہے، پھر قضیہ تعریف کے موضوع کا نام نوع رکھکر کلیات خمس کو پورا کر دیا، اور اس کو بجائے تقسیم قضایا کے بالعموم تصورات کی تقسیم قرار دی، اس بحث کو فرفوریوس نے جس قالب میں سولہ سو برس پیشتر ڈھالا تھا، اسی قالب میں یہ آجتک ہر جگہ جہاں منطق کا درس ہوتا ہے

[1] الٰہیات سے یہاں مراد ہے فلسفۃ الاولیٰ جو بعد کو مابعد الطبیعیات یا میٹا فزکس کہلایا کیونکہ اسکی تعلیم طبعیات کے بعد ہوا کرتی تھی،

خواہ مدرسہ ہو خواہ کالج، طلبہ کے آگے پیش کیجاتی ہے،

یہاں پر ایک دوسری غلط فہمی کی طرف اشارہ خلاف موقع نہ ہوگا، شارحین کہتے ہیں معلوم نہیں ان کا ماخذ کیا ہے، کہ اسکندر کی فرمایش سے ارسطو نے فن منطق[1] مدون کیا، اور اس کے صلہ میں اس کو ایک کثیر رقم ملی، اس سبب سے منطق کو میراث ذوالقرنین کہا گیا ہے، مگر اس بیان کی یونانی تواریخ میں کوئی شہادت نہیں پائی جاتی، یہ مسلّم ہے، کہ ارسطو تین سال تک اسکندر کا معلم رہا، لیکن اس نے شباب ہی میں جہان کشائی کے لئے وطن ایسا چھوڑا، کہ پھر اس کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوا، مزید بران فتح ایران کے ایام میں ارسطو کے ایک عزیز کلستھینز نامی نے جب اس کی عبادت حسب معمول اہل ایران کرنے سے انکار کیا، تو وہ ایسا چراغ پا ہوا کہ اپنے قدیم استاد سے اس کا بدلہ لینے سے دھمکی دی، اور اس کو اپنے سابق شاگرد کی قلمرو سے فرار ہونا پڑا،

علاوہ ازین ارسطو خود کہتا ہے، کہ منطق کی ابتدا جدلیات، ڈایلکٹیکا سے ہوئی، اور اس کا واضع زینون اکبر تھا، پھر سوفسطائی (فلسفہ فروش) اس فن کو اپنے مصرف میں لائے، فلاطون نے اس کو فلسفہ تہذیب الاخلاق (ایتھکس) سے جدا کرکے اس کے بہت سے مسائل پر بحثیں کیں، اخیر میں ارسطو نے قدما کے اقوال کی ایسی با اصول اور جامع تدوین کی، کہ اس کو اگر منطق کا واضع بھی کہا جائے، تو ایسا بیجا نہیں، بعد کو اس پر دو اضافے ہوئے، اس کے شاگرد وتھیو فراسٹس نے قضایائے شرطیہ کا بیان شامل کیا، شکل رابع کو ارسطو نے شاید ناقص سمجھ کر چھوڑ دیا تھا، اس کا اضافہ جالینوس کی طرف منسوب ہے،

منطق ارسطاطالیسی کا موازنہ قدیم ہندوؤن کی منطق سے کرنے سے فوراً تخم و پوست کا

---

[1] لاجک لوگوس سے اور منطق نطق سے مشتق ہے، اور دونوں لفظ ہم معنی ہیں، ارسطو کے یہاں اس فن کا نام انالیٹیکا ہے،

فرق ظاہر ہو جائے گا، سنسکرت میں اس فن کو نہایا[1] کہتے ہیں، قیاس تبکرار صغری و نتیجہ پانچ قضیوں پر بہ تفصیلِ ذیل مشتمل ہے،

مدعا :- اس پہاڑ میں آگ ہے،

سبب :- کیونکہ اس سے دھوان نکلتا ہے،

قاعدہ :- جس شے سے دھوان نکلے اس میں آگ ہوتی ہے،

اطلاق :- اس پہاڑ سے دھوان نکلتا ہے،

نتیجہ :- اس پہاڑ میں آگ ہے،

منطق کی بہتوں نے مخالفت کی ہے، جن میں لوتھر و بیکن یورپ میں اور امام غزالی اور شارحین کے امام زاعم، رازی مسلمانوں میں نامور گذرے ہیں، عارف جامی نے دو بیتوں پر اکتفا کی ہے،

زمنطق کن نطق کاند و گنیستی ۔۔۔ نہ حل شد ز اشکالِ او ہیچ مشکل

مبیں نگشت از حدود و رسومش ۔۔۔ نہ اجناسِ عالی نہ انواعِ سافل

---

[1] آئین اکبری ص ۷، ہندو راجک مطبوعہ کلکتہ یونیورسٹی،

اکبری دور کا ایک موجد

شاہ فتح اللہ شیرازی

از جناب معین الدین صاحب رہبر فاروقی (منشی فاضل)

تعجب ہو کہ شیراز کی مردم خیز خاک سے ایک باکمال اٹھتا ہے تو اس کی فضیلت کا غلغلہ شمال میں پھیلنے کی عوض جنوب کے آخری گوشۂ دکن کو متحرک کرتا ہے، جہاں عادل شاہی خاندان بیجاپور کی سرزمین پر حکرانی کیا کرتا تھا، اب یہ بات کوئی نئی نہیں رہی، کہ دکن کے سلاطین نے بھی علوم وفنون کی قدردانی، اور ارباب فضل کی سیادت میں بڑی بڑی شاہانہ فیاضیاں دکھلائیں، اور بے انتہا قدردانیاں کیں، چنانچہ مورخ فرشتہ لکھتا ہے، کہ "تاجدار بیجاپور نے ہزاروں منتوں اور سماجتوں کے ساتھ فرامین بھیجکر، لاکھوں روپیوں کے عاملانہ صلے پیش کرکے شاہ فتح اللہ کو اپنے دربار میں آنے پر مجبور کیا"۔

اس سے پہلے کہ اس حکیم کا بیجاپوری دربار سے تعلق بیان کیا جائے اس کے ابتدائی حالات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن سخت افسوس کا مقام ہے کہ ایسی بے نظیر و باکمال شخصیت کے متعلق کسی نے بھی کچھ توجہ سے کام نہیں لیا، تلاش میں جتنی محنت کی، ناکامی رہی، اور جس قدر ذاتی مطالعہ کا نتیجہ ہے، وہ اب آپکے مطالعہ کی نظر ہے،

نام فتح اللہ خطاب عضدالدولہ، وطن شیراز تھا، تاریخ بساتین السلاطین میں شاہ کمال الدین فتح اللہ بھی نام نظر پڑا، ان کے آبائے کرام حسینی زادے تھے، اور سیادت کا فخر رکھتے تھے، مولینا کمال الدین

[1] تاریخ بساتین السلاطین (بیجاپور) صفحہ ۲۱۲ مطبوعہ مطبع سیدی حیدرآباد دکن،

شروانی اور میر غیاث الدین منصور شیرازی کے سامنے طلب علم کے لئے زانوے ادب تہ کیا تھا، ابوالفضل نے اکبر نامہ میں ان کے اساتذہ میں ایک اور صاحب کا نام مولینا احمد بھی لکھا ہے[۵] ان بزرگواروں کے سوا انھوں نے خواجہ جمال الدین محمود سے بھی تلمذ کا شرف حاصل کیا تھا، مولوی محمد حسین آزاد مرحوم نے ان کی شاگردی سے متعلق ایک خاص واقعہ لکھا ہے کہ

"ابتدا میں فنا کے خیالات دل پر چھائے تھے، ضروریات علمی حاصل کرکے اہل عبادت اور گوشہ نشینوں کی خدمت میں حاضر رہنے لگے، اور اکثر میر شاہ و کمنہ کی صحبت کو سعادت سمجھتے تھے، اس عرصہ میں اہل علم، اور صاحبان فضل کی تقریروں پر راغب ہوئے، اس لئے درس و تدریس کے حلقے میں داخل ہوئے، رفتہ رفتہ خواجہ جمال الدین محمود کے درس میں گئے، پہلے ہی دن حاشیہ میر پڑھنے بیٹھے، پڑھتے جاتے تھے اور خود بھی تقریر کرتے جاتے تھے، اس دن ایسے مطالب دقیق اور معانی لطیف ان سے ادا ہوئے، کہ حاضرین حیران رہ گئے، اس ملک میں دستور ہے کہ جب شاگرد سبق پڑھ چکتا ہے، تو اٹھ کر اپنے استاد کی خدمت میں تعظیم و تکریم بجالاتا ہے، انھوں نے چاہا کہ کھڑے ہو کر لوازم تعظیم ادا کریں، خواجہ نے سبقت کرکے خود سینہ پر ہاتھ رکھا، اور کہا کہ آج تم نے ہمیں مستفیض کیا، چنانچہ چند روز میں منتہی ہو کر خود علم کے پیاسوں کو سیراب کرنے لگے"[۶]

مورخین ان کے نام فتح اللہ (شیرازی) کے آگے کبھی، امیر، میر، اور شاہ کے الفاظ زیادہ کرکے ذکر کیا کرتے ہیں، اور کبھی صرف خطاب عضد الدولہ پر اکتفا کیا ہے، جب مغلیہ دربار میں آئے تو اکبر میر فتح اللہ کہنے لگا[۷]

شاہ صاحب سلطنت بیجاپور میں آچکے تھے، اور عادل شاہ کی مہربانیوں سے لطف اندوز ہوتے تھے، اور سلطان کمال درجہ ان کی عزت کیا کرتا تھا، ابراہیم عادل شاہ نے اپنے بیٹے علی عادل شاہ کی

---

[۵] اکبر نامہ ابوالفضل مطبوعہ کلکتہ جلد سوم ص ۴۲۹، [۶] دربار اکبری ص ۶۲۳ مرتبہ محمد ابراہیم منصف امرتسر سنہ ۱۹۱۰ء [۷] دربار اکبری

تعلیم کے لئے ان کو مقرر کیا، شاہزادہ علی کی معلمی کے واقعہ کو، اور شاہ فتح اللہ کا کیرکٹر واضح کرنے کے لئے تاریخ بساتین السلاطین سے اس کے مؤلف کے اصل الفاظ نقل کئے جاتے ہیں، اس سے قبل مختصر طور پر یہ جان لینے کی ضرورت ہے، کہ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے آبائی مذہب امامیہ کو ترک کر کے تسنن اختیار کر لیا تھا لکھا ہے کہ

"شہزادہ علی در آوان طفلی، و زمان خوردی، بحدت فہم و شوخی طبع موصوف بود، و روز بروز چوں بحد تمیز و سن رشد، نزدیک ترمی شد خصال شریفہ و اوصاف مرضیہ بروے ظہور آوردن گرفت، اما بسبب صحبت خواجہ عنایت اللہ شیرازی کہ بخدمت تعلیم و تربیتش مامور بود، میل تمام بہ مذہب تشیع بہم رسانید، چنانچہ ابراہیم شاہ روزے در خلوت با خواص محرمان نشستہ بود، بتقریب ذکر مذہب و آئین جد و پدر، در میان آمد، فرمود شکر و سپاس مر معبود حقیقی را کہ مرا توفیق داد کہ از ملت و آئین جد و پدر بری گشتہ، دین قویم و صراط مستقیم کہ از سواد اعظم مذہب سنت جماعت است اختیار نمودم، و شعار روافض را برطرف ساختہ اثرے ازان نہ گذاشتم، در آں وقت شاہزادہ حاضر بود، و این سخن بہ گوش می کرد، واز شوخ طبعی ضبط خود نہ نمودہ، گستاخانہ در برابر پدر گفت کہ اگر از طریقہ جد و پدر گذاشتن، روش محمود و طریق پسندیدہ است، ضرور شد کہ فرزندان آن حضرت چنیں کنند، ابراہیم شاہ ازین شوخی و ہم زبانی او برآشفت و پرسید کہ تو چہ مذہب داری، ؟ گفت بالفعل مذہب پادشاہ دارم آیندہ بر خدا اعلم است، پادشاہ دانست کہ شہزادہ شیعہ است و آن را از تاثیر صحبت استادش یقین کرد، عتاب آگین گشتہ چندروز بار سلام نہ داد و استادش حکم بہ حبس نمود، بعد ازان برائے تعلیم شہزادہ ملا فتح اللہ شیرازی را مقرر کرد، قضارا او ہم مذہب تشیع داشت، بملاحظہ روزگار تقیہ را کار فرمودہ، خود را در مردم حنفی المذہب فرامی نمود صحبت او با شہزادہ بہ موافقت انجامید شہزادہ بہ توقیر و تکریم فتحا زی کوشید"[1]

[1] تاریخ بیجاپور (بساتین السلاطین) ص۳

اس عبارت سے ظاہر ہے، کہ شاہ صاحب ابراہیم عادل شاہ اول (جلوس ۹۶۵ھ) کے عہد ہی میں بیجاپور آئے، اسی لئے تو وہ شاہزادۂ علی کے استاد رہے، آزاد نے دربارِ اکبری میں ان کی آمد کے زمانہ کو علی عادل شاہ کا عہد بتایا ہے، جو درست نہیں معلوم ہوتا، [۱]

یہ بیجاپوری تاریخوں سے بھی ثابت ہوتا ہے، کہ انھوں نے علی عادل شاہ اول کے قتل کے بعد ۹۸۸ھ میں اس کے بھتیجے ابراہیم عادل شاہ ثانی کو تختِ سلطنت دلانے میں بڑی کامیاب کوشش کی، ابراہیم نے بھی ان کی کمال تکریم و قدردانی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، مگر یہاں کے امراء کے جوڑ توڑ، ان کے نفاق، عداوت، اور سلطنت کی ابتری کی وجہ سے وہ خوش نہ رہا کرتے تھے، اس دوران میں ان کے فضل و کمال کی شہرت، دکن سے نکل کر سارے ہندوستان میں گونج رہی تھی، چنانچہ دوسرے امراء کے سوا، جب فیضی دکن کا دورہ کرتا ہے، اور ان کی شہرت کی پیہم خبریں اسے ملتی ہیں، تو ان کے حالات بادشاہ کو لکھ بھیجتا ہے، اور دربارِ شاہی میں بلا لینے کی رائے دیتا ہے،

ادھر اکبر اہلِ کمال کا دلدادہ ہی نہیں، بلکہ بھوکا بیٹھا تھا، جب ان کے علم و فضل کے حالات نہایت کثرت سے سنے، تو ربیع الثانی ۹۹۰ھ میں عادل شاہ کے نام فرمان بھیجا، کہ اس یگانۂ روزگار کو فوراً دربارِ شاہنشہی میں روانہ کردو، چنانچہ اکبر نامہ میں ابوالفضل ۹۹۰ھ کے واقعات کے ذیل میں لکھتا ہے کہ

"درین ولا فرمانِ مقدس، بہ آمدن تذکرۂ حکمائے پیشین امیر فتح اللہ شیرازی شرف نفاذ یافت، و بہ خواہش آن نرخ افزائے دانش دیرین آرزوے او برآمد، از دیر باز بسیج قدسی آستاں داشت و روزگار نیرنگ سازیاوری نمی کرد، تا آنکہ بہ التماس عادل خاں، از شیراز بہ دکن آمد، و چوں روزگار او سپری شد، کمن اندیشہ نوی پذیرفت،"

گیتی خداوند از ین آگہی، نشاط فرمود، بہ گوناگوں نوازش، ازاں نگرانی برآورد، و مناشیر

---

[۱] دربارِ اکبری ص۱۷۳

"مقدس، بہ مرزبانانِ دکن، و اقطاع دارانِ ممالکِ محروسہ نفاذ یافت کہ و یسگالش آن سرآمد دودۂ آگہی، یاوری افزودہ، رہبری نمایند و بہ گرم خوئی، و دل جوئی گوہر شناسائی بہ پایۂ آورند[1]"

شاہ صاحب جب دارالسلطنت کے قریب پہونچے تو بادشاہ نے ان کے شایانِ شان عزت کی خاطر، خان خانان جیسے امیر کبیر اور ابوالفتح گیلانی ایسے اپنے ہر دل عزیز ندیم کو ان کے استقبال کیلئے بھیجا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی عظمت کا بادشاہ کے دل پر اور لوگوں میں کیا اثر ہوگا، کہ سلطنت کے سب سے بڑے، اور چوٹی کے امیر کو بھیجا، ان لوگوں نے میر صاحب کو جالیا، اور اپنے ہمراہ لیکر فتح پور میں بادشاہ کے حضور لاکر ملازمت کرائی، اکبر نے صدارت کے منصب سے سرفراز کرکے پرگنہ بساور، بیداغ اور محلی جاگیر میں عطا کئے[2] ان کے اس ورود کی تاریخ کسی نے "شاہ فتح اللہ امام اولیا" کہی[3]

۹۹۰ھ

جب شاہ صاحب دربار میں پہنچ جاتے ہیں تو اہلِ دربار پر ان کی عظمت و رفعت کا جو سکہ بیٹھتا ہے اسے بھی ابوالفضل کی زبان سے سنئے، اس کے ترجمے سے اس باکمال کی وقعت کم ہو جانے کا اندیشہ ہے اور ممکن ہے کہ ترجمان کا طرزِ بیان اصل الفاظ کی قدر و قیمت کو ادا نہ کر سکے، لکھتا ہے:-

"و از سوانح آمدنِ امیر فتح اللہ شیرازی، در حکمت نظری و عملی طراز یکتائی داشت، اگرچہ در دانش گاہ خواجہ جمال الدین محمود، و مولینا کمال الدین شروانی، و مولینا احمد کرد، فراواں شناسائی اندوخت لیکن پایۂ دانش از ینہاں بلند تر نہاد، عادل خاں بیجاپوری بہ ہزاراں خواہش از شیراز بہ دکن آورد، پس از سپری شدنِ روزگار او، بہ حکم دیریں آرزو و فرمانِ طلب، بہ صوب قدسی آستان گام سعادت برگرفت، بست و پنجم ایں، دولتِ

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص ۳۹۱ (کلکتہ)، [2] منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی جلد دوم ص ۳۱۵، ۳۱۶ (کلکتہ)، [3] ایضاً

والا دریافت، و شہنشاہِ حکمت پژوہ، بہ گوناگوں نوازش سربلندی بخشید . . . . .
و از انصاف پژوہی باچنیں شگرف آگہی، در کم تر فرصتے، جویائے ارادتِ گیہاں خدیو، شدہ از
سعادت منشی کامیاب خواہش آمد، بارہا در انجمن و نازش می کرد، اگر بہ خدمتِ ایں کثرت آرائے
وحدت گزیں" نمی رسیدم، راہے بہ ایزد شناسی نمی بردم" او را از فرخندگی ذات و سترگی جوہر،
بادہ حکمت گوارا شد، ز دانش رسمی، پردہ بر روئے حق پژوہی نہ ہشت . . . . .
و امروز از فرخندگی روزگار، و بہ بیدار بختی مردم گیتی خداوند، پیشوائے نخستیں گروہ است، خوشا
روشن ستارہ کہ بدیں شناسائی جاوید سعادت اندوزد[1]

میر نے تھوڑے ہی عرصہ میں، اکبر کے مزاج میں بڑا رسوخ پیدا کر لیا، اور مصاحبتِ شاہی میں پایۂ قرب و منزلت بڑھا، سہ ہزاری منصب پر سرفراز ہوا[2]، اور مظفر خاں تربتی کی چھوٹی لڑکی سے شادی کرلی، انتہائی وفاداری خلوص اور شوق سے اپنے بادشاہ کی خدمت گذاری کی،

اکبری دربار کا مذہبی رنگ کچھ ایسا بگڑا کہ خدا کی پناہ، اسی لئے شہنشاہ سمجھتا تھا کہ میر فتح اللہ جو نئے نئے آئے ہیں، دین فروش علماء کے ساتھ اس کی بیدینی کا ساتھ دینگے، کیونکہ وہ سنا کرتا تھا کہ شاہ صاحب میر غیاث الدین منصور کے شاگرد ہیں، جو مذہب سے چنداں واسطہ نہ رکھتے تھے، لیکن شاہ فتح اللہ نے امراپرستی اور دنیا داری کے باوجود یہاں پہنچ کر عجیب جراءت دکھائی کہ عین دیوان خانۂ خاص میں جہاں کسی کا جگر نہ ہو سکتا کہ علی الاعلان نماز پڑھ سکے، وہ انتہائی اطمینان اور فراغِ خاطر کے ساتھ، باجماعت امامیہ طریقہ پر نماز ادا کیا کرتے تھے، اکبر ان دنوں لامذہبیت کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا، بڑے بڑے علماء کی داڑھیاں منڈوا دی تھیں، اسلامی عبادات و مذہبی رسوم پر تمسخر کرتا اور لغو سمجھتا تھا، جبراً لوگ مذہب سے چھڑائے جاتے تھے، مگر میر صاحب کے ان معاملات میں کیا مجال تھی کہ دخل دیتا، البتہ انکو اربابِ تقلید سے سمجھتا تھا، انھوں نے

[1] اکبر نامہ جلد سوم ص ۴۹۳ [2] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۰۰ مطبوعہ کلکتہ،

بھی جسارت کی حد کر دی تھی، اکبر کو چونکہ انکا پاس خاطر مقصود تھا اسی لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ چشم پوشی سے کام لیتا تھا لیکن اتنا ضرور، خاص طور سے ہوا کرتا کہ ہمیشہ ان کے سامنے مذہب اور اس کے اصول و عقائد کی تذلیل بیربر وغیرہ کے ذریعے کیا کرتا تھا، یہ لوگ کھلم کھلا بادشاہ کی شہ پاکے "معراج" جیسے واقعات کو لیکر حملے کیا کرتے تھے، مگر شاہ صاحب نے ہمیشہ ان چیزوں کی بادشاہ کے سامنے کوئی تردید نہ کی، وہ ایک باجبروت شہنشاہ کے سامنے اس قسم کے مباحث کی تائید و تردید کو خلاف مصلحت وقت سمجھتے اور امرائے دربار کے رنگ کو دیکھ کر سہمے ہوئے تھے، جب کبھی ایسی صورتیں پیش آتیں تو سر جھکائے خاموشی سے سب کچھ سنتے اور دربار سے نکل آتے تھے،

میر صاحب کے کمالات نجوم و رمل کی وجہ سے اکبر کے زائچہ کی تصحیح کی فرمائش کی گئی، اس لئے کہ ہندی جوتشی اور یونانی نجومیوں نے الگ الگ اختلافات کے ساتھ اس کا زائچہ تیار کیا تھا، اور دونوں متفق نہ ہوتے تھے، ان کے سامنے جب یہ مسئلہ پیش کیا گیا تو انھوں نے اس وقت انتہائی فنی کمال کا اظہار کیا اور ہر گروہ کو اس کی غلطی سے آگاہ کرکے اس کی تصحیح کی،

اکبر نامہ میں لکھا ہے:-

"درسالے کہ قدوۂ علماے روزگار، و نقاوۂ دانش اندوزان آموزگار قسطاس دقایق علوم عقلیہ معانق مفہوم، مرتقی مدارج علیا مبین حقائق اشیا، نقاد جواہر معنی خلال غوامض یونانی پردہ شگاف روابط نور و ظلام، نکتہ طراز حرکت و سکون اجرام و اجسام عنقاے اوج بلند پروازی علامۃ الدہر، عضد الدولہ، امیر فتح اللہ شیرازی، بہ رہنمونی بخت بیدار، بہ پایۂ سریر ارفع اعلیٰ مشرف شدہ بہ مراتب رفیع، و مدارج عالی خلعت امتیاز یافت، روزے راقم ایں شگرف نامہ، مذکور ساخت، کہ زائچہ طالع مسعود، مختلف بہ نظری رسید، ما حول آن ست کہ ایشان نیز، بہ نمودار صحیح غور تمام کردہ، بہ میزان تحقیق بسنجید، خدمت میر از کمال تدقیق

بہ ضوابط فارسی و قوانین یونانی استنباط طالع اشرف نمودہ اسد قرار دادند چون بہ اعتمادِ محررِ معتمد ترین زائچہ با صورت آں رابا انموذجے، از احکام ایرادی نماید"[1]

شاہ صاحب کو دربار میں آئے ہوئے ابھی ایک سال کا عرصہ بھی نہ گذرا تھا کہ جلوس کے اٹھائیسویں سال صفر ۹۹۱ھ میں، نوروز کا جشن منانے کی تیاریاں شروع ہوئیں، نہایت اہتمام اور شان سے کام ہونے لگا مغل شہنشاہ اس جشن کو جس شوکت کے ساتھ مناتے تھے، وہ ظاہر ہے، اکبر نے خصوصیت سے اس کو کمال کے درجہ پر پہونچا دیا تھا، آج جس طرح بڑی بڑی تقاریب پر، عموماً صنعتی نمایشوں کے انعقاد سے علمی مظاہروں کا رواج ہو چلا ہے، شاید اس کو موجودہ دور کی اختراع سمجھا جاتا ہوگا، لیکن اکبر نے بھی ٹھیک اسی طرح اس نوروز میں حکم دیا، کہ امرا بھی اس میں حصہ لیں، اور اپنے اپنے کمالات کا اظہار کریں، چنانچہ دیوانِ خاص و عام کے اردگرد (۱۲۰) عالی شان ایوان تھے، ان میں سے ہر امیر کو ایک ایک ایوان عطا ہوا، کہ وہ اپنے مظاہروں کو ان میں ترتیب دیسکیں، اور اپنی قابلیتوں کے جوہر دکھائیں، ہر قابل و باکمال آدمی اپنے کمالات کے مظاہرہ کے لئے، موقع کا متجسس رہا ہی کرتا ہے، کہ اس کی داد ملے، شاہ فتح اللہ کو قدرت کی جانب سے بہت جلد یہ موقع ہاتھ لگا، انکی جیسی شہرت و شان تھی، اسی لایق اپنے ایوان کو سب سے زیادہ کامیاب بنانے کی کیا کچھ کوشش نہ کی ہوگی، مورخین لکھتے ہیں کہ

"ان کی نمایش گاہ کیا تھی، ایک عجیب و غریب علوم و فنون کا طلسم خانہ تھا، ہر بات میں نکتہ اور نکتہ میں باریکی پیدا کی تھی، گھڑیال اور گھنٹے چل رہے تھے، علم ہیئت کے آلات، کرے، ربع مجیب، اسطرلاب، نظام فلکی کے نقشے، اور ان کی مجسم مورتوں میں سیارے اور افلاک چکر مار رہے تھے، جر اثقال کی کلیں، اپنا کام کر رہی تھیں، علم کیمیا، اور علم نیرنجات کے شعبدے ساعت بساعت رنگ بدل رہے تھے"[2]

---

[1] اکبرنامہ جلد اول ص ۱۳۱ [2] تاریخ واقعات دارالحکومت دہلی حصہ اول ص ۴۰۲ و منتخب التواریخ جلد دوم

افسوس ہے کہ اس طلسم خانہ کی کامل تفصیل، اور اس کے پورے پورے حالات نہیں ملتے، کہ اس پرعظمت باکمال موجد کی یہ چیزیں ہمارا سرمایہ فخر بنتیں، اور اس کے کارنامے ہماری رہنمائی کرتے، تاریخیں اس بات کو نقل کرتی ہیں، کہ اکبر کو عرصہ سے ایک نئے سنہ کے ایجاد کی دھن لگی تھی، وجہ یہ لکھی ہے کہ وہ بہت دنوں سے کہا کرتا تھا، کہ ہندوستان میں ہجری تاریخ کارآمد نہیں ہوسکتی اور اس کے سوا یہ سنہ دوستوں کی تکالیف کی یادگار، اسلام کی کلفت و ناکامی، اور اعدار کی دشمنی کا اظہار کرتا ہے، اس لئے ایسے سنہ کا استعمال مبصروں کے دلوں میں اپنے وجود سے اس حزن وملال کی یاد تازہ کیا کرتا ہے[۱] لیکن بادشاہ ظاہر بینوں، رسمی عقلمندوں اور مذہبی لوگوں کی وجہ سے اور اس سبب سے بھی کہ دینی ضروریات کا اسی ماہ و سال پر انحصار ہے، متفکر و متردد ہا کرتا تھا کہ سنہ ۹۹۲ھ میں شاہ فتح اللہ شیرازی نے اپنے چند رفقار کیساتھ اس مشکل کو حل کر کے ایک نئے سنہ کی داغ بیل ڈالی اور اس کا نام اکبر کے "دین الٰہی" کے لحاظ سے "سنہ الٰہی اکبر شاہی" قرار دیا، اسکی بنا زیچ جدید گورگانی پر

---

[۱] اکبر کا یہ خیال بالکل غلط تھا، اسلئے کہ ہجرت کے ساتھ ہی اسلام کی مصیبتوں کا خاتمہ، اور اس کی ترقی کا آغاز ہوا ہے، اسلامی سال اور اسکے قمری مہینوں کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہی کہ یہ مہینے ہمیشہ مختلف موسموں میں گردش کرتے رہتے ہیں، چونکہ اسلام سارے عالم کے لئے آیا ہے، فرض کیجئے کہ دنیا کے کسی خطے کے باشندوں کے لئے رمضان کا مہینہ گرما میں آیا، تو چند سالوں کے بعد وہ دوسرے موسموں میں آئے گا، اور دنیا کو یہ شکایت کا موقع نہ ملیگا کہ اس نے اس مہینہ کو مختلف ممالک کا لحاظ کر کے مقرر نہیں کیا، تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کیجئے کہ اگر مئی کا مہینہ روزوں کے لئے مختص ہوتا، تو غور فرمائیے کہ اس مہینہ میں ساری دنیا میں ایک موسم نہیں ہوتا، کسی مقام کے باشندوں کیلئے روزے آسان ہوتے تو کسی کیلئے گرمی کی شدت کی وجہ سے انتہائی مشکل اور یہ شمسی مہینے قمری مہینوں کی طرح موسموں میں گردش بھی نہیں کرتے، کیونکہ ان کا انحصار سورج پر ہے، بہ خلاف قمری ماہ و سال کے کہ وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو روزے اور دیگر ارکان اسلام کی ادائی میں مختلف موسموں کا مزہ چکھاتے ہیں، کسی کو کسی شکایت کا موقع باقی نہیں رہتا،

رکھی، اور جلوس اکبر کو اس نوایجاد سال کا آغاز قرار دیا، مہینوں اور دنوں کے نام فارسی ہی بحال رکھے، اور کبیسہ کو خارج کر دیا، جب یہ امور مکمل ہو چکے، تو حکم ہوا کہ ہجرت کی بجائے لفظ رحلت لکھیں[۱]، اور سنہ کا شمار جناب سرور کائنات صلعم کی اس عالم سے پردہ فرمائی کے وقت سے شروع کریں، چونکہ حضور صلعم نے ۱۱ھ میں وفات پائی، اسی لئے ہجری اور الٰہی سنہ میں دس سال کا تفاوت ہے[۲]، بادشاہ نے تمام ممالک محروسہ میں اس ماہ و سال کے لئے فرامین نافذ فرمائے، اور اسی پر عمل ہونے لگا[۳]۔

ان کے معاصرین لکھتے ہیں، کہ شاہ فتح اللہ شیرازی اس فضل و کمال کے باوجود معمولی سی معمولی کتابیں تک پڑھاتے اور ادنی سواد ادنی تک کو تعلیم دینے میں پیچھے نہیں ہٹتے تھے، حتی کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو الف با بھی پڑھایا، اور حکیم ابوالفتح کے غلام تک کو درس دیا، اس درس و تدریس کے وقت اس منصب فضیلت و علمیت کے ہوتے ہوئے بھی اپنے شاگردوں کو فحش گالیاں دینے میں کبھی کمی نہ کی، چنانچہ ملا عبدالقادر بدایونی نے منتخب التواریخ میں، اس موقع پر ان کا کیرکٹر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"و بہ تعلیم اطفال امراء مقید بودہ و ہر روز بہ منازل مقربان رفتہ، نخست از ہمہ غلام حکیم ابوالفتح را، و وقتے پسر شیخ ابوالفضل و امراء زادہ ہائے دیگر، ہفت ہشت سالہ، بلکہ خورد تراں را معلم صبیانی می کرد، و تعلیم نقطہ و خط و دائرہ و بلکہ ابجد ہم می داد ....

.... و تفنگ بر دوش، و کیسہ دارو، بر میان بستہ، چون قاصدان بہ صحرا در رکاب می دوید و شان علمی کہ نماندہ بود، او بالکل بر خاک زد، و با وجود ایں ہمہ بلے شانی در زلی و خسیسی، در رسوخ اعتقاد، پہلوانی کرد کہ ہیچ رستم نہ کند[۴]"

---

[۱] منتخب التواریخ جلد دوم ص۳۰۶، [۲] حکومت آصفیہ (حیدر آباد) جو مغلیہ سلطنت کی یادگار سمجھی جاتی ہے، اس نے بھی موسم اور فصلوں کی رعایت کی وجہ اپنے لیے یہی الٰہی سنہ و تاریخ کو اپنا مالیہ اور دفتری سنہ قرار دیا ہے، اور یہاں یہ فصلی سنہ کہلاتا ہے، اس وقت ۱۳۴۷ف ہے [۳] مآثر الامراء جلد اول ص۱۰۱، [۴] منتخب التواریخ جلد سوم ص۱۲۶

میر صاحب ۹۹۴ھ میں جلوس کے تیسویں سال کے آغاز پر امین الملک بنائے گئے اور ساتھ ہی حکم ہوا کہ راجہ ٹوڈرل دیوانِ کل کے ساتھ، دفتری کام اور امورِ سلطنت کے انصرام میں مصروف ہوں، اور راجہ موصوف کو تاکید ہوئی، کہ وہ میر صاحب کی صلاح وصوابدید پر چلا کریں اور مظفر خان کی دیوانی سے اس وقت تک جتنے دفتری معاملات ملتوی پڑے ہیں، وہ بہت جلد ان کے مشورہ سے تکمیل کو پہونچائے جائیں، چنانچہ شاہ صاحب نے کمر ہمت چست کی، اور کاغذات وامثلہ کی رو سے مقدمات کو فیصل کیا، جو باتیں اصلاح طلب تھیں، ان کی ایک رپورٹ اور ان کے لئے تجاویز بھی پیش کیں، جو کچھ لکھکر گذرانا، وہ حضور سے حرف بہ حرف منظور ہوا[۱] یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ دفتر مال و دیوانی کی تہذیب و ترتیب، اور اس کی اصطلاحیں تنہا صرف ٹوڈرمل کی ایجاد نہیں، بلکہ اس میں میر صاحب کا بھی حصہ ہے، (باقی)

---

[۱] مآثر الامراء، جلد اول ص ۱۰۱،

مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب مرحوم اور اُن کی کتابین

مولوی احسن اللہ خانصاحب ثاقب مرحوم کی کتابیں مکاتیب امیر مینائی اور گوہرین نامہ ایک عرصہ سے ہمارے یہاں ایجنسی کی کتابوں میں داخل ہیں، کئی سال ہوئے کہ مرحوم کا انتقال ہوگیا، مرحوم نے اپنی بیوہ کے لئے بجز اس قلمی سرمایہ کے اور کوئی چیز نہیں چھوڑی ہے، ایسی حالت میں مولف مرحوم کے ہمدردوں، شناساؤں اور قدردانوں سے گذارش ہے، کہ وہ ان کی ان کتابوں کو کارِ خیر سمجھ کر خرید فرمائیں، تاکہ اس صورت سے ان کی غمزدہ بیوہ کی امداد کا کچھ انتظام ہو سکے،

قیمت:۔ مکاتیب امیر مینائی مع سوانحعمری امیر مرحوم، گوہرین نامہ (فارسی مخطوط)
عہ ۔ ۔ ۔ ۔ عہ

"منیجر"

جاپان میں اسلام کے مشکلات کا حل

از

پروفیسر نور الحسن برلاس ٹوکیو (جاپان)

عربوں نے اسلام کی تبلیغ میں تمام دنیا چھان ماری، اور جہاں گئے، احکام الٰہی پہونچانا اپنا فرض سمجھا، جاپان تک عربوں کی رسائی نہ ہو سکی، شاید اس وجہ سے کہ یہ مشرق کا بعید ترین ملک ہے، یا اس وجہ سے کہ اسے تاریخ میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، اور طوفان خیز سمندروں کے مصائب نے ان جزائر کی کشش کو کم کر دیا تھا، بہرحال اہل جاپان تک اسلام کی تعلیم نہ پہونچ سکی اور وہ اسلام سے نابلد رہے، جاپانیوں کی لاعلمی کے ذمہ دار دراصل مسلمان ہیں، جنھوں نے اپنے فریضۂ اعلاے کلمۃ الحق کی ادائگی میں کوتاہی برتی، اگر وہ ہمت کر کے یہاں اسلام کی تبلیغ کرتے، تو ممکن نہیں کہ جاپانی لبیک نہ کہتے، کیونکہ یہ لوگ من حیث القوم غیروں کی اچھی باتیں بہت جلد قبول کر کے اختیار کر لیتے ہیں، دوسری صدی عیسوی میں کنفیوشس کے عقائد چین سے آئے، اور چھٹی صدی میں بدھ مت ہندوستان سے نکل کر چین اور کوریا ہوتا ہوا یہاں پہونچا، ان دونوں مذاہب کے عقائد جاپانیوں کے رگ و ریشہ میں اس قدر سرایت کر گئے ہیں، کہ زندگی کا کوئی فعل ان کے اثر سے خالی نہیں، مغربی اقوام کے داخلہ کے ساتھ عیسائیت نے انیسویں صدی کے آخر میں قدم جمائے، اور اب اچھی طرح جڑ پکڑ لی ہے، عیسائیت کا داخلہ دراصل سولھویں صدی میں ہوا تھا، مگر غیر ملکی پادریوں کی سیاسی ریشہ دوانیوں سے مجبور ہو کر حکومت کو ایک صدی کے اندر ہی اندر اس کا قلع قمع کرنا پڑا، فی زماننا عیسائیت کے ساتھ ساتھ مغربی تہذیب وارد ہوئی، اور تھوڑے عرصے

میں تمام جاپانیوں پر چھا گئی،

جاپانیوں میں غیروں کے طور طریقے اختیار کرنے کی، اور ان میں کاٹ چھانٹ کر کے ملکی حالات کے بموجب موزوں بنا لینے کی حیرت انگیز قابلیت ہے، ان حالات میں اس طباع قوم کی نظر سے اسلام کا اوجھل رہنا بعید از فہم واقعہ ہے، شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اہلِ جاپان فطرۃً نہایت وضع دار واقع ہوئے ہیں، اور ظاہری شان رکھنے والی اشیا ان کے دلوں پر بہت اثر کرتی ہیں، عقائد کنفیوشس اور بدھ مت کے داخلے کے وقت خاقانِ چین کی وسیع متمدن اور طمطراق والی سلطنت نے ضرور اپنا رنگ دکھایا ہوگا، نیز مغربی تمدن کی آمد پر یورپ و امریکہ کی شان و شوکت کا جادو چلا ہوگا، اسلامی حکومت کے عروج کے وقت مسلمانوں نے موقع ہاتھ سے کھو دیا، مگر زمانہ حال میں اسلام کی اشاعت کا زیادہ موقع ہے، کیونکہ یہ دین فطرت ہے، اور عقلِ انسانی کے مطابق ہے۔

باوجودیکہ مسلمانوں نے جاپان میں تبلیغ اسلام سے غفلت برتی، جاپانیوں نے مغرب سے روشناس ہونے پر اس سے بے اعتنائی روا نہ رکھی، مگر انھیں اسلام کے متعلق تحقیقات کرنے میں مغرب کی جانب ہی رجوع ہونا پڑا، اہلِ مغرب کے تعصب کا یہ عالم تھا کہ پادریوں نے جو کچھ کہہ دیا، اس پر ایمان لے آئے، اور پادریوں کو ہمیشہ اسلام میں کیڑے ہی کیڑے نظر آتے رہے، لہذا انھوں نے اسلام کی جو تصویر عیسائی ممالک کے سامنے پیش کی ہے، وہ نہایت بھیانک ہے، جاپانی انھی کی تصانیف سے مستفید ہوئے ہیں، اور انھی کے تراجم و اقتباسات اپنی زبان میں شائع کئے ہیں، ظاہر ہے کہ اسلام کے بارے میں جاپانی کتابیں کیسی گمراہ کن ہوں گی،

جاپان میں اسلام کے خلاف غلط بیانی عام کتب تک محدود نہیں ہے، بلکہ درسی کتب تک پہنچ گئی ہے، اور یہ نہایت مضرت رساں ہے، ثانوی مدارس کے استعمال کے لئے تاریخ کی جو کتابیں تصنیف ہوئی ہیں ان سب میں آنحضرت صلعم کی زندگی اور تعلیم کے بارے میں کافی غلط بیانی سے کام لیا گیا ہے

جن کے پڑھنے سے آیندہ نسلوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف ایک غبار بھرا ہوگا اس بارے میں جاپانیوں پر دھوکہ دہی کا یا دانستہ غلط پروپگنڈا کرنے کا الزام لگانا بالکل ناجائز ہے، انھوں نے ان ذرائع سے معلومات حاصل کی ہیں، جہاں آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں یعنی مغرب سے جو موجودہ زمانے میں علم کی مشعل سے دنیا کو منور کر رہا ہے، اس لئے مجرم دراصل مغربی مصنفین ہیں نہ کہ جاپانی،

جاپان میں اسلامی تعلیمات کے ساتھ جو بے انصافی برتی جا رہی ہے، اس کے انسداد کی ذمہ داری بھی مسلمانوں پر ہی عائد ہوتی ہے، انھیں جاپانیوں کے لئے ایسی زبان میں صحیح معلومات فراہم کرنی چاہئیں، جس کا سمجھنا ان کے لئے آسان ہو، اسی ذریعے سے اسلام کے خلاف غلط بیانی کی تردید ہو سکتی ہے، اگر جاپانی مدارس میں موجودہ گمراہ کن تعلیم جاری رہی، تو اس کا نتیجہ خطرناک ہوگا، اس سے اہل جاپان اور مسلمانوں میں دوستی کا رشتہ تو پیوست ہو نہیں ہو سکتا، بلکہ جاپانیوں کے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا ہوں گے، اور جب جاپانیوں کے طرز عمل سے نفرت کا اظہار ہوگا، تو جواب میں مسلمان بھی جذبات نفرت کا اظہار کرنے پر مجبور ہوں گے، ہر ملک کے مدبرین کو اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے مستعد ہو کر مرض کے علاج کی فکر کرنی چاہئے، مجھے جن جن ذمہ دار جاپانیوں سے گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے، انھوں نے غلطی کا انسداد کرنے کی ضرورت محسوس کی ہے،

پچھلے سال مجھے ٹوکیو کی اورنٹیل کلچر سوسائٹی کی جانب سے اسلامی رواداری پر تقریر کرنے کیلئے مدعو کیا گیا تھا، تقریر کے ضمن میں مجھے اپنے تلخ تجربے کا اظہار کرنا پڑا، کہ تقریباً ہر نوجوان جاپانی کے منہ سے میں نے یہ سنا ہے، کہ یہ حضرت محمد صلعم نے اسلام کی تبلیغ اس طرح کی ہے کہ دائیں ہاتھ میں تلوار اور بائیں میں قرآن شریف لے کر نکلتے تھے، یہ لوگ اپنی معلومات کا ماخذ مدارس ثانوی کی کتب تاریخ کو بتاتے تھے، جو میری تحقیقات سے صحیح نکلا، میں نے سوسائٹی مذکور کی توجہ اس جانب مبذول کرا کے جناب صدر سے درخواست کی کہ صاحب موصوف یہ امر محکمۂ تعلیم کے گوش گذار کر کے یہ خواہش

کریں کہ علماے جاپان تاریخ اسلام کی معقول تحقیقات کرکے کتب تاریخ کی تصحیح کی کردیں، جناب کاچو،ناکامرا صاحب کا جو اس سوسائٹی کے بانی اور صدر ہیں، نہایت ممنون ہوں، کہ صاحب موصوف نے نہ صرف اپنی انجمن کے رسالہ جاپانیز ابراڈ میں میری تقریر شائع کردی، بلکہ پارلیمنٹ کے جاڑے کے اجلاس میں بحیثیت ایک رکن کے یہ مسئلہ اٹھادیا، آپ نے نواب وزیر محکمہ تعلیم، اور نواب وزیر محکمہ ماورائے بحر دونوں سے اس بارے میں استفسارات کئے، اور اس مشکل کو حل کرنے کے وعدے لئے، یہ استفسارات رسالۂ مذکور کے ماہ اپریل ۳۶ء کے پرچے میں جاپانی زبان میں شائع ہوچکے ہیں، ان کا ملخص یہاں درج ہے :۔

"حال میں میں نے نواب وزیر محکمہ تعلیم کی خدمت میں غیر اقوام کے مذہب اور دستور وغیرہ کی بابت استفسار کیا تھا، آج میں وہی استفسار نواب وزیر محکمہ ماورائے بحر کی خدمت میں پیش کررہا ہوں میں اپنی قوم کی توسیع کے لئے یا تو ان ممالک میں ہجرت کرنی پڑی ہے، جن میں بجائے سفید فام اقوام کے رنگین اقوام کے باشندے آباد ہیں، یا ان سے دوسری قسم کے تعلقات قائم کرنے پڑے ہیں، مثلاً افریقہ، مشرق قریب مشرق بعید اور جنوبی بحرالکاہل کے جزائر ان ممالک میں حضرت محمد (صلعم) کے ماننے والوں کی تعداد زیادہ ہے، جن کے مذہب کو دنیا میں بدنام کیا جاتا ہے، اور اس سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی ہے، مسلمانوں کے متعلق یہ بیان کیا جاتا ہے، کہ انھوں نے سیدھے ہاتھ میں تلوار اور الٹے میں قرآن شریف لے کر مذہب کی اشاعت کی ہے، یہ اقوال غیر مسلم اقوام میں رائج ہیں، اور ان کی بنا پر وہ مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں، یہ غلط بیانی دراصل سفید فام اقوام نے دنیا میں فساد برپا کرنے کیلئے رائج کی ہے، حقیقت میں مسلمان جنگ وجدل کے خلاف ہیں، اور وہ بنی نوع انسان میں اخوت و مساوات پھیلانے کے مدعی ہیں، مجھے بذات خود مذہب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں، مگر یہ میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جاپانی مدارس ثانوی کی مروجہ کتب تاریخ میں یہ غلط

روایات درج ہیں، لہذا میں حکومت کی خدمت میں یہ مشورہ پیش کرتا ہوں کہ اس مسئلہ کی کامل تحقیقات کی جائے، اور جہاں غلط بیانی ثابت ہو، اسکی تصحیح کردیجائے، اس بارے میں محکمۂ ماورائے بحر اور محکمۂ امور خارجہ کو محکمۂ تعلیم کے ساتھ تعاون کرنا چاہئے"

یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ محکمہ جاتِ متعلقہ کے نمایندوں نے جناب ناکا مُرا صاحب سے ہمدردی کا اظہار کیا، اور اس کے متعلق مناسب کارروائی کرنے کا وعدہ کیا، اب یہ کام دنیائے اسلام پر منحصر ہے، کہ تحقیقات اور تصحیح کے لئے مواد فراہم کردے،

تلخیص و تبصرہ

خرگوشی کا رسالہ تصوف

مسٹر اربیری (A. J. Arberry) نے بلیٹن آف دی اسکول آف اورنٹیل اسٹڈیز لندن (جلد ۹ حصہ ۲، ۱۹۳۸ء) میں خرگوشی کے رسالہ تصوف پر حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:۔

مجھے انڈیا آفس لائبریری میں ابوسعد عبد الملک بن محمد بن ابراہیم الواعظ الخرگوشی کے رسالہ تصوف تہذیب الاسرار کے دیکھنے کا موقع ملا، خرگوشی نے جو نبی کریم صلعم کی ایک ضخیم سوانح عمری اور خوابوں کی تعبیر پر ایک رسالہ تصنیف کرنے کی وجہ سے بھی مشہور ہوا، ۴۰۶ھ مطابق ۱۰۱۵ء یا ۴۰۷ھ مطابق ۱۰۱۶ء میں وفات پائی، اس لئے اس کا زمانہ سلمی (متوفی ۴۱۲ھ ۱۰۲۱ء) ابونعیم الاصفہانی (متوفی ۴۳۰ھ ۱۰۳۹ء) اور قشیری (متوفی ۴۶۵ھ ۱۰۷۲ء) سے پہلے ہے لیکن سراج (متوفی ۳۷۸ھ ۹۸۸ء) کلاباذی (متوفی ۳۸۵ھ ۹۹۵ء) اور ابو طالب المکی، (متوفی ۳۸۶ھ ۹۹۶ء) اس سے بھی پہلے کے ہیں، ان مقابلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خرگوشی تصوف پر لکھنے والوں میں کافی قدیم ہے، اس کا نام ان آٹھ مستند مصنفین کی فہرست میں شامل نہیں ہے، جو نکلسن (Nicholson) نے قدیم تصوف کی تاریخ کے لئے تیار کی ہے، اور نہ اس کی جانب اتنی توجہ کی گئی ہے جتنی توجہ کا وہ مستحق ہے، اگرچہ یہ صحیح ہے، کہ میناں (Massignon) نے حلاج کے مطالعہ میں اس سے استفادہ کیا، اس نوٹ کا مقصد یہ ہے، کہ رسالہ مذکور کے متعلق جو مختصر حالات آلوارٹ (Ahlwardt) نے لکھے ہیں، ان پر اضافہ کیا جائے، نیز خرگوشی کے رسالہ کی صحیح

قدر و قیمت کا اندازہ بحیثیت ایک اصلی ماخذ کے کیا جائے،

جیسا کہ آلوارٹ نے کہا ہے، تہذیب الاسرار اپنی موجودہ شکل میں خود خرگوشی کے قلم کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ اس کے ایک شاگرد کی تالیف ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ کتاب خرگوشی سے دو پشت بعد کی ہے، جیسا کہ ان اسناد سے ظاہر ہے، جو پہلے باب کے شروع میں نیز کتاب کے دوسرے مقامات پر دی ہوئی ہیں،

أخبرنا ابو عبد الله محمد بن احمد بن موسیٰ الشیرازی بمکة، قال اخبرنا الامام الزاهد ابو سعد قال ... الخ

اسی طرح کتاب اللمع سراج کے ایک شاگرد سے منقول ہے، اس عبد اللہ الشیرازی کے متعلق تاریخ بغداد (جلد ۱ ص ۷۰ - ۳۵۹) میں ایک دلچسپ تبصرہ ہے، خطیب کی روایت کے مطابق جس کا بیان ہے کہ اُس نے ۱۱۴ھ (۱۰۱۹ء) میں کچھ دنوں خود شیرازی سے حدیث لکھی، شیرازی نے بغداد میں ایک واعظ اور درویش کی حیثیت سے کافی شہرت حاصل کی، لوگ اس کے زہد و اتقا کی نمائش سے دھوکے میں آجاتے تھے، اور اس کی مجلسوں میں ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے، اس نے ایک شکستہ مسجد کی مرمت کرائی، اور پھر اس مسجد کو خانقاہ بنا لیا، اور اپنے مداحوں سے حاصل کر کے بڑی دولت جمع کی، اب اس نے پیوند لگے ہوئے لبادہ کا پہننا ترک کر دیا، اور بیش قیمت لباس پہننے لگا، اس نے غزوہ کے لئے اپنی ایک خاص فوج بھی تیار کر لی، اور بیان کیا جاتا ہے کہ آذربیجان کے گورنر کے مقابلہ میں وہ اپنی فوج لے کر بڑھا بھی تھا، ۴۲۹ھ مطابق ۱۰۴۷ء میں آذربیجان کے قریب اس کا انتقال ہو گیا، خطیب مختصر طور پر صرف اس قدر کہتا ہے، کہ حدیث کے راوی کی حیثیت سے وہ ضعیف سمجھا جاتا تھا،

اگر خطیب کا بیان صحیح ہے، تو ایسا شخص خرگوشی کی تہذیب الاسرار کا آخری راوی تھا، اسکی شہرت کی وجہ سے اعتماد نہیں پیدا ہوتا، خود اس کتاب کا تجزیہ بھی زیادہ اطمینان نہیں بخشتا، یہ دیکھکر کافی حیرت

ہوتی ہے، کہ صفحات (۱۰) ب لغایتہ (۱۱) الف پر صوفی کی جو تعریف درج ہے، وہ شیخ عبد القادر الجیلی کی طرف منسوب ہے، وہی شیخ عبد القادر جو غنیہ اور دوسری مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، اور جن کا انتقال خرگوشی کی وفات کے ڈیڑھ صدی بعد ۵۶۱ھ مطابق ۱۱۶۶ء میں ہوا، یہ صحیح ہے، کہ صفحہ (۱۱) الف کے حاشیہ پر کاتب (۴۴۴ھ) کے ہاتھ کا ایک نوٹ اس مضمون کا ہے، کہ یہ عبارت بعد کو بڑھائی گئی ہے، جو ابو سعد کے نسخے میں نہیں ملتی، اور اسی قسم کا ایک بیان ص (۱۰) الف کے متن میں بھی ابن خفیف (متوفی ۳۷۱ھ ۹۸۲ء) کے ایک قول کی نسبت درج ہے، لیکن یہ دونوں عبارتیں (ممکن ہے کہ اور بھی ہوں) اس بات کو ثابت کرتی ہیں، کہ اصل نسخہ میں بعد کو اضافہ کیا گیا ہے، یہ مشکل قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، کہ کاتب کے سامنے خرگوشی کا اصل مسودہ تھا، اس نے غالباً کتابت کے وقت محض ایک بالکل قدرتی نتیجہ نکالا ہے، جس سے اس کی ذہانت ظاہر ہوتی ہے،

کتاب کے اصل ڈھانچہ پر نظر ڈالنے سے فوراً واضح ہو جاتا ہے، کہ یہ تمام تر کتاب اللمع کے طرز پر لکھی گئی ہے، اتنا تو اسی وقت ظاہر ہو جاتا ہے، جب اس کے ابواب کی فہرست جسے آوارٹ نے مکمل طور پر دیا ہے، سراج کی کتاب کی فہرستِ مضامین کے مقابلہ میں رکھی جاتی ہے، دونوں میں ابتدا تصوف کی تعریف سے ہوتی ہے، (جیساکہ بالکل قدرتی ہے) فرقۂ ملامتیہ پر ایک باب، جو اس وجہ سے اور زیادہ اہم ہے، کہ اس عہد میں صرف سلمی کی اصول الملامتیہ اس مضمون کی دوسری مستند کتاب ہے، مضامین کی یکسانی کو منقطع کر دیتا ہے، لیکن اس کے بعد پھر دونوں کتابوں میں ایک فصل معرفت پر آتی ہے، اسکے بعد خرگوشی میں احوال اور مقامات کے ابواب آتے ہیں، اور سراج میں مقامات اور احوال کے، اس کے متعلق زیادہ تفصیل سے لکھنے کی ضرورت نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ تہذیب الاسرار کا ڈھانچہ کتاب اللمع کے ڈھانچے سے اس قدر ملتا جلتا ہے، کہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ خرگوشی (یا اس کے ایڈٹ کرنے والے) نے سراج ہی کی کتاب کو بغیر کسی اعتراف کے نمونہ کے طور پر استعمال کیا،

اتنا ہی نہیں، خرگوشی یا اس کا ایڈٹ کرنے والا) پوری پوری عبارت اخذ کرلیتا ہے، نہ صرف ان ابواب میں جہاں قدیم صوفیہ کے اقوال متن کا بڑا حصہ ہیں، بلکہ ان ابواب میں بھی جن میں تصوف کی اصطلاحات کی تعریف کی گئی ہے، جیسا کہ مندرجۂ ذیل مثالوں سے واضح ہوتا ہے،

(۱) ومنها المقام وهو الذى يقوم بالعبد فى الاوقات من انواع المعاملات وصدق المجاهدات فمتى اقيم العبد فى شيئ منها على التمام فهو مقامه حتى ينتقل منه الى مقام آخر (تہذیب ص ۲۳۰)

والمقام هو الذى يقوم بالعبد فى الاوقات مثل مقام الصابرين المتوكلين وهو مقام العبد بظاهره وباطنه فى هذه المعاملات والمجاهدات والارادات فمتى اقام (اقيم) العبد فى شيئ منه على التمام فهو مقامه حتى ينتقل منها الى مقام آخر، (اللمع ص ۳۲۵)

(۲) ومنها المكان وهو لاهل الكمال والتمكين والنهاية فاذا كمل العبد فى معانيه فقد تمكن فى المكان، (تہذیب ص ۲۳۰)

والمكان هو لاهل الكمال والتمكين والنهاية فاذا كمل العبد فى معانيه تمكن له المكان الخ (اللمع ص ۳۳۵)

(۳) . ومنها الطوالع وهى انوار التوحيد تطلع على قلوب اهل المعرفة شعاعها فيطمس سلطان نورها سائر الانوار كما ان سلطان الشمس يطمس انوار الكواكب، (تہذیب صفحہ ۲۳۰ م)

والطوالع انوار التوحيد تطلع على قلوب اهل المعرفة بتشعشعها فيطمئن ما فى القلوب من الانوار بسلطان نورها كالشمس الطالعة

اذا طلعت تخفی علی الناظر من سطوتہ نور ھا انوار الکواکب وھیَ فی اماکنہا

(اللمع صفحہ ۳۴۵)

اس فہرست کو طول دینے کی ضرورت نہیں، صفحے کے صفحے سرقہ کی مثالوں سے پر ہیں،

یہانتک تو تجزیاتی تنقید تھی، اس کا دوسرا رُخ یہ ہے، کہ تہذیب الاسرار اپنے بہت سے ابواب میں اللمع سے زیادہ مکمل ہے، اور اس میں سیکڑوں اقوال اور بہتیرے اشعار اور مکتوبات کے ابتدائی اجزا ایسے ہیں، جنکو سراج نے نقل نہیں کیا ہے، اور نہ غالباً کہیں اور محفوظ ہیں، گو یہ یقینی معلوم ہوتا ہے، کہ تقریباً ہر جگہ خرگوشی کسی دوسرے شخص کی روایت نقل کرتا ہے. تاہم چونکہ اس کے مآخذ اب موجود نہیں ہیں، اس لئے اسکی اہمیت وہی ہو جاتی ہے، جو ایک اصلی مصنف کی ہے، ملامتیہ پر جو باب اس نے لکھا ہے، اس کا ذکر پہلے آچکا ہے، اس کے علاوہ ولیوں کی کرامات اور نبیوں کے معجزات پر بھی ابواب ہیں، جن پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے اپنے ذاتی خیالات پیش کئے ہیں، نیز چند مقامات پر مصنف نے اپنے ذاتی تجربات بھی بیان کئے ہیں، خصوصاً اس باب میں جو ہواتف سے متعلق ہے،

کتاب کے اس تجزیہ سے ظاہر ہوگا، کہ تاریخ تصوف کے اصلی ماخذ کی حیثیت سے تہذیب الاسرار کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا، جو سراج کی، کلاباذی اور قشیری کی تصانیف کو حاصل ہے، علاوہ بریں سلمی اور ابونعیم الاصفہانی کی تصانیف بھی مستند ماخذوں میں شمار کی جاتی ہین، پھر بھی اگرچہ تہذیب الاسرار کے موجودہ نسخہ میں جو برلن کے قلمی نسخہ کی تنہا سند پر مرتب کیا گیا ہے، سرقہ کی مثالیں بہت ہیں، اور اسکی سندِ روایت بھی قابلِ اعتبار نہیں، جسکی وجہ سے اس کا شائع کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا، یہ ایک ایسا ماخذ ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اور تصوف کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکتی، جس میں خرگوشی کی کتاب سے استفادہ نہ کیا گیا ہو،

"ع ز"

عرب اور غیر ملکی کلچر

میجر گلب (J. B. Glubb) نے عربی تہذیب اور غیر ملکی کلچر کے باہمی تعلقات پر ایک مقالہ جرنل آف دی رائل سنٹرل ایشین سوسائٹی (Journal of the Royal Central Asian Society) میں لکھا ہے، جس کا خاتمہ رسالہ مسلم ورلڈ (اپریل ۳۸ئہ) میں نقل ہوا ہے اس کا ملخص ترجمہ درج ذیل ہے:-

ایک طریقہ سے یہ تمام مضامین جن پر ہم نے بحث کی ہے یعنی حکومت، عدل و انصاف، تجارتی کاروبار، فوج اور حب الوطنی سطحی ہیں، یوں کہئے کہ وہ ایک رواجی تقلید ہیں، سیرت کی کوئی بنیادی تجدید نہیں، لیکن میرے نزدیک سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے، کہ یورپ کی مثال عربوں کے حسنِ اخلاقی کی جڑ کھود رہی ہے، ایک نہایت معنی خیز بات میں نے گذشتہ چند سالوں میں یہ دیکھی ہے کہ عرب جب اہل یورپ کو کسی کام کے کرنے کا مشورہ دیں گے تو اکثر یہ کہیں گے "بے شک ہم جانتے ہیں کہ اس دنیا میں ہر شخص صرف اپنی غرض پوری کرنی چاہتا ہے، لیکن جو تجویز میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں، اس سے آپ ہی کو نفع پہونچے گا" اگر وہ اس چیز کو اخبارات میں لکھتے یا سیاسیات میں استعمال کرتے، تو خیال ہو سکتا تھا کہ یہ پروپگنڈا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حقیقۃً ان کا یہ خیال ہے کہ ایک یورپین سے گفتگو کرنے میں سب سے زیادہ دلنشیں دلیل اسکے لئے اسکا ذاتی نفع ہے، جب کسی یورپین کو قائل کرنا چاہتے ہیں تو یہی دلیل استعمال کرتے ہیں

عرب دیکھتے ہیں کہ یورپ طاقتور اور کامیاب ہیں، اور وہ اس کامیابی کا سبب معلوم کرنا چاہتے ہیں، بعض سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کامیابی کا اصلی سبب پالیا ہے، وہ یہ کہ یورپ میں ہر فرد اور ہر قوم تمام دوسرے خیالات سے نظر پھیر کر صرف اپنے ذاتی فائدہ کے حصول میں ہمہ تن مصروف ہے، نتیجہ یہ ہے کہ جتنا ہی زیادہ عربوں کے تعلقات اہل یورپ سے بڑھتے جاتے ہیں، اتنا ہی ان میں دولت کی خواہش بھی بڑھتی

جاتی ہے، سخاوت اور مہمان نوازی صدیوں سے عربوں کے مخصوص اوصاف ہیں، لیکن یورپین تہذیب کے زیر اثر یہ اوصاف اب ان سے کم ہوتے نظر آرہے ہیں، جنگ سے قبل بہت کم عرب قصبے ایسے تھے، جنھیں کھانے کی کوئی دوکان تھی، تمام سیاحوں اور مسافروں کی مہمان نوازی کیجاتی تھی، میں نے عربوں کو ہمیشہ ایک نہایت بامروت، دردمند، اور نرم دل قوم پایا ہے، تمام عرب مفلس، ضعیف العمر اور نابینا اشخاص کی مدد خوشی سے کرتے ہیں، اور نہ صرف ان کی بلکہ ہٹے کٹے اور فضول خرچ لوگوں کی بھی، جب تک کسی عرب کے پاس کھانا ہے، کوئی شخص بھوکا نہیں رہ سکتا، دنیا میں عرب لڑنے مارنے والے اور لٹیرے مشہور کئے جاتے ہیں، لیکن خود میں نے ان کو ایک شریف، فیاض اور فلسفی قوم پایا ہے،

اصلی عرب کی ایک اور خاص خصوصیت ہر کسی اپیل سے متاثر ہو جانا ہے، میرا خیال ہے کہ اہل یورپ عربوں کے اس وصف کا بہت شاذ ذکر کرتے ہیں، اور شاذ تر اس کو سمجھ سکتے ہیں، یورپ والے دلیل یا حساب سے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، جسکی وجہ سے قائل کرنے میں انھیں بالکل ناکامی ہوتی ہے، لیکن اگر آپ کسی عرب کی عزت سے اپیل کریں یا اسکی مدد چاہیں تو یقیناً آپ نے مانگا ہے، وہ سب دیدے گا، بلکہ اس سے زیادہ، عرب جو فطرۃً سخی، رحم دل اور حساس واقع ہوا ہے، یورپ کے زیر اثر اپنے بعض بہترین فضائل کھوتا ہوا نظر آتا ہے،

جن خیالات کو میں ظاہر کرنا چاہتا ہوں، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے،:-

اول یورپین کلچر کا اثر اسوقت مغربی ایشیا میں زیادہ ہے، یہ غالباً ایک عارضی حالت ہے تاریخ سے معلوم ہوتا ہے، کہ زمانہ گذشتہ میں تقریباً برابر مدت تک یکے بعد دیگرے ایشیائی کلچر کا اثر یورپ پر اور یورپین کلچر کا اثر ایشیا پر پڑا ہے، یہ اثر عموماً تعلیم یافتہ طبقوں پر پڑتا ہے، اور صرف وہی غیر ملکی کلچر کو قبول کرتے ہیں، کسان طبقوں کے لوگ اکثر غیر متاثر رہتے ہیں، اور وہی بالآخر اصلی ملکی کلچر کی طرف عود کا سبب بنتے ہیں،

دوم:- اگر ہم مغربی ایشیا کی موجودہ حالت پر غور کریں، تو یہ مان لیں گے، کہ عرب یورپ کی مدد سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں، خصوصاً تنظیم اور سائنٹفک طریقوں میں اور شاید ملکی خدمات سے متعلق بعض شہری خوبیوں میں بھی بشرطیکہ یہ خوبیاں حد سے گذر کر انتہائی قومیت کی شکل نہ اختیار کرلیں، لیکن دوسری سمتوں میں حکومت عدل و انصاف، اور فوج سے متعلق عربوں کی روایات مختلف ہیں، میں کہوں گا، کہ مقامی حالات کے لحاظ سے یہ روایات جہاں ناموزوں ثابت ہوئی ہیں وہاں ان میں بتدریج ترمیم کردینی چاہئے، نہ کہ یوروپین خیالات کو داخل کرنے کے لئے انھیں بالکل خارج کردینا چاہئے،

سوم، عرب یوروپین اخلاق کو حقیر نظر سے دیکھتے ہیں، ان پر یہ اثر ہے، کہ اہل یورپ صرف اپنی غرض کے بندے ہیں، جب تک یورپ کے لوگ اس سے زیادہ بلند معیار نہ قائم کردیں اخلاقی دائرہ میں ان کا اثر عربوں کو فائدہ نہیں پہونچا سکتا، جب اقتدار عربوں کو حاصل تھا تو انھوں نے یورپ کو شریفانہ بہادری بخشی، ہمیں امید کرنی چاہئے کہ اس کے جواب میں یورپ انھیں مادیت نہ دے گا، "ع ز"

عرب و ہند کے تعلقات

از

مولینا سید سلیمان ندوی،

عرب و ہند کے علمی، تجارتی، مذہبی تعلقات و روابط پر وہ پانچ خطبے جو مولینا سید سلیمان ندوی نے ہندوستانی اکاڈیمی الہ آباد میں دیئے، وہ خوبصورت اردو ٹائپ میں مجلد شائع ہوئے ہیں، ضخامت ۴۰۲ صفحے، قیمت :- للعہ

"منیجر دار المصنفین"

اخبار علمیہ

فوٹوگرافی سے جرائم کا انکشاف

سائنس کی ترقی سے جرائم کی تفتیش میں بھی بہت کچھ مدد مل رہی ہے، کچھ عرصہ سے فوٹوگرافی کی صنعت نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ اب وہ جرائم کے انکشاف کا ایک اہم آلہ بن گئی ہے، ذیل میں فوٹو گرافی کے اس کمال کے چند دلچسپ واقعات درج کئے جاتے ہیں:-

ایک روز شام کو ایک شخص ہاتھ میں لکڑی کا ایک ڈبہ لئے ہوئے جو اخبار میں لپٹا ہوا تھا، ایک گودام میں چپکے سے داخل ہوا، اور وہ ڈبہ وہاں چھوڑکر تیزی کے ساتھ باہر نکلا، اور غائب ہوگیا، ٹھیک تیس منٹ کے بعد گودام کے اندر بم پھوٹنے کا ایک نہایت سخت دھماکا ہوا، جس سے پڑوس کے مکانات بھی ہل گئے، اور گودام کا ایک حصہ اور کھڑکیاں وغیرہ پاش پاش ہوگئیں، ذخیرہ دار جو اس وقت خوش قسمتی سے عمارت کے باہری حصہ میں تھا بال بال بچ گیا، فوراً پولیس نے موقع پر پہونچکر گودام گھر کی ہر چیز کا جائزہ لیا، اور مختلف تصویریں لیں، مگر کچھ سراغ نہ لگا، سڑک پر موٹر کے پہیے کے جو نشانات تھے، ان کی تصویر بھی لی، اس سلسلہ میں انھیں لکڑی کے اُس ڈبہ کے ٹکڑے مل گئے، جس میں بم رکھا ہوا تھا، انھوں نے تلاش کرکے تمام ٹکڑوں کو جمع کیا، ایک ٹکڑے میں انگلی رکھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی، جیسی اسکولوں کے چاک کے ڈبوں میں بنی رہتی ہے، یہ ایک معنی خیز سراغ تھا، لیکن جرم کا انکشاف جس حیرت انگیز شہادت سے ہوا، وہ ڈبہ کے ایک دوسرے ٹکڑے نے فراہم کی، خوردبین سے بغور دیکھنے پر معلوم ہوا، کہ اس ٹکڑے پر کوئی عبارت نہایت ہلکے حروف میں چھپی ہوئی نظر آتی

ایک خاص قسم کے کیمرے سے اس ٹکڑے کی تصویر لے لی گئی، تصویر میں اخبار کی ایک عبارت کا عکس اتر آیا، جو اگرچہ بہت خفیف تھا تاہم پڑھا جا سکتا تھا، واقعہ یہ تھا، کہ بم کے پھوٹنے سے ڈبے کے ٹکڑے اتنے زور سے اڑے کہ رگڑ کی سختی سے ایک ٹکڑے پر اخبار کی عبارت کا ہلکا سا نشان پڑ گیا تھا، تحقیقات سے معلوم ہوا، کہ وہ عبارت ایک ایسے اخبار کی تھی، جو بم پھوٹنے سے صرف بارہ گھنٹے پیشتر پڑوس کے ایک شہر میں شائع ہوا تھا، اس نشان سے ذخیرہ دار کے ایک مشہور و معلوم دشمن کا پتہ لگ گیا، جو اس شہر کے ایک اسکول میں ملازم تھا، پولیس کی جرح پر مجرم نے جرم کا اقرار بھی کر لیا،

چند روز ہوئے نیو یارک شہر میں ایک شخص خنجر سے ہلاک کر دیا گیا، قاتل کا نشان کہیں بھی مل نہیں رہا تھا، اس سلسلہ میں ایک مشتبہ شخص کی تصویر اس خاص قسم کے کیمرے سے جو تفتیشِ جرائم کیلئے ایجاد کیا گیا ہے، لے لی گئی، تصویر میں قمیص کے دامن پر ایک نہایت خفیف سا سرخ دھبا نظر آیا، جو بظاہر بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا، کیونکہ قمیص بہت صاف دھلی ہوئی تھی، اور اس پر کہیں کوئی داغ نہ تھا، جب اس دھبہ کے متعلق اس شخص سے سوال کیا گیا تو وہ گھبرا گیا، اور متضاد جوابات دینے لگا، لیکن بالآخر عاجز آ کر اُس نے اقرار کیا، کہ یہ دھبہ مقتول ہی کے خون کا ہے قمیص بہت احتیاط سے نہایت صاف دھودی گئی تھی، مگر تصویر میں خون کے پوشیدہ نشانات بھی ظاہر ہو گئے،

لیکن جس طرح یہ کیمرا مجرموں کو ماخوذ کرتا ہے، اسی طرح بیگناہوں کو بری بھی کرتا ہے، ایک عورت اپنے شوہر کے قتل کے الزام میں گرفتار تھی، عورت کا بیان یہ تھا، کہ مقتول شراب پیے ہوئے بدمست گھر آیا، اور پستول نکال کر اسے مار ڈالنے کی دھمکی دینے لگا، یہ اُسے روکنے کی کوشش کرتی رہی اور اس کشمکش میں اتفاقاً گھوڑا دب گیا، اور گولی چل گئی، پولیس کا دعویٰ یہ تھا، کہ شوہر سامنے سے آرہا تھا، کہ عورت نے کمرہ کے جالدار کواڑوں کے پیچھے سے پستول چلا کر اسے مار ڈالا، فیصلہ کا دار و مدار اسی بیان کے ثابت یا رد ہونے پر تھا، مقدمہ کی کارروائی اپنی انتہائی اہمیت پر اس وقت پہونچی

جب ملزمہ کے وکیل نے جیوری کے سامنے تصویروں کا ایک بنڈل پیش کیا، ہر تصویر پستول کی گولی کی تھی، ان میں سے بجز ایک کے تمام گولیوں پر آڑے ترچھے نشانات بنے ہوئے تھے، ان گولیوں کو بار بار تار کے جالدار کواڑ کے اندر سے لکڑی کے تختوں پر چلایا گیا تھا، باوجود اس کے کہ لکڑی انسانی جسم سے کہیں زیادہ سخت چیز ہے، ان گولیوں پر تار کی جالی کے نشانات باقی رہ گئے تھے، لیکن جس گولی سے وہ شخص ہلاک ہوا تھا، اسکی تصویر میں اس قسم کا کوئی نشان موجود نہ تھا، گھنٹوں کی بحث سے بھی جو بات اتنی صفائی سے ثابت نہ ہوتی، وہ ان تصویروں سے ثابت ہوگئی، کہ جس گولی سے ہلاکت واقع ہوئی وہ ہرگز جالی کے کواڑوں کے پیچھے سے چلائی نہیں گئی تھی، اسی ثبوت پر عورت بری کردی گئی،

مالدیپ کے مسلمان

جزائرِ مالدیپ برطانیہ کا مقبوضہ ہیں، اور ان کا تعلق حکومت سیلون سے ہے، لیکن اندرونی انتظام خود سلطان اور اسکی حکومت کے ہاتھ میں ہے، سلطان کی مدد کے لئے وزراء کی ایک مجلس اور تین کمیٹیاں ہیں، پہلے ان جزائر کی فرمانروائی اہل چین کو حاصل تھی، اس کے بعد تقریبًا سولہ سال تک پرتگال کا قبضہ رہا، پھر برطانیہ کا قبضہ ہوا، اور موجودہ نظام ۱۸۸۶ء کے صلحنامہ کی بناپر قائم ہے،

آبادی تقریبًا (۷۹۰۰۰) ہے، اہل جزائر کا مذہب اسلام ہے وہ ایک ایسی زبان بولتے ہیں، جو سیلون کی سنہالی زبان سے ملتی جلتی ہے، لیکن ان کے طور طریقے اور رسم و رواج سنہالیوں سے بہت زیادہ مختلف ہیں، متعدد مدرسے ہیں، جن میں بچوں کو فارسی، عربی، اور مالدیپی زبان کی تعلیم دیجاتی ہے، انہی مدرسوں میں جہازرانی کی تعلیم بھی ہوتی ہے،

اہل مالدیپ زیادہ تر ماہی گیر یا کاشتکار ہیں، مالدیپ کی مچھلی ہندوستان کے اکثر حصوں اور سیلون میں بکثرت بھیجی جاتی ہے مچھلی کے بعد تجارت میں ناریل کی رسی کا نمبر ہے، مالدیپ کے ناریل کے درخت کے ریشے جن سے رسی بنائی جاتی ہے، اپنے ہلکے رنگ اور مضبوطی کی وجہ سے صدیوں سے

مشہور ہیں، کہا جاتا ہے، کہ قدیم زمانہ میں اہل پرتگال اپنے جہازون کے لئے جو بحر ہند میں چلا کرتے تھے، زیادہ تر رسیاں انہی جزیرون سے منگاتے تھے، ان جزیروں کے لوگ اپنے نفیس ٹک کے کام اور نہایت باریک چٹائیوں کے لئے بھی مشہور ہیں، یہ لوگ چھوٹے قسم کے ناریل سے ایک طرح کی مٹھائی تیار کرتے ہیں جسکو "بوندی حلوا" کہتے ہیں، اس ناریل میں ایک خاص قسم کی خوشبو ہوتی ہے، جو مٹھائی میں بھی سرایت کرجاتی ہے جو سالانہ خراج سیلون بھیجا جاتا ہے، اس میں مذکورہ بالا چیزیں بھی خاص طور پر شامل ہیں، پہلے مالدیپ کے لوگ بنگال سے کوڑیوں کی تجارت بھی بہت کیا کرتے تھے لیکن یہ تجارت اب بہت کم ہوگئی ہے، یہ لوگ تسخیرات اور جادو اور سحر کے لئے بھی مشہور ہیں،

ڈچ ایسٹ انڈیز کے گشتی کتب خانے

ڈچ ایسٹ انڈیز کی حکومت اپنی ساٹھ ملین آبادی کے لئے عام طور پر تعلیم کا انتظام کر رہی ہے اور گذشتہ بیس برس میں دو ملین اسکول کے بچوں کی تعلیم کا انتظام کر چکی ہے، اس سلسلہ میں ایک علمی ادارہ انسٹی ٹیوٹ آف پاپولر لٹریچر بھی قائم کیا گیا ہے جسکا مقصد یہ ہے کہ مدرسہ کی باضابطہ تعلیم جب ختم ہوجائے اسوقت بھی بے ضابطہ تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا جائے، چنانچہ اس ادارہ سے تین ہفتہ وار رسالے شائع ہوتے ہیں، جو حالات حاضرہ پر جاوی، سنڈانی اور ملائی زبان میں تبصرہ کرتے ہیں اور ان تینوں زبانوں میں قصص اور بلند پایہ کتابوں کے ترجمے شائع کرتے رہتے ہیں اس ادارہ کے ذریعہ سے اسکول لائبریریوں کے علاوہ گشتی کتب خانے بھی قائم کر دیے گئے ہیں جو خاص قسم کی گاڑیوں میں دیہات دیہات گھومتے پھرتے ہیں، کتابوں کی نمائش کرتے ہیں اور عاریۃً یا بقیمت لوگوں کو کتابیں فراہم کرتے ہیں ان کتب خانوں کے ذریعہ سے اسوقت تقریباً ڈیڑھ ملین کتابیں گردش میں ہیں اس کام کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ۱۹۳۱ء میں صرف جاوا میں (۱۰۰۰) اسکول لائبریریاں تھیں اور تمام مجمع الجزائر میں (۲۶۲۳)، ۱۹۲۵ء اور ۱۹۳۱ء کے درمیان پڑھنے والوں کی تعداد جاوا میں تقریباً (۱۲۵۰۰۰) سے (۳۰۰۰۰۰) تک پہونچ گئی، اور تمام جزائر میں (۲۴۰۰۰۰) سے تقریباً (۴۰۰۰۰۰) تک،

ادبیات

ماتمِ اقبال

از یحییٰ اعظمی

کس کے غم میں وقفِ شیون ہے فضائے باغِ دہر
خون سے لبریز ہیں کیوں لالہ وگل کے ایاغ

آہ اے اقبال اے مرغِ نوا سنجِ حیات
ہوگیا محروم نغموں سے ترے مشرق کا باغ

شاعرِ اسلام سے خالی ہوئی بزمِ وجود
سینۂ ملت نہ کیوں ہو فرطِ غم سے داغ داغ

اُف کہوں کیونکر کہ تیری شمعِ ہستی بجھ گئی
بجھ گیا صد حیف بزمِ علم و عرفاں کا چراغ

تھی تجھی سے ہند میں تنویرِ حکمت ضوفشاں
اے حکیمِ دیدہ ور اے عارفِ روشن دماغ

تو نے پایا تھا ازل سے سوزِ سلمانؓ و اویسؓ
تیری بزمِ دل میں روشن تھا محبت کا چراغ

اللہ اللہ یہ جنونِ شوق کی وارفتگی
عمر بھر تو نے لگایا کوئے جاناں کا سراغ

ہر نفس تیرا تھا ملت کے لئے یکسر پیام
تیری ہستی آخری دم تک رہی وقفِ بلاغ

کون اب ہم پر کریگا فاش اسرارِ و رموز
فکر کس کا اب لگائے گا حقیقت کا سراغ

تھا جو کل عقدہ کشائے کشمکش گاہِ حیات
پاگیا اب خود کشاکش ہائے ہستی سے فراغ

الوداع اے ملتِ اسلام کے روشن دماغ
الفراق اے عالمِ توحید کے چشم و چراغ

آہ اب دنیا سے وہ اسرار کا حامل گیا
اس جہانِ آب وگل کا عارفِ کامل گیا

خاکدانِ دہر میں ملتا تجھے کیونکر قرار — خلد میں تھا مرشد رومیؒ کو تیرا انتظار

شوق میں تھیں جسکے اک مدت سے آنکھیں فرشِ راہ — آگیا خود آج وہ دیرینہ یارِ غمگسار

رومی و رازی کہیں، سینا و فارابی کہیں — خیر مقدم کو کھڑے ہیں سب قطار اندر قطار

کہہ رہا ہے بے خودی میں شاعرِ المانوی — مرحبا اے ہمدم و ہمراز جانِ بیقرار

قدسیانِ پاک میں بھی ہے یہ غوغا چارسو — آگیا ہاں آگیا وہ لامکاں کا رازدار

قدس کی خلوت سرائے راز کا وہ پردہ در — خاکیوں کی فطرتِ بیتاب کا آئینہ دار

آگیا وہ آب و گل کا ترجمانِ خود شناس — ہوشیار اے ساکنانِ عالمِ جاں ہوشیار

آہ اے اقبال اے خاور کی جانِ آرزو — چھوڑ کر مشرق ہوا تو عازمِ دار القرار

بلبلِ مشرق ہوا خاموش اے واحسرتا — کس کے نغمے دیں گے اب ملت کو پیغامِ بہار

برق بن کر دوڑتی تھی جسکی موجِ آتشیں — کیا ہوئی اب وہ نوائے خامۂ معجز نگار

آہ وہ دانائے اسرارِ پیامِ صبح و شام — آہ وہ رمز آشنائے گردشِ لیل و نہار

اب کہاں ہے وہ ادا دانِ مزاجِ کائنات — اب کہاں ہے آہ وہ فطرت شناسِ روزگار

جستجوئے راز میں کل تک تھا وقفِ پیچ و تاب — فکر تیرا آج ہے، لطفِ سکوں سے ہمکنار

تو وہاں آسودۂ خلوت سرائے قدس ہے — مشرق و مغرب یہاں ہیں تیرے غم میں سوگوار

تو وہاں سرخوش ہے موجِ کوثر و تسنیم سے — تشنہ کامانِ نگاہِ فیض ہیں یاں بیقرار

دید کے قابل ہے یہ ہنگامۂ آشوبِ غم — ہاں دمے بردار سر اکنوں ز بالینِ مزار

آج ہیں سونے پڑے حکمت کے میخانے تمام،

خوں فشاں ساقی کے غم میں ہیں خم و مینا و جام

اے حیات افروز مشرق یہ تری آرامگاہ — اب قیامت تک رہے گی آستانِ مہر و ماہ

لیجئے سوغاتیں درودوں کی قطار اندر قطار | نوریانِ عرش اتریں گے یہاں شام پگاہ
ہاں رہے گی حشر تک اب مہبطِ انوارِ قدس | عارفِ شوریدۂ اسلام کی یہ خوابگاہ
آسماں اس پر کرے گا گوہرِ انجم نثار | ہونگے ذرہ ذرہ پر اس کے تصدق مہر و ماہ
چپہ چپہ ہو گا، اربابِ نظر کی سجدہ گاہ | ذرہ ذرہ دیدۂ افلاک کا نورِ نگاہ
ہاں بنے گی مرکزِ سیارگانِ علم و فن | آفتابِ جلوہ بارِ شرق کی یہ جلوہ گاہ
تھی پرے کل سرحدِ ادراک سے منزل تری | کیا خبر ہے آج کس عالم میں تیری بارگاہ
کون جانے جلوہ فرما آج کس محفل میں ہو | "گنبدِ در بستہ" کے آگے تھی کل تک تیری راہ
اب کہاں ہے آہ وہ دیوانۂ بالغ نظر | تھی فروغ انگیزِ مہر و ماہ جس کی گردِ راہ
ہے عرب سے تا عجم غم میں ترے ماتم سرا | اے نوا پیرائے باغِ قدس ادھر بھی اک نگاہ
اب نہ وہ شورِ نوا ہے اور نہ پیغامِ حیات | کیا نہیں اب غم فزا اسلام کا حالِ تباہ
ہے سیہ پوش آج ماتم میں ترے امتِ تمام | ہر لبِ مومن پہ جوشِ غم سے ہے فریاد و آہ
اُف مقدر تھا ازل سے یہ غمِ صبر آزما | دیکھنا تھا ایک دن ملت کو یہ روزِ سیاہ

اٹھ گیا دنیا سے وہ شوریدۂ خاکِ حرم،
ہے بجا گر یثرب و بطحا ہوں وقفِ دردِ غم

مقالاتِ شبلی حصہ دوم

مولینا کے ادبی مضامین کا مجموعہ، ضخامت ۱۰۳ صفحے۔ قیمت:- ۱۲ر

"منیجر"

مکاتیبِ غالب، مرتبہ جناب امتیاز علی صاحب عرشی، ناظم کتب خانہ رامپور، تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۷ صفحے، کاغذ نفیس ٹائپ پاکیزہ، قیمت مجلد للعہ، پتہ مؤلف سے ملیگی،

مرزا غالب اور دربار رامپور کا تعلق استادی اور شاگردی کا تھا، وہ نواب یوسف علی خان والی رامپور کے استاد تھے، سنہ شاگردی کے بارہ میں مرزا غالب کے بیانات مختلف ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ۱۸۵۵ء یا ۱۸۵۷ء میں یہ تعلق قائم ہوا، اور ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر ہوا جسے نواب یوسف علی خان کے بعد ان کے جانشین نواب کلب علی خان نے بھی جاری رکھا، اور مرزا غالب کی وفات تک برابر ان کو ملتا رہا، ان کا انتقال ۱۸۶۹ء میں ہوا، اس حساب سے کم و بیش چودہ پندرہ برس تک دربار رامپور سے وابستہ رہے، اس تعلق سے نواب یوسف علی خان، نواب کلب علی خان اور بعض دوسرے اہلکاران ریاست سے مرزا کی خط و کتابت رہتی تھی، ان کے یہ خطوط ریاست کے دارالانشاء میں محفوظ ہیں، اردو زبان میں مرزا غالب کے خطوط اور ان کے انوکھے طرز تحریر کا جس کے وہ موجد بھی تھے اور خاتم بھی، ادبی پایہ محتاجِ بیان نہیں، ان کے مکاتیب کو ان کی زندگی ہی میں اتنی مقبولیت حاصل ہو گئی تھی کہ اسی زمانہ میں اس کے مجموعے شائع ہوئے، اور اس وقت تک اس کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں، خطوط تو خطوط، خطوط کے لفافوں تک پر مستقل مضامین لکھے جاتے ہیں، ایسی حالت میں دارالانشاء کے ان ادبی جواہر کو بھی منظر عام پر لانے کی ضرورت تھی، جناب امتیاز علی صاحب عرشی شکریہ

مستحق ہیں، کہ انھوں نے یہ اہم ادبی خدمت انجام دی، اوران خطوط کو ایک بسیط مقدمہ اورنفیس اور ستھری طباعت کے ساتھ نہایت اہتمام سے شائع کیا، مقدمہ میں مرزا غالب کے خطوط، اوران کی تحریروں سو انکے سوانح، تصانیف، تلامذہ، قلعۂ معلی، اور انگریزوں سو مرزا کے تعلقات کے حالات ہیں لیکن اسی تخصیص اور اہتمام کے ساتھ مرزا غالب کے حالات لکھے جاچکے ہیں، اس لئے ان حالات میں دربار رامپور سے ان کے تعلق کی تفصیلات کے علاوہ اور کوئی خاص اضافہ نہیں ہے، ذاتی حالات کے بعد مرزا کی انشار اور خطوط پر تبصرہ اور اس کے جملہ لوازم و متعلقات کے نہایت تفصیلی اور جزوی حالات اور مکاتیب غالب کے مجموعوں اور ان کی اشاعت کی تاریخ ہے، یہ حصہ اس کتاب کے مقدمہ کا امتیازی پہلو ہے کہ اس پہلو پر اس استقصار کے ساتھ کسی نے نہیں لکھا ہے، اس کے بعد خطوط ہیں، ان کی مجموعی تعداد ۱۰۷ ہے، ان میں سے ۹۴ نواب یوسف علی خان کے نام ۵، ۶ نواب کلب علی خاں کے نام ۲ صاحبزادہ نواب زین العابدین خان کے نام، منشی سیلچند کے نام اور ایک ایک خلیفہ احمد علی صاحب رامپوری، اور مولوی محمد حسن خان مالک مطبع حسنی کے نام ہیں، ان میں سے چند فارسی میں ہیں، باقی کل اردو میں، یہ خطوط زیادہ تر ذاتی اور خانگی حالات کے متعلق ہیں، ان میں خاص چیز مرزا غالب کی ایک غزل اور کچھ قطعات تاریخ ایسے ہیں، جو ان کے مطبوعہ دواوین میں نہیں ہیں، جو مختلف سلسلوں میں نواب یوسف علی خان اور کلب علی خان کے ملاحظہ کے لئے بھیجے گئے تھے مؤلف نے اپنے پیشرو مرزا غالب کے سوانح نگاروں کے بعض بیانوں سے ایک دو مقاموں پر اختلاف اور ان کے بعض مسامحات کی تصحیح کی ہے، لیکن ایسے واقعات میں جن کے متعلق کوئی صریح شہادت موجود نہیں ہے، دونوں کے بیانات محض قیاسی ہیں، اسیر لکھنوی سے نواب یوسف علی خان کے تلمذ کے بارہ میں امیر مینائی کے بیان کی تردید نہایت ناکافی ہے، ان مکاتیب میں ایک چیز جس پر ہر پڑھنے والی نظر پڑتی ہے وہ مرزا کی پریشان حالی اور افلاس و ناداری کا شکوہ ہے، چونکہ یہ خطوط ان کے آقا ے ولی نعمت کے نام ہیں، اس لئے ان میں یہ شے زیادہ نمایاں ہے، بعض خطوط میں تو اپنی تنگدستی اور تبہ حالی کا رونا اس طرح

روئے ہیں، کہ اس کی سرحد دریوزہ گری سے ملجاتی ہے، جو ایک ترکمان بچہ کے بانکپن سے بہت فروتر ہے، لیکن یہ ان کے آخری دور کے آلام و مصائب، مالی پریشانیوں، ضعفِ قویٰ اور اس کے دماغی اثرات کا لازمی نتیجہ ہے، ورنہ ان کی فطرت کی بلندی تو یہ تھی،

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا،

اور ایک زمانہ دراز تک وہ اس وضعداری پر قائم رہے، جس پر ان کی زندگی کے متعدد واقعات شاہد ہیں، ہم نے اس کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا، کہ اس زمانہ کے بعض مصنفین نے غیر اختیاری حوادث کے نتائج اور اس کے شکوہ کو بھی قابلِ ملامت سمجھا ہے، بہرحال مکاتیبِ غالب کا یہ مجموعہ اردو ادب میں ایک بیش قیمت اضافہ اور اس کے رتبہ کے مطابق اس کی ظاہری نفاست بھی لائقِ تعریف ہے، کتاب کی زینت کے لئے نواب یوسف علی خان، نواب کلب علی خاں اور مرزا غالب کے قلمی مرقعوں کے فوٹو بھی دیئے گئے ہیں، اور مرزا کے ایک دستی خط کا عکس بھی شامل ہے،

هادي المسترشدين الى اتصال المسندين (عربی) مؤلفہ مولینا ابوسعید محمد عبدالہادی صاحب واعظ سرکار عالی تقطیع بڑی، ضخامت ۰۰ ۷ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت اور پتہ مرقوم نہیں،

حدیث نبوی صلعم سے متفرع علوم میں ایک اہم علم "علم الاسناد" ہے، اگرچہ اس کا آغاز روایت حدیث کے سلسلہ سے ہوا، لیکن پھر تمام علوم پر حاوی ہو گیا، اور جملہ علوم کی تحصیل میں شیوخ اور اسناد معیار قرار پائے، لیکن مسلمانوں کے پرانے علوم کے انحطاط کے ساتھ اس فن کا بھی مذاق جاتا رہا، اور آج علماء میں بھی محدثین کے علاوہ اس کے کم قدرداں ملیں گے، ایسے زمانہ میں مولینا عبدالہادی صاحب کا اس موضوع پر ایک ضخیم کتاب تالیف کر دینا لائقِ تحسین ہے، یہ کتاب چار حصوں پر تقسیم ہے، پہلے حصہ میں مولینا عبدالہادی صاحب نے اپنے ہندوستان اور بیرون ہند کے بعض شیوخ

کے مختصر حالات مع اسناد لکھے ہیں، اور بعضوں کے اجازت ناموں کو بھی نقل کیا ہے، دوسرے حصہ میں، تفسیر، حدیث، فقہ، عقائد، کلام تصوف اور مختلف علوم و فنون کی ممتاز کتابوں کے اپنے سلسلہ کو ان کے مصنفین تک نقل کیا ہے، اور ان کتابوں کی مختصر خصوصیات، ان کے مصنفین کے مختصر حالات اور ان کی دوسری تصانیف بھی لکھدی ہیں، اس طریقہ سے بہت سے ائمۂ اسلام کے مختصر حالات جمع ہو گئے ہیں، تیسرے حصہ میں ستر مرفوع احادیث و آثار کو مع ان کے مختلف طرق روایت کے اپنے سے لیکر رسول اللہ صلعم تک پہونچایا ہے، اور ان احادیث سے مستنبط مسائل اور بعض ضروری فوائد کو بھی لکھدیا ہے، ان احادیث میں یہ امر لائق ذکر ہے، کہ ان کے مضامین کی عملی شکل رسول اللہ صلعم سے لیکر مؤلف تک یکساں ظہور میں آتی چلی آئی ہے، مثلاً تبسم، مصافحہ، اور ضیافت کی احادیث میں رسول اللہ صلعم سے لیکر مؤلف کے شیخ تک تمام شیوخ نے تلامذہ سے ان احادیث کی روایت کیا تھا تبسم مصافحہ، اور ضیافت بھی کی، کتاب کے آخر میں مؤلف کے تصوف کے سلاسل ہیں، اس زمانہ میں اگرچہ کتاب کے قدر دان کم نکلیں گے، لیکن ارباب علم میں مؤلف کی یہ محنت قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائیگی،

نجات الارب، از مولوی نظر احمد صاحب سہسوانی تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۲ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط، قیمت مرقوم نہیں، پتہ سید عبد القیوم صاحب آزاد سہسوان، قاضی محلہ ضلع بدایوں،

مولینا ضیاء الحسن صاحب علوی ایم اے، رجسٹرار امتحانات، عربی، و فارسی الہ آباد بورڈ نے "زنات الطرب" کے نام سے نامور شعرائے عرب کے اٹھارہ منتخب قصیدوں کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جو غالباً کسی عربی کے امتحان میں داخل ہے، مولوی نظر احمد صاحب سہسوانی نے طلبہ کی آسانی کے لئے "نجات الارب" کے نام سے اردو میں اسکی شرح لکھی ہے، ہر قصیدہ کے آغاز میں صاحب قصیدہ شاعر کے مختصر حالات اور اس قصیدہ کی بحر کا ذکر ہے، اشعار کی شرح میں پہلے ہر شعر کے مشکل لغات کا عربی میں

حل ہے، اس کے بعد اردو میں تشریحی ترجمہ ہے، ہم نے جابجا سے اسکو دیکھا ہے، صحیح و صاف اور امتحان دینے والے طلبہ کے لئے مفید پایا،

الہامی کلمات، از جناب مولوی جعفر مہدی صاحب نعمانی رزم، ردولوی، تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت معمولی قیمت ۳ر پتہ:۔ مصنف ردولی ضلع بارہ بنکی سے ملے گی،

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف منسوب کلمات طیبات اور مختصر حکیمانہ مقولے پند و موعظت اور حکمت و دانائی کا دفتر ہیں، جناب رزم نے غالبًا عبد الواحد آمدی کی غرر الحکم و درر الکلم سے ان موتیوں کو چنکر ایک سلک مروارید آراستہ کردی ہے، اس مجموعہ میں حضرت علیؓ کے پانسو سرسٹھ حکیمانہ اقوال مع ترجمہ ہیں، آپکے مقولے ارباب محبت کے اوراد ہیں لیکن آپ کے دیوان اور خطبات کی طرح یہ امر تحقیق طلب ہے کہ آیا یہ تمام مقولے آپ ہی کے ہیں یا آپ کی جانب منسوب ہیں، بہرحال حکمت مومن کا گم گشتہ مال ہے جہاں ملے، اسے حاصل کرنا چاہئے، پھر ارباب محبت کے لئے تو انتساب کافی ہے، اس راہ میں تحقیق کا کیا سوال،

مشیت ایزدی اور قرآنی تعلیمات، از جناب محمد یوسف خانصاحب چشتی بریلوی پرنسپل اشاعت اسلام کالج لاہور، تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۰ صفحے کاغذ کتابت طباعت معمولی قیمت ۵ر، پتہ، پیکو آرٹ پریس موچی دروازہ لاہور،

مشیت ایزدی کا مسئلہ اسلام کے پیچیدہ مسائل میں سے ہے، اس مختصر رسالہ میں مولف نے مشیت اور اس سے متفرع مسائل جبر و اختیار، خیر و شر، نیکی و بدی، اعمال، جزا و سزا، کا فلسفہ، نظام کائنات، اسکی ترتیب، خدائی مصالح، علل و اسباب، خواص اشیاء، وجود باری، توحید باری، اسلام، فلاسفہ، اور دوسرے مذاہب کے خدا کے صفات میں فرق اور اس قسم کے مسائل اور سوالات کو جو عمومًا دل میں بطور وسوسہ پیدا ہوتے ہیں، آسان طریقہ سے سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے، ان مسائل پر نہایت عالمانہ اور تفصیلی مباحث و مضامین موجود ہیں، یہ رسالہ غالبًا عوام کیلئے لکھا گیا ہے، اور انکے لئے مفید ہے،

"م"

سیر الصحابہؓ

سیرۃ النبی کے بعد مسلمانون کیلئے جن مقدس ہستیون کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ہوسکتے ہیں، وہ حضرات صحابہ کرامؓ ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان کام کو انجام دیا، اور اردو میں صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدین احادیث و سیر کے ہزارون صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کین، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ہدایت و رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفون کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی مین چلین، جو آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدون کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، جن کا مجموعہ ۴۳ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف ۴۰ میں یہ دس جلدیں کامل نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدینؓ	سے/	جلد ششم	سیر الصحابہؓ ششم	عہ/
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	ہے/	جلد ہفتم	سیر الصحابہؓ ہفتم	عہ/
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	سے/	جلد ہشتم	سیر الصحابیاتؓ	عہ/
جلد چہارم	سیر الانصارؓ اول	سے/	جلد نہم	اسوۂ صحابہؓ اول	عہ/
جلد پنجم	سیر الانصارؓ دوم	عہ/	جلد دہم	اسوۂ صحابہؓ دوم	ہے/

منیجر
دار المصنفین اعظم گڑھ

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں، اُنکا لب و لہجہ دلآزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہوجاتا ہے، مولٰنا ابوظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لیے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہوجائیں،

ضخامت ۵۰۰ صفحے، قیمت :۔ عہ

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اسکی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، اس میں تمام بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں اور مدرسوں اور مکتبوں کے کارکن اور معلم اسکو نصاب تعلیم میں داخل کرینگے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :۔ عہ

مقالات شبلی، جلد ششم،

(تاریخی)

یہ حصہ مولانا شبلیؒ مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن و تہذیب علم و فن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں، ضخامت ۲۴۰ صفحے،

قیمت :۔ عہ

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ
(مطبع معارف میں محمد اویس وارثی نے چھاپکر شائع کیا)

رجسٹرڈ نمبر اے ۸۱

جون ۱۹۳۸ء

معارف

مجلس دار المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

قیمت: پانچ روپیہ (۵) سالانہ

دفتر دار المصنفین اعظم گڈھ

سیرۃ النبی

رسول اللہ صلعم کے حالات و غزوات، اخلاق و عادات اور تعلیم و ارشاد کا یہ عظیم الشان کتابی ذخیرہ جسکا نام سیرۃ النبی تمام عالم میں مشہور ہے، مسلمانوں کے موجودہ ضروریات کو سامنے رکھکر نہایت اہتمام کیساتھ مرتب کیا ہے،

ابتک اس کتاب کے پانچ حصے شائع ہو چکے ہیں، پہلے میں ولادت سے لیکر فتح مکہ تک کے حالات اور غزوات ہیں، اور ابتدا میں ایک نہایت مفصل مقدمہ لکھا گیا ہے جسمیں فن سیرت کی تنقید و تاریخ ہے، دوسرے حصے میں تکمیل دین، تاسیس حکومت الٰہی، وفات، اخلاق و عادات، اعمال و عبادات اور اہلبیت کرام کے سوانح کا مفصل بیان ہے، تیسرے حصہ میں آپکے معجزات و خصائص نبوت پر بحث ہے، اسمیں سب سے پہلے عقلی حیثیت سے معجزات پر متعلق متعدد اصولی بحثیں کیگئی ہیں، پھر ان معجزات کی تفصیل ہے جو بروایات صحیحہ ثابت ہیں، اسکے بعد ان معجزات کے غلط روایات کی تنقید و تفصیل کی گئی ہے، چوتھے حصہ میں ان اسلامی عقائد کی تشریح ہے جو آپکے ذریعہ مسلمانوں کو تعلیم کئے گئے ہیں، کوشش کی گئی ہے کہ اس میں قرآن پاک اور احادیث صحیحہ سے اسلام کے عقائد لکھے جائیں، پانچویں حصہ میں عبادت کی حقیقت، عبادت کی تفصیل و تشریح اور ان کے مصالح و حکم کا بیان ہے، اور دوسرے مذاہب کے عبادات سے ان کا مقابلہ و موازنہ ہے،

چھٹا حصہ جو اخلاق پر مشتمل ہے، اس وقت زیر طبع ہے،

قیمت باختلاف کاغذ حصہ اوّل تقطیع خورد [illegible]، حصہ دوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ سوم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ چہارم تقطیع کلاں [illegible] تقطیع خورد [illegible]، حصہ پنجم تقطیع کلاں [illegible]

(منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ)

جلد ۴۱ ماہ ربیع الثانی ۱۳۵۷ھ مطابق ماہ جون ۱۹۳۸ء عدد ۶

مضامین

میں دو مہینون سے دفتر سے دور ہون، اس مہینہ کے شذرات کے صفحے لکھ کر ۹ جون کو دفتر بھیجے گئے تھے، مگر افسوس ہے کہ وہ ڈاک مین ضائع گئے، جس کی اطلاع ۱۸ کی شام کو مجھے ہوئی، اب ۱۹ کی پچھلی رات کو یہ صفحے لکھ کر دوبارہ بھیجے جا رہے ہیں، اس اتفاقی بلکہ جبری تاخیر کی معافی چاہتا ہون،

خوشی کی بات ہے کہ مسلمانون کو ابتدائی تعلیم کی اہمیت کا احساس ہو رہا ہے، مختلف صوبون مین اس کے لئے جد وجہد کا آغاز ہو رہا ہے، صوبہ بہار میں جہاں آجکل میرا قیام ہے، بعض نوجوان اس کے لئے کچھ محنت بھی اٹھا رہے ہیں، لیکن ضرورت اس کی ہے کہ کسی ایک خاص نظام اور کسی ایک خاص نصاب اور طریقۂ تعلیم کی یکسانی کے ساتھ اس کام کو چلایا جائے،

صوبہ بہار کے وزیر تعلیم آنریبل ڈاکٹر محمود صاحب نے اپنے صوبہ میں اردو اور ہندی کی ابتدائی تعلیم پھیلانے اور ہندوستانی زبان کو باقاعدہ تعلیمی زبان بنانے کی جو کوششیں کی ہیں، وہ بہت کچھ قدر کے لائق ہیں، نوجوان طالب علم جہالت کے خلاف جہاد کرنے میں مصروف ہیں، ہندی اور اردو دونون کی چند ہفتون میں تعلیم کے نقشے بن گئے ہیں، جن کے ذریعہ سے تعلیم دی جا رہی ہے، ہندوستانی زبان کے لئے لغت اور قواعد کی کتابوں کے بنانے کا کام انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی اکاڈیمی کے سکریٹریوں کے سپرد ہوا ہے، اور معلوم ہوا کہ یہ دونوں صاحب اس کام کو انجام دے رہے ہیں،

مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن نے جو اب تک صرف عربی کتابوں کو چھاپتی تھی اپنی ترقی کا دوسرا قدم بڑھایا ہے، اس نے ایک عربی اور اسلامی علوم و فنون کی اکاڈیمی کی شکل اختیار کی ہے، اور اس غرض سے ۹-۱۰-۱۱ جولائی ۱۹۳۸ء کو حیدرآباد میں وہ اپنا ایک سالانہ اجلاس کر رہی ہے، جس میں ملک کے ممتاز علماء اور محققین علوم اسلامیہ اپنے اپنے تحقیقی مقالے پیش کرینگے، خدا کرے کہ اس کی ترقی کا یہ نیا قدم مسعود و مبارک ہو،

لاہور کا ادارۂ معارف اسلامیہ جو ہر دوسرے سال اپنا اجلاس کرتا ہے، امسال دہلی میں دسمبر میں اپنا اجلاس کرے گا، امید ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے اہل علم اس میں شرکت کرینگے، ادارہ کے متعلق کئی سال سے کوششیں ہو رہی تھیں کہ وہ لاہور کے علاوہ وقتاً فوقتاً اپنے قدم سے دوسرے شہروں کی بھی رونق بڑھائے، ادارہ کا یہ موجودہ فیصلہ تعریف کا مستحق ہے، اور جب وہ دہلی تک قدم رنجہ فرما چکا ہے تو پھر آیندہ اس کو لکھنؤ اور پھر اعظم گڈھ تک آنے میں کیا زحمت ہو سکتی ہے،

یورپ کی اورینٹل کانفرنس کا آیندہ اجلاس ۵ - ۱۰ ستمبر ۱۹۳۸ء کو بلجیم میں ہو رہا ہے، حسب معمول اس دفعہ بھی اس کے نو شعبے ہونگے، اسلامیات، یہودیات، عیسائی مشرق، مصریات، اشوریات، وسط ایشیا، مشرق بعید مع جاوا، ہندیات اور سامی قومیں اور زبانیں، شعبۂ اسلامیات کے صدر ڈاکٹر ونک مقرر ہوئے ہیں،

یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ جامعۂ مصریہ کی انجمن تالیف و اشاعت (لجنۃ التالیف والترجمۃ والنشر) نے ہمارے ہندی حیدرآبادی دوست ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے خواہش کی ہو کہ وہ عربی میں مسلمانوں کی ابتدائی سیاست خارجہ پر ایک کتاب لکھیں، موصوف نے یہ خواہش منظور کر لی ہے، اور امید ہو کہ سال کے ختم تک اُن کا یہ کام انجام کو پہنچے، یہ کتاب ان کی شائع شدہ فرانسیسی کتاب سے الگ ہوگی،

جاپان میں اسلام کا آفتاب اپنی کرنیں پھیلا رہا ہے، جاپان کے شہر کوبے میں ہندوستانی تاجروں کی کوشش سے ایک مسجد تیار ہو چکی ہے، کوبے کی مسجد کے ارکان یہ کوشش کر رہے تھے کہ جاپان کی حکومت مسجد کو مسلمانوں کی عبادت گاہ تسلیم کرلے، مگر اب تک کامیابی نہیں ہوئی تھی، امسال ارکانِ مسجد نے وفد کی صورت میں پایہ تخت میں آکر سلسلہ جنبانی کی اور مزید کوشش کے لئے راستہ صاف کر دیا،

پروفیسر برلاس دہلوی نے جو اس وفد میں شریک تھے، اس وفد کا مختصر حال لکھ کر آیندہ مفصل لکھنے کا وعدہ کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ "کوبے میں مسجد بن جانے کے بعد ٹوکیو میں مسجد کی ضرورت زیادہ محسوس ہونے لگی، مگر ٹوکیو میں نہ مسلمانوں کی اتنی تعداد ہے اور نہ ان کے پاس اتنا سرمایہ ہے کہ وہ تنہا مسجد بنا سکیں، چند ہمدرد جاپانی مدبرین کو اس کا احساس ہوا تو انھوں نے بعض مخیر جاپانی حضرات سے روپیہ جمع کر کے سوا لاکھ این کی لاگت سے ایک مسجد اور اسی سے ملحق ایک مدرسہ تعمیر کرانا شروع کیا، اب دونوں مکمل ہو چکے ہیں، اور مئی میں ان کا باقاعدہ افتتاح ہوا، افتتاح کی رسم مسٹر ٹویامہ ایک جاپانی مدبر نے ادا کی، اور فیتہ کاٹ کر مسجد میں پہلا قدم انہی نے رکھا، اُنکے ساتھ تاتاری اور دوسرے مسلمان تکبیر کہتے ہوئے مسجد میں داخل ہوئے اور نفل نماز شکرانہ ادا کی، باہر شامیانہ میں جلسہ ہوا جس میں جاپانی معززین اور نمایندوں میں سے بڑے بڑے لوگوں نے تقریریں کیں، مسلمانوں کو اس بات پر تعجب ہوا کہ اس اسلامی تقریب میں ٹرکی، ایران اور افغانستان کے نمایندے شریک نہیں ہوئے، شاید اسکی وجہ مسجد کی سیاسی حیثیت ہو گی"۔

ٹوکیو میں قربان علی ایک تاتاری لیڈر ہیں جو نیم مذہبی اور نیم سیاسی حیثیت رکھتے ہیں، ان کے حامیوں میں بیس تیس تاتاری ہیں، باقی چار پانچ سو تاتاری جو ٹوکیو اور جاپان کے دوسرے شہروں میں رہتے ہیں، ان سے سخت نالاں تھے، مئی کے وسط میں وہ گرفتار ہو گئے، اور ان کی جگہ عبد الرشید ابراہیم تاتاری کو دیدی گئی، اب ٹوکیو کی مسجد سے تاتاریوں نے جو ترک موالات کر رکھا تھا وہ دور ہو رہا ہے، کوبے کے ہندوستانی مسلمانوں کو بھی اس مسجد میں شریک ہونے کی خواہش کی گئی تھی انھوں نے یہ جواب دیا ہے کہ مسجد اگر کلیۃً مسلمانوں کے ہاتھوں میں رہی تو وہ شرکت کر سکتے ہیں، مدبرین جاپان نے اسکا وعدہ کر لیا ہے اب زمانہ اسکے ایفا کا انتظار کریگا،

مقالات

اسلامی نظامِ تعلیم

از مولینا ریاست علی ندوی

اس علمی سفر سے طالب علموں کو بڑا فائدہ یہ پہونچتا تھا، جیسا کہ ابن خلدون نے یہ تشریح لکھا ہے کہ تھوڑے زمانہ میں مختلف ملکوں کی سیاحت اور مختلف ملکوں اور شہروں کے علما کی زیارت سے انہیں علمی بصیرت پیدا ہوجاتی تھی، وہ لکھتا ہے:-

"علم کی تحصیل کے لئے سفر کرنے اور مشائخ سے ملنے میں تعلیم میں کمال کا اضافہ ہوتا ہے کیونکہ انسان علم، اخلاق، مذہب اور دوسری فضیلتوں کو کبھی تو تعلیم و تعلم کے ذریعہ سے حاصل کرتا ہے، اور کبھی نقل، تقلید، اور میل جول سے، لیکن جو ملکہ میل جول سے حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ قوی اور مستحکم ہوتا ہے، طالب علم پر تعلیمی اصطلاحیں بھی مشتبہ ہوجاتی ہیں، یہانتک کہ بعض طالب علم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ علم کا جزو ہیں، یہ شبہہ علما کے میل جول کے بغیر زائل نہیں ہوسکتا، کیونکہ اساتذہ کے تعلیمی طریقے مختلف ہوتے ہیں، اس لئے متعدد مشائخ سے ملنے سے وہ ان مختلف طریقوں کو نفس علم سے الگ کریگا، اور سمجھنے لگے گا کہ یہ صرف تعلیمی طریقے ہیں، خود علم ان سے علحدہ چیز ہے یہ اس کیلئے ہے جس کیلئے اللہ علم اور ہدایت کے راستے آسان بنادے، اسلئے علم کی طلب میں فائدہ حاصل کرنے، مشائخ اور عام لوگوں سے مل جل کر کمال پیدا کرنے کیلئے سفر کرنا ضروری ہے[1]"

اس کے علاوہ علمی اور تعلیمی سفروں سے طالب علموں کو دوسرا فائدہ یہ پہونچتا تھا کہ وہ گھربار سے علحدہ ہوکر پورے سکون اور اطمینان سے علم کی تحصیل میں مصروف رہتے تھے، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طالب علموں

[1] مقدمہ ابن خلدون ص ۹۲۰،

کو اسی لحاظ سے سفر کرنے کا مشورہ دیا ہے، وہ لکھتے ہیں :۔

"اور اسی لئے سلف علم کی طلب میں وطن سے بے وطن ہونا، خاندان، عزیز، اقارب، اور گھر بار کو چھوڑنا پسند کرتے تھے، اگر گھر بار کی فکر پڑھنے کے زمانہ میں طالب علم کے دل و دماغ پر چھائی رہی، تو اس کا دل علمی حقائق پر متوجہ نہ ہو سکے گا، کیونکہ اللہ نے کسی کے سینہ میں دو دل نہیں بنائے ہیں[۱]"

دنیاوی تعلقات سے کنارہ کشی، پھر طالب علم کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا و مافیہا ہر چیز سے بے تعلق ہو جائے، تاکہ اسکو دماغی سکون اور ذہنی یکسوئی حاصل ہو، مثل مشہور ہے کہ

العلم لا یعطیك بعضه حتی تعطیه كله، علم تمہیں اپنا بعض حصہ بھی نہ دیگا جب تک تم اسے اپنا سب کچھ نہ دیدو،

خطیب نے کسی دوسرے بزرگ کا یہ قول نقل کیا ہے،

اس علم کو وہی شخص پا سکتا ہے، جو اپنی دوکان بٹھا دے، اپنا باغ خراب کر دے، اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ دے، اور اگر اس کا کوئی عزیز قریب بھی مرے، تو اس کے جنازے میں نہ جائے"

حضرت مخدوم الملک شرف الدین احمد یحییٰ منیری کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ جب وہ علم کی تحصیل کے لئے دلی تشریف لے گئے، تو والدین اور عزیز و اقارب کے جو خطوط آتے، انھیں اس خیال سے نہ پڑھتے، کہ شاید کوئی بُری خبر درج ہو، اور طبیعت علم کی تحصیل کی طرف سے اچاٹ ہو جائے۔

امام شافعی فرماتے ہیں :۔

"اگر مجھے ایک پیاز بھی خریدنے کی زحمت اٹھانی پڑتی تو میری سمجھ میں کوئی علمی مسئلہ نہ آتا"

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۷۰،۷۱، [۲] نزہۃ الخواطر ص ۹،

بعض شیوخ اپنے شاگردوں کے کپڑے صرف اسلئے رنگوادیتے تھے، کہ ان کے بار بار دھونے کی فکر جاتی رہے، جس کی وجہ سے علمی مصروفیت میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے،

اصل مدعا یہ ہو کہ طالب علم کے لئے پوری طرح دلی اطمینان اور ذہنی یکسوئی حاصل رہے، تاکہ اسکی تعلیمی مصروفیتوں میں خلل نہ پڑے[1]

تجرد اس ذہنی یکسوئی اور دلی سکون کے لئے طالب علموں کو شادی نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خطیب بغدادی کہتے ہیں:۔

"طالب علم کے لئے بہتر ہے، کہ وہ کنوارا رہے، تاکہ زوجیت کے حقوق اور معیشت کی طلب کی مشغولیتیں، اوسے کمال کی طلب سے محروم نہ کردیں"۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں:۔

"جس نے شادی کرلی، وہ سمندر میں کشتی پر سوار ہوگیا، اور اگر کوئی بچہ پیدا ہوگیا، تو اس کشتی میں سوراخ بھی ہوگیا"[2]

اس کے بعد قاضی ابن جماعہ لکھتے ہیں:۔

"جو شخص شادی کرنے پر مجبور نہ ہو، اس کا شادی نہ کرنا بہتر ہے، خصوصاً طالب علم کیلئے جس کی ساری پونجی، دل کے اطمینان اور بے فکری کی زندگی میں رکھی ہے"[3]

فقر و فاقہ اور صبر و قناعت طالب علموں کے لئے قناعت پسندی ان کا بہترین جوہر تصور کیا جاتی تھی، انھیں معمولی غذا، اور سادہ اور مختصر لباس میں بسر کرنے، اور اگر فقر و فاقہ کی نوبت آئے تو صبر و استقلال سے اسے برداشت کرنے کی تلقین کیجاتی تھی،

امام شافعی فرماتے ہیں:۔

---

[1] احیاء العلوم جلد ۱ ص ۴۲، و تذکرۃ السامع ص ۷۰، ۷۱، و تعلیم المتعلم ص ۵۰، [2] تذکرۃ السامع ص ۷۲،

"کوئی شخص اس علم کو ملک و دولت، عزت اور خودداری قائم رکھکر حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ جو شخص اپنی خودی مٹا کر اور تنگ حالی میں گذار کر علماء کی خدمت کی سعادت حاصل کریگا وہ کامیاب ہوگا، بلکہ یوں سمجھو علم کی طلب صرف نادار اور مفلس ہی کے لئے ساز گار ہو سکتی ہے"

امام مالک فرماتے ہیں:-

"کوئی شخص علم و دانش کے مرتبہ پر اس وقت تک نہیں پہونچ سکتا، جب تک اس پر فقر اور فاقہ کی مار نہ پڑے، اور اسے وہ ہر چیز پر ترجیح نہ دے لے،

ایک دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:-

"یہ امر (علم) اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا، جب تک فقر و فاقہ کا مزانہ چکھ لیا جائے"[۱]

چنانچہ ائمۂ اسلام کے سوانح میں بہت سے ایسے واقعات ہیں کہ انھوں نے تکلیف اور تنگدستی میں بسر کیا، اور صبر اور استقلال سے اپنی تعلیم جاری رکھی، ابن القاسم، حضرت ربیعہ بن سلمان کے متعلق بیان کرتے ہیں، کہ

"ربیعہ علم کی طلب میں ناداری کی اس حد تک پہونچ گئے تھے، کہ انھوں نے اپنے مکان کی چھت کی لکڑی فروخت کر ڈالی، اور یہانتک کہ وہ آبادی کے گھوروں پر سے منقیٰ اور کھجور کا فشردہ اٹھا کر کھاتے تھے"[۲]

حافظ ابو محمد حجاج کی تحصیل علم کے زمانہ کا یہ واقعہ مشہور ہے، کہ جب وہ حافظ شبابہ کے یہاں درس حدیث کیلئے گئے تو ان کی ماں نے انھیں سو کلچے پکا کر تھیلی میں دیدیئے، وہ روزانہ ایک کلچہ نکالتے اور دجلہ کے پانی میں بھگو کر سد رمق کرتے، جب کلچے ختم ہو گئے، تو انھیں بھی استاد کا در چھوڑنا پڑا،[۳] حضرت بقی بن مخلد نے چقندر کے پتے کھا کر طالب علمی کا زمانہ کاٹا،[۴]

---

[۱] تذکرۃ السامع ص ۷۱، ۷۲، مختصر جامع بیان العلم ص ۴۹، ۵۰ و تذکرۃ السامع [۲] مختصر جامع بیان العلم ص ۴۸،
[۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۳، [۴] ص ۲۰۴،

حضرت ابو حاتم رازی نے طالب علمی کے زمانہ میں ایک مرتبہ کپڑے بیچ کر گذارا کیا، اور جب کپڑے بھی نہ رہے، تو دو دن فاقے کے گذر گئے[۱]،

ابو نصر فارابی کو طالب علمی کے زمانہ میں چراغ کا تیل میسر نہ تھا، چوکیداروں کے چراغ کے پاس بیٹھ کر پڑھتا تھا[۲]، اور ابو العلا ہمدانی مسجد کے چراغ کی روشنی میں پڑھتے تھے[۳]،

مدرسہ نظامیہ بغداد کے علامہ وخشی کا تذکرہ اوپر گذر چکا ہے، وہ اپنی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ بیان کرتے ہیں، :-

"میں عسقلان میں تھا، اور ابن مصحح وغیرہ سے حدیث سنتا تھا، میرے اخراجات میں تنگی ہوگئی، اور چند دن فاقے سے گذر گئے، انہی دنوں میں کچھ لکھنے بیٹھا، مگر بھوک کے غلبہ کی وجہ سے لکھ نہ سکا، تو ایک نان بائی کی دوکان کی طرف چلا گیا، اور اس کے قریب بیٹھا تاکہ روٹی کی خوشبو سونگھ کر کچھ تقویت حاصل کروں، اس کے بعد اللہ نے مجھ پر اپنی روزی کا دروازہ کھول دیا[۴]"

امام شعبی سے پوچھا گیا کہ انھیں علم کیونکر حاصل ہوا، تو فرمایا، :-

"اپنے اوپر اعتماد نہ کرنے، علم کے لئے سفر کرنے، گدہوں کی طرح صبر کرنے، اور کوے کی طرح صبح تڑکے اٹھنے سے[۵]"-

کم خوری طالب علموں کو کھانا کم کھانے کی ہدایت کی جاتی تھی، کیونکہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے، اور مطالعہ دیکھنے اور سبق یاد کرنے میں آسانی ہوتی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ

"میں نے سولہ برس تک پیٹ بھر کر کھانا نہیں کھایا"،

حضرت حسن سے مروی ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا،

---

[۱] تذکرۃ الحفاظ جلد ۲ ص ۱۰۲، [۲] عیون الانبیاء جلد ۲ ص ۱۳۴ [۳] تذکرۃ الحفاظ جلد ۴ ص ۱۲ [۴] ر جلد ۴ ص ۳۴۵ [۵] ر جلد ۱ ص ۱،

"غور و فکر نصف عبادت ہے، اور کم خوری عین عبادت"

حضرت سہل تستری مبالغہ کے ساتھ کہتے ہیں،

"میں قیامت کے دن کھانا چھوڑنے سے بہتر نیکی کا کوئی دوسرا کام نہیں جانتا"

پھر فرمایا:-

"علم اور حکمت گرسنگی میں رکھے گئے ہیں، اور جہل اور معصیت پرخوری میں"

نضر بن شمیل کہتے ہیں:-

"کوئی شخص علم سے اسوقت تک لذت نہیں پا سکتا، جب تک وہ بھوکا نہ ہو، اور علم کی محویت میں وہ بھوک کو بھول نہ جائے"

رزق حلال اور نوعیتِ غذا کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے میں طلبہ کو یہ خیال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، کہ جو چیزیں انھیں حاصل ہوں، وہ حلال کی کمائی کی ہوں، اسی طرح ایسی چیزوں کے کھانے سے پرہیز کریں، جو کند ذہنی پیدا کرتی ہیں، اور ایسی غذائیں کھائیں، جو ان کے دل و دماغ کو قوت بخشیں،

کم خوابی طالب علموں کو کم سونے کا مشورہ بھی دیا جاتا تھا، اگرچہ سونے کے لئے ۲۴ گھنٹوں میں سے ۸ گھنٹوں کی اجازت تھی لیکن عملی طور پر اہل علم و طالب علم بہت کم سوتے تھے، اور رات کا بڑا حصہ تعلیم اور مطالعہ میں صرف کرتے تھے، بلکہ کبھی رات کی رات گذار دیتے تھے، زرنوجی کا بیان ہے، کہ

"امام حسن بن زیاد نے ۸۰ سال کی عمر پائی، جس میں چالیس سال ایسے گذار دیئے، کہ انکی پیٹھ بستر سے نہیں لگی"

امام محمد بن حسن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے، کہ وہ رات رات بھر جاگتے تھے، اور پیالہ میں پانی

بھر کر رکھتے تھے، جب نیند آتی، تو منہ پر پانی کی چھینٹیں مار لیتے تھے، وہ راتوں کو جاگ کر مسائل حل کر لیتے اور فرماتے "یہ لذتیں شاہزادوں کو کہاں نصیب ہیں" اور ان کے شاگرد قاضی اسد بن فرات نے بھی بیان کیا ہے، کہ امام محمد نیند سے ہشیار کرنے کے لئے ان کے منہ پر پانی کی چھینٹیں مارتے تھے،

ابو علی ابن سینا کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ پوری رات کبھی نہیں سویا، اور نہ دن کا بڑا حصہ مطالعہ کے سوا کسی دوسرے کام میں لگایا[1]

وقت کی قدر و قیمت | علمائے اسلام وقت کی بڑی قدر کرتے تھے، اور شاگردوں کو اسکی تلقین کیا کرتے تھے، امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں :-

"میں ان وقتوں کے کھونے پر افسوس کرتا ہوں، جو علم سے بے تعلق ہو کر کھانے پینے میں صرف ہوتے ہیں، ہمیں وقت اور زمانہ بیحد عزیز ہے"[2]

نظام اوقات | طالب علموں کے لئے یہ ضروری تھا، کہ وہ اپنے دن رات کو چوبیس گھنٹوں میں اس طریقہ سے تقسیم کریں، کہ جس وقت جس قسم کا تعلیمی مشغلہ مناسب ہو انجام پائے، مثلاً صبح نور کے تڑکے حفظ کیلئے مقرر تھا، صبح سبق کی تکرار اور بحث کے لئے، دن چڑھے کتابت کے لئے اور شب مطالعہ اور مذاکرہ کے لئے، بعض لوگ اس سے کسی قدر مختلف نظام اوقات بھی بیان کرتے ہیں،[3]

غیر سود مند صحبتوں سے اجتناب | طالب علموں کو عام معاشرتی زندگی کی چہل پہل سے دور رہنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، خصوصاً انھیں غیر جنسوں کی صحبتوں سے علحدہ رکھا جاتا تھا، وہ صرف انہی لوگوں سے ملتے جلتے جن سے یا تو وہ خود فائدہ اٹھاتے، یا ان سے فائدہ اٹھایا جاتا، بلکہ اگر طالب علم کسی صحبت میں کسی علمی فائدہ کی امید میں شریک ہوتے، اور اون کی توقع اس سے پوری نہ ہوتی، تو چند دنوں کے تجربہ کے بعد اس سے

---

[1] تذکرۃ السامع ص ۵۷ تا ۷۰، [2] طبقات الشافعیہ جلد ۲ ص ۷۳ و تعلیم المتعلم ص ۵۰، ۵۱، ۵۲، [3] تذکرۃ السامع ص ۷۲، ۷۳،

قطع تعلق کر لیتے تھے،[1]

حفظان صحت کا خیال طالب علموں کو حفظانِ صحت کے اصولوں کی تلقین کیجاتی تھی صحت کے لئے مضر غذاؤں کے استعمال سے روکا جاتا، اور صحت بخش غذائیں اور دوائیں انھیں بتائی جاتی تھیں، اگر وہ شادی شدہ ہوتے، تو فریضۂ زوجیت کی ادائی میں اعتدال رکھنے کی ہدایت کیجاتی تھی، اسکی کثرت کے نقصانات سمجھائے جاتے تھے، نزہت گاہوں میں سیر کرائی جاتی، خصوصاً صحت کی بقا، اور جسم کی ریاضت کیلئے چہل قدمی کے معمول بنا لینے کی ہدایت کیجاتی تھی، قاضی ابن جماعہ نے ان میں سے ہر ایک کو علٰحدہ علٰحدہ تفصیل سے لکھا ہے،[2]

استاذ کی صحبتوں میں نشست طالب علم استاد کے درس کے حلقہ میں حاضر ہونے کے علاوہ اسکی دوسری مجلسوں میں شریک رہتے تھے، اور اس کی گفتگوؤں سے علمی فائدے حاصل کرتے، مذاکروں میں تہذیب اور ادب سے حصہ لیتے، اور ان مجلسوں سے واپس آکر کارآمد باتیں لکھ لیتے تھے، اگر ان مجلسوں میں کوئی شریک نہ ہو سکتا، تو وہ اپنے ان ساتھیوں سے مذاکروں کا حال دریافت کرتا جو ان مجلسوں میں شریک رہے ہوں، نیز مجلس کے برخاست ہونے کے بعد وہ باہم ان مسئلوں پر تبادلۂ خیالات کرتے تھے، طالب علموں کو ان مذاکروں سے بڑے فائدے پہونچتے تھے،[3]

مذاکرہ اور تکرار طالب علم آپس میں بھی علمی مذاکرے کرتے تھے، جریر کہتے ہیں، کہ ان کے ساتھی اعمش کے درس کے حلقہ سے اٹھنے کے بعد ان کے مکان پر اکٹھا ہوتے تھے، اور ان سے مذاکرہ کے بعد اعمش کے حلقہ کی تمام حدیثیں لکھ لیتے تھے[4]

مذاکرہ کا اسقدر اہتمام تھا، کہ اگر دو طالب علم بھی جمع ہوتے، تو مختلف مسئلوں پر مذاکرہ کرتے، اور اگر دو جمع نہ ہو سکتے، تو طالب علم کو رات کی تنہائی میں فرضی طور پر کسی کو موجود قرار دیکر اس سے کسی علمی

---

[1] تذکرة السامع ص ۸۳ [2] ص ۷۷، ۷۶، ۷۹، ۸۰ [3] ص ۱۴۲،

مسئلہ پر مذاکرہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا تھا، وہ خود سوال کرتا، اور اس کے تشفی بخش جواب اپنے ہی ذہن سے حاصل کرتا، چنانچہ قاضی ابن جماعہ نے طلبہ کو یہی مشورہ دیا ہے،[1]

مختلف علماء کے سوانح میں ان کے طالب علمی کے زمانہ میں ان کے مذاکروں کے حالات ملتے ہیں، امام ابو یوسف کے متعلق کہا جاتا ہے، کہ وہ فقہ کے مسائل پر بڑی توجہ سے فقہاء سے مذاکرہ کرتے تھے، امام اعظم رح مذاکرہ کا سلسلہ اپنی دوکان ہی پر جاری رکھتے تھے، اور کہا جاتا ہے، کہ انھوں نے علم فقہ میں اسی کے ذریعہ سے جلا پیدا کی،[2]

ابو بکر خطیب بغدادی کہتے ہیں، کہ "میں برقانی کے ساتھ حدیثوں کا کثرت سے مذاکرہ کرتا تھا، وہ اسے لکھ لیتے، اور اپنے مجموعہ میں شامل کر لیتے تھے،"[3]

درس کے خالی وقتوں میں طالب علم سبق کو آپس میں مل کر دہراتے تھے، اور اسے تکرار کہتے تھے، اس سے بہت سی باتیں جو ایک طالب کو یاد نہ رہ جاتی تھیں، وہ دوسرے طالب علموں سے یاد آجاتی تھیں،

کتابوں کی تعظیم؛ طالب علم کتابوں کا بڑا احترام کرتے تھے، کیونکہ علم کی تعظیم یہی تھی، کہ کتاب کی تعظیم کیجائے، شمس الائمہ حلوائی فرماتے ہیں:۔

"میں نے یہ علم تعظیم سے حاصل کیا، میں نے کبھی کوئی کاغذ پاکی کے بغیر ہاتھ میں نہیں لیا"

طالب علموں کو کتاب کی طرف پیر پھیلانے سے منع کیا جاتا تھا، کتاب پر کوئی دوسری چیز رکھنے کی اجازت نہ تھی، یہانتک کہ دوات بھی رکھی نہ جا سکتی تھی، لیکن بعض علمائے نے اسکی اجازت دی ہے، کہ اگر کتاب کی توہین کا خیال نہ ہو تو ایسی چیزیں کتابوں پر رکھی جا سکتی ہیں، تاہم احتیاط اولیٰ ہے،[4]

طلبہ اور ان کی کتابیں؛ طالب علموں کے تعلیمی مشاغل میں کتابوں کا نقل کرنا بھی تھا، اس زمانہ میں کتابوں کے حاصل کرنے کے چند ذرائع تھے، اگر طالب علم دولت مند ہوتے، تو کتابیں خریدتے یا اجرت دیکر نسخ کراتے، ورنہ کسی سے عاریۃً مانگتے، یا خود نقل کرتے،

[1] تذکرۃ السامع ص ۱۴۳ [2] مطلع النجوم ص ۳۰ [3] ابن عساکر جلد ا ص ۵۹ [4] تعلیم المتعلم ص ۲۶،

ان مختلف شکلوں کے لحاظ سے طالب علموں اور ان کی کتابوں کے متعلق حسب ذیل اصول اور طریق عمل جاری تھے

۱۔ دولتمند طالب علموں کو کتابیں خریدنے یا نسخ کرانے کا مشورہ دیا جاتا تھا، انہیں نہ خود لکھنے کی اجازت تھی، اور نہ کتابیں مستعار لینے کی،

۲۔ مستعار کتابوں پر کچھ لکھنا حاشیہ چڑھانا، یا کوئی نشان بنانا تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا،

۳۔ کتابوں کے نسخ کرنے میں چند آداب مقرر تھے،

الف :۔ خط کے حسن و خوبی میں مبالغہ کرنے، اور نوک و پلک نکالنے میں وقت ضائع کرنے سے روکا جاتا تھا، صرف خط صاف ستھرا ہونا چاہئے تھا،

ب :۔ مذہبی کتابوں کے نسخ میں ذیل کے آداب ضروری تھے، جسم طاہر ہو، کپڑے صاف ستھرے ہوں، روشنائی پاک ہو، لکھتے وقت قبلہ کی طرف منہ ہو، اللہ تعالیٰ کے نام کے سامنے تعظیمی فقرے "تعالیٰ سبحانہ یا عزوجل" لکھے جائیں، آنحضرت صلعم کے نام مبارک کے آگے صلی اللہ علیہ وسلم لکھا جائے، صحابہ کے لئے "رضی اللہ عنہ" اور ائمہ سلف کے لئے رحمہ اللہ تعالیٰ"

ج۔ سلف کے نزدیک مہین حروف میں لکھنا پسندیدہ نہ تھا، یہ مقولہ مشہور ہے کہ

"ایسا لکھو، کہ جب تمہارے پاس اسکی ضرورت کا وقت آئے تو وہ کام دے، ایسا نہ لکھو کہ بوقت حاجت یعنی ضعیفی میں ضعف بینائی کے وقت وہ تمہارے کام نہ آئے"،

امام ابو حنیفہ نے ایک شخص کو مہین حروف میں لکھتے دیکھا تو فرمایا،

"باریک مت لکھو ورنہ اگر تم زندہ رہے تو تمہیں ندامت ہوگی، اور مرو گے تو گالی سے یاد کئے جاؤ گے"

۴۔ کتابت کا آغاز بسملہ کے بعد حمد و صلوٰۃ سے کیا جائے،

۵۔ جز اور کتاب کے ختم پر خاتمہ کا نشان بنایا جائے،

۶۔ اگر کوئی عبارت مکرر ہو جائے، تو اسے قلمزد کرنے کے بجائے، اس سطر کے ذرا اوپر خط یا

نقطے دیئے جائیں،

۷۔ کتاب کے بابوں اور فصلوں کو سرخ روشنائی سے لکھا جائے، پوری کتاب کو سرخ روشنائی سے لکھنا پسند نہیں کیا جاتا تھا،

۸۔ دو سطروں کے درمیان کی جگہ میں نہ لکھا جائے،

۹۔ تصحیح، شک وسوال اور کلام کے خاتمہ وغیرہ کی مقررہ علامتیں کتاب میں لکھی جائیں،

۱۰۔ کتابت کی تاریخ کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے،

۱۱۔ اُلماری میں کتابیں علوم کی تقسیم، اور ان کی اہمیت کے اعتبار سے اوپر نیچے رکھی جائیں، اسی طریقہ سے روشنائی اور قلم بنانے، اور چاقو کے مناسب طور پر استعمال کرنے کے طریقے بتائے جاتے تھے۔ ناموں اور لفظوں کے حروف کو ضبط میں لانے، غلط کتابت کی تصحیح کرنے، اصل متن پر حواشی بڑھانے، کوئی اعتراض وارد کرنے یا شک رفع کرنے، کتابوں کے مطالعہ کے وقت انھیں مناسب طریقہ سے سامنے رکھنے وغیرہ کے آئین اور آداب مقرر تھے، جنھیں قاضی ابن الجماعہ نے تفصیل سے بیان کیا ہے[۱]۔

استاذ کی اطاعت شاگرد کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ استاذ کا کامل مطیع اس طریقہ سے ہو جیسے ایک مریض ماہر طبیب کے آگے ہوتا ہے، اسے ہر وقت استاد کے چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کے لئے تیار اور اس کی ہر قسم کی خدمت گذاری پر مستعد رہنا چاہئے، حضرت ابن عباسؓ اپنی بزرگی اور مرتبہ کے باوجود حضرت زید بن ثابتؓ انصاری کی رکاب پکڑ کر چلتے، اور فرماتے تھے، کہ "ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم اپنے علماء کیساتھ ایسا ہی برتاؤ کریں"، حضرت شعبہؒ کہتے ہیں، کہ "میں نے جس شخص سے ایک حدیث بھی سُنی زندگی بھر اس کا غلام بنا رہا"۔

---

[۱] تذکرۃ السامع از ص ۱۶۳ تا ۱۹۳۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں، کہ

"میں اس شخص کا غلام ہوں جس نے مجھے ایک حرف بھی پڑھایا، اسے اختیار ہے، چاہے وہ مجھے بیچ دے، چاہے آزاد کرے، چاہے غلام بنائے رہے"[1]

قاضی فخر الدین ارسانبدی مرو کے بڑے امام سمجھے جاتے تھے، بادشاہِ وقت ان کی تعظیم کرتا تھا، وہ فرماتے ہیں کہ

"مجھے یہ منصب استاذ کی عزت کرنے سے حاصل ہوا ہے، میں اپنے استاد ابوزید دبوسی کی خدمت کرتا تھا، ان کا کھانا پکاتا، اور اس میں سے خود نہ کھاتا تھا"[2]

خلیفہ ہارون رشید کا لڑکا اصمعی سے علم ادب پڑھتا تھا، ایک مرتبہ خلیفہ اصمعی کے مکان کی طرف سے گذرا، اور دیکھا کہ اصمعی وضو کرنے میں پاؤں دھو رہے ہیں، اور شاہزادہ پانی ڈال رہا ہے، خلیفہ یہ دیکھکر برہم ہوا، اور اصمعی سے کہا:۔

"میں نے اس لڑکے کو تمھارے یہاں ادب سیکھنے کے لئے بھیجا ہے، تم اپنا پاؤں اپنے ہاتھ سے کیوں دھو رہے ہو، اس سے دھلانا چاہئے تھا، ایک ہاتھ سے پانی ڈالتا، دوسرے سے پاؤں دھوتا"[3]

استاد و شاگرد کی باہمی معاشرت اور استاذ کے ادب و احترام کے آئین و طریق قاضی ابن الجماعہ نے ایسے آداب اور آئین جنھیں اسلامی نقطۂ نظر سے شاگردوں کو اپنے استاذ کے ساتھ معاشرتی زندگی میں برتنا چاہئے تفصیل سے بیان کئے ہیں، ان سے اسلامی عہد میں استاد و شاگرد کی باہمی معاشرت پر روشنی پڑتی ہے، ان کا خلاصہ حسب ذیل ہے:۔

۱۔ طالب علموں کا فرض ہے، کہ وہ استاذ کو عظمت کی نگاہ سے دیکھیں، اور یقین رکھیں کہ

---

[1] تعلیم المتعلم ص ۲۳ [2] ایضاً ص ۲۴ و ص ۲۵۔ [3] ایضاً ص ۲۴۔

وہ کمال کے درجہ پر فائز ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ جب میں امام مالک کے سامنے کتاب کا ورق الٹتا تھا، تو ان کی ہیبت کی وجہ سے اس قدر آہستہ الٹتا، کہ وہ سننے نہ پاتے۔" ربیعہ کہتے ہیں "کہ خدا کی قسم میں نے امام شافعی کے سامنے ان کی عظمت اور بزرگی کی وجہ سے کبھی پانی پینے کی جرات نہ کی"

۲۔ اگر استاد کوئی حکم دینے میں غلطی بھی کرے، تو اسے صواب سمجھ کر تسلیم کر لینا چاہئے، حضرت موسیٰؑ اور خضرؑ کے قصہ میں اس کا اشارہ موجود ہے،

۳۔ استاذ کو کسی عام خطاب سے مخاطب کرنے کے بجائے "یا سیدی" یا "یا استادی" وغیرہ سے مخاطب کرنا چاہئے، اور اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کا نام تعظیمی الفاظ بڑھائے بغیر زبان پر نہ لانا چاہئے، علمائے اسلام اپنے اساتذہ کیساتھ یہی ادب برتا کئے، خواہ اپنے علم و فضل کے بلند سے بلند درجہ پر بھی فائز ہو گئے ہوں،

۴۔ ہر مجلس میں استاذ کی عزت اور حرمت کا لحاظ رکھنا چاہئے، اگر کسی موقع پر کوئی شخص اس کی شان میں ادب سے پیش نہ آئے، یا ناروا نکتہ چینی کرے، تو فوراً اپنی ناراضی ظاہر کر کے اس کی مدافعت کرنی چاہئے، اور اگر غیظ و غضب کے ظاہر کرنے کا موقع نہ ہو تو اس مجلس سے اٹھ جانا چاہئے

۵۔ علوم و فنون میں اس کے نظریوں اور خیالوں پر عبور رکھنا چاہئے، انھیں دلنشیں رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے، اور اس کے مسلک کی پیروی کو اپنا شعار بنانا چاہئے،

۶۔ اس کی عادتوں اور خصلتوں کی پیروی کرنی چاہئے،

۷۔ اس کی زندگی میں اس کے لئے بھلائی کی دعا کرنی چاہئے، اور اس کی وفات کے بعد اس کی قبر کی زیارت کر کے اس کے لئے مغفرت کی دعا مانگنی چاہئے، اور اس کی اولاد اور عزیز و اقارب سے محبت اور تعظیم سے پیش آنا چاہئے، کہ اصل میں یہ تعظیم اپنے استاد کی ہو گی،

ہدایہ کے مصنف شیخ الاسلام برہان الدین بیان کرتے ہیں، کہ امام بخاری کے شیوخ میں سے

ایک بزرگ درس کی مسند پر تشریف فرما تھے، ایک مرتبہ ان کی یہ عجیب و غریب کیفیت دیکھی گئی کہ وہ درس کے درمیان میں رہ رہ کر رک جاتے ہیں، اور پھر اضطراب سے کسی کی تعظیم کیلئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ان سے اسکا سبب پوچھا گیا، تو انھوں نے کہا،

"میرا استاذ زادہ بچوں کیساتھ گلی میں کھیل رہا ہے، وہ کھیلتے کھیلتے مسجد کے دروازہ پر آجاتا ہے، جب میری نظر پڑتی ہے، تو استاذ کی تعظیم کے خیال سے اون کے صاحبزادہ کی تعظیم کے لئے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں" (تعلیم المتعلم)

۸۔ اگر استاذ کی طرف سے کوئی زیادتی یا سوء خلقی ظاہر ہو تو اس کا کوئی اثر نہ لینا چاہئے، اور اسکی وجہ سے اس کی صحبت میں جانے سے گریز نہ کرنا چاہئے، بلکہ اس کے طرز عمل کی کوئی تاویل کرکے اپنے دل کو سمجھا لینا چاہئے،

۹۔ استاد جو کچھ رشد و ہدایت کی راہ دکھائے، اس پر اس کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۱۰۔ اگر استاد کسی وقت کوئی باریک علمی نکتہ بیان کرے، اور شاگرد اس سے پہلے سے آگاہ ہو تو بھی اسے پوری توجہ سے سننا چاہئے، اور اس نکتہ کے مرحمت کرنے پر استاد کا شکریہ ادا کرنا چاہئے،

۱۱۔ استاد کے یہاں بغیر اجازت حاصل کئے نہ جانا چاہئے، عام اس سے کہ وہ تنہا ہو یا کوئی دوسرا شخص اس کے پاس بیٹھا ہو، اگر استاد کسی وجہ سے اجازت دینے میں تامل کرے تو اجازت حاصل کرنے پر اصرار نہ کرنا چاہئے، لیکن اگر یہ شبہہ ہو کہ استاد کو اسکی آمد کی اطلاع نہیں ہوئی تو تین مرتبہ سے زیادہ اپنی اطلاع نہ کرائے، اگر اطلاع دینے کے لئے دروازہ پر کھٹکھٹانا ہو تو پہلے آہستہ سے انگلیوں کے ناخن سے کھٹکھٹانا چاہئے، اگر اندر آواز نہ پہونچے، تو انگلیوں سے کھٹکھٹائے، اس کے بعد آہستہ آہستہ ہتھیلی مارے، اگر اس کے باوجود جواب نہ آئے تو لوٹ آنا چاہئے،

۱۲۔ استاد کی خدمت میں صاف ستھرے کپڑے پہن کر جانا چاہئے، اور حجامت بڑھی نہ ہو،

۱۳۔ اگر استاذ کے پاس پہونچکر معلوم ہو کہ وہ کسی کام میں مصروف ہی، تو وہاں پر خاموشی سے کھڑا نہ رہنا چاہیئے، بلکہ فوراً لوٹ آنا چاہیئے، اگر استاد اس کو روکنا چاہے گا، تو خود ٹھہرائے گا،

۱۴۔ استاذ سے پڑھنے پڑھانے کے لئے کسی ایسے وقت کا مطالبہ نہ کرنا چاہیئے، جو اس پر گراں گذری

۱۵۔ استاذ کے سامنے پورے ادب سے بیٹھنا چاہیئے، بیٹھنے میں تواضع انکسار اور خشوع و خضوع ظاہر ہو، اس کی طرف متوجہ رہنا چاہیئے، دائیں بائیں بلاضرورت نہ دیکھنا چاہیئے، نہ ایسی حرکتیں کرنی چاہئیں، جن سے استاذ کی توجہ بٹ جائے، بعض لوگ بیٹھے بیٹھے اپنے کپڑوں سے کھیلنے لگتے ہیں بعض ناخن چباتے ہیں، بعض اپنے ہاتھ داڑھی پر رکھتے ہیں بعض لوگ داڑھی کے بال ناک میں لیجاتے اور نکالتے ہیں، بعض زمین پر لکیریں بناتے ہیں، یہ اور اس قسم کی تمام عادتیں آداب و تہذیب کے منافی ہیں، ان سے استاذ کے سامنے احتیاط لازم ہے،

۱۶۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے کے جتنے معلوم طریقے ہیں، ان میں جو غیر مہذب اور بے تکلفی کے طریقے ہیں، انھیں استاد کے سامنے اختیار نہ کرنا چاہیئے،

۱۷۔ استاذ کے سامنے بلاضرورت کھانسنا تھوکنا اور ناک صاف کرنا بُرا ہے، اگر ضرورت پڑے تو مہذب طریقے سے کرنا چاہیئے، رومال سے صاف کرنا چاہیئے، اسی طرح بے تکلف ہو کر ہنسنا اور مسکرانا بھی ادب کے خلاف ہے، ان تمام عادتوں کے متعلق علمائے سلف کے بہت سے اقوال اور واقعات ہیں جنکا یہاں تذکرہ کرنا طول عمل ہے،

۱۸۔ استاد کے پہلو سے پہلو ملاکر بیٹھنا روا نہیں، نہ اس کے سجادہ اور مصلی پر قدم رکھنا چاہیئے، نہ اس کے تکیہ سے ٹیک لگانا چاہیئے، البتہ اگر استاد حکم دے اور اصرار کرے تو حکم کی تعمیل میں کوئی مضائقہ نہیں،

۱۹۔ استاذ سے ہم کلام ہونے میں تہذیب اور ادب کا لحاظ رکھنا چاہیئے، کیونکہ تین تسلیم

نہیں کرتا" "یہ کہاں ہے" ؟ یہ اور اس قسم کے فقرے ادب کے خلاف ہیں، انہی مطلبوں کو مناسب لفظوں میں تہذیب سے ادا کرنا چاہئے،

۲۰۔ اگر استاد کسی مسئلہ میں ایسی دلیل دیتا ہو اور اس پر اصرار کرتا ہو، جسے شاگرد کا دل قبول نہ کرے، تو بھی اصرار کی صورت میں خوشی سے اسے قبول کر لینا چاہئے،

۲۱۔ اگر استاد کی شان میں کسی دوسرے نے کوئی نا ملائم بات کہی ہو، تو اسے استاد کے سامنے "نقل کفر کفر نہ باشد" سمجھ کر بلا تکلف دہرانہ دینا چاہئے، بلکہ اس مفہوم کو اشارہ اور کنایہ ہی سے ادا کرنا چاہئے،

۲۲۔ استاد سے کسی مسئلہ یا سوال وجواب میں رد وکد نہ کرنا چاہئے، اگر وہ کسی بات کے متعلق کہے، کہ "کیا تم نے ایسا نہیں کیا تھا؟" یا "تمہارا یہ مقصد نہ تھا" تو اس کے جواب میں فوراً تردید کے لئے تیار نہ ہو جانا چاہئے، بلکہ خاموش رہے، اور اگر سوال کا جواب باصرار مانگا جائے، تو تہذیب کے ساتھ لطیف انداز میں اپنا مافی الضمیر بیان کردے،

۲۳۔ استاد کے کلام کے سلسلہ کو بیچ سے نہ توڑنا چاہئے، اور نہ اس کی گفتگو کے درمیان اپنی جماعت کے کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنی چاہئے،

۲۴۔ استاد کے سامنے اپنا ذہن حاضر رکھنا چاہئے، اگر وہ کسی کام کا حکم دے یا کسی بات کے متعلق کچھ دریافت کرے، یا کسی جانب کوئی اشارہ کرے، تو فوراً امتثال امر کے لئے تیار ہو جانا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ غفلت میں اس کی طرف دھیان نہ رہے، اور اسے اپنی بات کے دہرانے کی ضرورت پڑے،

۲۵۔ اگر استاد کوئی چیز طالب علم کی طرف بڑھائے، تو اسے داہنے ہاتھ سے فوراً لینا چاہئے اگر وہ کوئی تحریر ہو تو اسے فوراً پڑھنا چاہئے، اگر استاد اوراق کا کوئی مجموعہ دینا چاہے، اور اس کے

پڑھنے کے وقت اس کے اوراق پریشان ہوگئے ہوں، تو بڑھ کر اسی حالت میں استاد کے ہاتھ سے لے لینا چاہئے، استاد کے ترتیب دینے کا انتظار نہ کرنا چاہئے، بلکہ لیکر خود مرتب کرنا چاہئے، اور اگر وہ کسی کتاب میں کوئی چیز پڑھنے کے لئے بڑھائے، اور وہ کتاب کسی صفحہ پر کھلی ہوئی ہو تو اسی طرح پڑھکر اسی کھلے ہوے صفحہ کے ساتھ واپس کرنا چاہئے،

۲۶- استاذ سے اس قدر قریب نہ ہونا چاہئے، کہ اس کے کپڑوں سے چھو جانے کا اندیشہ ہو اور نہ اس کے سامنے کچھ دیکھنے کے لئے اس قدر جھکنا چاہئے، کہ اس کے پہلو سے مس ہو جانے کا اندیشہ ہو، یہ حرکتیں ادب کے خلاف ہیں،

۲۷- جب استاذ مجلس سے اٹھ کر جانے کے لئے تیار ہو، تو اس کی جانماز اٹھانے، اور اس کے جوتے سیدھے کرنے کے لئے عجلت کے ساتھ بڑھنا چاہئے، بشرطیکہ استاد کو یہ ناگوار نہ گذرے اور اس فعل سے اللہ کے نزدیک تقرب اور استاذ کے دل میں جگہ پانے کی نیت رکھی جائے،

۲۸- اگر استاذ کے ساتھ راہ چلنے کا اتفاق ہو، تو ضرورت کے وقت شب میں اس کے آگے چلنا چاہئے، تاکہ اس کے چلنے سے استاذ کے لئے راستہ صاف اور چلا ہوا معلوم ہو، اور دن کے وقت اس کے پیچھے چلنا چاہئے، لیکن اگر راستہ میں بھیڑ ہو، تو راستہ بنانے کے لئے آگے چلنا چاہئے، اگر رات کے وقت آگے جانے کا اتفاق ہو تو بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتے جانا چاہئے، کہ استاد بلا زحمت راستہ طے کر رہا ہے،

اگر استاذ راستہ میں کچھ باتیں کرے، تو اس کے دائیں جانب اور بعض لوگوں کے کہنے کے مطابق بائیں طرف اس سے تھوڑے فاصلہ پر پیچھے رہ کر اس کی باتیں سنے، استاذ کے پہلو بہ پہلو صرف ضرورت ہی کے وقت چلنا روا ہو سکتا ہے، یا اس نے خود اشارے سے اپنے ساتھ چلنے کے لئے بلا لیا ہو اس صورت میں مونڈھے اور ہاتھوں کو استاذ کے جسم سے چھو جانے سے بچائے، اور اگر گرمی کا

زمانہ ہو تو اس طریقہ سے چلنا چاہیئے، کہ اس کا سایہ استاد کے جسم پر پڑے، اور اگر جاڑے کے دن ہوں، تو یہ لحاظ رہے کہ دھوپ اس کے جسم پر لگے، اگر استاد راستہ میں کسی دوسرے شخص سے باتیں کرنے لگے، تو اس قدر پیچھے ہو جانا چاہیئے، کہ اس کی باتیں نہ سن سکے، اور اگر قرینہ سے یہ معلوم ہو کہ اس گفتگو میں وہ شریک سمجھ رہا ہے، تو جو پہلو استاد کے مخاطب سے خالی ہو، اس پہلو پر آجانا چاہیئے،

۲۹- اگر استاد راہ میں ملجائے تو اسے عجلت سے سلام کرنا چاہیئے لیکن سلام دور سے کرنا مناسب نہیں، اسکے قریب سامنے آکر سلام کرنا چاہیئے،[۱]

طلبہ میں تعلیم کا شوق اور جد و جہد

اس زمانہ میں طالب علموں میں تعلیم و تحصیل کا بڑا شوق تھا، سید شریف جرجانی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے کہ انھیں شرح مطالع کو اس کے مصنف سے پڑھنے کا شوق ہوا، چنانچہ وہ امام رازی کی خدمت میں پہونچے، مگر وہ ضعیف ہو چکے تھے، پڑھانے سے معذور تھے، انھوں نے انھیں سفارشی خط دیکر اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس قاہرہ بھیجا، مبارک شاہ نے انھیں حلقہ درس میں صرف سماع کی اجازت دی، مستقل درس اور قرأت کا موقع نہ دیسکے، چنانچہ ان کی تعلیم جاری ہو گئی، ایک مرتبہ رات کے وقت مبارک شاہ اپنے حجرے سے نکل کر مسجد کے صحن میں آئے، یہاں ایک طالب علم کو زور کی آواز میں یوں پڑھتے سنا، "مصنف نے یوں کہا، شارح یہ کہتا ہے، اور میں یہ کہتا ہوں" معلوم ہوا یہ سید شریف جرجانی ہیں، استاد کو طالب علم کی یہ محنت اور شوقِ طلب پسند آیا، اور دوسرے دن انھیں حلقہ درس میں سب طالب العلموں پر مقدم کر دیا،[۲]

---

[۱] تذکرۃ السامع ازص ۷۰ تا ۱۱۲، اسی قسم کے آداب امام غزالی نے احیاء العلوم جلد اص ۳۴ تا ۳۵ میں اور زرنوجی نے تعلیم المتعلم میں اجمال کیساتھ بیان کئے ہیں [۲] الشقائق النعمانیہ بر حاشیہ ابن خلکان جلد اص ۱۶۷، ۱۶۸،

شیخ ابو علی ابن سینا کا بیان ہے، کہ انھوں نے طالب علمی کے زمانہ میں کتاب مابعد الطبیعۃ پڑھنی شروع کی، مگر سمجھ میں نہ آئی، سمجھنے کے لئے اسے بار بار پڑھتے، مگر مفہوم واضح نہ ہوتا، یہانتک کہ چالیس مرتبہ اسے پڑھ ڈالا، اور کتاب ازبر ہوگئی، پھر اتفاق سے ایک دن بازار میں اسی فن کی ایک کتاب ہاتھ آگئی، اسے بھی بادل ناخواستہ خریدلیا، پھر دیکھا تو یہ ابو نصر فارابی کی تصنیف تھی، جس میں اس نے کتاب مابعد الطبیعۃ کے اغراض کی تشریح کی تھی، کتاب پہلے ازبر ہو چکی تھی، اس شرح نے مشکلات کے تمام پردے چاک کر دیئے،[۱]

کتاب الحماسہ کے شارح خطیب تبریزی کی طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے، کہ ایک مرتبہ وہ فن لغت میں ابو المنصور کی کسی کتاب کے مطالب حل کرنے کے لئے اپنے شہر کے کسی لغوی کے پاس پہونچے، اس نے کہا کہ ابو العلاء معری کی طرف رجوع کرو، چنانچہ وہ تبریز سے معرۃ روانہ ہوگئے، ابو العلاء معری سے مل کر اس کے مطالب حل کئے،[۲]

مشہور نحوی و لغوی اسود کے متعلق مشہور ہے کہ وہ طالب علمی کے زمانہ میں چہرے پر تیل مل کر دھوپ میں بیٹھ جاتا تھا تاکہ بدویوں سے ہم شکل ہوجائے، اور ان سے مل جل کر لغت کی تحصیل کر سکے، چنانچہ وہ نہ صرف اپنے فن میں امام، بلکہ اسی لقب اسود سے مشہور ہوگیا،[۳]

تعلیمی و علمی حمیت اس زمانہ کے طالب علموں اور فارغ التحصیل طلبہ میں پوری تعلیمی و علمی حمیت پائی جاتی تھی، ابن جنی نحوی کا نام مشہور ہے، وہ تحصیل علم سے فارغ ہو کر درس دینے کے لئے بیٹھا، اتفاق سے اس کے حلقہ میں نحو کا مشہور امام ابو علی فارسی پہونچ گیا، اور کسی مسئلہ میں اس نے ابن جنی کی غلطی دیکھی، ابو علی صرف اس قدر کہہ کر اوٹھ گیا زببت قبل ان تحصرم، تم انگور بننے سے پہلے منقی بن گئے، یعنی ابھی گدرانے

---

[۱] عیون الانباء جلد ۲، ص ۴، [۲] وفیات الاعیان جلد ۲ ص ۲۳۲، [۳] نزھۃ الالباء ص ۲۳۷،

بھی نہ پائے تھے، کہ پختہ کار ہوگئے، یہ فقرہ ابن جنی کے دل میں کھپ گیا، اسی وقت دامن جھاڑ کر درس کی مسند سے اٹھ کھڑا ہوا، اور منزل منزل طے کرکے ابو علی سے جا ملا، اور زندگی بھر اس کا ساتھ نہ چھوڑا، اور پھر خود امام فن کہلایا[1]

ایک دوسرے نحوی کسائی کا واقعہ ہے کہ وہ ایک مرتبہ ایک غلط لفظ کسی محفل میں بول گیا، اسے ٹوکا گیا، جس سے اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت اس فن میں کمال حاصل کرنے کا تہیہ کیا، چنانچہ نحو کے استاد خلیل بصری کے حلقہ میں داخل ہوا، یہاں تحصیل کرنے کے بعد اسے خیال ہوا، کہ جیسے خلیل نے اسے حاصل کیا ہے، وہ بھی حاصل کرے، چنانچہ بدوؤں سے ملنے کے لئے بادیہ پیمائی شروع کی، اور کمال حاصل کرکے امام فن کہلایا[2] (باقی)

---

[1] نزہتہ الالبا، ص ۴۰۰، [2] ایضاً،

ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہیں

از

مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم

ہندوستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں مرتب طور پر ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی حالات اور ان کے مدرسوں اور تعلیمگاہوں کا حال معلوم کرنا چاہیں، تو نہیں مل سکتا، مولوی ابوالحسنات صاحب مرحوم نے نہایت تحقیق و تلاش کے بعد ہندوستان کی قدیم اسلامی درسگاہوں پر ایک مقالہ مرتب کیا تھا، جو اہل نظر کو بیحد پسند آیا، اب دارالمصنفین نے اسی مقالہ کو کتابی صورت میں نہایت اہتمام کیساتھ پیش کیا ہے

ضخامت ۱۴۴ صفحے قیمت ۱۲ر "منیجر"

امالی ابی علی القالی

اور

اللآلی

از

مولینا ابو عبداللہ محمد بن یوسف بن محمد السورتی

(۳)

۳۴۔ ص ۳۱ "کان قطریاً من النواصب" یہ سراسر غلط ہے، قطری بن الفجارۃ الخارجی ایک مشہور شجاع وشاعر امیر جیش خوارج تھا، ناصبی خاص حضرت علیؓ کے دشمنوں کے لئے استعمال کیا جاتا ہے، خارجی حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ اور سارے بنی امیہ وغیرہ سے عداوت رکھتے ہیں، تارک فرائض اور مرتکب کبائر کو کافر سمجھتے ہیں، اس لئے ان دونوں کے عقائد وخیالات میں بعید فرق ہے،!

۳۵۔ ص ۳۲ "العباس بن مرداس شاعر سلمی" صحابہ مؤلفۃ القلوب میں سے مشہور شخص ہیں، ان کے نسب میں "ابن ابی عامر بن حارثہ بن عبد بن عبس"، اور کبھی "عبد قیس" کبھی "رفاعۃ بن الحرث بن بھثہ بن سلیم کبھی الحرث بن یحییٰ بن الحرث، کبھی حیی بن الحرث" خبط عشوا" اور "نسج خرقا" سے زیادہ نہیں جب اس قدر اشکال تھا، تو سلامتی اجتناب میں تھی، صحیح نسب اسطرح ہے،

"العباس بن مرداس بن ابی عامر ویقال ابن ابی غالب بن جاریۃ بن عبد بن عبس وقیل عنبس بن رفاعۃ بن الحرث بن بھثۃ بن سلیم بن منصور بن عکرمۃ بن خصفۃ بن

قیس عیلان ابن مضر بن نزار بن معد بن عدنان" اب ہم فاضل راجکوٹی کے اغلاط و تصحیفات لکھتے ہیں:-

الف:- حارثہ کی جگہ لکھا ہے، جو جاریہ کی تصحیف ہے، جیسا کہ ابن ماکولا وغیرہ نے ضبط کیا ہے،

ب:- عبد قیس جو اغانی وغیرہ سے منقول ہے، ناقابل اعتبار ہے، صحیح عبد بن عبس یا عنبس ہے!

ج:- "الحرث بن یحییٰ بن الحرث" وغیرہ بھی خبط و غلط، اور محض تصحیف ہے، !

۳۶- ص ۳۳ "الریاشی"! اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں،" ابوریاش القیسی صاحب شرح الحماسہ" یہ عجیب ادعا غفلت کا نتیجہ ہے، ابوریاش القیسی متاخر ہے، ممکن ہے اسے بھی "الریاشی" کہدیں، ورنہ دراصل الریاشی ابوالفضل العباس بن الفرج مشہور رواۃ شعر و اخبار عرب وغریب اور مبرد کا استاد ہے یہی یہاں مراد ہے، نہ اور کوئی،

۳۷- ص ۳۷ "حدیث موسیٰ بن محمد بن ابراہیم التیمی عن ابیہ عن جدہ فی صفۃ السحاب" کی بابت البکری نے لکھا ہے،" ہو حدیث مسند" معلوم نہیں یہ جملہ کیوں فاضل میمن کی نگاہ تنقید سے چھوٹ گیا، یہ حدیث مسند نہیں بلکہ مرسل ہے، کیونکہ ابراہیم صحابی نہیں، پھر ضعیف بھی ہے کیونکہ موسیٰ متکلم فیہ ہے اور محمد بن ابراہیم میں بھی کلام ہے،

۳۸- ص ۳۸ "مرتع بن عمرو" غلط ہے، مرتع عمرو کا بیٹا نہیں ہے، بلکہ مرتع عمرو کا لقب ہے، دیکھو مختلف آمدی، ابن ماکولا وغیرہ،

۳۹- ص ۳۹- وخفاف بن ندبۃ السلمی اتاہ الشعر من قبل خالہ تابط شرا" اس مقام پر لکھتے ہیں،" کذا فی الاصل، ویاتی لہ فی صفحہ ۲۶ انہ خفاف بن نضلۃ وھو الصواب لان ندبۃ امراۃ سوداء"

یہ سارا بیان بوجوہ ذیل صحیح طریق استدلال سے عاری اور غلط در غلط ہے،

الف :۔ خفاف بن نضلہ اور ابن ندبہ دونوں ایک نہیں ہیں، ابن نضلہ اسدی ہے یہ سلمی،

ب :۔ خفاف بن ندبہ کے باپ کا نام عُمیر ہے، نہ نضلہ، دیکھو انساب عرب، کتاب الاشتقاق ومختلف النسبہ وغیرہ،

ج :۔ ندبہ کے متعلق اختلاف ہے، بعض اسے بنی الحرث بن کعب سے بتاتے ہیں، بعض کسی اور سے مگر اس کا اتصال تا بطا شرا سے معلوم نہیں ہوسکا،

د :۔ یہ لکھنا کہ "وهو الصواب لان ندبة امرأة سوداء" عجیب غریب استدلال ہے، ندبہ کے سوداء یا بیضاء ہونے سے خفاف بن ندبہ کا خفاف بن نضلہ ہونا کس اعتبار سے صحیح ہوسکتا ہے؟ نہ ماں کے سوداء سے عربی صحیح نسب سے نہ ہونا لازم آتا ہے، اور نہ اس کی وجہ سے باپ عمیر کی جگہ نضلہ بنانا ضروری ہے،

ھ :۔ یہاں اصل مسئلہ پر بھی بحث کی ضرورت تھی، کہ خفاف بن ندبہ کا ماموں کس ذریعہ سے تأبط شرا بن سکتا ہے، لیکن ایسی ضروری بحثوں سے میمن صاحب ہمیشہ گریز کیا کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ شارح کا یہ خیال قابل بحث اور صحت سے عاری ہے، اس کی سند ہمیں کتب انساب وغیرہ سے نہیں ملتی، نہ خود شارح نے کوئی ثبوت دیا ہے،

۳۹۔ ص ۳۹ "دريد بن الصمة انا ه الشعر من قبل خاله عمرو بن معد يكرب" اس پر فاضل میمن نے کشف وغیرہ سے یہ اشکال نقل کیا ہے: "دُرید غزوۂ ہوازن (یعنی حنین) میں قتل ہوا، اس وقت یہ بہت بوڑھا تھا، عمرو بن معدیکرب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں اسلام لایا، وہ اس وقت توانا تھا" پھر لکھتے ہیں "میرے نزدیک ریحانہ کا جو درید کی ماں ہے، عمرو بن معدیکرب کی بہن ہونا محال ہے" کیونکہ درید قتل کے وقت دوسو برس کے قریب پہونچ چکا تھا، جیسا کہ المعمرین کے نسخہ ۱۳۷ میں مذکور ہے

اور عمرو ۲۱ ھ میں قتل ہوا، جب کہ اس کی عمر ایک سو بیس برس سے زیادہ تھی، جیسا کہ اصابہ میں ہے، اس سے لازم آتا ہے، کہ بھانجا ماموں سے سو برس بڑا ہو، جو قطعاً حد سے زیادہ عجیب بات ہے"۔

اس تمام بحث کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ چونکہ ماموں بھانجے کی عمر میں اس قدر تفاوت ممکن نہیں اسلئے میمن صاحب نے "محال" لکھدیا، مگر اسے محال عقلی شمار کیا جائے، یا عادی ابھی اشکال باقی ہے، تھوڑے سے تفاوت کی بنا پر ایسا فیصلہ انھوں نے صادر کر دیا،

اولاً عمر کی تاریخیں حقیقی اور ہر اعتبار سے صحیح نہیں ہوتیں، انمیں اختلافات کو بہت کچھ دخل ہوتا ہے اس لئے مناسب تاریخیں معین کرنا ایک محقق مورخ کا اہم فریضہ ہے،

ثانیاً بہن کا بھائی سے بہت بڑا ہونا ممکن ہے، ہوسکتا ہے بہن سب سے پہلی اولاد ہو، اور بھائی سب سے چھوٹا، اس اعتبار سے بھائی بہن میں پچاس ساٹھ سال کا فرق بھی ممکن ہے، اور ایسا دیکھا بھی گیا ہے، ایسی صورت میں تخمیناً سو برس کا تفاوت کوئی محال امر نہیں، اور محض اس ظنی استبعاد سے معاملہ محال تک نہیں پہونچ سکتا،

اس کے بعد ہم اس مضمون کے اہم اغلاط پر متوجہ ہوتے ہیں،

الف، عمرو بن معدی کرب کے اسلام کی بابت یہ لکھنا کہ وہ عمر بن الخطاب کے زمانہ میں تھا، سراسر باطل اور ناقابلِ التفات ہے، وفد زبید میں عمرو کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونا اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ارتداد پھر رجوع الی الاسلام ثابت ہے، ان واقعات کی روشنی میں یہ خیال کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا،

ب:۔ عمرو کے قتل کا واقعہ مختلف فیہ ہے، بعض مورخین کا خیال ہے، کہ نہاوند کے معرکہ میں قتل ہوئے، بعض اس کے فالج یا سانپ کا کاٹنا موت کا سبب بتاتے ہیں،

ج۔ آغانی میں ہے، کہ "ریحانہ عمرو کی ایک بیوی تھی، جسے اس نے طلاق دیکر افسوس کیا تھا"

اس کو میمن صاحب صحیح مان کر ریحانہ اخت عمرو کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اس سے ان کے مدعا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، کیونکہ عمرو کی بیوی کا ریحانہ نام ہونا، اس کی بہن کے ریحانہ ہونے کے نہ خلاف ہے، نہ اس سے اس پر کوئی ایسا اثر پڑ سکتا ہے، کہ درید کی ماں ریحانہ عمرو کی بہن نہ ہو، پس یہ ساری محنت فضول اور عبث ہے، ضرورت اسکی تھی، کہ درید کی ماں ریحانہ کی بابت یہ ثابت کیا جاتا کہ وہ عمرو بن معدی کرب کی بہن نہ تھی، اس کا کوئی ثبوت نہیں مل سکا، اور معاملہ جوں کا توں رہا،

۴۱۔ ص ۴۷۸ "آنَ الشیٔ یئین اُمُناً حان، واصلہ من الواو ولکنہ من باب فعِل یفعل مثل وَلِی یلی وجاء المصدر بالواو لیطرد علی فعلہ"، شارح کا یہ بیان ہر اعتبار سے مشکل اور غلط ہے، مگر فاضل میمن صاحب اپنی کمال صناعہ کے لحاظ سے ایسے امور پر توجہ کرنا ضروری نہیں خیال فرماتے، اس میں حسب ذیل اغلاط ہیں،

الف:۔ "اصلہ من الواو" یہ غلط ہے، "این" یائی ہے، نہ واوی،

ب:۔ فعِل یفعِل سے ہونا محض شارح کا بے معنی دعویٰ ہے، اسکی کوئی دلیل اور عرب سے سند نہیں دی،

ج:۔ "المصدر بالواو" غلط اور تحریف ہے، صحیح "بالیاء" ہے تاکہ شارح کا کلام صحیح ہو سکے،

"تاج العروس" جلد ۹ صفحہ ۱۳۳ پر البکری کی یہ عبارت نقل کرکے لکھا ہے، "قال شیخنا رحمہ اللہ قولہ وَلِی یلی وَدَعویٰ کونہ واویّاً فیہ نظر ظاہر، ومخالفۃ للقیاس" نیز وہاں "المصدر بالیاء" ہے، جو صحیح طور پر ہونا چاہئے،

۴۲۔ ص ۴۷۹ "وَرُواۃ عثمان بن حکیم عن عامر بن سعد عن ابیہ کلھم عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم، خرجہ عنھم مسلم وغیرہ"، اس عبارت پر فاضل میمن صاحب کہتے ہیں "نُ الروایۃ عن غیر مسلم"، شارح نے جب یہ سب روایتیں خاص مسلم سے نقل کی ہیں، تو محشی صاحب

کا فرض تھا کہ اس کو پوری طرح تلاش کرتے، یا سکوت کرجاتے کہ رازِ درون ظاہر نہ ہوتا، سچ کہا گیا،

وفی الصمت سترٌ للعییّ وانما صحیفة لب المرء ان یتکلما،

کاش وہ صحیح مسلم "باب فضل المدینة" دیکھتے تو عثمان بن حکیم وغیرہ کی روایتیں موجود پاتے اور یہ جملہ لکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی،

۴۳۔ ص ۵۱، "وخرجه محمد بن اسمٰعیل من طریق الاوزاعی بزیادة، فقال حدثنا ابو مقاتل حدثنا عبد الله الخ اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں، وفیه کالمغربیة ابن مقاتل مصحفا وفی التقریب ابو مقاتل السمرقندی مقبول من الثالثة"

یہاں میمنی صاحب نے صحیح بخاری پر بھی ہاتھ صاف کر دیا، اور اپنے کمال ادبی کو کمال حدیث اور کمال فن رجال سے مخلط کرنے کی بے کار سعی کی،

سبکناہ ونحسبه لجینا فابدی الکیر عن خبث الحدید

کاش میمن صاحب اصلی کتاب کو بعینہ باقی رکھ کر حاشیہ پر اپنی تحقیق پیش کر دیتے، اصل کتاب کو اس طرح بدل دینا بہت بڑی علمی خیانت ہے، اس میں حسب ذیل اغلاط ہیں،

الف :۔ بخاری کا استاد ابن مقاتل ہے، نہ ابو مقاتل!

ب :۔ ابن مقاتل کا نام ابو الحسن محمد بن مقاتل ہے، جو ابن مبارک کے خاص شاگرد ہیں،

ج :۔ ابو مقاتل سمرقندی بخاری کے رواۃ میں نہیں ہے،!

د :۔ ابو مقاتل بخاری کا استاد بھی نہیں ہے،

ہ :۔ ابو مقاتل بخاری کے رواۃ کے ہم پلہ بھی نہیں، کیونکہ یہ صرف مقبول ہے، بخاری کے رواۃ کا درجہ اس سے بالاتر ہے،

و :۔ اس میں سب سے اہم غلطی اور اصطلاح محدثین سے ناواقفیت کی دلیل یہ ہے، کہ میمن صاحب نے تقریب

سے ابو مقاتل سمرقندی کو تلاش کر لیا لیکن اتنا نہ سمجھے، یہ بخاری کا استاد ہے اور یہ فیصلہ کر دیا کہ طبقہ ثالثہ سے ہے، کاش پہلے وہ یہ اصطلاح سمجھ لیتے کہ ثالثہ سے کون ہو سکتا ہے، اور وہ بخاری کا استاد بھی ہو سکتا ہے، "ثالثہ طبقہ صغار تابعین کا ہے، جیسے حسن بصری وغیرہ، ان سے بخاری نے کب روایت کی ہے،

ذ:۔ تقریب وغیرہ میں ہر راوی کے متعلق یہ بھی بتا دیا گیا ہے، وہ کس کس کتاب میں ہے کاش میمن صاحب اس پر نظر ڈال لئے ہوتے، کہ یہ راوی بخاری میں ہے بھی یا نہیں، ؟

ح:۔ میمن صاحب نے ادب کی نادر کتابوں کی طرح جن کی روایت منقطع ہو چکی، اور جن کے نسخے شاذ و نادر ملتے ہیں، صحیح بخاری کو بھی نایاب سمجھ لیا، جس کے ایک ایک حرف و نقطہ پر علما بحث کرتے چلے آئے ہیں، پھر ابن حجر جیسے امام جلیل القدر ماہر فن رجال کی شرح کے ہوتے ہوئے نہ سمجھے کہ یہ ابن مقاتل ہے، یا ابو مقاتل، ؟ یہ انتہا درجہ کا بے معنی اجتہاد ہے،

اذا شُرِقَ الفتی دجها وتاحا تقلّبَ فی الامور کما یشاءُ

۴۴۔ ص ۲۰ "نقنقت و نقیقت" کی بابت اپنی کمال صناعہ سے تحریر فرماتے ہیں "ولعله نقنقت بالنون والتاء، و نقیقته بالتائین عن ابی عُبیدۃ، فالراجح علی هٰذا بالنونین او بالنونین والتاء ونقیقته بالتائین ضعیفٌ"

خلاصہ یہ کہ نقیق ضعیف، اور "نقنق" قوی، حالانکہ یہ کالعدم ہے، اور ابن الاعرابی وغیرہ نے اس کا انکار کیا ہے، مشہور معاجم میں بھی اس کا وجود نہیں ہے، خود نادر قسم سے ہے، خواہ نقیق بالتاء ہو خواہ نقنق بالنون، مگر جسے عجائب سے دلچسپی ہو، وہ ایسے ہی لغات بنا تا رہتا ہے، صحیح کو باطل اور ضعیف و باطل کو قوی کر دینا بھی کمال فن ہے،

۴۵۔ ص ۰۰ "سنان بن امیۃ" (امامہ) یہ غلط ہی، صحیح امۃ جیسا کہ کتب انساب و لغۃ میں مذکور ہے،

۴۴۔ ص ۱۱، محمد بن حفص الوصابی اس پر لکھتے ہیں، کذا ھنا ولم اجدہ ولعل الصواب محمد سیاتی عمر بن حفص.... الوصابی بالضم منسوب الی ناحیۃ بالیمن"

اس میں دو غلطیاں ہیں، ایک خواہ مخواہ محمد بن حفص کا انکار کرنا، اس کے لئے کافی تتبع و تلاش کی ضرورت ہے، لم اجدہ کہہ کر گذر جانا ہر شخص کی زبان پر زیب نہیں دیتا، یہ صرف وسیع المطالعہ اور وسیع المعرفۃ کا منصب ہے،

مشتبہ النسبہ ذہبی وغیرہ میں یہ موجود ہے اور اسے "واہ" لکھا ہے،

دوسری غلطی الوصابی بالضم منسوب الی ناحیۃ بالیمن" لکھا ہے صحیح الوصابی بفتح واو وتشدید صاد اس کے جد کی طرف منسوب ہے، دیکھو السمعانی، مشتبہ النسبہ وغیرہ،

۴۷۔ ص ۱۳۱، "قال ابو عبیدۃ" حاشیہ پر لکھا ہے، ھو ابن الجراح کذا کتبتہ اولاً و لا ادری الآن من این ھو" یہ محض فضول و لغو حاشیہ ہے، پہلی غلطی اپنی ذات تک محدود تھی، اب اسے عام کرنے کے لئے شائع کرکے دوسری غلطی کی، اپنی ذات پر اعتماد کس قدر ہو گیا ہے، کہ پھر اور بے معنی بات کو خواہ اسکی کوئی سند نہ ہو، اپنے خیال کے مطابق لکھ دینا کمال صناعہ شمار کر لیا ہے،

یہ ابو عبیدہ کوئی گمنام شخص نہیں، بلکہ امام لغت و ادب معمر بن المثنی التیمی ہے، تمام کتب لغت میں اسی سے یہ معنی مذکور ہیں، اور ہر جگہ اس کا ذکر ہے، پس ایسے شخص کو ابو عبیدہ بن الجراح کی طرف گھسیٹ لیجانا بجز میمن جیسے کامل الفن کے اور کوئی نہیں کر سکتا،

۴۸۔ ص ۳۰۹، "عنمہ ضبطوہ محرکا وقال عبد الغنی الحافظ فی مؤتلفہ (۹۴) انہ بسکون النون،

اسی مقام پر میمن صاحب نے جدت طرازی میں دو زبردست غلطیاں کی ہیں، اگر وہ ذرا تدبر سے کام لیتے تو یہ نوبت نہ آتی،

ایک یہ کہ "عتمہ" جسے عبدالغنی نے بالسکون لکھا ہے، وہ عبداللہ بن عتمہ شاعر کا والد نہیں ہو، جسکی بابت بحث ہے، بلکہ اور کوئی شخص ہے،

دوم یہ ضبط خود عبدالغنی اور ان کی کتاب کی غلطی ہے، کیونکہ العسکری نے کتاب "تصحیفات المحدثین" میں ابن ماکولا نے "الاکمال" میں، ذہبی نے "مشتبہ النسبة" میں، پھر خاتمة الحفاظ علامہ ابن حجر العسقلانی نے "تبصیر المنتبہ" میں بجز مفتوح النون کے اور کچھ لکھا ہی نہیں ہے، اگر عبدالغنی کے یہاں غلطی تھی، تو اسے ظاہر کرنا چاہئے تھا، ورنہ دونوں صورتوں کے متعلق کچھ لکھتے، پس یہ ضبط باطل اور ناقابل اعتبار ہے، نسخہ کی غلطی کا قرینہ غالب ہے، ورنہ نسخہ اگر صحیح ہو جائے، تو خود حافظ عبدالغنی کی غلطی ماننی پڑے گی، کیونکہ تمام ائمۂ لغت ونسب کے خلاف ان کا ضبط کسی طرح قابل اعتبار نہیں ہو سکتا،

۴۹۔ ج ۲ ص ۹۱۷۔ وکان وراء القوم منهم بقیة الخ یہ نابغہ جعدی کے مشہور قصیدہ کا ٹکڑا ہے، اسکی تخریج نہ معلوم کیوں چھوڑ دی،

۵۰۔ ص ۹۲۲۔

هل تخمشن ابلی علی وجوهها، او تطعنن نحورها بالآلی،

اس شعر میں "الآلی" کا لفظ میمن صاحب کی سمجھ میں نہیں آیا، اس واسطے مصحف لکھ کر استفہام کی علامت آگے لکھدی، صحیح لفظ "بمآلی" ہے، مآلی جمع مِئلاة بالکسر وہ سیاہ کپڑا جسے ماتم کرنے والی عورتیں استعمال کرتی ہیں، دیکھو الشعر والشعراء ابن قتیبہ طبع جدید مصر ص ۹۰ وغیرہ،

تنبیہ: بعض ائمۂ لغت نے مَئلاة کا لمعلاة لکھا ہے، اس سے محض وزن مقصود ہے حرکت میم نہیں وہ بالکسر ہی ہے،

۵۱۔ ص ۹۲۵ و لہ احد بمعنی تشریح الشعر من باب التفعیل

معلوم نہیں میمن صاحب نے لغت کی کتنی کتابیں یاد کرلی ہیں یا کتنے لغات پر انھیں احاطہ ہے کہ

وہ ایسے بے معنی دعوی کی جرأت کرتے ہیں، کم از کم صحاح، جمہرۃ، لسان، قاموس وغیرہ پر عبور حاصل ہونے کے بعد اس قسم کے جملے لکھنے کی جرأت کرنی چاہیے،

لیجئے، ہم صرف جمہرہ سے اسکی متعدد شہادتیں پیش کرتے ہیں، جن کے متعلق صناعت کے ماہر "لم احد" لکھکر اپنا کمال ثابت کر رہے ہیں،

ج ۲ ص ۲۴۴ پر لکھتے ہیں، "دریت الشعر بالمد دریٰ تدریۃ، قال الشاعر،

قد علمت اخت بنی فزارۃ　　ان لا اُدری لِلّتی لجارۃ

ج ۱ ص ۱۲ پر ہے:-

وَامّ مثواہ تدرّی لِمّتی　　وتغمز القنقاء ذات الفروۃ

اسی صفحہ پر تیسرا شعر ملاحظہ ہو،

وقد اشہد الخیل المغیرۃ بالضحیٰ　　وانت تدرّی فی البیوت وتفرق

یہ صرف لغت کی ایک کتاب کے حوالے ہیں، بھلا ایسی ناقص تلاش پر لم اجد کہنا کیونکر اہل علم کے نزدیک پسندیدہ ہو سکتا ہے، پھر اس کی وجہ سے "یدرّین" کو "یدرین" بنانا قبل از وقت نہیں تو اور کیا ہے؟

تذ قت الظبا علی خراش　　فمایدری خراش مایصید

ج ۵ ص ۹۹ و مضریۃ ملحنۃ وقال ابو عمرو بن العلاء، قال زہیر حرب مضرۃ

ولو کان الی لعلت مضرۃ　　ای تعتر وغضی

اس پر میمن صاحب لکھتے ہیں:-

ھکذا وانظر کیف یزن البیت علیہ؟ وعلی اصلاح ابی عمرو، ولکنی ادری ان لاحاجۃ الی مضرۃ، ولا الی مضرۃ، فانھم ینسبون کل مافیہ شدۃ الی مضر

یہ تمام بحث عجیب و غریب اور لطیف تحقیق کا نمونہ ہے، کاش یہ حاشیہ وہ نہ لکھتے، تو اتنے اغلاط کا انبار اپنے سر پر نہ لادتے،

وہ اصل مضمون ہی نہ سمجھے، ورنہ وزن کے جھگڑے سے نجات ملجاتی، اغلاط بغور ملاحظہ فرمائیے،

الف :۔ شرح "مضریّۃ" کی نہیں "مضرۃ" کی ہے، جو زہیر کے پہلے بیت کے پہلے مصرع میں ہے "حرّ عوان مُضِرّۃ" یہاں مضریہ کا کوئی موقع نہیں، اسی کو ابو عمرو "مُصِرّۃ" بالصاد المثلثۃ" کہنا چاہتے ہیں" غریب مطالب کی طرف جانا، اور واضح او مانوس کو ترک کرنا "غریب" کی نسبت صحیح کرنے کے واسطے ضروری ہے "اِنَّ الغریبَ یُسْعدُ الغریبا"،

ب :۔ زہیر نے حرب مضریّہ کب کہا ہے، جس کے واسطے میمن صاحب لکھتے ہیں "مضرۃ اور مُصِرّہ کی ضرورت نہیں، مضریہ بھی درست ہے"،

ج :۔ میمن صاحب کا یہ کہنا کہ "ہر ایک شدت کی چیز مُضر کی طرف منسوب ہوتی ہے" ان کا تخیل محض اور کلام عرب پر ادعا ہے، ورنہ اس کا ثبوت پیش کریں، زہیر نے اگلے بیت میں "قضاعیۃ" اور "مضریۃ" دونوں کہا ہے، تو کیا قضاعہ کی طرف بھی شدت کی نسبت ہوا کرتی ہے،

۵۲ :۔ تنبیہ (۱) میمن صاحب کی اس کتاب میں جابجا "ابن" کے پہلے خواہ وہ علمین کے درمیان کیوں نہ ہو، الف لکھا جاتا ہے، حالانکہ یہ ائمہ فن کے نزدیک غلط ہے، مثلاً اس جگہ "ابو عمرو ابن العلا" ہے، نہ معلوم یہ کون جدید اجتہاد میمن صاحب نے اس بارہ میں کیا ہے،!

۵۴ :۔ تنبیہ (۲) امالی کے جزء ثانی ص ۲۰۸ پر "ما افترقت فرقتان بعدُ مُدْرِکۃ" ہے، حالانکہ صحیح "طابخۃ" ہے، جیسا کہ سلسلۂ نسب اور تمام قصہ سے ثابت ہوتا ہے، اسی طرح یہ قصہ کتب انساب ولغت میں آیا ہے،

۵۵ ۔ اسی طرح اس صفحہ پر "المامور" تام آیا ہے، جس پر محشی نے لکھا ہے، کذا بالاصل بمیمین

بوزن مفعول، اس قسم کے اشکال پر میمن صاحب کی وسیع نظر نہیں کام کر سکی، وہ تو نفیس و رطب اشیاء کا تتبع کیا کرتے ہیں، اور خوب محنت کرکے خود بھی تھکتے ہیں، اور دوسروں کو بھی تھکانے کی فکر میں رہتے ہیں،!

یلجلج مُضغۃً فیھا انیضٌ اصلّت فھی تحت الکشح داءٌ

"المامور" غلط ہے، صحیح "المامومُ" بالمیم، اخیراً بدل الراء جیسا کہ ابن درید نے کتاب الاشتقاق میں ضبط کیا ہے، شیبان کا بیٹا ماموم تھا، نہ مامور، اسی کا بیٹا عثجل بن الماموم "یوم وقیط" میں قید ہوا تھا، جس کا مسئلہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں،

لطیفہ و خاتمہ، میمن صاحب نے اس غریب کتاب کو خواہ مخواہ اپنا مہمان بنا لیا تھا، وہ بھی ایک دو وقت کے لئے نہیں، سات آٹھ سال کے لئے آپ کی مہمان نوازی کا لنآدعلی علم معروف و معلوم ہے اسی بنا پر تحریر فرماتے ہیں، "ولکنني بعد کیت وذیت ولو ولیت احمد المولی سبحانہ علی اتجھز غادر البیت، وان کان غادرنی ایضاً لقی کالمیت" بڑے اخلاص و عجز سے میمن صاحب اللہ تعالی کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آخر بہت سے مشکلات کے بعد یہ مہمان جو بمنزلہ شیطان رجیم گیا تھا، روانہ ہو گیا، اس فقرہ سے ہمارے دوست کی مہمان نوازی کی شان ظاہر ہوتی ہے، جو بے اختیار واقعہ بن کر ان کی زبان قلم پر آگیا اور ہم سب احباب نے ان کے اس فقرے سے بڑا مزہ لیا،

ابو العلاء و ما الیہ

عربی زبان میں خیام عرب ابو العلاء کے حالات سوانح اور اس کے مساعی پر بہترین تبصرہ، حجم ۴۰۲ صفحے، قیمت مجلد ہے، غیر مجلد عہ، مطبوعہ مصر،

"منیجر"

سلاطین غزنہ کے ہندوستانی حکام

از

مولینا سید ابو ظفر صاحب ندوی،

ہندوستانی زبان میں عام طور پر جو تاریخیں ہندوستان کی لکھی گئی ہیں خصوصًا اسکولوں اور کالجوں کے طلبہ کے لئے، ان کو پڑھ کر نہ صرف عام تعلیمیافتہ اشخاص بلکہ بلند طبقے کے سنجیدہ اور فہمیدہ لوگ بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی شہاب الدین محمد غوری ہے حالانکہ اس سے صدیوں پہلے ہندوستان میں اسلامی سلطنت کی بنیاد پڑ چکی تھی،

سچ پوچھو تو اسلامی سلطنت کا اصلی بانی محمد بن قاسم ثقفی ہے، جس نے پہلی صدی کے آخر میں بحر عرب سے لیکر کشمیر تک فتح کر کے اسلامی سلطنت کا سکہ بٹھایا، لیکن اس زمانہ میں ہندوستان تین حصوں میں منقسم تھا، سندھ، ہند اور دکن،

محمد بن قاسم نے جو ملک فتح کیا، اس زمانہ میں اسکو سندھ کہتے تھے، اور اسی لئے عام لوگ محمد ابن قاسم کو فاتح ہندوستان نہیں، بلکہ فاتح سندھ جانتے ہیں،

مہلب بن ابی صفرہ (۴۴ھ) کے بعد صحیح معنی میں سب سے پہلا حملہ ہندوستان پر سبکتگین کا تھا جس نے ۳۸۰ھ کی جنگ میں ملتان سے لیکر پشاور تک فتح کر کے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی، سرحد کی حفاظت اور مفتوحہ علاقہ کے انتظام کے لئے ایک مسلمان ترک اس نے مقرر کیا، یہ سرحدی ہندوستان کا پہلا مسلمان حاکم ہے،

سلطان محمود غزنوی ماہ صفر ۳۸۹ھ میں جب تخت نشین ہوا، تو سب سے پہلے سلطنت بخارا سے اسکی جنگ ہوئی، اسی میں کچھ دنوں الجھا رہا، اس لئے ہندوستان کی طرف رُخ نہ کرسکا ۳۹۱ھ اور ۳۹۴ھ میں جے پال سے سرحدی جنگیں ہوئیں ان میں سلطان محمود کامیاب رہا، لیکن سندھ کے اس پار کوئی ملک ہاتھ نہ آیا، ۳۹۵ھ میں بھاٹیہ (بھیرہ) فتح ہوا، اور ۳۹۶ھ میں ملتان کی ریاست باجگذار ہوگئی، ان جدید مقبوضات کے لئے جو دریائے سندھ کے اس پار تھے، ایک حاکم کی ضرورت محسوس ہوئی، سلطان محمود نے نہایت فراخدلی سے سکھپال نامی ایک ہندوستانی نو مسلم کو جو کسی راجہ کا نواسہ تھا، یہاں کا حاکم بنایا[1]،

یہ جدید مفتوحہ علاقہ میانوالی سے لیکر دریائے سندھ کے کنارے ملتان تک تھا، جس کی حکومت سکھپال کے سپرد کی گئی، سلطان محمود غزنوی کا یہ پہلا تجربہ تھا، کہ ہندوستان پر ہندوستانیوں کے ذریعہ حکومت کیجائے، مگر افسوس یہ ہے کہ وہ اس میں کامیاب نہ ہوا، سکھپال نے جب دیکھا کہ سلطان ہندوستان سے دور ترکوں سے جنگ میں مشغول ہے، تو اس نے باغی ہوکر خودمختاری کا اعلان کردیا، سلطان کو اس بغاوت کی خبر اس وقت ہوئی، جب ۳۹۸ھ میں ترکوں پر فتح پاکر غزنہ واپس آرہا تھا، چنانچہ اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے ایک ترکی افسر کو ہندوستان بھیجدیا، جس نے سکھپال کو گرفتار کرکے ایک لاکھ تاوان وصول کیا، اور غالباً اس کے بجائے کوئی دوسرا ترک حاکم مقرر ہوا

۴۰۴ھ میں سلطان محمود نے قلعہ نندنہ پر حملہ کیا، جو کوہ بالاناتھ پر راولپنڈی کے پاس کوہ نمک میں واقع تھا، یہاں کا حاکم بھاگ کر درۂ کشمیر میں چلا گیا، اور اس کا ماتحت افسر جنگ میں ناکامیاب ہوا اور مجبوراً قلعہ سلطان کے سپرد کردیا، سلطان نے پورے علاقہ پر قبضہ کرکے اپنے ایک ترک افسر سارغ نامی کو یہاں کا حاکم بنایا، جو اپنے حسن انتظام کے سبب سے سلطان مسعود غزنوی کے زمانہ تک اپنے عہدہ پر برقرار رہا[2]،

---

[1] زین الاخبار ص ۶۹ لندن سنہ ۵۲ء ص ۶۲ مطبوعہ لندن،

سنہ ۴۲۱ھ میں سلطان محمود نے اپنے لڑکے مسعود کو ملتان بھیجا، یہ مشہور پایہ تخت تھا، خارجی اور سیاسی اعتبار سے بھی یہاں کسی حاکم کا رہنا ضروری تھا، تاکہ ایک طرف غیر مسلموں پر نگاہ رہے اور دوسری طرف اسماعیلیوں کی سرگرمی کا خاتمہ کر دیا جائے، جو پایہ تخت میں انقلاب کی سازش کر رہے تھے، اسکے علاوہ سلطان محمود اپنے لڑکے مسعود سے ناراض بھی تھا، اسلئے پایہ تخت سے دور بھیجکر ایک قسم کی تنبیہ بھی مقصود تھی، اسلئے سنہ ۴۲۱ھ میں ہرات کی حکومت اس کے سپرد ہوئی،

اس کے بعد سلطان نے اختیارات کے دو حصے کر دیئے، دیوانی تو قاضی شیرازی کے سپرد کئے، فوجداری اور سپہ سالاری کے عہدہ پر سپہ سالار حاجب علی اریارق ایک ترک افسر کو مقرر کیا، اس نے عرصہ تک یہاں حکومت کی، اس لئے اس کے دشمن بہت ہو گئے، چنانچہ جب اسکی متعدد شکایتیں سلطانی دربار میں کی گئیں، تو سلطان بھی اس سے متاثر ہوا، اس نے اس کو غزنہ کے دربار میں طلب کیا، مگر وہ نہ گیا، سلطان محمود کا یہ آخری وقت تھا، اس لئے موقع نہ ملا کہ اس کی نافرمانی کی سزا دیتا، سلطان محمود کے انتقال کے بعد جب سلطان محمد تخت نشین ہوا تو اس نے بھی دربار میں حاضر ہونے کا فرمان بھیجا، مگر حاجب علی یہ کہکر ٹالتا رہا کہ سلطان مسعود اگر عراق سے حرکت نہ کرے گا، اور آپ مستقل بادشاہ تسلیم کر لئے جائینگے تو اسوقت میں غزنہ حاضر ہو جاؤں گا[1]

سلطان محمود کا وزیر احمد بن حسن میمندی جو قلعہ کالنجر میں قید تھا، اسکو سپہ سالار مذکور کی یہ خبریں ملتی رہیں، وہ تجربہ کار وزیر تھا، سمجھ گیا کہ اگر اسکو ذرا بھی ڈھیل دی گئی، تو وہ بہت جلد خود مختاری کا اعلان کر دے گا، اس لئے جب وہ قید سے نجات پاکر سلطان مسعود کے پاس جانے لگا، تو اس نے سپہ سالار اریارق سے کہا کہ تم نے بار بار نافرمانی کی ہے، اس لئے اب بہتر یہ ہے، کہ تم میرے ساتھ چلو تاکہ تمہارے متعلق بادشاہ سے گفتگو کر کے تمکو خلعت اور فرمان دلاؤں، اسکے بعد تم عزت سے ہندوستان واپس جاؤ،

---

[1] بیہقی ص ۲۶۶ کلکتہ،

وزیر کی چرب زبانی سے سپہ سالار متاثر ہو کر غزنہ چلا گیا، سلطان اس وقت بلخ میں تھا، وزیر نے دربار سلطانی میں حاضر ہو کر اصل حقیقت سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ فوراً دربار میں طلب کیا گیا، ابتدا میں اسکی بڑی عزت کی گئی، مگر جب وہ نشہ میں برسر دربار امرا، کو گالیاں دینے لگا، تو چہار شنبہ ۱۹ ربیع الاول ۴۲۲ھ میں بادشاہ نے اس کو نظر بند کر دیا[1]

غالباً دوسرے حاکم کے لاہور پہنچنے تک عبداللہ قراتگین قائمقام سپہ سالار لاہور قاضی شیراز کیساتھ ملکر کام کرتا رہا[2]

چھ سات ماہ کے بعد شعبان ۴۲۲ھ میں احمد نیال تگین ہندوستان کا سپہ سالار ہو کر آیا لیکن بدقسمتی سے وزیر احمد بن حسن میمندی اس سے سخت ناراض تھا، اور قاضی شیرازی کا دل بھی اس سے صاف نہ تھا، اس لئے وزیر نے ان دونوں کو لڑا دیا، چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد دونوں میں کشمکش شروع ہو گئی، انجام کار دونوں میں سخت عداوت ہو گئی، دونوں نے دربار سلطانی میں شکایتیں لکھیں لیکن قاضی صاحب کی کوئی شنوائی نہیں ہوئی، اسلئے وہ تو خاموش ہو گئے، مگر احمد نے یہ حرکت کی کہ خراج کی وصولی بھی خود ہی شروع کر دی اور اس طرح راجوں اور ٹھاکروں سے وصول کر کے کافی روپیہ جمع کر لیا،

اب اس نے ہندوستانی، ترکی اور دیلمی لوگوں کو فوج میں بھرتی کر کے ایک زبردست لشکر تیار کر لیا، اس فوج کو لیکر گنگا کے میدان میں جا پہونچا، پھر اسکو عبور کر کے جب آگے بڑھا، تو بائیں طرف اس کو ایک شہر نظر آیا، جس کا نام "نبارس" تھا، یہ بہت بڑا شہر دو فرسخ (چھ میل) چوڑا، اور دو ہی فرسخ لمبا تھا، اور لب گنگا ہونے کے باعث پانی کی کوئی کمی نہ تھی،

لشکر نے جب اس شہر پر حملہ کیا، تو صبح کا وقت تھا، اس وقت سے عصر تک اسکو لوٹتا رہا،

---

[1] بیہقی صفحہ ۲۴۴ و صفحہ ۲۷۰ کلکتہ [2] بیہقی صفحہ ۴۹۶،

مگر اس پر بھی بزازوں، عطر فروشوں اور گوہر فروشوں کے بازار سے آگے نہ بڑھ سکا کیونکہ غنیم اس عرصہ میں تیار ہو کر آگیا تھا، فوج نے سونا چاندی، جواہرات اور عطریات لوٹ کر بڑا ذخیرہ حاصل کیا، لوٹ کے مال میں چند ہاتھی بھی تھے۔

احمد جب لاہور واپس ہوا تو لوٹ کا پانچواں حصہ اور دوسری نادر چیزیں دربار سلطانی میں روانہ کیں، قاضی صاحب کو اس پر بڑا حسد ہوا، انھوں نے ایک عریضہ خفیہ طور پر بادشاہ کے پاس روانہ کیا جس میں تحریر تھا کہ احمد نے لوٹ کا مال بہت حاصل کیا ہے، اس میں سے اعلیٰ درجہ کا مال اور بیش قیمت چیزیں چھپا لی ہیں، مال کی اصلی فہرست جاسوسوں کے ذریعہ جو حاصل ہوئی ہے، وہ ملاحظہ کے لئے ارسال خدمت ہے،

سلطان پر اس خفیہ تحریر کا بڑا اثر پڑا، خصوصاً ترکمانوں کی فوجی بھرتی سے بہت خوفزدہ ہوا کیونکہ وہ اسوقت تک ۲۰ غلام خرید چکا تھا، اس نے سمجھا کہ غالباً وہ خود مختاری کا خواب دیکھ رہا ہے،

بادشاہ نے مناسب سمجھ کر ایک ہندو افسر ناتھ بن ملی کے ماتحت تنبیہ کے لئے ایک فوج روانہ کر دی، لیکن افسوس کہ اس فوج کو شکست ہوئی اور ناتھ مارا گیا، احمد اب پہلے کی بہ نسبت زیادہ طاقتور ہو گیا تھا، اس کا مقابلہ اب آسان نہ تھا، اسلئے بادشاہ نے مجلس مشاورت میں یہ طے کیا کہ ایک جدید طاقتور فوج اسکے مقابلہ کو روانہ کیجائے، لیکن اس فوج کی سرداری کون لے، اس کے لئے کوئی تیار نہ تھا، آخر ایک ہندو افسر تلک بن جھیلن نے اس کو قبول کر لیا، اور ایک بڑی فوج لیکر منگل کے دن ۱۵ رجمادی الاول ۴۲۵ھ کو لاہور روانہ ہو گیا[1]،

ہندوستان پہونچکر اس نے احمد کا مقابلہ کیا، مگر شکست ہوئی، پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوا، اس نے بڑی تیزی سے فوجی بھرتی شروع کر دی، اسوقت شمالی ہندوستان میں دو قومیں زیادہ جنگجو تھیں، ایک گوجر راجپوت دوسرے سندھ کے جاٹ، بیہقی نے جنگ سیستان کے موقع پر ان ہندو سپاہیوں کی مجنونانہ بہادری کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس سے یقین ہوتا ہے، کہ غالباً راجپوتوں کی تعداد

[1] کامل ابن اثیر جلد ۹ صفحہ ۱۴۱، مصر، [2] زین الاخبار صفحہ ۱۰۲ مطبوعہ لندن،

فوج میں بہت زیادہ تھی، اور درحقیقت تمام شمالی ہند میں یہی ایک قوم ایسی بہادر تھی جو ترکوں کا مقابلہ کر لیتی تھی،

تلک نے جنگی تیاری جب کافی طور پر کر لی تو دوسری تدبیر یہ کی کہ خفیہ طور پر احمد کے لشکر میں پھوٹ ڈالدی، اور اس طرح اس کی فوج کے دو حصے ہوگئے، تاہم وہ ایک ترک تھا شجاعت اس کے رگ و پے میں پیوست تھی، اس نے نہایت استقلال سے میدان کارزار میں جنگ آزمائی کی لیکن آخر میں شکست کھا کر سندھ کی طرف چلا گیا، [1]

شکست دینے کے بعد تلک نے سب سے پہلے لاہور کے قلعہ پر قبضہ کر لیا، اور احمد کے ساتھی جس قدر وہاں تھے، سب کے داہنے ہاتھ کاٹ ڈالے، اس سخت سزا سے لوگوں کو بڑی عبرت ہوئی، احمد کے ہمراہی پناہ مانگ مانگ کر جدا ہونے لگے،

اب تلک نے احمد کا تعاقب کا شروع کیا، جہاں مڈبھیڑ ہو جاتی، ایک سخت جنگ کی شکل اختیار کر لیتی، تلک نے اسی کیساتھ احمد کے سپاہیوں کو اپنی طرف مائل کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترکمانوں کی پوری فوج احمد سے علٰحدہ ہو کر تلک کے پاس پناہ گزین ہوگئی اور اسکے پاس صرف تین سو آدمی رہ گئے،

تلک نے جب دیکھا کہ اب بھی احمد ہاتھ نہیں آتا، تو اس نے تمام ٹھاکروں کے یہاں خطوط لکھے کہ جو شخص احمد کو پناہ دیگا، وہ شاہی مجرم قرار دیا جائے گا، اور اس کے گرفتار کرنے والے کو پانچ لاکھ درہم (ایک لاکھ روپیہ) انعام ملیگا۔ اس انعام نے احمد کے دشمنوں میں بڑی تعداد کا اضافہ کر دیا، اب سندھ کا ہر جٹ (کاشتکار) اس کی تلاش میں سرگرداں نظر آنے لگا،

غالباً احمد بلوچستان یا سیستان چلا جانا چاہتا تھا، لیکن عین اس موقع پر جب کہ دریائے سندھ کے

[1] بیہقی صفحہ ۵۳۲ کلکتہ،

پاس تھا، وہ تین ہزار سوار اور پیادہ سندھی جٹ آپہنچے، احمد کے پاس دو سو سواروں سے بھی کم تھے، اسلئے دریا پار ہو کر نکل جانا چاہا، لیکن سندھی جٹ بھی دوڑ پڑے، اور اسکو چاروں طرف سے گھیر کر مار ڈالا اور اسکے لڑکے کو گرفتار کر لیا، بقیہ کچھ قتل ہوئے، کچھ ڈوبے، جو بچے وہ قید کر لئے گئے، تلک بھی قریب ہی تھا، جلد آپہنچا، اور اس خوشخبری سے بہت ہی مسرور ہوا،

اب جٹوں نے پانچ لاکھ درہم کا تقاضا شروع کیا، تلک نے کہا کہ احمد کا تمام مال تم نے لوٹ لیا، کیا یہ تمھارے لئے کافی نہیں ہے، ؟ اس کے علاوہ تم نے شاہی خدمات انجام دیئے، یہ تمھا فرض تھا، آیندہ تمھارا خیال رکھا جائے گا،

لیکن اس چرب زبانی سے جٹوں کا سردار ذرا متاثر نہیں ہوا، اس نے بغیر رقم لئے احمد کا سر اور اس کے لڑکے کو حوالہ کرنے سے صاف انکار کر دیا، آخر گفت و شنید کے بعد ایک لاکھ درہم (۲۵ ہزار روپے) پر معاملہ طے ہو گیا، تلک فتحیاب ہو کر لاہور واپس آیا، اور انتظام مملکت میں مصروف ہو گیا ذو الحجہ ۴۲۶ھ میں تلک اپنے قائم مقام (نائب) کو چھوڑ کر غزنہ واپس چلا گیا،[1]

شنبہ ۳ ر ذو القعدہ ۴۲۷ھ میں سلطان مسعود نے اپنے لڑکے امیر مجدود کو ہندوستان کا والی (حاکم اعلیٰ) بنا کر لاہور بھیجا، چلتے وقت بہت ہی بیش قیمت خلعت جیسا کہ والیانِ ملک کو دینے کا دستور تھا عنایت کیا اور اسی کیساتھ امارت کی نشانی طبل علم، اور ہاتھی مع ہودج بھی سرفراز فرمایا، لشکر کیساتھ تین تجربہ کار مشیر بھی تھے، جن میں سے ابو منصور بن ابو القاسم علی نوکی کو برادر سعد سلمان کو مستوفی (محاسب) کا عہدہ عنایت فرمایا، اور فوجی کام محمد کے سپرد ہوا، سلطان محمود کے مشہور غلام ابو النجم ایاز بن ایماق کو امیر مجدود کا اتالیق بنا کر ساتھ کر دیا[2]، اور خوارزم شاہ (خیوہ) کے لڑکے رشید نامی کو بھی اسکے سپرد کر دیا، کہ ہندوستان پہونچکر لاہور کے قلعہ میں اس کو نظر بند رکھے،[3]

---

[1] بیہقی صفحہ ۵۳۶ کلکتہ، [2] فرشتہ جلد اول ص ۴۲، [3] بیہقی صفحہ ۶۲۲ کلکتہ،

سنہ ۴۳۲ھ میں امیر محمد بن محمود غزنوی نے اپنے لڑکے نامی بن محمد بن محمود کو ملتان اور منصورہ (سندھ) کا حاکم بنایا، لیکن امیر محمد کے قتل ہونے پر امیر مودود نے ایک امیر ابونصر محمد بن احمد کو لشکر دیکر سندھ روانہ کیا، اس نے شاہزادہ نامی بن محمد کو قتل کر کے سندھ اور ملتان پر قبضہ کر لیا،

شاہزادہ مجدود بن مسعود کو جب معلوم ہوا کہ بڑا بھائی مودود بن مسعود، غزنہ کا سلطان ہو گیا، تو اس کے دل میں بھی سلطنت کی ہوس پیدا ہوئی، وہ ہر طرف سے دولت جمع کرنے لگ گیا، اور ایک زبردست فوج کے ساتھ مقابلہ کا اس نے پورا بندوبست کیا، اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے اتالیق امیر ایاز کے ذریعہ سندھ سے لیکر ہانسی اور تھانیسر تک کا بہترین انتظام کیا، اس کا خیال تھا، کہ دہلی بھی فتح کر لے، اور اسی لئے وہ ہانسی میں مقیم تھا، لیکن سلطان مودود کو اسکی نیت کا پتہ چل گیا، اس نے ایک لشکر مدافعت کے لئے روانہ کیا، ادھر مجدود بھی غزنوی لشکر کے پہونچنے سے پہلے قلعہ لاہور میں داخل ہو گیا،

اس عرصہ میں غزنوی لشکر بھی لاہور پہونچ گیا، مگر ان میں سے اکثر امیر مجدود سے مل گئے، قریب تھا، کہ غزنوی فوج شکست کھا جائے، کہ ۱۳ ذوالحجہ سنہ ۴۳۲ھ میں امیر مجدود والی ہندوستان صبح کے وقت اپنے خیمہ میں مردہ پایا گیا، اور کچھ دنوں کے بعد اس کا اتالیق ایاز بھی لاہور میں مرگیا، اور وہیں دفن ہوا[1] (اسکی قبر آج تک لاہور میں مشہور ہے)

امیر مجدود اور غلام ایاز کس طرح مارے گئے، اس کا صحیح حال کسی کو معلوم نہیں ہوا، مگر یہ ظاہر ہے کہ ان دونوں کی موت خفیہ طور پر زہر سے ہوئی، ان کی موت نے راستہ صاف کر دیا، اور اب ہندوستان بلا شرکت غیرے سلطان مودود بن مسعود کے قبضہ میں آگیا،

لیکن خاندان غزنویہ میں اس خانہ جنگی سے بڑا ضعف پیدا ہو گیا تھا، اس کو ہندوستانیوں نے

---

[1] الکامل جلد نہم صفحہ ۱۶۲ و فرشتہ جلد اول صفحہ ۴۶ بمبئی،

محسوس کیا، چنانچہ ۴۳۵ھ میں راجہ دہلی نے دو اور راجون کی مدد سے تھانیسر اور ہانسی پر حملہ کر کے فتح کر لیا، اور یہ دونوں قلعے سلطان کے قبضہ سے نکل گئے، اس فتح یابی سے ان کی ہمت بڑھ گئی، اور آگے بڑھکر قلعہ بھیم نگر پر حملہ آور ہوئے، قلعہ کے ترک سپاہی جانتے تھے کہ ان کا مقابلہ دشوار ہے پھر بھی وہ قلعہ بند ہو کر لڑنے لگے، اور لاہور کے حاکم کو اطلاع دیکر مدد کی درخواست کی، لیکن افسوس کہ ان کو کسی قسم کی مدد نہ ملی، ان مٹھی بھر بہادر ترکوں نے ہندوستانیون کا چار مہینہ تک مقابلہ کیا، جب لاہور کی مدد سے مایوس ہو گئے، اور سامان رسد ختم ہو گیا، تو غنیم سے امان طلب کر کے قلعہ اس کے سپرد کیا اور خود لاہور چلے آئے،

پنجاب اور اس کے ارد گرد کے حکمرانوں نے جب غزنوی سلطنت کا یہ حال دیکھا، کہ ایک طرف ان کے دشمن فتحیاب ہو رہے ہیں، اور دوسری طرف غزنہ کے ترک حاکم خانہ جنگی میں مبتلا ہیں، اور کوئی ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتا، تو ان کو بھی طمع دامنگیر ہوئی، اور چاہا کہ لاہور پر قبضہ کریں، چنانچہ تین حاکمون نے مل کر دس ہزار سوار اور بے شمار پیادوں کیساتھ لاہور کا محاصرہ کر لیا، اب ترکون کی آنکھ کھلی، غفلت اور خانہ جنگی کا نتیجہ سامنے نظر آرہا تھا، اس لئے فوراً غزنہ خبر بھیجکر سلطان سے امداد کے طالب ہوئے، ادھر ہندوستان میں جتنے ترک تھے، وہ اپنی خانہ جنگی کو بالاے طاق رکھکر متحد ہو گئے،

اس اتحاد کا بڑا خوشگوار نتیجہ برآمد ہوا، ترکوں نے ایک طرف سے جم کر مقابلہ شروع کیا، اور دوسری طرف سے جنگی تدبیریں اور جوڑ توڑ سے کام لیا، چنانچہ قبل اس کے کہ غزنہ سے امدادی فوج آئے ان راجوں میں سے ایک نے اطاعت قبول کر لی، یہ دیکھ کر بقیہ دو گھبرا کر بھاگ نکلے، قلعہ کے ترکوں نے جو ان کو فرار ہوتے دیکھا تو ان کا تعاقب شروع کیا، چنانچہ پہلے ایک راجہ کو جس کا نام دیپال ہری ناتھ تھا، جا لیا، دونوں میں سخت جنگ ہوئی، آخر راجہ شکست کھا کر بھاگا، اور

اپنے تمام لشکر کے ساتھ پہاڑی قلعہ مین جاکر پناہ لی، اس وقت اسکے پاس پانچہزار سوار اور ستر ہزار پیادے تھے، ترکوں نے بھی قلعہ کا محاصرہ کر لیا،

راجہ کو اس قلعہ میں خلاف توقع پناہ لینی پڑی، اور غالباً قلعہ میں اسقدر سامان رسد نہ تھا کہ پون لاکھ سپاہیوں کو کافی ہو، اسلئے انھوں نے متعدد حملوں سے محاصرہ توڑنے کی کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوئے، یہان تک کہ راجہ نے پریشان ہو کر صلح کی درخواست کی اور قلعہ حوالہ کردینے کا اقرار کیا، ترکون نے اس درخواست کو قبول کرنیسے اسوقت تک کیلئے انکار کر دیا، جب تک کہ راجہ اپنے تمام مقبوضہ قلعے حوالے نہ کر دے، یہ شرط بڑی سخت تھی، راجہ کسی طرح قبول کرنے کیلیے تیار نہ ہو گا، لیکن بڑی مصیبت یہ تھی کہ سامان رسد ختم ہو گیا تھا، اور ہر وقت یہ خوف دامنگیر رہتا تھا، کہ ایسا نہ ہو کہ ترک قلعہ فتح کر لین، اس لئے مجبور ہو کر تمام شرطیں قبول کرنی پڑین، اور تمام قلعے خالی کرکے ترکوں کے حوالے کئے، ۱۵ ہزار مسلمان جو ان قلعوں میں قید تھے، رہائی پاکر مسلمانوں سے آملے[1]،

اس کامیابی نے ترکوں کی ہمت بڑھا دی، اسلئے اب دوسرے حریف کے گھر پہنچکر دروازہ پر دستک دی، اس راجہ کا نام "ناتھ رائے" تھا، راجہ نے بھی ہمت کرکے مقابلہ کے لئے فوج کو درست کیا، اور آگے بڑھ کر ترکوں کو روکا، دونوں میں بڑی خونریز جنگ ہوئی، آخر ہندوستانی شکست کھا کر بھاگے، راجہ مارا گیا، پانچہزار ہندوستانی مقتول اور مجروح ہوئے اور بہت سے گرفتار کئے گئے، ترکوں نے ان کے مال واسباب سب لوٹ لئے، اسلحہ کا بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا اور بے شمار جانوروں پر انھوں نے قبضہ کیا،

جب ہندوستان کے دوسرے حکمرانوں کو یہ حال معلوم ہوا تو سب مطیع ہو گئے، اور اپنے قیمتی تحفے کا خراج دربار سلطانی میں روانہ کیا، اور اپنی اپنی سلطنت کی طرف سے حفاظت کیلئے اقرار نامے لکھے،

[1] الکامل جلد نہم ص ۲۵۴، لندن و فرشتہ مقالہ ۵۲، صفحہ ۲۵۴ و صفحہ ۲۵۵، لندن،

سنہ ۴۳۲ھ میں سلطان مودود نے اپنے ہندوستانی مقبوضات کے دو حصے کر ڈالے، دریائے سندھ کے اس پار ملک کا پایۂ تخت پشاور قرار پایا، اور اس پر اپنے لڑکے منصور کو حاکم بنایا، اور دریائے سندھ کے مشرقی جانب کا دارالامارۃ لاہور بنایا گیا، یہاں سلطان کا لڑکا شاہزادہ ابوالقاسم محمود حاکم بنا کر بھیجا گیا، اور ابو علی حسن کوتوال غزنہ کو ہندوستان کا سپہ سالار کر کے انکے ساتھ کر دیا، تاکہ سرکش ہندوستانیوں کی بغاوت کا خاتمہ کر دے،

ابو علی حسن غزنہ سے چل کر پشاور آیا، اور یہاں سے قلعہ ماہ تیلہ روانہ ہوا، قلعہ کے باغی حاکم آہنی نامی کو جب یہ معلوم ہوا، تو وہ چپ چاپ بھاگ نکلا، اور اس طرح بغیر جنگ کے یہ بغاوت فرو ہو گئی،

ہندوؤں کا سردار بجری ٹائک سلطان محمود غزنوی کے عہد میں ممتاز لوگوں میں سے تھا، مگر پھر وہ اس بادشاہ کی خدمت کرتا رہا، لیکن اسکی بعض باتوں سے ناراض (یا خوفزدہ) ہو کر غزنہ سے بھاگ آیا، اور کشمیر کے دروں میں وہ اپنی زندگی بسر کر رہا تھا، ابو علی سپہ سالار نے ایک آدمی بھیجکر اس کی غلط فہمی دور کرائی، پھر تسلی اور دلاسا دے کر لاہور لے آیا، و دبدو گفتگو کر کے اسکو مطمئن کیا، اور عہد و پیمان کے بعد غزنہ روانہ کیا، جہاں امیر مودود نے اسکی کافی عزت افزائی کی،

اب ابو علی نے پشاور، لاہور وغیرہ کے سرکشوں کو مطیع کر کے اور ملک کا مکمل انتظام درست ہو جانے کے بعد سندھ کا رُخ کیا، جہاں سرکش (غالباً اسماعیلی سومری) لوگوں نے بڑی بدعملی پھیلا رکھی تھی،

سندھ پہونچکر اس نے تمام سرکشوں کی خوب خبر لی، اور حتی الامکان تمام باغیوں سے ملک کو پاک کر دیا، جب پشاور، لاہور، اور سندھ کا حال قابلِ اطمینان ہو گیا، تو ابو علی غزنہ واپس چلا گیا،[1]

---

[1] فرشتہ جلد اوّل ص۴۹ بمبئی،

سنہ ۴۲۱ھ میں علی بن ربیع حاجب باغی ہوکر غزنہ سے بھاگ نکلا، اور بزور پشاور اور سندھ پر قابض ہوگیا، لیکن اسی سال کے آخر میں سلطان عبدالرشید نے علی بن ربیع کو دلاسا اور تشفی دیکر پشاور اور سندھ سے واپس بلا لیا اور اسکے بجائے حاجب نوشتگین جو بہترین سپہ سالار تھا، اسکو بڑے لشکر کے ساتھ ہندوستان کا والی (نائب الحکومت) بناکر لاہور روانہ کیا، جب لاہور آیا تو اس نے سب سے پہلے ملک کی اس انتظامی چول کو جو ڈھیلی ہوگئی تھی، درست کی، پھر داخلی امور درست کر لینے کے بعد خارجی سیاست کی طرف متوجہ ہوا، غزنوی سلطنت میں خانہ جنگی سے جو خلل پڑگیا تھا، اس سے سلطنت کا رعب جاتا رہا، اور اسی سبب سے حکام لاہور کو اتنی فرصت نہ ملی، کہ کانگڑہ کا قلعہ واپس لیتے، سپہ سالار نوشتگین کو اس کا بڑا خیال تھا، چنانچہ جیسے ہی اسکو فرصت ملی وہ ایک جرار فوج لیکر نگر کوٹ (کانگڑہ) کی طرف روانہ ہوگیا، قلعہ والوں کو جب اس کا حال معلوم ہوا تو قلعہ بند ہوگئے، سپہ سالار نے بھی اس کا محاصرہ کرلیا، اور صرف پانچ چھ روز میں اس کو فتح کر ڈالا سپہ سالار نوشتگین بڑا مدبر شخص تھا، اور کچھ دنوں ہندوستان میں رہ گیا ہوتا، تو ہندوستان میں فتوحات کا دروازہ پھر کھل جاتا، لیکن افسوس کہ سلطان عبدالرشید کے قتل ہوجانے سے سنہ ۴۴۳ کے آخر میں غزنہ واپس چلا گیا، اور غالباً سنہ ۴۵۰ھ تک اس کا نائب ہندوستان پر حکومت کرتا رہا، سنہ ۴۵۰ھ میں جب سلطان ابراہیم تخت نشین ہوا، تو اس نے اپنی مملکت کا جدید انتظام کیا، لیکن تاریخوں سے اس کا پتہ نہیں چلتا، کہ سنہ ۴۵۰ھ سے سنہ ۴۶۹ھ تک ہندوستان میں کون کون والی (نائب السلطنت) ہوے،

سنہ ۴۶۹ھ میں سلطان ابراہیم غزنوی نے اپنے لڑکے ابوالقاسم محمود کو لاہور روانہ کیا، اس کا مرتبہ اور درجہ بھی بلند کردیا، خاص اس کے لئے غزنہ سے خلعت فاخرہ گھوڑے اور مرصع ہتھیار روانہ کئے، اس عزت افزائی سے خاص وعام میں اسکی بڑی شہرت ہوگئی، اس نے بھی اپنی اعلیٰ لیاقت

سے باپ کو خوش رکھنے کی ہمیشہ کوشش کی، اسی لئے سلطان نے اسکو اپنا ولی عہد قرار دیا،

شاہزادہ محمود بڑا بہادر تھا، اس نے اپنی شجاعت کا بڑا سکہ ہندوستان میں بٹھایا، یہ آگرہ تک یلغار کرتا ہوا چلا گیا تھا، چنانچہ مسعود سعد سلمان لاہوری نے جو قصائد اسکی مدح میں لکھے ہیں، اس میں اس کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، یہ علم کا بڑا قدرداں تھا، اس کے ساتھ علما، شعرا، دربار میں برابر حاضر رہتے،[۱]

شاہزادہ محمود کو خلیفہ بغداد القائم متوفی ۴۹۷ھ نے بھی ولی عہد تسلیم کر لیا، اور "سیف الدولہ، عز الملۃ صنیع امیر المومنین" کا خطاب عنایت فرمایا، چنانچہ سرکاری کاغذوں میں اس کا نام اس طرح درج کیا جاتا تھا "سیف الدولہ عز الملۃ ابو القاسم محمود صنیع امیر المومنین"

اس خطاب کے ملنے پر متعدد شعراء نے قصیدے لکھے، اور مبارکبا ددی، انہی میں سے مسعود سعد سلمان لاہوری بھی تھا، آخر میں سلطان ابراہیم نے اس کو یہ بھی اجازت دیدی تھی، کہ وہ ہندوستان میں سلطان کے نام کیساتھ خطبوں میں اپنا نام بھی شامل کرلے، اس نے ہندوستان میں ۴۹۲ھ تک حکومت کی،

۴۹۲ھ میں سلطان علاء الدولہ مسعود بن ابراہیم نے اپنے لڑکے شیرزاد کو عضد الدولہ کا خطاب دیکر لاہور بھیجا، ابو نصر فارسی اس کا نائب اور سپہ سالار اس کے ساتھ کر دیا گیا، اسی نے مسعود سعد سلمان لاہوری کو جالندھر (پنجاب) کی حکومت عطا کی،[۲]

عضد الدولہ نے ہندوستان پہونچکر حاکم اور محکوم کے تعلقات کو خوشگوار بنانے مین بڑی کوشش کی، اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں، کہ اس کے عہد میں کسی قسم کی بغاوت نہیں ہوئی،

غالبًا ۵۰۰ھ میں حاجب طغاتگین کے سپرد ہندوستان ہوا، اس نے لاہور پہونچکر جب ہندوستان کی باگ ہاتھ میں لی ہے، تو دیکھا کہ سلطنت کے اندرونی حصہ میں تو امن قائم ہے، لیکن

---

[۱] الیٹ جلد ششم ص ۲۵۵ ضمیمہ ۵۲ جرنل رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن ۱۹۱۶ء میں پروفیسر برون کا مضمون

سرحدی لوگ ہمیشہ دق کیا کرتے ہیں، اس لئے اس نے ایک جرار فوج لیکر گنگا کو عبور کیا، اور تمام سرکشوں کو سزا دے کر ان کے مددگاروں کو دباتا ہوا، اس قدر دور نکل گیا کہ سوائے سلطان محمود کے کوئی دوسرا سپہ سالار یہاں تک نہیں پہونچا تھا، طغاتگین یہاں اطمینان کر کے مال غنیمت کیساتھ لاہور واپس آکر انتظام سلطنت میں مشغول ہو گیا[1]

۵۰۹ھ میں سلطان ارسلان شاہ نے محمد باہلیم کو ہندوستان کا والی (نائب السلطنت) بنایا جس نے لاہور آکر ملک کا بہترین انتظام کیا، کیونکہ اس میں انتظامی قابلیت بڑی اعلیٰ تھی،

۵۱۱ھ میں جب ارسلان شاہ کے مرنے کی خبر ہندوستان پہونچی تو یہاں کے والی کی نیت بدل گئی، اس نے ہر طرح سے اپنے کو تیار کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا، بہرام شاہ یہ خبر پاتے ہی بڑی فوج لیکر غزنہ سے ہندوستان آدھمکا، دونوں میں سخت جنگ ہوئی جس میں بہرام شاہ کامیاب رہا، ۲۷ رمضان ۵۱۲ھ کو محمد باہلیم گرفتار ہو کر بہرام شاہ کے سامنے پیش ہوا، گو اسوقت اسکو قید کا حکم دیا گیا، مگر کچھ دنوں کے بعد اس کی اعلیٰ قابلیت کو دیکھتے ہوئے قید سے رہا کر کے پھر ہندوستان کا والی بنا دیا، اور خود غزنہ واپس چلا گیا،

محمد باہلیم نے جو میدان صاف دیکھا تو پھر اسکی نیت بگڑی، اس نے سوالک کے اطراف میں بھیرہ کے پاس ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام "ناگور" رکھا، اپنے تمام اہل و عیال کو اس قلعہ میں رکھکر خود لشکر جمع کرنے میں مشغول ہو گیا، اس نے چند ہی دنوں میں عرب، عجم، افغان اور خلجی لوگوں کو بھرتی کر کے ایک زبردست فوج تیار کر لی، اور جس قدر سرکش ہندوستانی تھے انکو اس نے کچل ڈالا جب اندرون ملک کی طرف سے اطمینان ہو گیا، تو اس نے پھر خود مختاری کا اعلان کر دیا،

بہرام شاہ یہ سنتے ہی فوج لیکر ہندوستان پہونچ گیا، باہلیم بھی مقابلہ کے لئے تیار تھا، ملتان

---

[1] فرشتہ جلد اول، صفحہ ۴۹ نولکشور،

کے پاس دونوں کی جنگ ہوئی، باہلیم کے دس لڑکے تھے، ان سب کو اس نے بڑے بڑے عہدے دے رکھے تھے، اس وقت ان میں سے دو اس جنگ میں شریک تھے، باپ بیٹوں نے مل کر ایسی سخت جنگ کی، کہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت کم نظر آتی ہے، لیکن انجام یہ ہوا کہ بہرام شاہ کی فتح ہوئی، اور محمد باہلیم شکست کھا کر بھاگتے ہوئے ایسی جگہ پہنچا، جہاں دلدل تھا، وہ مع اپنے دونوں بیٹوں کے دلدل میں ایسے پھنسے کہ پھر نکل نہ سکے، اور اسی دلدل میں غرق ہو گئے[۱]

یہ دلدل کہاں تھا قابل غور بات ہے، یہ جنگ ملتان کے پاس ہوئی تھی، جہاں جہلم اور ستلج آکر ملتے ہیں، ممکن ہے کہ انھی دریاؤں کے کنارے کہیں دلدل ہو گیا ہو، جہاں یہ سب غرق ہوئے، ایک دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے، کہ یہ سب ملتان سے بھاگ کر اچھ جا رہے ہوں کیونکہ اس طرف ملتان کے بعد دوسرا شہر جہاں غنیم سے پناہ مل سکے وہ "اچھ" ہی تھا، اور اچھ ہی کے پاس وہ دریا بہتا ہوا ریت میں غائب ہو گیا ہے، جس کا نام ہکڑا (گھگھر) ہے، عہد قدیم میں ہند اور سندھ کے درمیان یہی دریا حد فاصل تھا، اس قسم کے دریا جہاں ریتوں میں غائب ہو جاتے ہیں، وہاں دلدل پیدا ہو ہی جاتا ہے، پس ہو سکتا ہے، کہ وہ لوگ ادھر آنکلے ہوں، اور اسی دلدل میں غائب ہو گئے ہوں،

بہرحال جب بہرام شاہ فتح یاب ہو کر غزنہ واپس جانے لگا، تو ۵۱۲ھ میں ہندوستان کا والی سالار حسین بن ابراہیم علوی کو بنایا، جس نے غالباً بہرام شاہ کو ہندوستان کی سرحد سے غزنہ کی طرف رخصت کرکے لاہور میں ہندوستان کی باگ اپنے ہاتھ میں لی، اور ہندوستان کا انتظام جو برہم ہو گیا تھا، اس نے اپنے حسن انتظام سے سب کو درست کر دیا، اسی واسطے ہم دیکھتے ہیں، کہ بہرام شاہ کے آخر زمانہ تک ہندوستان کے متعلق پھر کوئی شکایت نہیں ہوئی،

۵۵۲ھ میں جب خسرو شاہ غزنہ کے تخت پر بیٹھا، تو غوری اسکے سخت ترین دشمن تھے، وہ غزنہ پر

---

[۱] طبقات ناصری ص ۲۴ کلکتہ و فرشتہ جلد اول ص ۵۰ نولکشور،

قبضہ کرنا چاہتے تھے اسلئے موقع دیکھ کر آگے بڑھے، اور غزنہ پر قابض ہوگئے، خسرو شاہ مجبوراً غزنہ سے ہاتھ دھو لاہور چلا آیا، اور اسی کو پایۂ تخت بنایا، سات سال سلطنت کرکے ۵۵۹ھ میں وفات پاگیا، اور غالباً اُسی جگہ دفن ہوا،

۵۵۹ھ میں خسرو ملک لاہور میں تخت نشین ہوا، غزنہ کا حاکم اس وقت شہاب الدین غوری تھا، جو پیش قدمی کرتا ہوا برابر ہندوستان کی طرف بڑھ رہا تھا، چنانچہ ۵۸۰ھ میں وہ لاہور آگیا، مگر بغیر فتح کئے واپس گیا، البتہ سیالکوٹ (پنجاب) میں ایک قلعہ تعمیر کرکے اپنے ایک افسر حسین خرمیل کو قلعہ دار بنایا، ہندوستان میں غوریوں کا یہ پہلا حاکم ہے،

۵۸۲ھ میں شہاب الدین پھر لاہور آیا، اور خسرو ملک کو گرفتار کرکے غور لیتا گیا، اور اس طرح خاندان غزنہ کا اختتام اور غوریوں کی ابتدا ہوئی،

ہمارے اس بیان سے واضح ہوگیا، کہ ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی محمود غزنوی تھا، اور یہ کہ غوریوں کے ہندوستان آنے تک برابر غزنوی سلاطین کا قبضہ ہندوستان پر رہا، اور یکے بادیگرے ان کے حکام ہندوستان آتے رہے،

اکبری دور کا ایک موجد

شاہ فتح اللہ شیرازی

از جناب معین الدین صاحب رہبر فاروقی، (منشی فاضل)

(۲)

اکبر ایک عرصہ سے دکن پر دانت تیز کئے بیٹھا تھا، متعدد سفارتوں اور شہزادوں کے ذریعہ یہاں اپنا اثر جمایا، مگر تاریخ داں جانتے ہیں، کہ ان سالوں دکنی سلاطین پر خود مختاری کا رنگ تھا اور وہ اپنے آپ کو مطلق العنان سمجھتے تھے، اور درحقیقت تھے بھی، ان کے پاس بھی کافی دولت اور فوج تھی، اسلئے اس مغل حریف اعظم کا ایک عرصہ تک داؤں نہ چلنے دیا، ان مرزبانانِ دکن میں خاندیس کا حاکم راجہ علی خان عقل و تدبیر کا پتلا تھا، ملک کے نظم و نسق اور سلطنت کی حفاظت میں بڑی پامردی دکھائی، اکبر ایک عرصہ سے اسکو مطیع کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اسی سال (۹۹۳ھ میں) خان اعظم کو حکم ہوا کہ وہ ولایتِ دکن کی تاخت کے لئے روانہ ہو، چونکہ شاہ فتح اللہ دکنی سلطنتوں میں رہ کر آئے تھے، یہاں کے حالات سے واقف اور صاحبِ عقل و تدبیر تھے، اس لئے بادشاہ نے اس موقع پر ان کو عضد الدولہ کے خطاب سے سرفراز کرکے خان اعظم کیساتھ روانہ کیا، تاکہ حکیم صاحب کے مشہور مالی و ملکی تجربے اور سیاست کی بدولت صوبۂ دکن بھی کامل طور پر سلطنتِ مغلیہ کے زیرنگین ہو جائے، لیکن وہ خاندیس پہونچکر خود سر راجہ علی خان کو راہِ راست پر نہ لاسکے، خانِ اعظم کی کوتہ اندیشیوں سے مہم ناکام ہوئی، اس نے شاہ صاحب کی ایک نہ چلنے دی،

اس ناکامی کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ خان اعظم اور شہاب الدین احمد خاں میں جو اس کے ہمراہیوں میں سے تھا، آپس میں نااتفاقی ہوگئی، راجہ علی خان نے ان کے نفاق سے فائدہ اٹھایا، اور دوسری دکنی سلطنتوں کو اپنے موافق بنا کر مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑا ہوا، میر نے معاملہ درست کرنا چاہا لیکن جب تدبیرن نہ آئی، تو خانخاناں کے پاس گجرات پہونچے، کہ اس کی کمک سے اس مہم کو سر کریں[۱] مگر یہاں پہونچنے کے بعد یہ بھی نہ ہوسکا،

اسی سنہ (۹۹۳ھ) میں اکبر نے کشمیر پر چڑھائی کا ارادہ کیا، اور لاہور ہی میں مقیم رہکر اس امر میں مشورہ چاہتا تھا، کہ قندھار پر بھی تاخت کیجائے یا نہ کیجائے، اگر کیجائے تو کس راستہ سے، اس مشورہ میں وہ شاہ فتح اللہ کی اصابت راے پر عمل کرنا چاہتا تھا، اس کے لئے ان کو اور خانخاناں دونوں کو طلب کیا، یہ دونوں انتہائی تیزی کے ساتھ پندرہ ہی دن میں لاہور پہونچے[۱]

شاہ صاحب دکن سے آکر اکبر جیسے بے نظیر مردم شناس فرمانروا کی شاہانہ عطوفت سے سات سال سے زیادہ مسرت اندوز نہ ہوسکے، اگر وہ کچھ دن اور جیتے، تو معلوم نہیں بادشاہ انھیں کس مرتبہ پر پہنچاتا اور کتنی قدر کرتا، ان کی موت کے واقعات میں لکھا ہے، کہ اکبر نے ۲۲ جمادی الثانی ۹۹۷ھ میں کابل سے کشمیر کی سیر کا ارادہ کیا، جس کو مغل "باغ خاصہ" کہا کرتے تھے، محلات شاہی کو شاہزادہ مراد کے ساتھ مقام بھنبیر میں جہاں سے کشمیر کا کوہستانی راستہ شروع ہوتا ہے، چھوڑا، اور خود یلغار کرتا ہوا آگے بڑھا، اس سفر میں شاہ صاحب بھی ہمرکاب تھے، یکایک تپ محرقہ میں بیمار ہوئے، بادشاہ کو اطلاع ہوئی، بے چین ہوگیا، خود بنفس نفیس عیادت کو پہونچا، معلوم ہوا حکیم علی گیلانی کا علاج ہے، اور اس نے معالجہ میں غلطی کی ہے، یہ سن کر میر صاحب کو تسلی اور دلاسا دے کر انھیں شہر میں چھوڑا، اور خود آگے بڑھا، اور حکیم حسن کو علاج کے لئے بھیجا، اثنائے راہ میں جب زیادہ حالت بگڑنے

---

[۱] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۰۲، [۲] دربار اکبری ص ۶۹۷،

کی خبر سنی، تو حکیم مصری کو روانہ کیا لیکن ان کے پہونچتے پہونچتے شاہ صاحب کا انتقال ہوگیا، غالباً یہ شوال کی تیسری تاریخ تھی، اور سہ شنبہ کا دن تھا ع[1]

شہنشاہ جہان را از وفاتش دیدہ پرنم شد سکندر اشک حسرت ریخت افلاطون غالم شد

صاحب منتخب التواریخ کا بیان ہے، کہ شاہ صاحب چونکہ خود بھی طبیب حاذق تھے، اسی لئے اپنے مرض کا علاج ہریسہ سے کیا، حکیم گیلانی نے روکا مگر وہ نہ مانے اجل گریبان گیر تھی، تدبیر الٹی پڑی، اور کشاں کشاں انھیں دارِ بقا کو پہونچا دیا ع[2]

چوں قضا آید طبیب ابلہ شود

ابوالفضل اور دوسرے مورخین شاہ صاحب کی موت کا الزام بے چارے بدنصیب علی گیلانی کے سر تھوپتے ہیں، لیکن ملا عبدالقادر بدایونی خود ان ہی کی خود رائی کا نتیجہ بتاتے ہیں، واقعہ کچھ بھی ہو وقت آگیا تھا، اس لئے جانبر نہ ہو سکے، موت کی خبر سن کر اکبر کے رنج کی انتہا نہ رہی، پہلے خانقاہ میر سید علی ہمدانی میں سونپا تھا، پھر حکم دیا کہ یہاں سے منتقل کر کے کشمیر کے قریب، کوہ سلیمان کے بہشت زار دامن میں سلایا جائے، چنانچہ اس پہاڑ پر سید عبداللہ خان چوگان بیگی کی قبر کے پہلو میں انھیں سپرد خاک کیا گیا، کسی نے تاریخ وفات "فرشتہ بود" کہی، ۹۹۷ھ

شاہ کی موت کا حادثہ معمولی واقعہ نہ تھا کہ دنیا کو اس کا احساس نہ ہوتا، اس کی عظمت کا حال ابوالفضل سے پوچھئے، دربار کے نورتنوں سے سنئے، جن کی گردنیں اس کے ذکر کے آگے جھک جاتی تھیں، ان سب کے مربی شہنشاہ اکبر کے دل سے پوچھئے، ابوالفضل نے اکبر نامہ میں شہنشاہ کے جو جذبات اس فاضل عصر کی وفات پر لکھے ہیں، ان سے آج بھی اس یگانہ روزگار حکیم کی فضیلت و عظمت کا اندازہ ہوتا ہے،

---

[1] لطائف فیاضی قلمی، [2] منتخب التواریخ، صفحہ ۳۶۹

بندہ مبارک لکھتا ہے،

"از سوانح، سپری شدن روزگارِ عضد الدولہ، از بیماری در شہر گذاشتہ بودند، بہ سرنوشتِ آسمانی حکیم علی را در مداوا لغزشے رفت، جہاں سالار حکیم حسن را بہ چارہ گری فرستاد، دریں ولا او بہ اردوے ہمایوں پیوست، روشن شد کہ ازیں پیچ سرادل برگرفت، پادشاہِ پایہ شناس را از گذشتنِ آں یادگارِ حکماے پیشیں، اندوہ در گرفت و بارہا بر قدسی زبان رفت کہ میر وکیل و حکیم و طبیب و منجم بود، اندازہ سوگواری ماکہ تواند شناخت اگر بہ دستِ فرنگ افتادے[۵۱] و ہمگی خزائن عوض خواستے، بہ آرزو آن سوداے فراوان سود کردمے، و آن گرامی گوہر را بہ ارزان اندوختمے"

این حیرانِ انجمن ہستی، چناں می دانستے کہ قافلہ دبستان دانش را یکبارہ رہ زدہ اند، از دیدنِ این معنوی بزرگ دریافتہ، دگر گونگی پذیرفت بہ آن مایہ شناسائی در راستی و درستی و معاملہ دانی نایاب گوہرے بود، فرمان شد کہ از خانقاہ میر سید علی ہمدانی برداشتہ، فرازِ کوہِ سلیمان کہ دل کشا جائے است نگاہ دارند[۵۲]"

فیضی نے ان کی وفات پر جو مرثیہ لکھا تھا اس کے پڑھنے سے دل وہل جاتا ہے، اس مرثیہ میں (۴۴) اشعار ہیں، چند منتخب اشعار ملاحظہ ہوں،

ایزد کہ ساخت عقلِ تو گنجینۂ نہاں،	ہستی دو قفل ماند ترا، بر درِ زبان
دانستہ کہ ایں ہمہ قفل از براے چیست	تا گنج خانہ را، بہ کشائی زمان زمان
بر خفتگانِ خاک، بہ خواری نظر مکن	شیراں، بہ روے خاک نہ خسپند جاودان
ہر نطفہ کہ زاد، ز آدم، نہ آدمی ست	ہر سنگِ اصفہان نہ بود کحلِ اصفہان

۵۱ دیکھئے اس وقت بھی اکبر کے دور میں فرنگیوں کی قدر شناسی مشہور تھی، ۵۲ اکبر نامہ جلد سوم ص۵۰۵،

بنگر طریق پائے، ز سر کردگانِ فقر — سر بر زمین و توسنِ افلاک زیر ران

ہشیار گام نہ، کہ درین پہنِ بادیہ، — ہر خار بُن بہ قصدِ تو شیرے بود زیان

دیدی کہ در مصاف بہ افگندنِ حریف — پہلو بہ روئے خاک نہد، مردِ پہلوان

از حرص، تا بہ چند زبون گیر خود شدن — بر ناتوانِ خویش، بہ بخشائے ناتوان

بر ملک و مال غرّہ مشو، کاُمّہاتِ دہر — اقبال زادہ اند، باد بارِ تو امان

در سرگذشتِ ملک، بہ عبرت نظارہ کن — کاندر فلان زمان بفلان آمد از فلان

دہقان بخاک، بہر کفن پنبہ کاشت ست — مسکیں پدر بزادن فرزند کامران

اُبرآن بُود، کہ سیل برد، خانۂ ترا — با د آن بُود، کہ در زند آتش بہ خانمان

عطار گو بہ بند دُکان کز اثر گذشت — کردم ہزار بار عقاقیرش امتحان

حبل الخناق گیر، و گلو بند، و گریہ کن — حب السعال ریزہ بہ منقار ماکیان

تا دورہ خورد کن، بہ سرِ ناطبیب شہر — نشتر بزن، بدیدۂ فقصا و قلتبان

چندین حکیم دورخیالِ بلند فہم — صرّافِ عناصر واجرامِ راضمان

مستدعیٔ اجل، بہ نہان خانہائے خاک — بروآن یگانہ ہائے جہان رایگان گاین

زآن ہا، دو نامؔ[1] در خلفت الصدقِ روزگار — کافلاک، شان نہ زاد، بہ جمل و صد قران

اوّل امامِ دین، عضد الدولہ بحرِ علم — قرامۂ حقیقت و علامۂ زمان

شاہِ سہیل ناصیہ، فتح اللہ آن کہ عقل — با چرخ آفتاب نہد پلہ اش گران

در جنبِ پرتو خرد دوربین او، — بنمود، نور مشعلۂ عقلِ کل، دُخان

---

[1] یہ واضح رہے کہ شاہ فتح اللہ شیرازی کے کچھ ہی دنوں بعد اس سفر میں اکبر کا ایک اور عزیز ترین حکیم ابو الفتح گیلانی کا بھی انتقال ہوا تھا، اس لئے اس مرثیہ میں ان دونوں کا ذکر ہے،

از حکمت الٰہی و عقل مستفید، وز دقت ریاضی او غیب مستان

در پیش چشم من کہ پر از خاک و ہر باد، در عرض ہفتہ ہر دو گذشتہ ناگہاں

بودم دران سفر من بدروز تیرہ بخت، از کف عناں گسل بہ رکاب خدایگاں

لیکن چو در حقیقت ایں کار بنگرم، آبے ست این تراوش باد است این فغاں

ہرگز نہ مردہ اند، و نہ میرند اہل دل، حرفے ست نام مرگ بریں قوم ترجماں

برقدر روح پیرہنے بیش نیست تن، گیرد چو کہنہ گشت سپہر کہن ستاں

فیضی سخن زمبد، فیاض می کند، دانستہ خموش، نہ دانستہ بداں

دار و فروش ہندم و کس نیست ہمچو من

دانندہ مزاج تر و خشک، بحر و کان[1]

ایک اور مرثیہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں،

گرامی اُمہات فضل را فرزند روحانی، ابوالآبائے معنی شاہ فتح اللہ شیرازی

دو صد بونصر رفت و بوعلی تا او پدید آمد، بیسے وار و قضا، درتہ دکان زین گونہ بزازی

گہے با محمل مشائیان گرد زمیں گردی، گہے با موکب اشراقیاں گرد فلک تازی

مباہات از وجود کامل او بود دوراں را

بدوران جلال الدین محمد اکبر غازی[2]

مسلمان موجدوں کے حالات ہماری قوم کو بہت کم معلوم ہیں، اور ادھر لوگوں نے توجہ بہت کم کی ہے، ارباب علم کو اس اہم پہلو کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اسلاف کے یہ کارنامے ہماری آیندہ نسلوں کے لئے نمونۂ عمل کا کام دیں، حکیم موصوف کی عظمت کا سرمایہ صرف

---

[1] اکبر نامہ جلد سوم صفحہ ۵۶۶ پر پورا مرثیہ ملاحظہ فرمائیے، [2] منتخب التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۶۷،

علم و فضل ہی نہیں ہے، بلکہ وہ اپنے عہد کے ایشیا کے بڑے موجدین میں تھے، آیندہ سطور میں اونکی بعض قابل فخر ایجادات بیان کیجاتی ہیں،

ا- حکیم صاحب نے اپنے کمالات سے ایک ایسی چکی بنائی تھی، جو خود بخود ہوا سے حرکت کرتی تھی اور آٹا پیسا جاتا تھا، فارسی مورخین اس کا نام "بادآسیا" لکھتے ہیں، غالباً یہ اسی قبیل کی کوئی چکی ہوگی جسے انگریزی میں "ونڈ مل" (Wind Mill) کہتے ہیں اور جو ہالینڈ میں عام طور پر پائی جاتی ہے، اس سلسلہ میں یہ امر لائق غور ہے کہ ہالینڈ نے یہ چکی ایجاد کی یا شاہ صاحب نے پہلی صورت میں شاہ صاحب کو اس کا علم تھا، اور ان کی ایجاد ویسی ہی تھی جیسی ہالینڈ کی، یا کوئی فرق تھا، ایک خیال یہ بھی ہوتا ہے کہ اکبر کے دور میں ہندوستان میں انگریزوں کی کافی آمدورفت تھی، بلکہ اس نے ان کو اپنے دربار تک میں جگہ دی تھی، خود اس کی ایک مغربی بیوی تھی، اگر حکیم صاحب کی یہ ایجاد کوئی اہمیت نہ رکھتی اور اسی قبیل کی ہوتی جیسی کہ ہالینڈ کی ہوتی تھی، تو ضرور اس ایجاد و کمال کی عظمت گھٹ جاتی اور مغربی نووارد اکبر کی نظروں سے اس کمال کی وقعت گرا دیتے، مگر جہاں بادآسیا کا ذکر ہے، وہاں کسی نے کچھ نہیں لکھا، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ شاہ صاحب ہی سب سے پہلے ونڈمل کے موجد ہیں، اور ممکن ہے کہ موجودہ ہوائی چکیوں سے جدا کوئی اور کمال و صنعت گری خرچ کر کے شاہ فتح اللہ نے یہ چکی بنائی ہو، افسوس ہے کہ شاہ صاحب کے معاصر مورخین نے عبارت میں اس کا کوئی تفصیلی نقشہ نہیں کھینچا ہے اور نہ اسکے متعلق خاطر خواہ لکھا ہے، البتہ آثار اکبری سے (جو فتح پور سیکری میں اکبر کے آثار کا تذکرہ ہے) اس چکی کے وجود اور اس کے محل وقوع کا پتہ چلتا اور تصدیق ہوتی ہے، چنانچہ مؤلف کے اصل الفاظ یہ ہیں :-

"اس موضع چریاری میں پہاڑ کی سب سے بلند چوٹی پر ایک عمارت کے کچھ آثار باقی ہیں، جو "پون چکی" کے نام سے مشہور ہیں ایک ہشت پہل گچ کا مکان ہے جس کا برضلع ہیٹ

۴-انچ، اور قطر ۱۹ فیٹ ہے، ہر پہل میں ایک دروازہ ہے، چھت لداؤ کی ہے، جس کے اوپر ۳ فیٹ ۴ انچ بلند سنگین چبوترہ ہے، یہ چبوترہ بھی ہشت پہل ہے، جس کا ہر ضلع ۸ فیٹ ۱۰ انچ ہے، آس پاس اور بھی عمارت کے آثار ہیں، بہت سے سنگین اور منقش ستون، اور پتھر اِدھر اُدھر پڑے نظر آتے ہیں، فارسی تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے، کہ میر فتح اللہ شیرازی نے فتح پور میں پون چکی بنائی تھی، جو ہوا سے خود چلتی تھی، غالباً یہ اسی چکی کی عمارت ہے[۱]۔

۲-اسی فتح پور میں حکیم صاحب نے اپنا ایک حکیمانہ محل بنا رکھا تھا، مؤلف آثار اکبری اسکی نشان دہی دیوان عام کی جنوبی دیوار سے سکہ تال تک کے مکانات سے "جو حکیم کے مکان" سے موسوم ہیں، کرتے ہیں، اور کہتے ہیں، کہ غالباً یہی میر فتح اللہ شیرازی کا مکان ہے[۲] شہر فتح پور اور ان کے مکان کو دیکھ کر فیضی نے اکبر کو جو عرضی لکھی، اس میں ان الفاظ میں اس کا ذکر کیا ہے،:-

"از حقیقت شہر چہ نویسد، عمارت گلیں ہمہ داخل زمین شدہ، دیوار ہائے سنگین ایستادہ بہ آتش خانہ ہا و خانہ ہا را، بعضے از دور و بعضے از نزدیک نظارہ کرد و عبرت گرفت خصوصاً از خانہ میر فتح اللہ شیرازی کہ بہ آبستن نہ صد سال مادر ایام او را زادہ بود، و بدیۂ الٰہی بود کہ بہ حضرت کرامت فرمودہ بودند"[۳]

۳- میر صاحب نے ایک آئینہ ایجاد کیا تھا، جو نزدیک اور دور کے عجیب و غریب تماشے دکھاتا تھا، ممکن ہے یہ دوربین کی قسم ہی ہو، یا اکبر کے لئے سکندر کے آئینہ کی طرح کوئی آئینہ بنایا ہو، افسوس

---

[۱] آثار اکبری مطبوعہ مطبع اکبری آگرہ ص ۱۰۰، مؤلف نے یہ کتاب ۱۳۲۳ھ ۱۹۰۵ء میں لکھی ہے، اور انہوں نے اسی زمانہ میں بذات خود تحقیقات کرکے یہ کتاب لکھی ہے۔ [۲] آثار اکبری ص ۱۳۰ [۳] یہ وہ عرضداشت ہے جس کو فیضی نے خاندیس سے اکبر کی خدمت میں بھیجا ہے "لطیفۂ فیاضی" میں جو فیضی کے منشأت کا مجموعہ ہے، اور خود آزاد کی دربار اکبری میں ص ۲۹۹ پر اس عرضی کی نقل موجود ہے،

کہ اس سے زیادہ اسکی کوئی تفصیل نہیں[1]،

۴۔ ایک عجیب قلعہ شکن توپ بنائی تھی، جس کے متعلق آزاد لکھتے ہیں :۔

"توپ ہے کہ تخت پر چڑھی ہے ہبشی (قلعہ شکن) توپ ہی، پہاڑ سامنے آجائے تو چوڑیوں کی طرح حلقہ حلقہ الگ، ہاتھوں ہاتھ اٹھاکر چڑھا جاؤ[2]"

۵۔ توپ کیساتھ، ایسی ہی بے مثل بارہ ضربی بندوق بھی ایجاد کی تھی، جو ایک ہی فیر میں بارہ گولیاں چلاتی تھی، جس کی ایجاد کا سہرہ غالباً عوام مغرب اور موجودہ دنیا کے سر باندھتے ہیں، ان ایجادوں کی تصدیق آج بھی قدیم مطبوعہ وغیر مطبوعہ تاریخوں سے کیجاسکتی ہے، چنانچہ شاہ صاحب کا ہم عصر مورخ نظام الدین احمد طبقات اکبری میں لکھتا ہے:۔

امیر فتح اللہ (با آن کہ در جمیع علوم عقلی و نقلی در ایران، و ہند بل در ربع مسکوں قرین خود نہ داشت) از نیرنجات و طلسمات ماہر بود آسیاے ساختہ کہ خود حرکت می کرد، و آردمی شد و آئینہ درست کردہ کہ از دور و نزدیک اشکال غریبہ مرئی می گشت و آن کہ بیک چرخ دوازدہ بندوق سرمی شد نیز از اختراع اوست[3]"

اگر میر سا فرزانہ روزگار اپنی علمی یادگاریں نہ چھوڑتا، تو بڑا رنج ہوتا کہ جب تک وہ زندہ رہا، اپنے وقت کے لوگوں تک اپنا فیض پہونچایا، لیکن اسکی ایجادیں سب کی سب اسکے ساتھ رخصت ہوگئیں، آنے والی نسلیں جب اسکی یاد تازہ کرتیں، تو دیکھتیں کہ اس نے اپنے اخلاف کے لئے اپنے بیش بہا علم و کمال کی کیا دوامی یادگاریں چھوڑیں، مورخین لکھتے ہیں کہ شاہ صاحب کی بہت سی تصانیف ہیں، مگر ملتی کم ہیں، جو کچھ ہیں وہ سند ہیں،

---

[1] دربار اکبری ص ۷۰۱، [2] ایضاً ص ۷۰۱، [3] طبقات اکبری مطبوعہ نولکشور ص ۳۸۹، و مآثر الامراء مطبوعہ کلکتہ جلد اوّل ص ۱۰۰،

آزاد نے دربار اکبری میں جہاں ان کا حال لکھا ہے، ان کی تصنیفات سے صرف خلاصۃ المنہج اور منہج الصادقین کے نام درج کئے ہیں، اور ان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں، کہ یہ ہند میں کمیاب بلکہ نایاب ہیں" یہ دونوں کتابیں فن تفسیر میں ہیں، ابوالفضل نے اکبرنامہ میں اور صاحب طبقات شاہ جہانی نے بھی ان کے حالات لکھتے ہوئے لکھا ہے، کہ انھوں نے ایک تفسیر لکھی تھی[1]، مگر نام درج نہیں کیا، ہمارے علم میں انکے جتنے علمی کارنامے آئے ہیں، ان کی تفصیل ذیل میں درج کیجاتی ہے،

۱۔ تفسیر منہاج الصادقین فی الزام المخالفین" یہ تفسیر فارسی زبان میں پانچ جلدوں میں لکھی گئی ہے، اس کے مفسر کا نام ملا فتح اللہ کاشانی[2] لکھا ہے، یہ کتاب جسے آزاد ہند میں کم یاب و نایاب فرماتے ہیں، بمقام دارالسلطنت اصفہان شاہ ناصر الدین قاچار کے عہد حکومت میں حاجی شیخ رضا طہرانی و حاجی ملا علی اکبر کتب فروش کے اہتمام سے) ربیع الاول ۱۳۱۳ھ میں بہت بڑے سائز پر خط نسخ میں مکمل چھپ چکی ہے، ہم نے اس کے متعدد قلمی نسخے بھی دیکھے ہیں، ملا صاحب تفسیر کے دیباچہ میں، اور اسباب تالیف کے سوا ایک وجہ یہ بھی لکھتے ہیں،" چونکہ شیعہ مذہب کے خلاف تفسیریں لکھی گئی ہیں، جو اس فرقہ کے عقائد سے متضاد ہیں، اس لئے میں نے یہ تفسیر لکھی، دیباچہ کا بیان ان ہی کے الفاظ میں سنئے کہ اس میں شاہ صاحب کے قلم سے کچھ حقیقت کا اظہار بھی ٹپک پڑا ہے،

پس معلوم شد کہ علم قرآن اصل علوم شریعت است و دانستن آن ضرور وچونکہ بعضے از عجم

---

[1] طبقات شاہ جہانی قلمی ص ۲۹۲ کتب خانہ آصفیہ، [2] ہم جن فتح اللہ کا حال لکھ رہے ہیں، وہ شیراز کے رہنے والے ہیں، لیکن اس تفسیر میں "کاشانی" لکھا ہے، یہ تحقیق طلب ہے کہ دونوں میں کون سا بیان صحیح ہے، اکبر کے دور میں اور بھی فتح اللہ نامی اشخاص گذرے ہیں جنھیں دامن شاہی سے وابستگی حاصل تھی ان سے تو میں ابوالفتح گیلانی تو الگ ہی رہے، ان میں ایک حکیم بھی تھے، جو فتح اللہ گیلانی کہلاتے تھے، جنکی ایک کتاب ترجمہ کلیات قانون بھی ہے، جو نولکشور سے چھپ چکی ہے، اس میں انھوں نے اپنے آپکو شیرازی لکھا ہو اور جیسا کہ سنہ ترین ۱۰ ہو میں ترجمہ ہوا

از مطالعہ تفاسیر عربیہ عاجز بودند، واز تفاسیر فارسیہ مغلقہ، بہرہ نہ داشتند تا بہ واسطۂ آں کہ بعضے ازاں بہ جہت تفاصیل جمیع لغات و ماخذ و مشتقاتِ آں، و ذکر وجوہ ترکیبات باسرہا وبیان...... کہ مطالعہ آں موجبِ کلال می شد،........... وبعضے دیگر بجہت الفاظِ فرس قدیم واسلوب نامربوط، وعبارت نامستقیم، باعث ملال، وبرخے دیگر در غایت اختصار کہ ازاں فائدہ تامہ حاصل نمی شد، وتفسیر کاشفی اگرچہ بجواہر عبارات بلیغہ ولآلی الفاظ بلیغہ فصیحہ، محلی بود، اما چوں کہ موافق روشِ مخالفین، ومخالفِ مذہبِ ائمۂ صادقین بوذ (صلوٰۃ اللہ علیہم اجمعین،) در نظر اعتبار، بہ مثابۂ مارِ زرنگاری نمود، کہ ظاہر ایں مزین بود، بہ نقوش جمیلہ، وباطنش مملو از سموم عقائد قاتلہ، وباوجود ایں، در غایت ایجاز واختصار،"

بناءً علی ہذا، بہ خاطرِ فاتر ایں فقیرِ ضعیف، مانی المفتقر الی غفران اللہ اللطیف السبحانی ابن شکر اللہ فتح اللہ الشریف کاشانی،.........رسید کہ تقرباً الی اللہ تعالیٰ وطلباً لمرضاتہ العلیٰ مطالعہ تفاسیر عربیہ وفارسیہ وکتب تواریخ واحادیث وغیرآں، از کتب کلامیہ واصول وفروع فقہیہ کردہ تفسیرے ازاں انتخاب نماید..... چوں مقصد اقصیٰ ومطلب اعلیٰ ازیں منتخب، ایضاح طریقہ ائمہ صادقین است بہ حجج واضحہ والزام مخالفین بہ براہین باہرہ ازیں جہت مسمی شد بہ منہج الصادقین فی الزام المخالفین وبر پنج جلد ترتیب یافت بعدد آلِ عبا،"

۲۔ خلاصۃ المنہج، یہ کتاب اول الذکر تفسیر کا خلاصہ ہے، چوں کہ تفسیر منہاج الصادقین ایک ضخیم ومبسوط کتاب تھی، جس کا مطالعہ مصروفیت رکھنے والے اصحاب اور عوام کے لئے دقت طلب تھا، اس لئے اس تفسیر کا ایک ضروری خلاصہ لکھا جس میں صرف ترجمہ اور کچھ ضروری باتیں درج

ہیں، نام بھی تفسیری نام کے لحاظ سے "خلاصۃ المنہج" ہے، اس کتاب سے بھی شاہ صاحب کی تمہید کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ فرمائیے،

"چوں بتائید ربانی و توفیق سبحانی منہج الصادقین فی الزام المخالفین فی الروایات المحققین کہ محتوی بر پنج مجلد است مرتقی بر صد و ہشتاد ہزار بیت کہ بر ترتیبے کامل و تالیفے شامل است اختتام پذیرفت، و بنظر کیمیا اثر بعضے از خواص اخوان دینی ...... رسیدہ عز قبول یافت، بخاطر فاتر مؤلف و جامع المفتقر الی الغفران ربہ اللطیف السبحانی ابن شکر اللہ، فتح اللہ الشریف الکاشانی ...... رسید"

اس کتاب کا ایک نسخہ ہماری نظر سے گذرا، جو ربیع الاول ۱۰۹۰ھ کا مکتوبہ ہے، خاتمہ کی عبارت ہے،:-

"قَدْ اَفرغ مِنْ تحریر ھٰذہ الرابع اوّل التفسیر الشریف المبارکہ علی ید الفقیر الحقیر الی اللہ الغنی۔ ملا محمد طاھر اردستانی نائب قاضی بندر مچھلی پٹن فی حادی عشرین شھر ذی قعدۃ الحرام سنہ ۱۰۹۰ھ[۱]"

۳- اکبر نے ۹۹۰ھ میں حکم دیا کہ ہجرت کو ہزار سال ہو رہے ہیں، اس لئے ایک ایسی تاریخ لکھی جائے، جو ابتدا سے آجتک کے تمام بادشاہان اسلام کے حالات پر حاوی ہو، اور اپنے معلومات کے لحاظ سے تمام تاریخوں کی ناسخ کہی جاسکے، اس کا نام بھی "تاریخ الفی" رکھا جائے، چنانچہ حسب فرمان اس کام کے لئے سات آدمی مقرر ہوئے، پہلا دور نقیب خاں سے متعلق ہوا، دوسرے کے لئے شاہ فتح اللہ مامور ہوئے، اسی طرح حکیم ہمام، حکیم علی، حاجی ابراہیم سرہندی، مرزا نظام الدین احمد اور ملا عبد القادر بدایونی نے عہد بعہد کے حالات لکھ کر اس کتاب

[۱] یہ خلاصۃ المنہج بھی کتب خانہ آصفیہ میں فن تفسیر فارسی قلمی نمبر (۶۳۸) پر موجود ہے،

کی تکمیل کی[۱]، یہ تاریخ نہایت ہی کمیاب ہے، اور ہندوستان میں اس کے صرف دو تین ہی نسخوں کا پتہ چل سکا ہے،

۴۔ اکبر کے حالات میں خود شاہ فتح اللہ نے ایک تاریخ الگ مرتب کی تھی، اور اس کا نام اقبال نامۂ اکبری رکھا تھا، اس کتاب کا کچھ صحیح پتہ نہیں چلتا، صرف اس کا نام سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ میں ہمیں ملا، اس میں اکبری دور کی تاریخوں کے ذکر کے ضمن میں شاہ صاحب کی اس تالیف کا پتہ چلتا ہے،

۵و۶۔ آزاد نے دربار اکبری میں لکھا ہے کہ انھوں نے کشمیر کے حالات پر ایک رسالہ لکھا تھا، جو بادشاہ کے حسب الحکم اکبر نامہ میں شامل کیا گیا،

زیچ جدید کے نام سے تاریخ الٰہی اکبر شاہی کا ایک حصہ بھی ان کی نگرانی میں لکھا گیا تھا،[۲]

[۱] منتخب التواریخ جلد ۲ ص ۳۱۸، [۲] دربار اکبری صفحہ ۶۸۰ و صفحہ ۶۸۱،

رسائل عماد الملک

کی

قیمت میں غیر معمولی تخفیف

تلخیص و تبصرہ

قرون وسطیٰ میں کتابوں کے ساتھ مسلمانوں کا شغف

ذیل کا مضمون ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ صاحب کے ایک مقالہ کا خلاصہ ہے، جو اسلامک کلچر بابت اپریل ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا ہے:۔

اسلام کا ابتدائی دور مختلف تمدنوں کے اتصال کا دور تھا، جو بعد میں مہذب دنیا کے ایک بڑے حصہ کے لئے حد درجہ اہم ثابت ہوا، اس عہد میں ایک مخلوط تمدن نہایت تیزی کیساتھ پیدا ہو گیا جسکو عربی تہذیب یا اسلامی کلچر کہتے ہیں، اس تمدن کی تعمیر میں مختلف قوموں نے حصہ لیا، عربوں نے اپنے مذہب اور اپنی بے مثل زبان کا حصہ پیش کیا، ایرانیوں نے ہر قسم کے فلسفیانہ تخیل اور علوم و فنون کی تحصیل کے لئے اپنی نمایاں ذکاوت اور قابلیت کیساتھ شرکت کی، اور ترک اپنی انتظامی قابلیت عملی کاموں کے لئے اپنی موزونیت اور اسلام کی خدمت کیلئے اپنی فوجی قوت لائے،

عربوں کی حکومت نے جو بہتیرے ملکوں اور قوموں پر تھی، علٰحدگی کی سرحدیں توڑ ڈالیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات اور نصب العینوں کے مبادلہ نے قدامت پسندی کی قوت کو کمزور کر دیا، اکثر آدمیوں کے دماغ، خواہ وہ کسی قومیت سے تعلق رکھتے رہے ہوں، بندشوں سے آزاد ہو گئے، اور فکر و عمل کی دنیا میں نئی نئی راہیں پیدا کرنے لگے، چنانچہ اسلام کے عہد زرین میں مادی خوشحالی اور ذہنی سرگرمی ساتھ ساتھ دکھائی دیتی ہے، مسلمان نہ صرف قیصر و کسریٰ اور خاقان کی دولتوں کے

وارث ہوگئے، بلکہ یونان، ایران، اور ہندوستان کی حکمت کی وراثت بھی ان کے حصہ میں آگئی، بقول پروفیسر نکلسن علم کا ذوق اس قدر بڑھا ہوا اور عالمگیر تھا کہ معلوم ہوتا تھا، گویا ساری دنیا خلیفہ سے لیکر حقیر سے حقیر شہری تک دفعتہً طالب علم یا کم از کم علم و ادب کی سرپرست بن گئی ہو،

جب بنو عباس نے بغداد کو دار الخلافہ بنایا، تو انھوں نے اپنی سرپرستی سے ہر قسم کے ادبی، سائنٹفک اور فلسفیانہ علوم کو بہت کچھ ترقی دی، خلیفہ مامون کا عہد اس مشرقی نشاۃ ثانیہ کے پورے شباب کا دور تھا اس نے قدماء کی تصانیف کو تلاش کراکے فراہم کیا، اور ترجمہ کے لئے سائنس اور فلسفہ کی کتابیں حاصل کرنے کی غرض سے ایک وفد اپنے ہم عصر رومن شہنشاہ کی خدمت میں بھی بھیجا، چنانچہ ایک قلیل مدت میں یونان، ایران اور ہندوستان کی خاص خاص علمی و ادبی اور فلسفیانہ کتابوں کے ترجمے عربی زبان میں ہوگئے، مامون نے بغداد میں ایک بیت الحکمت قائم کیا اور اس میں علم و ادب کے فاضلوں کو مقرر کیا، اس ادارہ میں ایک رصدخانہ اور ایک بڑا کتب خانہ بھی تھا، اسلام کے قرون وسطیٰ میں کتابوں کے ایک منظم اور جامع ذخیرہ کی یہ پہلی مثال ہے، اس کے بعد دار الخلافہ اور دوسرے مرکزوں میں بھی اس قسم کے بہت سے ادارے قائم ہوگئے اور انکی شہرت دور دور تک پہنچ گئی،

اسلام کے دور عروج میں جو علمی اور ادبی تحریک شروع ہوئی، اسکے ساتھ کتابوں کا شوق بھی لوگوں میں انتہا درجہ کا پیدا ہوگیا، ماہر فن کاتبوں کی ایک بڑی تعداد پیدا ہوگئی، جو بیش بہا کتابوں کی نقلیں کیا کرتے تھے، ان کے علاوہ چھوٹے درجہ کے کاتب بھی تھے، جو عام افادہ کی کتابیں اوسط معاوضہ پر نقل کیا کرتے تھے، تاکہ معمولی حیثیت کا طالب علم بھی انھیں خرید سکے، اسطرح کتابوں کی نقلیں تیزی کیساتھ بڑھتی گئیں، اور چھوٹے بڑے کتب خانے قائم ہونے لگے، خلفاء اور بادشاہوں نے مثالیں قائم کین، اور اسکی تقلید ذی علم امراء اور دوسرے علم دوستوں نے بھی کی چنانچہ ہر جگہ کتب خانے قائم ہوگئے، اور مسجدوں، مدرسوں، ہسپتالوں، مہمان سراؤں اور اسی قسم کے دوسرے

اداروں کی طرح کتب خانوں نے بھی مسلم سوسائٹی کی تمدنی زندگی میں ایک اہم جگہ حاصل کرلی،
چند مشہور کتب خانوں اور کتاب کے شائقوں کے ذکر سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ
اس موقع پر اسلامی مشرق میں فن کاغذ سازی کے رواج پر کچھ روشنی ڈالی جائے، قدماء زیادہ تر
ایک خاص قسم کے کاغذ پر لکھتے تھے، جو پاپرس (Papyrus) نامی ایک پودے
کے ریشہ سے بنایا جاتا تھا، اس کاغذ کو پاپرس کہتے تھے، اور اس کا عربی نام "بردی" ہے، اس کے
بعد بھیڑ اور بکری کی کھالیں کاغذ کے طور پر استعمال کی جانے لگیں، مسلمانوں نے اپنی تاریخ کے ابتدائی
دور میں ان دونوں قسم کے کاغذوں کو استعمال کیا، چنانچہ عربی پاپرس کی ایک خاصی بڑی تعداد گذشتہ
ساٹھ سالوں میں مصر میں کھود کر نکالی گئی ہے، جس سے اس ملک کے قدیم عرب نظام حکومت پر بہت زیادہ
روشنی پڑتی ہے تیار کیا ہوا چمڑہ زیادہ قیمتی ہونے کی وجہ سے صرف سرکاری کاغذات یا قرآن مجید کے لکھنے میں استعمال کیا جاتا تھا
کاغذ کی جو شکل آج ہمارے سامنے ہے، اسکے بانی اہل چین ہیں، ریشم اور ریشم کے فضلہ سے کاغذ
بنانے کا فن قدیم زمانہ میں ان ہی نے دریافت اور استعمال کیا، حضرت عیسیٰؑ کی پیدایش سے تقریباً ایک
صدی بعد ایک چینی عہدہ دار نے جس کا نام تسائی لون (Tsai Lun) تھا، کاغذ سازی
میں سن، چیتھڑے، اور چینی گھاس کو استعمال کر کے اس صنعت کو بڑی ترقی دی اور اس کی لاگت میں
بہت زیادہ تخفیف پیدا کردی، عرب تاجر جو مشرق بعید سے تجارت کیا کرتے تھے، چینی کاغذ اپنے
ملک میں لانے لگے، مگر خود اسلامی دنیا میں کاغذ بنانے کی صنعت ایک اتفاقی واقعہ سے جاری ہوگئی،
۷۵۱ئہ میں عربوں نے سمرقند کو فتح کیا، قیدیوں میں ایک تعداد چینیوں کی بھی تھی، جو ترکوں کی حمایت
میں عربوں سے لڑتے تھے، ان قیدیوں نے عربوں کے زیر حکومت سمرقند میں کاغذ سازی کا کام
شروع کردیا یہ صنعت کامیاب ہوئی، اور سمرقند کی ایک قیمتی صنعت بن گئی، عرب سلطنت میں پہلا
شہر جس کا تعلق کاغذ سازی سے ہوا سمرقند ہی تھا،

تھوڑے ہی دنوں میں یہ صنعت عرب سلطنت کے مرکزی صوبوں میں بھی پھیل گئی، چنانچہ فضل ابن یحییٰ مشہور برمکی وزیر نے کاغذ سازی کا پہلا کارخانہ بغداد میں قائم کیا، یہ صنعت اس قدر کامیاب ہوئی کہ چند ہی سال بعد اس کے بھائی جعفر بن یحییٰ نے چرمی کاغذ کے بجائے معمولی کاغذ کا استعمال سرکاری دفتروں میں جاری کر دیا، عراق سے یہ صنعت شام اور مصر پہونچی، اور وہاں سے مراکش اور اسپین کاغذ کی مانگ اس کے ارزاں ہونے کی وجہ سے اسقدر بڑھی کہ اس کے کارخانے اسلامی دنیا کے تقریباً ہر شہر میں ہوگئے، عربوں نے کاغذ کے بنانے میں روئی اور دوسری نباتات کے ریشے استعمال کرنے شروع کئے، چونکہ مختلف چیزوں سے کاغذ بنایا جانے لگا، اس لئے تیار شدہ کاغذ کی بھی مختلف قسمیں پیدا ہوگئیں، چنانچہ ابن الندیم صاحب فہرست نے چھ قسم کے کاغذوں سے واقفیت ظاہر کی ہے،

کاغذ سازی کی صنعت کو اپنی سلطنت میں رائج کرکے عربوں نے نہ صرف اپنے علوم وفنون کی اشاعت کو ترقی دی، بلکہ یورپین تہذیب کی عموماً اور قدیم یونانی، اور رومن لٹریچر کی خصوصاً ایک بڑی خدمت انجام دی، اس طرح کہ پہلے یورپ میں کاغذ کی برآمد کی، اور پھر خود کاغذ سازی کی صنعت کو اندلس اور صقلیہ کی راہ سے وہاں جاری کیا، قرون وسطیٰ میں یورپ کے لوگ بہت دنوں تک صرف چمڑے پر لکھا کرتے تھے، قیمتی ہونے کی وجہ سے اس پر زیادہ کتابیں لکھی نہیں جاسکتی تھیں، عموماً یہ اتنی قیمتی اور نادر چیز تھی، کہ چمڑے پر یونان وروما کے قدیم مصنفین کی جو کتابیں لکھی ہوئی تھیں، انھیں مٹا مٹا کر ارباب کلیسا اسی چمڑے پر اپنے حمد و وظائف لکھا کرتے تھے، ان قدیم تصنیفات کو مٹانے اور ضائع کرنے کا سلسلہ صدیوں تک جاری رہا، اور خدا ہی جانتا ہے، کہ اس طرح کتنے بے بہا خزانے جہالت کی قربانگاہ کی نذر ہوگئے، اگر اہل یورپ کو معلوم بھی ہوتا، کہ چین کے لوگ ریشم سے کاغذ بناتے ہیں، تو بھی وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے تھے، کیونکہ وہ اس وقت تک ریشم کے پیدا کرنے کے طریقہ سے ناواقف تھے، عرب نہ صرف کاغذ کو یورپ میں لائے، بلکہ انھوں نے اسپین میں روئی کی

کاشت بھی جاری کی، جس سے مغرب میں کاغذ سازی کی صنعت وجود میں آئی، اس وقت تک روئی کا پودا یورپ میں نامعلوم تھا،

اب اس تاریکی سے نکل کر جو قرون وسطی کے یورپ پر طاری تھی، مشرق کی اسلامی دنیا میں آئیے جہاں مسلمانوں کے علوم وفنون کی روشنی دور دور پھیلی ہوئی تھی، خلیفہ مامون کے بیت الحکمت کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، اس کا کتب خانہ تمام علوم وفنون کی کتابوں کا ذخیرہ تھا، اور یہ کتب خانہ ۱۲۵۸ء تک قائم رہا، جب کہ بغداد مغلوں کے ہاتھوں خاک میں مل گیا، خلیفہ کی مثال کی تقلید بہت سے امرا اور اہل دولت نے کی، اور انھوں نے اپنی جیب خاص سے بغداد اور دوسرے مقامات پر علمی ادارے اور کتب خانے قائم کئے، مثلاً علی بن یحیٰی (متوفی ۲۷۵ھ) نے جو المنجم کے لقب سے مشہور ہے، بغداد سے متصل اپنے قلعہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا، اور اس کا نام خزانۃ الحکمت رکھا، اسکی کتابوں کے لئے لوگ دور دور سے آتے تھے، اور ان لوگوں کے قیام وطعام کا انتظام بھی بانی کتب خانہ کی طرف سے تھا، اس کتب خانہ میں خاص طور پر علم ہیئت کی کتابیں زیادہ تھیں، اسی طرح ۳۸۳ھ میں وزیر ابونصر صبور بن اردشیر نے بھی بغداد میں ایک دارالعلم قائم کرکے اس میں ایک کتب خانہ بھی قائم کیا، بیان کیا جاتا ہے، کہ اسکی کتابوں کی تعداد ایک لاکھ جلدوں سے زیادہ تھی جن میں سے بعض اس زمانہ کے ممتاز ترین خوشنویسوں کی لکھی ہوئی تھیں، بغداد کے تقریباً ہر مدرسہ کے ساتھ کوئی بڑا یا چھوٹا کتب خانہ شامل تھا، مدرسہ نظامیہ اور مدرسہ مستنصریہ کے کتب خانے اپنی وسعت اور کتابوں کی قیمتی حیثیت کے لحاظ سے خاص طور پر مشہور تھے، کتب خانوں کی تعداد برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ساتویں صدی ہجری میں صرف بغداد میں کم سے کم (۳۶) کتب خانے موجود تھے، ذاتی کتب خانے ان کے علاوہ تھے، جو حد شمار سے باہر ہیں،

کتب خانے صرف بغداد تک محدود نہ تھے، بلکہ اسلامی دنیا کے تقریباً ہر تمدنی مرکز میں قائم

ہو گئے، دولتِ عباسیہ کے زوال پر جب سلطنت میں بہت سی خود مختار اور نیم خود مختار حکومتیں قائم ہوگئیں، اسوقت بھی تمدنی زندگی میں کوئی انحطاط نہیں پیدا ہوا، بلکہ اس کے برعکس مختلف حکمرانوں نے اسکو ترقی دی، اور اس میدان میں ایک دوسرے سے مسابقت کی کوشش کرتے رہے، چنانچہ اسپین میں امویوں نے مصر میں فاطمیوں، حلب میں ہمدانیوں، ایران میں آل بویہ، بخارا میں سامانیوں اور افغانستان میں غزنویوں نے کتب خانوں کے ذریعہ علوم کی ترقی میں خاص طور پر کوشش کی، اہمیت اور شہرت کے لحاظ سے خلیفہ مامون کے بیت الحکمت کے تقریبًا برابر ہی فاطمی خلیفہ الحاکم کا دار العلم تھا، جسے اُسنے خاص کر اپنے شیعی مذہب کی تبلیغ و اشاعت کے لئے ۱۰۰۵ء میں قاہرہ میں قائم کیا، اس میں ایک کتب خانہ بھی تھا، جو نادر کتابوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ تھا، شاہی کتب خانہ علحدہ تھا، جو محل کے اندر تھا، بیان کیا جاتا ہے، کہ ایک وقت میں اس شاہی کتب خانہ میں بیس لاکھ جلدیں تھیں، بعض بعض کتابوں کی بیسیوں نقلیں موجود تھیں، صرف قرآن مجید کے (۲۴۰۰) مطلا نسخے تھے بہت سے نادر قلمی نسخوں کے علاوہ جو ابن مقلہ اور دوسرے مشہور خوشنویسوں کے لکھے ہوئے تھے، عربی کے بعض مشہور ترین مصنفوں کی تصنیفیں خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس کتب خانہ میں محفوظ تھیں مثلاً کتاب العین خلیل بن احمد، تاریخ طبری امام ابو جعفر طبری اس کی تیس نقلیں تھیں،

قرونِ وسطیٰ کی اسلامی دنیا کا تیسرا عظیم الشان کتب خانہ اموی خلیفہ الحکم ثانی (۹۶۱-۷۶ء) کا قرطبہ میں تھا، اس خلیفہ کو کتابوں کا بیحد شوق تھا، اور اس کے ایجنٹ اسکندریہ، قاہرہ اور بغداد کے کتب فروشوں کی دکانوں پر نادر نسخوں کی تلاش میں پھرا کرتے تھے، جب کوئی کتاب قیمتًہ حاصل نہ ہوسکتی، تو وہ اسکی نقل کرالیتا، بعض اوقات ایسا ہوتا، کہ یہ سن کر کہ فلاں شخص فلاں کتاب لکھنے کا قصد کر رہا ہے، وہ اُس شخص کے پاس کوئی قیمتی تحفہ بطور نذر کے بھیجدیتا، اور یہ درخواست کرتا، کہ کتاب کا پہلا نسخہ اس کے پاس بھیج دیا جائے، چنانچہ کتاب الاغانی کا پہلا نسخہ حاصل کرنے کے لئے جسے ابوالفرج

الاصفہانی اس وقت عراق میں لکھ رہا تھا، خلیفہ نے اس کے پاس ایک ہزار دینار بطور ہدیہ کے بھیجے، ان ذرائع سے اس نے چار لاکھ کتابیں جمع کر لیں، اسے کتابوں کے صرف جمع کرنے کا شوق نہ تھا، بلکہ اس نے ان میں سے بہت سی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا تھا، اور ان پر حاشیے بھی لکھے تھے،

کتابوں کے باب میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کا بھی یہی حال تھا، محمود غزنوی سے قطع نظر کرکے جس کا دربار اس عہد میں شعراء اور اہل علم کا خاص مرکز تھا، ملکی فرمانرواؤں میں غلام خاندان کا سلطان ناصر الدین خاص طور پر مشہور صاحب علم اور علوم و فنون کا بڑا سرپرست گذرا ہے، بادشاہی کی حالت میں بھی وہ ایک طالب علم اور درویش کی زندگی بسر کرتا تھا، اور کتابت کی اجرت سے اپنے ذاتی اخراجات پورا کرتا تھا، مغل شہنشاہوں کا علمی ذوق بھی بہت بڑھا ہوا تھا، بابر کی خود نوشت سوانحعمری ایک قیمتی تاریخی ماخذ ہے، ہمایوں کو کتابوں سے اس قدر محبت تھی، کہ اپنی جلاوطنی کے زمانہ میں بھی جب وہ ادھر ادھر گھومتا پھرتا تھا، انھیں اپنے ساتھ ہی رکھتا تھا، اکبر اگرچہ لکھا پڑھا نہ تھا، تاہم اس نے کتابوں کا ایک عمدہ ذخیرہ جمع کر لیا تھا، اور شام کے وقت کتابیں پڑھوا کر سنا کرتا تھا، اس کے خاص حکم سے بہت سی کتابیں سنسکرت اور دوسری ہندوستانی زبانوں سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں، جہانگیر، شاہجہان، اورنگ زیب نیز خاندان تیموریہ کے اور بہت سے شہزادے بڑے تعلیم یافتہ اور کتابوں کے بڑے شائق تھے، آج بھی یورپ اور ہندوستان کے پبلک اور پرائیوٹ کتب خانوں میں سیکڑوں کتابیں موجود ہیں، جن پر ان کے دستخط یا مہریں ثبت ہیں،

علوم کے ان شاہی سرپرستوں کی تقلید ان کی رعایا بھی کرتی تھی اور بہت سے لوگ تو کتابوں کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھتے تھے، اسلام کی تاریخ میں کوئی عہد اور کوئی ملک خواہ کتنا ہی زوال پذیر کیوں نہ ہو، ایسا نہیں ہے، جو اس قسم کے لوگوں سے کلیتہً خالی رہا ہو، سوڈان اور سینیگال جیسے ملکوں میں بھی کتب خانے اور کتابوں کے شائق آج تک موجود ہیں،

عربوں نے کتابوں کا ذکر ہمیشہ عزت اور محبت کیساتھ کیا ہے، اور انھیں اپنا وفادار دوست سمجھا ہے، عربی زبان کا کوئی مجموعۂ نظم مشکل ہی سے ایسا ملے گا جس میں کتاب کی مدح میں اشعار نہ ہوں، متنبی کہتا ہے،

أعز مكان في الدنى سرج سابح وخير جليس في الزمان كتاب

"دنیا میں سب سے زیادہ معزز جگہ صبا رفتار گھوڑے کی زین ہے، اور زندگی میں بہترین ساتھی کتاب ہے"، المہلبی نے جو سلطان معزالدولہ (آل بویہ) کا وزیر تھا، اپنے بیٹوں کو یہ نصیحت کی تھی "جب تم بازار جاؤ تو صرف ایسی دوکان پر کھڑے ہو جہاں اسلحہ بکتے ہوں یا کتابیں"

کسی ملک میں کتابوں کی تجارت سے بھی وہاں کے لوگوں کی علمی زندگی کا اچھی طرح اندازہ ہوتا ہے، مورخ یعقوبی کا بیان ہے، کہ اس کے زمانہ یعنی تیسری صدی ہجری میں صرف بغداد میں کم سے کم ایک سو کتب فروش تھے، ان کی دوکانیں ایک خاص سڑک پر تھیں، جسکو سوق الوراقین کہتے تھے، کتب فروشوں میں اکثر مشہور خوشنویس اور اہل ادب بھی ہوتے تھے، ان کی دوکانیں صرف کتابوں کا ذخیرہ نہ تھیں، بلکہ علمی مرکز بھی تھیں، جہاں طلبہ اور اہل علم جمع ہو کر کتابوں کو جانچتے تھے، اور ان کی قدر و قیمت پر بحث کرتے تھے،

"ع ز"

حیات امام مالکؒ

امام مالکؒ کی سوانح عمری، علم حدیث کی مختصر تاریخ، فقہ مدنی کی خصوصیت اور علم حدیث کی پہلی کتاب موطأ امام مالک پر تبصرہ، طبع دوم، ضخامت ۱۰۶ صفحے، قیمت :- عہ

"منیجر"

اخبار علمیہ

دنیا کی سب سے بڑی نمائش

آیندہ سال نیویارک میں ایک ایسی نمائش ہونیوالی ہے، جو سائنس کی ترقیوں کا ایک بے مثل مظاہرہ ہوگی، اس نمائش گاہ میں سڑکین جھیلین، پل، جنگل، زمین وغیرہ سائنس کی کرشمہ سازیوں کے نمونے ہونگی جس زمین پر یہ نمائش ہو رہی ہے، وہ اب سے دو سال قبل ولدل تھی لیکن سائنسدانوں کی دو سال مسلسل کوششوں کے بعد اب وہ قابل زراعت اور زرخیز بنادی گئی ہے، انھون نے پہلے اسے ہل سے جوتا، پھر چونے کی آمیزش کرکے فاسفیٹ اور نائٹروجن ملایا، آخر میں کھاد ڈالدی، ان تدبیرون سے یہ زمین حسب خواہش تیار ہوگئی ہے،

نمائش میں قدرتی مناظر پیدا کرنے کے لئے ایک جنگل لگایا گیا ہے، جہان سینکڑون میں سے درخت لاکر نصب کئے جا رہے ہیں، بعض درخت جو باہر سے لائے گئے ہیں، وزن میں ۶۰ ٹن اور طول میں پچاس فیٹ سے زیادہ ہیں،

اس احاطہ میں سترہ میل کی سڑکین، پندرہ میل کی گیس کی ندی، دس پل اور دو مصنوعی جھیلین بنائی جائیں گی، ایک بحری بندرگاہ بھی ہوگا، جہان دریائی موٹر اور جہاز میں سے لگیں گے،

بعض عمارتیں بھی عجیب وغریب بن رہی ہیں، ایک عمارت اس ساخت کی ہے، کہ انجینیر جس طرح چاہیں، اسکو آسانی کے ساتھ ہٹا سکیں گے، دوسری عمارت بیضاوی شکل کی ہے، جو ۰۰ فیٹ ہوا میں

بلند بنیاد اسکی بنیاد کے وقت جو لکڑیاں دی گئیں، وہ گیارہ میل تک پھیلی ہوئی تھیں، تیسری کی شکل بالکل گیند سی ہے، جس کا قطر ۲۰۰ فیٹ ہے، یہ عمارتیں میلوں کے فاصلہ سے دکھائی دیتی ہیں، اور نمائش کے ناظرین کے لئے بے حد دلچسپی کا باعث ہوں گی، ان کی تعمیر کے اخراجات کا تخمینہ ۱۲ لاکھ ڈالر ہے،

گیند نما عمارت میں "جادو کا قالین" ہوگا، جو نمائش دیکھنے والوں کو مستقبل کے شہر اور گاؤں کے نمونے دکھانے کے لئے اوپر لے جائیگا، یہ جادو کا قالین سوٹن کا ایک پلیٹ فارم ہوگا، جب اس پر لوگ بیٹھ جائیں گے، تو یہ اوپر کی طرف دائرہ کی شکل میں اٹھنے لگیگا، یہ قالین ستونوں پر قائم ہوگا، لیکن اس پر کچھ اس ترتیب سے روشنی ڈالی جائے گی، کہ ستون مطلق نظر نہ آئیں گے، اور یہ جادو کا قالین آہستہ آہستہ ایک منٹ میں تیس فیٹ کا حلقہ بناتا رہیگا، جس سے بظاہر یہ عمارت گیند کی طرح فضا میں تیرتی نظر آئے گی، رات کو اس عمارت کے باہر روشنی کی رنگین اور گھومتی ہوئی شعاعیں پڑتی رہینگی، جس سے عمارت گھومتی ہوئی معلوم ہوگی، یہ پانچ منزلوں کی عمارت ہوگی، جس کے اندر داخل ہونے کے لئے ایک بہت ہی لمبا زینہ ہے، جو خود بخود چلتا رہتا ہے، اس کے ذریعہ سے ایک گھنٹہ میں سولہ ہزار آدمی اوپر جا سکتے ہیں، اترنے کے لئے ایک گول زینہ ہے، جہاں سے نمائش کے تمام مناظر نظر آتے ہیں،

نصف درجن کی مختلف قسم کی گیسوں کی روشنیاں نمائش میں بیک وقت پھیلی ہوئی ہوں گی، یہ کوشش بھی کیجا رہی ہے، کہ آگ اور پانی کو ملا کر فوارے اور رنگین شعلے دکھائے جائیں خیال ہے کہ نمائش کے چھ مہینے کی مدت میں نصف کرور کیوبک فیٹ کی گیس خرچ ہوگی،

سب سے زیادہ جاذب توجہ ریل گاڑیوں کی نمائش ہوگی، ایک گول کمرہ کے اندر ایک پورے سائز کی ریل گاڑی چلتی نظر آئے گی، ایک دوسرے کمرہ میں جو ۱۰۰×۱۵۰ فیٹ کا ہوگا، ریلوے لائن کا مکمل مظاہرہ ہوگا، چھوٹی چھوٹی گاڑیاں انجن اسٹیشن سگنل، پھاٹک، اور پل وغیرہ سب باضابطہ

ہون گے، اور نقل وحمل کے تمام مدارج دکھائے جائیں گے،

ایک ہزار مربع فیٹ کا ایک گیہوں کا کھیت بھی ہوگا جس میں گیہوں بونے کے وقت سے لیکر روٹی پکنے تک کے تمام مدارج دکھائے جائیں گے، اسی طرح مختلف صنعتوں، مثلاً موٹر گاڑیوں کی تیاری کے تمام مراحل نظر کے سامنے ہوں گے، سائنس کے مختلف معمل برابر کام کرتے رہیں گے، فوٹو گرافی سے شوق رکھنے والے معمولی تصویر کشی سے لیکر پورے فلم کی تیاری تک کو دیکھ سکیں گے،

طب اور صحت عامہ کا شعبہ بھی عجیب وغریب ہوگا، ایک کمرہ کے اندر اٹھارہ فیٹ کا ایک مصنوعی انسان کھڑا ہوگا، جس کے دل کی حرکت کی آواز کو سب تماشائی سن رہے ہون گے، اس کے ذریعہ سے بڑے پیمانہ پر انسان کے دل اور اس کی حرکتوں کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کے بغل میں معمولی قد کے انسان کے مجسمے ہوں گے، جن میں مختلف انسانی اعضا نہایت صاف دکھائی دین گے، یہ تمام اعضا زندہ انسانوں کے اعضا کی طرح کام کرتے ہون گے، اور غذا کی تحلیل پسینے کے نکلنے، آنکھ اور کان کے افعال جسم کے نمو، متعدی امراض کے پھیلنے وغیرہ کی جیتی جاگتی تصویرین ہون گی،

ریاست ہائے متحدہ کی موت اور پیدائش کی شرح موٹر کی دوڑ کی تصویر کے ذریعہ سے دکھائی جائے گی، اس دوڑ میں کبھی موت اور زندگی ساتھ دوڑتی ہوں گی، کبھی پیدائش آگے بڑھتی نظر آئے گی، اس مظاہرہ سے یہ بھی ظاہر کیا جائے گا، کہ سائنس اور طب بچوں کے موت کے روکنے اور انسانی زندگی کو بڑھانے میں کس حد تک معاون ہوئی ہین،

ان عجائبات میں تماشائیوں کی نظر ایک عظیم الشان "جماہی لینے والے منہ" پر پڑے گی جس کے اندر آدھے درجن آدمی بیک وقت داخل ہونے کے بعد وہ ایک قالین پر چلتے نظر آئیں گے، جو اصل میں انسانی زبان ہوگی، اس کے چاروں طرف وہ شفاف دانتوں کی قطارین دیکھیں گے، جن

شریانوں میں خون دوڑتا ہوگا، دانتوں کی جڑوں میں شریانوں کو کام کرتے بھی دیکھ سکیں گے، بچوں کے دانت کس طرح نکلتے ہیں، پھر عمر کیساتھ کس طرح بڑھتے رہتے ہیں، اور آخر میں کس طرح گر جاتے ہیں، یہ سب کچھ دیکھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے ہوں گے،

ہر قسم کی آب و ہوا کی ایک جگہ

پیرس کے ڈاکٹر گولڈ مین اور برلن کے پروفیسر کارل اسٹوڈیک نے نیویارک کی ایک سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے اپنی صحت گاہ کی تجویزیں پیش کی ہیں، جہاں ایک ساتھ صحت بخش غسل کیلئے حمام، دنیا کے مشہور چشموں کے پانی، اور پہاڑ اور سمندر کے ساحل جیسی آب و ہوا کا ایک عجیب و غریب مجموعہ ہوگا، یہ گھر ایک شیشہ کی عمارت کے اندر واقع ہوگا جسکا رقبہ ۲½ ایکڑ ہوگا اور جسکی تعمیر میں ۹۰ لاکھ ڈالر خرچ ہونگے اسمیں داخل ہونیکے لئے ایک قلیل سی رقم ادا کرنی ہوگی، اندر داخل ہوتے ہی ایک وسیع کمرہ نظر آئیگا، جسمیں رات اور دن مصنوعی آفتاب کی شعاعیں چمکتی رہیں گی، اسکے بعد ایک تیرنے کا حوض ہوگا، جسکے اوپر ریت بھاپ کے ذریعہ سے گرم رکھی جائیگی، یہاں تیرنے والے ارکسٹرا کی موسیقی اور آفتاب کی صحت بخش شعاعوں سے لطف اندوز ہوسکیں گے، اوپر بادل چلتے نظر آئیں گے، تیرنے کے بعد گرم کمروں میں داخل ہونیسے کپڑے اور جسم فوراً خشک ہوجائیں گے، اسی کے پہلو میں بعض کمرے اور خیمے ہوں گے، جہاں معدنی پانی گرم ہوا، بھاپ، اکس ریز اور آفتاب کی روشنی سے ہر قسم کے صحت بخش غسل کئے جاسکیں گے، پھر حسب خواہش دوسرے کمروں میں فلوریڈا کی خوشگوار، ایری زونا اور نیو میکسیکو کی خشک ہوا ملیگی، اور اس کے ساتھ ہی زیکوسلاویکیا کے کارلسباڈ فرانس کے ویشی، نیویارک کے سیر ٹوگا کے چشموں، اور ورجینا کے گندھک کا پانی دستیاب ہوگا، اس کے علاوہ اس کے اندر پانچ جمنازیم، ایک تھیٹر، اور ایک میل سے زیادہ ٹہلنے کی جگہ ہوگی، اور مختلف کھیلوں کے میچ کا بھی سامان ہوگا،

"ص ع"

مطبوعاتِ جدیدہ

محبوبِ خدا، مؤلفہ جناب چودھری افضل حق صاحب تقطیع اوسط ضخامت ۱۸۷ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ تاج کمپنی لمیٹڈ ریلوے روڈ لاہور،

اس سے پہلے جناب افضل حق صاحب کی ایک تصنیف "زندگی" اپنی معنوی خوبیوں کی وجہ سے کافی شہرت حاصل کرچکی ہے، اب انھوں نے جیل کی فرصت میں دوسری کتاب محبوبِ خدا کے نام سے سیرتِ طیبہ پر لکھی ہے، سیرت پر آئے دن کتابیں نکلتی رہتی ہیں اسلئے ان میں کوئی نمایاں امتیازی پہلو پیدا کرنا بہت مشکل ہے لیکن مؤلف کے جوشِ عقیدت اور والہانہ اندازِ تحریر نے کتاب مذکور میں ایک خاص کیفیت پیدا کردی ہے، سیرت کے واقعات کیساتھ ان سے سبق آموز نتائج نکالے گئے ہیں، اور جابجا اسلامی تعلیمات پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس طرح یہ کتاب دینی اور دنیوی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کے لئے سبق آموز بن گئی ہے، طرزِ تحریر پرجوش اور والہانہ ہے، کہیں کہیں زبان "سیرت نگاری" کی ثقاہت کے پایہ سے گرگئی ہے،

وفاق ہند، از خان بہادر ڈاکٹر نجم الدین احمد جعفری تقطیع اوسط ضخامت ۱۰۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، علاوہ محصولڈاک، پتہ اردو لٹریچر کمپنی، دہلی،

اردو میں جدید دستور کا خلاصہ غالباً سب سے پہلے مکتبہ جامعہ نے کتابی صورت میں شائع کیا تھا لیکن وہ نہایت مختصر تھا، ڈاکٹر نجم الدین صاحب جعفری نے وفاقِ ہند کے نام سے اس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے، اس میں آئینِ جدید کے تمام ضروری ابواب آگئے ہیں، آغاز کتاب میں سرشاہ سلیمان کا پیش لفظ

نقطہ ہے، تمہید میں وفاقی حکومت کی تعریف، اس کے اقسام، مختلف ملکوں میں اس کے تجربے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد کی مختصر تاریخ ہے، جس سے ہندوستان کی آئینی تاریخ سمجھنے میں مدد ملتی ہے، اس کے بعد اصل کتاب میں جدید دستور کے تمام ابواب ہیں، اگرچہ یہ نہایت خشک موضوع ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کے طرز تحریر نے اسکو دلچسپ اور خوشگوار بنا دیا ہے، انگریزی نہ جاننے والوں کے لئے یہ کتاب خصوصیت کیساتھ زیادہ مفید ہے،

دلی کا سنبھالا، مصنفہ جناب خواجہ محمد شفیع دہلوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۵۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی،

دلی کا سہاگ دولت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی لٹ گیا تھا، لیکن آخری دور کی اجڑی ہوئی دلی بھی مشرقی تہذیب کا مرکز اور ہر صنف کے ارباب کمال کا مخزن تھی، خواجہ محمد شفیع صاحب دہلوی نے مذکورہ بالا کتاب میں اس خزان رسیدہ دور کی آخری بہار دکھائی ہے، اور اس دور کے ہر طبقہ کے ارباب کمال کے کمالات، ان کی خصوصیات اور تہذیب کو دلی کی پرانی پاکیزہ اور ستھری زبان میں اس خوبی سے دکھایا ہے، کہ مٹی ہوئی بہار کا سماں آنکھوں میں پھر جاتا ہے، یہ کتاب زبان کی لطافت اور واقعات کی مصوری دونوں حیثیتوں سے لائق قدر ہے، زبان کے ایسے بہتر نمونے اب کم نظر آتے ہیں،

فکر و نشاط، جناب جوش ملیح آبادی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نفیس، قیمت مجلد عہ، پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ قرولباغ دہلی،

فکر و نشاط جناب جوش ملیح آبادی کے منظومات کا تازہ مجموعہ ہے، ان کے کلام کا رنگ اور اسکی خصوصیات معروف و مشہور ہیں، معارف میں اس سے پہلے ان کے کلام پر تفصیلی ریویو بھی ہو چکا ہے، اس لئے اس مجموعہ پر تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی، لیکن اس مجموعہ کے رنگ کلام

میں ایک خاص قابل ذکر تغیر نظر آرہا ہے، وہ یہ کہ پہلے جناب جوش "شباب" کے نقیب تھے، انکا کلام جوانی کی رنگینیوں اور جنون خیزیوں کی تفسیر ہوتا تھا، اب غالباً کچھ بہ تقاضائے عمر اور کچھ مشق و مہارت کی پختگی سے فکر و تدبر اور سنجیدگی و متانت اسکی جگہ لے رہی ہیں، چنانچہ اس مجموعہ میں جس میں چھوٹی بڑی ۴۲ نظمیں ہیں، بیشتر سنجیدہ موضوعوں پر ہیں لیکن رنگینی جوش کی سرشت میں داخل ہے، اور ان کی شاعری کی زمین ہی گلکار واقع ہوئی ہے، اسلئے یہ مجموعہ بھی رنگین بیانیوں سے خالی نہیں ہے، اور سنجیدہ نظموں میں بھی اس کے آثار نظر آتے ہیں، تاہم اس کی بے اعتدالیاں بڑی حد تک گھٹ گئی ہیں، غالباً اسی تغیر کی بنا پر اس مجموعے کا نام "فکر و نشاط" رکھا گیا ہے، باقی جوش کی زبان و بیان کی خصوصیات اس میں بھی وہی ہیں، جو لوگ مست شباب جوش کی رعنائیاں دیکھ چکے ہیں، انھیں یہ افکار سلیم بھی دیکھنے چاہئیں،

مخدوم الملک مولفہ جناب رشید احمد صاحب بہاری، تقطیع چھوٹی ضخامت ۷۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸/، پتہ رشید اینڈ کمپنی بہار شریف پٹنہ۔

اس رسالہ میں مؤلف نے حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری قدس سرہ کے مختصر حالات آپکے مجاہدات، مدارج سلوک اور بعض مذہبی اور صوفیانہ تعلیمات لکھے ہیں، آخر میں آپکے عرس کے مراسم اور تقریبات کا ذکر ہے، زبان اچھی نہیں،

روحی فداک از جناب محمد حسین صاحب محوی صدیقی، تقطیع اوسط، ضخامت ۱۱۶ صفحے کاغذ کتابت و طباعت معمولی قیمت ۸/، پتہ دائرہ ادبیہ لکھنؤ،

"روحی فداک" مصر کے ایک مشہور اہل قلم خلیل آفندی اڈیٹر "الاہرام" کا پرانا ناول ہے، یہ ایک پاک اور سچے عشق اور اس راہ میں قربانی اور جانفروشی کی درد انگیز داستان ہے، جناب محوی صدیقی نے عرصہ ہوا اسکا ترجمہ کیا تھا، افسانہ دلچسپ ہے، ترجمہ کی خوبی کیلئے جناب محوی کا نام بہت کافی ہے،

"م"

سیر الصحابہ

...ہدایت کے پیاسے ذوق کیلئے جن مقدس ہستیون کے کارنامے اور سوانح حیات مشعل راہ ... وہ حضرات صحابہ کرام ہیں، دار المصنفین نے پندرہ برس کی جانفشانی و کوشش سے اس عظیم الشان ... م دیا، اور اردو میں صحابہ کرام کے حالات و سوانح اور اخلاق و حسنات کی دس ضخیم جلدیں احادیث ... ہزارون صفحات سے چنکر مرتب کیں، اور بہ حسن و خوبی شائع کین، ضرورت ہے کہ حق طلب اور ... رہنمائی کے جویاں مسلمان ان صحیفون کو پڑھیں، اور اس شمع ہدایت کی روشنی مین چلین، جو آج سے ... تیرہ سو برس پہلے ان کے سامنے جلائی گئی تھی، ان جلدون کی علحدہ علحدہ قیمتیں حسب ذیل ہیں، ... مجموعہ عـــــہ ہوتا ہے لیکن پورے سٹ کے خریدار کو صرف عـــہ میں یہ دس جلدیں ... نذر کیجاتی ہیں، پیکنگ ذمہ دار المصنفین، محصول ذمہ خریدار،

جلد اول	خلفائے راشدینؓ	ہے ر	جلد ششم	سیر الصحابہ ششم	عہ ر
جلد دوم	مہاجرینؓ، اول	ہے ر	جلد ہفتم	سیر الصحابہ ہفتم	عہ ر
جلد سوم	مہاجرینؓ دوم	ہے ر	جلد ہشتم	سیر الصحابیات	عہ ر
جلد چہارم	سیر الانصار اول	ہے ر	جلد نہم	اسوۂ صحابہؓ اول	عہ ر
جلد پنجم	سیر الانصار دوم	عہ ر	جلد دہم	اسوۂ صحابہؓ دوم	ہے ر

منیجر
دار المصنفین اعظم گڈہ

دار المصنفین کی نئی کتابیں

مختصر تاریخ ہند

ہمارے اسکولوں میں جو تاریخیں پڑھائی جاتی ہیں ان کا طالب علم دل آزاری اور تعصب سے خالی نہیں ہوتا، اور اس وجہ سے ہندوستان کی مختلف قوموں میں تعصب اور بغض و عناد پیدا ہو جاتا ہے، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی نے یہ تاریخ مدرسوں اور طالب علموں کے لیے اس غرض سے لکھی ہے کہ اس کا طرز بیان قومی جذبات سے متاثر نہ ہو اور ہندو اور مسلمان فرمانرواؤں نے ہندوستان کے بنانے میں جو کام کئے ہیں، وہ طالب علموں کو بلا تفریق مذہب و ملت معلوم ہو جائیں۔

ضخامت ۰۰ صفحے، قیمت :- عہ

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچوں کے نصاب میں کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو ان کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے با خبر کر سکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچوں کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، اس میں تمام بڑی بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ ہے جو گذشتہ صدیوں میں مسلمانوں نے دنیا کے مختلف حصوں میں قائم کیں، امید ہے کہ اسکولوں، مدرسوں، مکتبوں کے کارکن اور معلم اس کو نصاب تعلیم میں داخل کریں گے، ضخامت ۲۰۰ صفحے، قیمت :- عہ

مقالات شبلی "جلد ششم"

(تاریخی)

یہ حصہ مولانا شبلی مرحوم کے ان تاریخی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں اسلامی حکومتوں کے تمدن و تہذیب، علم و فن، شوق علم، اور بے تعصبی کے متعلق نہایت محققانہ واقعات درج کئے گئے ہیں، اور ان کے متعلق یورپین مورخوں کے اعتراضات کے جوابات دیئے گئے ہیں،

ضخامت ۲۴۰ صفحے،

قیمت :- عہ

مسعود علی ندوی، منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

(مطبع معارف میں محمد اویس وارثی نے چھاپ کر شائع کیا)